

اردو علم ادب کی ... کا ایک ...

...کی بیت ۔ ۔ ایڈیٹر ۔ ۔ ۱
...خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ریونیو ممبر کونسل بہاولپور ۔ ۱۰
...کا عشق ۔ مسٹر عبدالروف (از لندن) ۱۷
...باب الدین صاحب ...وی ۔ ۴۵
۶۰
... سید اکبر حسین صاحب جج الہ آباد ۶۱
پہاڑ کا منظر ۔ جناب ثاقب از مالیر کوٹلہ ۔ ۶۲
تاریا سمیں ۔ منشی گنگا سہائے صاحب ... ۶۴
ناطقہ ۔ مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی ۶۵
زندگی ۔ علی الدین صاحب عجز بدایونی ۶۸
... جناب بہجت اکبر آبادی از لکھنؤ ۔ ۶۹
تازہ غزلیں: حضرت حفیظ جونپوری ۷۰
جناب سید مہدی حسن احسن لکھنوی
مولوی سید محمد حسین صاحب ...
...
جناب ... صاحب

...انی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو ... ہیں

اعلیحضرت بادشاہ کابل کے مشیر طبی اور لاہور و آگرہ کے سرکاری ڈاکٹری مدرسوں کے استاد ڈاکٹر صاحبان کیا فرماتے ہیں

لاہور میڈیکل کالج کے معلم علم تشریح
جناب ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

علم اردو خواں اشخاص کے لئے ایک نہایت ہی مفید اور علم آموز کتاب ہے۔ اس کتاب میں تمام مروجہ امراض کا مفصل بیان ہونے کے علاوہ جسم کی ساخت، اعضا کے افعال، حفظ صحت، مردوں عورتوں اور بچوں کے خاص خاص امراض کا علیحدہ علیحدہ بابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی زبان بہت سادہ اور آسان ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ یہ کتاب بطور ایک کامل مشیر طب ہر ایک گھر میں موجود رہنا چاہئے۔

اعلیحضرت بادشاہ کابل کے مشیر طبی
جناب ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا صاحب فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

واقعی اردو زبان میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس میں ڈاکٹری و طب یونانی کی تمام اصطلاحات کو موزون اردو الفاظ میں لکھا ہے اور ہر مرض کے انگریزی عربی اور اردو نام اور ڈاکٹری و یونانی علاج مذکور ہیں۔ میں اردو خواں پبلک کو جنہیں میرے خیال میں طب خانگی پر ایک ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے۔ اور نیز ڈاکٹروں اور حکیموں کو مخزن حکمت کی بڑے زور سے سفارش کرتا ہوں۔ درحقیقت کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔

آگرہ میڈیکل کالج کے معلم علم الادویہ و علم کیمیا
جناب ڈاکٹر محمد ماشاء اللہ صاحب ایل۔ آر۔ سی۔ پی فرماتے ہیں کہ

"مخزن حکمت"

کے اکثر مقامات کو میں نے دیکھا ہے۔ عمیل میڈیسن یعنی علم طب خانگی پر یہ ایک بے نظیر مکمل اور صحیح کتاب ہے اس میں جا بجا بہت سی نقشہ جات بھی ہیں۔ قابل مصنف نے جس جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے اس کے لئے درحقیقت وہ اہل ملک کے کمال شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں

مخزن حکمت

کا ہر ایک گھرانے میں موجود ہونا نہایت ہی مفید ہے

[illegible] صفحہ لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت مجلد [illegible] آنہ [illegible] مہتمم [illegible] ملنے کا پتہ [illegible]

مخزن

حروف کی بحث

کسی نے کہا ہے کہ ہندوستان مشکل مسئلوں کا ملک ہی۔ گو ہر ملک اپنی اپنی مشکلات رکھتا ہی۔ مگر حقیقت میں ہندوستان کی قسمت اس بارے میں دُنیا سے نرالی ہے۔ جتنی پیچیدگیاں یہاں کے معاملات میں لاینحل سوالوں سے پیدا ہوتی ہیں شاید ہی کہیں ہوتی ہونگی۔ زمانہ حال میں جو مشکل سے مشکل سوال ہند میں پیش ہوتے ہیں۔ اُن میں یہ مسئلہ کہ ہندوستان عام طور پر کون سے حروف کو تحریر کے لئے کام میں لائے۔ دقت میں کسی مسئلہ سے کم نہیں۔ اِس میں شک نہیں کہ ایسا مسئلہ اگر دُنیا کے کسی اَور حصّہ میں درپیش ہوتا۔ اور وہاں کے حالات وہی ہوتے جو اس مُلک کے ہیں تو وہاں بھی اس کا حل کرنا آسان نہ ہوتا۔ لیکن جو دشواری اس کے حل ہونے میں یہاں واقع ہوئی ہے۔ اور جس طرح یہاں اُس نے مختلف اقوام ہند کے صاحبان تدبیر و رائے کو حیران کیا ہی۔ یہ بھی کسی اَور جگہ غالباً پیدا نہ ہوتی۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ اس وقت ہمارے مُلک میں رسم الخط کی بہت سی قسمیں مروج ہیں۔ اور ہر حصّہ مُلک کو وُہ رسم الخط جس کے وہاں کے لوگ عادی ہیں۔ عزیز ہے۔ لیکن کوئی غور کرنے والا انسان اس میں بھی شک نہیں لا سکتا کہ اگر اس بڑے مُلک میں جو

ایک بڑا عظیم کا حکم رکھتا ہے۔ کوئی دن ایسا بھی آنیوالا ہے۔ جب ہر حصۂ ملک میں باہمی ارتباط۔ میل جول اور یگانگت زیادہ ہو اور کاروبار اور تجارت کے رشتے مضبوط اور تعلقات وسیع ہوں۔ تو یہ بھی لازمی ہے کہ ملک بھر میں کوئی ایک زبان مروج ہو اور اس کیلئے ایک رسم خط ہو۔ بلکہ جہانتک تجارتی دنیا کا تعلق ہے۔ رسم خط کا ایک ہونا ہی بہت مفید اور کارآمد ہے۔ اور زبان میں کچھ اختلافات بھی ہوں تو بھی رسم الخط کے اتحاد سے بہت کچھ کام چل سکتا ہے۔ پس ہر فہمیدہ باشندۂ ہندوستان کا فرض ہے کہ وہ نہ صرف اس دن کے لئے تیار ہو۔ جب رسم خط کی یگانگت زبان کے اتحاد کا باعث ہوگی۔ زبان کا اتحاد خیالات اور جذبات میں ہم رنگی پیدا کرے گا اور ہمخیالی تفرقات مذہبی و قومی و رواجی کا خاتمہ کردیگی۔ بلکہ اس منتہائے خیال تک پہنچنے کے ذرائع تلاش کرے۔ ان ذریعوں میں سب سے بڑا ذریعہ یہی ہے کہ ہر شخص یہ طے کرے۔ کہ کونسا خط بہ حیثیت عام ملکی رسم الخط کے اختیار کرنا چاہیئے۔ یہ فیصلہ کرنے کے لئے دو باتیں ذہن نشین کرلینی ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ مختلف حروف مروجہ میں قدرتی طور پر جنگ لازمی ہے۔ اور بالآخر قانون قدرت کے منشا کے مطابق جد و جہد کے بعد وہ خط باقی رہ جائے گا جس میں قبول عام کا مادہ زیادہ ہو۔ جس کی سہولتیں بہ حیثیت مجموعی اوروں سے بڑھ کر ہوں اور جس میں قوت زیست اور قوت نمو بدرجۂ اعلیٰ موجود ہوں۔ جب انجام یہ ہوتا ہے تو دانشمندی اس میں ہے کہ ہم خود اس وقت کے آنے سے پہلے ایک خط کے باقی رہنے اور ترقی کرنے اور دوسروں کے رفتہ رفتہ مٹتے جانے کے لئے آمادہ ہوجائیں اور جو قوتیں خطوں اور حرفوں کی اس باہمی جنگ و جدال میں بیکار صرف ہونگی۔ انہیں کسی عمدہ مصرف لگائیں

دُوسری بات یہ ہے کہ موجُودہ خطوں میں سے کسی ایک رسم خط کو انتخاب کرتے وقت ہم اپنے ذاتی میلان یا مذہبی یا قومی جوش کو تھوڑی دیر کے لئے علیحدہ رکھکر فقط اس امر پر غور کریں کہ مُلک کی عام اغراض کے لئے کونسے رسم خط کا اختیار کرنا بہتر ہوگا اور یہ اندازہ کرنے کے واسطے اپنی نظر صرف ضروریاتِ حال پر ہی نہ ڈالیں۔ بلکہ زمانۂ مستقبل کو بھی ملحوظ رکھیں۔

ہمارے ہاں بارہا یہ بحث چلی ہے کہ رسم الخط کونسا اختیار کیا جائے۔ مگر کبھی اصُولی طور پر نہیں۔ اوّل تو بہت شاذ یہ سوچا گیا ہے کہ سارے مُلک میں ایک رسم الخط ممکن بھی ہے کہ نہیں اور اگر ممکن ہے تو ترجیح کون سے خط کو دیجائے۔ دوم عموماً مختلف صُوبجات میں یہ بحث صُوبوں کی حدود تک محدود رہی ہے۔ اور اس کو یہ خصُوصیت حاصل رہی ہے۔ کہ ایک جماعت یا فریق نے محض اپنی فوری ضرورتوں یا مذہبی اور قومی خیالات کو مدنظر رکھکر یہ زور دیا ہے کہ وُہ حروف جو اُن کے ہاں مستعمل ہیں۔ سرکاری طور پر مُروّج ہوجائیں۔ تاکہ اس جماعت کو قدرے سہولت ہو اور دُوسری جماعتوں یا فریقوں نے اس تحریک کی پُرجوش مخالفت کی ہے۔ اس بحث مباحثہ اور جدوجہد کے بعد کہیں یہ تحریک غالب آئی ہے کہیں مخالفت۔ کہیں دونوں برابر رہی ہیں۔ صُوبجات متحدہ میں اُردو ہندی کی بحث اصل میں اردو حروف اور ناگری حروف کی تکرار تھی۔ اور آخر سرکار سے اسکا فیصلہ یہ ہُوا۔ کہ دونوں پہلو بہ پہلو عدالتوں میں رواج پائیں۔ اگرچہ رواج عام نے اب تک اس حکم کے سر پر قبول کا تاج نہیں رکھا۔ مگر یہ حکم اس تکرار کی یادگار باقی ہے۔ پنجاب میں اُردو پنجابی کا جھگڑا اصلی طور پر اُردو حروف اور گورمکھی حروف کا جھگڑا ہے۔ مگر ابھی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ آخرکار یہ مسئلہ کیا صُورت اختیار کریگا۔ تاحال اسی قدر ہُوا ہے۔ کہ گورنمنٹ نے گورمکھی حروف کو

کوئی غیر معمولی ترجیح دینے سے انکار کیا ہے۔ لیکن یہ سب جھگڑے ایک طرح مقامی جھگڑے ہیں۔ جن کا ایک صُوبہ کی حدود سے باہر در اصل کچھ اثر نہیں۔ فرض کیجئے۔ لڑنے جھگڑنے کے بعد ایک صُوبہ میں کوئی فریق کامیاب ہو کر کسی خاص قسم کے حروف کو رواج دلا بھی دے تو اس سے سارے مسئلہ کی مجموعی صُورت اور مشکل اور پیچیدہ ہو جائیگی اور اس کا حل ہونا بدستور دشوار رہیگا۔ اصل طریق اس مسئلہ کے حل کرنیکا یہ ہے کہ تعصبات اور فریق بندی کے خیالات کو الگ کرکے رسم الخط پر ٹھنڈے دل سے بحث کیجائے اور پھر جس میں مُلک کے لئے زیادہ نفع اور پائدار نفع نظر آئے۔ اسے پسند کیا جائے۔

ہمارے خیال میں چار چیزیں ہیں جو رسم الخط کی خوبیوں کے پرکھنے کے لئے کسوٹی کا کام دے سکتی ہیں۔

۱۔ کونسا خط ایسا ہے جو مختلف حصصِ مُلک میں زیادہ مروّج ہے اور جس کے سامنے دوسرے خطوں کا جو خاص حصّوں یا خاص قوموں تک محدود ہیں۔ دعویٰ برابری بیکار ہوگا۔

۲۔ کونسا خط ایسا ہے جو اپنی ذاتی صفات کے لحاظ سے قابلِ پذیرائی ہے۔

۳۔ کس خط کے اختیار کرنے میں باہمی خانہ جنگی کا خطرہ نسبتاً کم ہے۔

۴۔ کس خط کا اختیار کرنا توسیع تجارت اور بیرونی دُنیا سے تعلقات پیدا کرنے کے لئے زیادہ مفید ہے۔

مَیں طرفداری سے نہیں کہتا۔ بلکہ برسوں کے غور و فکر کا نتیجہ اپنے ابنائے وطن کی بہی خواہی کی نیّت سے ظاہر کرتا ہوں کہ بہ حیثیتِ مجموعی فارسی حروف جن میں اُردو زبان آج کل عمُوماً لکھی جاتی ہے۔ ہندوستان کے لئے بہترین

حروف ہیں۔ اور اگر کسی سبب سے اہل ہندان حروف کو رواج دینے پر متفق نہ ہو سکیں تو میرے خیال میں رسم خط کے اتحاد کی ضرورت اس درجہ ہے کہ میں زور سے ہندوؤں مسلمانوں سکھوں پارسیوں غرض سب باشندگان ہند کو یہ مشورہ دونگا کہ وہ رومن حروف جن میں انگریزی زبان لکھی جاتی ہے اختیار کر لیں۔ اس موقعہ پہ یہ کہدینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی جماعت مذہبی یا قومی ضرورتوں کے خیال سے عام ملکی رسم خط کے علاوہ کوئی اپنا رسم خط قائم رکھنا چاہے۔ یا اسے بطور ایک خط ثانی کے رواج دے تو یہ اس کی خوشی پر موقوف ہے۔ اس میں اغراض ملکی کا کچھ نقصان نہیں۔ اور کسی معقول پسند شخص کو اس سے تعرض نہیں ہونا چاہیئے

اب میں مندرجہ بالا رائے کی وجوہات لکھتا ہوں۔ جو چار معیار اوپر قائم کئے گئے ہیں۔ اُن میں ہر ایک میں فارسی رسم الخط پورا اُترتا ہے۔ ہندوستان کا کوئی حصہ ایسا نہیں جس میں یہ کم و بیش موجود نہ ہو۔ بحالیکہ دُوسرے حُروف اپنے اپنے علاقوں میں محدود ہیں۔ ذاتی صفات کے لحاظ سے فارسی رسم خط کی بابت اس موقعہ پر زیادہ لکھنا بے ضرورت ہے۔ یُوں تو ہر رسم خط اپنی خوبیاں اور اپنے نقص لئے ہُوئے ہے اور ہر ایک کے طرفدار اس کی خوبیوں میں مبالغہ اور اس کے نقائص میں کمی کر کے دکھلاتے ہیں۔ مگر انہی اوراق میں ایک نہایت مفصل و مدلل مضمون فارسی رسم خط کی ذاتی خوبیوں کے متعلق سال گذشتہ میں چھپ چکا ہے۔ اس کی دلائل کا اعادہ کرنے کی حاجت نہیں۔ اس میں فاضل مضمون نگار نے ثابت کیا تھا کہ علاوہ مختصر نویسی کی خوبی کے جو فارسی خط میں بدرجہ اعلیٰ موجود ہے۔ اسکی طرز تحریر انسان کے ہاتھ اور دست و بازو کے پٹھوں کی ساخت کے لئے زیادہ مناسب ہے۔ اور یہ طرز تحریر بمقابلہ اس طرز تحریر کے جو مغربی دُنیا میں مروج ہے۔ زیادہ قدرتی طریقہ لکھنے کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض نقائص اس رسم خط میں ہیں جن سے

ناگری رسم خط یا رومن رسم خط مبرّا ہے۔ مگر اسکی سہولتیں نظر انصاف میں اسکی دقتوں سے زیادہ ہیں اور اس لئے ذاتی صفات میں یہ بعض خطوں سے بہتر ہے۔ یا کم از کم کسی سے کمتر نہیں۔ باہمی خانہ جنگی کا خطرہ اسکے اختیار کرنے میں اس لئے کم ہے۔ کہ اول تو اس کے اختیار کرنے میں کسی نئی چیز کو جو پہلے بہت کمزوری او بے اثری کی حالت میں ہو۔ دفعتہً بلند مرتبہ پر پہنچا دینا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک مقبول چیز کو مقبول تر کرنا ہوگا جس پر کسی کو جائز اعتراض نہیں ہو سکتا۔ اس رسم خط کا ایک عام اثر اطراف ملک میں موجود ہے۔ صرف اسے وسیع کر دینا ہے۔ برعکس اس کے اگر بنگال کا رسم خط مہاراشٹر میں یا مہاراشٹر کا رسم خط بنگال میں یا مدراس کے حروف شمالی ہندوستان میں رواج دینا چاہیں تو اُن کے مقبول ہونے کا ہرگز اتنا امکان نہیں جتنا فارسی حروف کا ہے۔ کیونکہ بنگال اور مہاراشٹر کے حروف کو جو اصل میں سنسکرت حروف کی شاخیں ہیں۔ ایک دوسرے پر ترجیح دینا ترجیح بلا مرجح ہوگا۔ اور ناپسند کیا جائیگا۔ سنسکرت تحریر سے نکلے ہُوئے حروف میں صرف ناگری حروف ہیں جو کسی حد تک ہندوستان میں فارسی حروف کے مقابلہ میں میدان میں آسکتے ہیں۔ لیکن اگر موجودہ رواج کی عمومیت پر فیصلہ ہو تو پھر انہیں بھی زیادہ موقع کامیابی کا نہیں۔ اور اس کے سوا اُن میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ ہندوستان کو دُنیا کے دُوسرے حصوں سے بالکل منقطع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ فارسی اور رومن حروف نہ صرف ایک دو بلکہ بہت سے ممالک سے ہندوستان کا رشتہ جوڑتے ہیں۔ اِسی لئے تجارت کو وسعت دینے اور بیرونی دُنیا سے ربط پیدا کرنے کے لئے فارسی اور رومن حروف تمام دوسرے مروّجہ خطوں سے یقیناً بہتر ہیں۔

ابھی یہ بتانا باقی ہے کہ فارسی اور رومن حروف میں ہندوستان کے لئے فارسی حروف کو ترجیح کیوں ہے۔ بظاہر تو اس زمانہ میں رومن حروف کو ترجیح ہونی

چاہئیے۔ ہندوستان انگریزی حکومت کے زیر سایہ ہے۔ انگریزی زبان یہاں کے دفاتر اور مدارس میں رواج پا گئی ہے اور پائی جاتی ہے۔ اور وہ رومن حروف میں لکھی جاتی ہے۔ پس رومن حروف کا اختیار کرنا حاکم و محکوم کے باہمی تعلقات میں صفائی کا باعث ہوگا۔ اور رفتہ رفتہ ہمارا ایک تعلق یورپ اور امریکا کے تمام اُن ممالک سے پیدا کردیگا۔ جن میں رومن حروف کا رواج ہے۔ یعنی یورپ میں نہ صرف انگلستان بلکہ فرانس اور اٹلی وغیرہ ممالک سے ایک سلسلۂ کاروبار قائم کرنے میں آسانی ہوگی۔ یہاں کا ایک پڑھا لکھا آدمی جو رومن حروف پہچانتا ہوگا۔ اُن ممالک میں سفر کرتے وقت بہت سی سہولت دیکھیگا اور وہاں سے اگر کوئی کاروباری خط یہاں کے تاجر کے پاس آوے تو وہ محض حرف شناسی کی بدولت بغیر دُوسری زبانیں جاننے کے بھی کچھ نہ کچھ اس کا پتہ لگا سکیگا۔ یہ سب درست ہے اور اسی اعتبار سے اس مضمون میں یہ اعتراف کیا گیا ہے کہ اگر ہندوستان والے اپنے ایشیائی رسمِ خط پر متفق نہ ہوئے تو رومن خط کا اختیار کرنا بالآخر اُن کے لئے ایک نعمت عظمیٰ ثابت ہوگا۔ لیکن اوّل یہ کیوں ضروری ہے۔ کہ فارسی رسم خط کے اختیار کرنے کی کوشش کیجائے۔ اس کی وجوہات مختصر طور پر یہ ہیں:۔

۱۔ یہ خط جس رفتار سے ترقی کر سکتا ہے۔ رومن خط ملک میں اُس رفتار سے نہ پھیل سکیگا اور اگر پھیلا بھی تو بہت زیادہ عرصہ اس کے پھیلنے کے لئے درکار ہوگا اور اس وجہ سے ملک کی اغراض تعلیمی میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوسکیگی۔

۲۔ رومن خط بہ وجہ بالکل اجنبی ہونے کے بہت سی آوازوں کے ادا کرنے سے قاصر ہے۔ یا اگر ادا کرتا ہے تو اُن میں شُبہ و التباس پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس لئے ہندی زبانوں کے لئے موزوں نہیں۔ برعکس اس کے فارسی خط اوّل ایشیائی الاصل ہے۔ دوئم صدیوں سے ہندوستان میں بود و باش

استیثار و ایثار

یہ مقام مسرت ہے کہ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب جنکی خدمات حال ہی میں پنجاب پراونشل سروس سے ریاست بہاولپور میں منتقل ہوئی ہیں اور جو ریاست کی کونسل میں صیغۂ مال کے ممبر مقرر ہوئے ہیں۔ باوجود اپنے اہم فرائض منصبی کی مصروفیت کے علمی مشاغل کیلئے وقت نکالتے رہتے ہیں۔ ہم ممنون ہیں کہ اپنے نئے عہدہ کے کاروبار میں بھی اُنہوں نے مخزن پر وہی پہلے سی نظرِ عنایت رکھی۔ ذیل کا مضمون انکے اکثر مضامین کی طرح غور و فکر سے لکھا ہوا ہے اور ملک و قوم کی توجہ کے لائق ہے۔

دُنیا کی منڈی میں داد و ستد کا طریقہ شروع ہی سے چلا آتا ہے۔ کوئی لیتا ہے اور کوئی دیتا ہے۔ کوئی دینے والا ہے اور کوئی لینے والا۔ اگر کوئی کسی دوسرے کی کوئی ضرورت رفع کرتا ہے تو اس کی بھی کوئی دُوسرا شخص کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی ضرورت رفع کرتا ہے۔

اگر یہ دونوں طریقے دُنیا کی منڈی میں مرعی نہ ہوں تو یہ سلسلہ جو اسوقت چل رہا ہے ایک ہی دن میں بند ہو سکتا ہے اور اس منڈی کی ساری رونق دم بھر میں نیست و نابود ہو جائے۔ چاہے کوئی امیر ہو اور چاہے غریب دونوں اِس کساد بازاری کی زد سے بچ نہیں سکتے۔ اسی طرح استیثار اور ایثار کی کیفیت ہے۔

استیثار کیا ہے؟

یہ چاہنا اور اِس لَے میں رہنا کہ کوئی دوسری ہستی کوئی دُوسرا شخص کسی دُوسرے کے کام آئے اور اس کی زندگی کی آسائش کے واسطے اُس سے کوئی

کام یا کوئی خدمت بروقت ہو سکے۔ ایک مفلوک الحال یا ایک غریب آدمی ہی اس کا خواہاں نہیں رہتا بلکہ ایک دولتمند اور صاحب اقبال بھی اس کا محتاج رہتا ہے اور سچ پوچھو تو دولتمند اور با اقبال لوگ اس کے نسبتاً زیادہ تر خواہشمند رہتے ہیں۔

ایثار کیا ہے؟ کسی کے کام آنا۔ کسی کی خدمت کرنا۔ کسی کی بہتری اور آسائش کے واسطے جان جوکھوں میں ڈالنا۔ یہ بھی ایک قسم کا لین دین ہی جو ایثار چاہتا ہے وہ لیتا ہے اور جو ایثار کرتا ہے وہ دیتا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ ثابت ہی کہ اس طریق عمل کی واقعی ضرورت ہی اور اسکے سوائے کام نہیں چل سکتا۔

کوئی ملک اور کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس میں آمد درآمد نہ ہو اور داد وستد کا سلسلہ جاری نہ رہے۔ استیثار کا طریقہ تو دنیا کی بعض قوموں میں ایک خاص حد تک جاری رہتا ہے لیکن ایثار کے نہ ہونے سے انکی ترقی رُکی رہتی ہے اور روز بروز ان میں ضعف آتا جاتا ہے۔

کونسی قومیں اور کونسے ملک تنزل پاتے اور اپنے عروج سے گر جاتے ہیں وُہ جو استیثار میں تو کوئی کمی نہیں کرتے لیکن ایثار میں کمزور پڑتے جاتے ہیں۔

جس ملک اور جس قوم میں سب کے سب لینے اور مانگنے والے ہی ہوں اور دینے والے فیصدی پانچ بھی نہ ہوں وُہ ملک اور وہ قوم کیونکر فارغ البال ہو سکتی ہی جب سب لوگ یہی چاہیں اور یہی درخواست کریں کہ انہیں اور لوگ دیں ہی دیں تو اس صورت میں خود اُن سے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔

اگر ہم مُردہ اور متنزل اقوام کی تاریخیں پڑھینگے تو ہمیں یہ بات ماننی پڑیگی کہ جب اُن میں ایثاری جذبات کا مواد باقی نہ رہا اور نری خود غرضی باقی رہ گئی تو انکی حالت دن بدن بگڑتی گئی۔ اگرچہ بعض مورخوں نے ان اسباب کے بیان

کرنے میں جو کسی قوم کے ادبار کا باعث ہوتے ہیں۔ ایثاری قوتوں کی کمی کا بالخصوص ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن اگر تنزل کا اصلی ٹوٹولیا جائے تو یہ کہنا ہی پڑے گا کہ اس قوم کے تنزل کا اصلی موجب ایثار کی کمی تھی۔ ایثار کے نہ ہونے سے دُنیا کی جاعتوں میں کسی مرض یا کسی عارضہ کا دور ہوتا ہے۔

(الف) خودغرضی کا۔

(ب) خودمطلبی کا۔

(ج) خودپسندی کا۔

یہ تینوں عارضے اس قسم کے ہیں کہ اُن کے ہوتے کوئی تدبیر اور کوئی علاج کارگر نہیں ہوتا اور نہ کسی قوم کی حالت میں کوئی نیک تبدیلی ہوتی ہے۔

جن جن قوموں میں ایثاری مواد کا زور ہے اور لوگ اس کی ضرورتوں سے آگاہ ہیں۔ اُن میں بھی اگرچہ یہ عارضے شخصی حد تک ہوتے ہیں۔ لیکن قومی رنگ میں اُنکی کوئی حقیقت اور اُن کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ بیشک یہ بھی نہایت ضروری بات ہو کہ شخصی رنگ میں بھی ایثار کی سخت ضرورت ہو اور قومی ایثار کی بنیاد یہیں سے پڑتی ہے۔ لیکن جب تک قومی ایثار نہ ہو تب تک شخصی ایثار کی مطلقاً قدرومنزلت نہیں ہوتی علوم وفنون اور دولتمندی یا حرفت سے بھی قوموں کی ترقی اور خوش حالی منصور ہے۔ لیکن ان چیزوں کے ساتھ جب تک قومی ایثار نہ ہو۔ اُن کی کوئی وقعت نہیں اور نہ اُنکا کوئی عملی اثر ہوتا ہے۔ قومی ایثار کب ہوتا ہے جب شخصی ایثار مجموعی حیثیت سے پایا جاتا ہو۔

یہ حالت کب نصیب ہوتی ہے۔

جب جائز خودغرضی کے سوائے اَور سب خودغرضیاں ترک کردیجائیں۔

یہ ترک کیونکر ہوں۔

جب اپنی موجودہ حالت کا صدق سے جائزہ لیا جائے۔

جب اس مرحلہ پر انسان پہنچتا ہے تو اس کا ضمیر اس مرکز پر لے آتا ہے کہ ایک گرے ہوئے شخص کی ضرور امداد کرنی چاہئیے۔ اور گرے ہوئے شخص کی اسوقت امداد ہوتی ہے کہ جب اپنی جان لڑا دی جائے اور اپنے مطالب پر پانی پھیر دیا جائے۔

جب کوئی قوم اس نقطہ پر پہنچتی ہے تو وہ ایثاری دائرہ میں آجاتی ہے۔ اور اسکی ناکامیاں رفتہ رفتہ کامیابیوں سے تبدیل ہونے لگتی ہیں۔

ایثار کی کئی قسمیں ہوسکتی ہیں۔

(الف) شخصی ایثار۔

(ب) خاندانی ایثار۔

(ج) جماعتی ایثار۔

(د) قومی ایثار۔

(ہ) ملکی ایثار۔

(و) جذباتی ایثار۔

(ز) خودغرضانہ ایثار

(ح) مذہبی ایثار۔

یہ سب قسمیں بجائے خود اپنے اپنے موقعہ پر مفید اور ضروری ہیں۔ سوائے اس کے کہ خودغرضانہ ایثار ایک حد تک اپنی تہ میں ایک کمزوری لئے ہوئے ہے۔ اس سے تو ہم کسی حالت میں بھی انکار نہیں کرسکتے کہ ہماری قوموں اور ہمارے ملک میں کسی نہ کسی حدتک سب قسم کے ایثار پائے جاتے ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ سوائے خودغرضانہ ایثار یا جذباتی ایثار

کے اور سب قسمیں کمزوری کی حالت میں ہیں۔ جذباتی ایثار سے محبت اور دوستانہ ایثار مراد ہے۔ سو یہ ایک خاص صورت ہے۔ اس کا وجود ہر حالت میں پایا جاتا ہے۔ شخصی۔ خاندانی۔ جماعتی۔ ملکی اور قومی ایثار کی مثالیں یا تو سرے سے پائی ہی کم جاتی ہیں اور یا اُن میں کچھ نہ کچھ خود غرضانہ مواد بھرا ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کے ایثاروں میں صداقت بہت کم ملتی ہے۔ چند ہی روز کے بعد انکی حقیقت کھل جاتی ہے اور اختلافِ خیالات کی صورت میں پردہ فاش ہو جاتا ہے۔

ایشیائی ملکوں میں بجائے قومی اور ملکی ایثار کے مذہبی ایثار کی مثالیں کثرت سے ملینگی اور یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ مغرب میں اُنکا عشرِ عشیر بھی نہیں لیکن اب اُن میں بھی ایک قسم کی کمزوری پیدا ہو چکی ہے جس سے اُن کی وقعت میں فرق آگیا ہے۔ ایشیائی ملکوں میں دراصل مذہبی ایثار ایک حد تک قومی رنگ میں بھی تھا۔ کیونکہ یہاں کی قومیت مذہب میں ملی جلی رہتی ہے اور مذہب کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ خلاف اس کے مغربی ممالک میں اب مذہبی ایثار اور قومی ایثار میں فرق کیا جاتا ہے اور اب قومی ایثار مذہبی ایثار پر غالب ہوتا جاتا ہے اور مذہب تقریبًا قومی رنگ میں ظاہر ہو رہا ہے۔ نتیجہ دونوں طریقِ عمل کا ایک ہی ہے۔ صرف اس قدر فرق ہے کہ مذہبی رنگت روحانیت رکھتی ہے اور قومی رنگت میں مادیات کی آمیزش زیادہ ہے۔ بیشک وہ دن بہت شرمناک ہوگا کہ جب ایشیائی ایثاروں سے مذہبی یا روحانی لہروں کی ہستی معدوم ہو جائیگی۔ کیونکہ مذہبی یا روحانی جذبات ایشیائی قوموں کا دراصل جدی ورثہ ہیں۔ لیکن روحانی جذبات کی عدم تکمیل۔ کمزوری اور دوسری جانب سے مادیات کی کمی دونوں مل کر ایشیائی حصوں میں سخت انقلاب کا باعث

ثابت ہو رہی ہیں۔ مذہبی رنگت بھی پھیکی پڑ گئی اور مادی صورت بھی مسخ ہو گئی تو اسکا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا کچھ خیال میں لایا جا سکتا ہے کہ دونوں پہلو متروک ہو چکے۔

اس وقت مذہبی رنگ میں بھی جو کچھ ایثاری ہستی پائی جاتی ہے۔ اسکی حالت بھی چنداں پائدار نہیں ہے۔ فرقوں کی باہمی دشمنیاں اور آئے دن کے مناقشے ایسی ہستی کی وقعت اور وسعت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ اور یہ کہنا پڑتا ہے کہ اسی ایثار کی آخرکار قیمت کیا کچھ پڑنے والی ہے۔ دوسری طرف سے مادی ایثار فرقوں اور قوموں کی کاوش اور موجودہ شکر رنجی کا ایک کمرشکن نظارہ ہے۔ کیا ان حالات میں کسی حالت میں بھی کہا جا سکتا ہے کہ ایشیائی قوموں میں صحیح معنوں میں کوئی ایثاری قوت کام کر رہی ہے صحیح نتیجہ پر پہنچ کر اس کا یہی جواب ہے کہ اس وقت ہم میں کوئی ایثاری قوت صحیح پیمانہ پر کام نہیں کرتی اور ہم میں سے فیصدی پچیس بھی اس قوت کی ضرورت اور ہستی سے واقف نہیں ہیں یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ اسکا واقعی احساس ہی کمزور پڑ گیا ہے۔ کیا ہوا اگر کروڑوں مخلوق میں دو چار روحیں کام کر رہی ہوں۔ کروڑوں میں جب تک ہزاروں کی تعداد نہ ہو تب تک ایثاری قوت کے وجود کا اعتراف نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اور غلطی عام طور پر دیکھی جاتی ہے۔ لوگ مذہبی یا تمدنی رنگ میں ذاتی یا نفسانی ایثار سے جماعتی یا قومی اور ملکی ایثار مراد لینے کے عادی ہیں۔ مثلاً ایک عابد اور ایک تپشیا کرنے والا جب یہ خیال کرتا ہے کہ اس کی عبادت اور اسکی تپشیا قوم یا ملک کے واسطے بہئیت مجموعی کوئی اثر رکھتی ہے تو وہ درحقیقت ایک غلطی کی پیروی کر رہا ہے۔ یہ ایک جذباتی ایثار ہے جس کی

خاص وجوہ ہیں اور اس کا فائدہ جو کچھ بھی ہو زیادہ تر اُس کی ذات کیواسطے مخصوص ہے۔

اگر اس مُلک میں کوئی شخص یہ اندازہ لگائے کہ اُس نے خالصًا ایثاری رنگ میں اپنی زندگی میں کتنے مفلوک دوستوں کی خدمت کی ہے تو اُسے پتہ لگیگا کہ ایسی خدمات کی تعداد بہت ہی محدود ہے۔

اگر اس ملک میں قومی ایثار کی زندہ مثالیں تلاش کیجائیں تو شاید فی ہزار ایک آدمی ملیگی اور استیثاری تخمینہ اگر لگایا جائے تو فی صدی پچیس ہوگا اسکا موجب سوائے اس کے اَور کیا ہوسکتا ہے کہ ایثاری قوت بالکل ماند اور کمزور پڑگئی ہے اور دلوں سے اس کا احساس اُٹھ گیا ہے۔ بعض اوقات لوگ خیرات سے مراد ایثار لیا کرتے ہیں۔ میری رائے میں اوّل تو اس کا اکثر حصہ نمایش پر ہوتا ہے اور دُوسرے یہ کہ یہ ایثار بجائے خود اسوقت کسی ضابطہ کے ماتحت نہیں ہے۔ جس سے اس کی ہستی عمومًا غیر مفید ہو رہی ہے۔ استیثار اور ایثار کا سوال ایک بڑا بحث طلب سوال ہے۔ یہاں کی قومیں اسپر غور کریں +

سُلطان احمد (بہاولپور)

بعض لوگوں کی عادت ہے کہ دوسروں کے چلن پر شک آمیز حملہ کرتے ہیں۔ ایسی طرح کہ بظاہر کسی سے محض سرسری ملاقات میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے کرتے کئی شخصوں کا ذکر کر جاتے ہیں اور جب کسی کا نام گفتگو میں آ جاتا ہے اسکو نام پر ایک نہ ایک بُرا دھبہ لگاتے جاتے ہیں۔ یا اسکی نسبت کچھ شک پیدا کر دیتے ہیں اور کچھ نہیں تو کسی کا نام لیکر ایک خاص انداز سے چپ ہو جاتے ہیں اور مخاطب سے کہتے ہیں "آپنے کچھ سُنا بھی۔ ہم کو تو یقین آتا نہیں لیکن ....." اتنا کہکر پھر چُپ ہو جاتے ہیں۔ اور سر ہلاتے ہیں۔ یا شانوں کو جنبش دیتے ہیں اور ان حرکات سے چپ چاپ اپنے ناتمام فقرے میں بُرے سے بُرے معانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسا کرنا نہ صرف حد درجہ کی بے پروائی بلکہ شرارت ہے۔ کہنے والے کبھی اس پر غور نہیں کرتے کہ مُنہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آسکتی۔ جو ایک دفعہ مُنہ سے نکالتے ہیں۔ ہمیشہ کے لئے تیر از کمان جستہ ہے۔ ممکن ہے کہ کہنے سے برسوں بعد کہنے والے کو معلوم ہو۔ کہ اس ایک سرسری لفظ سے ایک زندگی ناخوش ہوگئی۔ یا کسی گھر بھر کی عافیت و آرام میں ہمیشہ کے لئے خلل آگیا۔ سینٹ جیمس کا مقولہ ہے کہ تم میں سے جو شخص مذہبی معلوم ہوتا ہے مگر اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا۔ اسکا مذہب بے معنی ہے (ترجمہ)

ایک ماما کا غش

پہلا منظر

صبح کا سہانا وقت تھا۔ اگرچہ اُفقِ مشرق پر قرصِ آفتاب کا ابھی تھوڑا سا حصہ نمودار ہُوا تھا لیکن فراخ میدانوں اور سبز مرغزاروں کو اس کی دھیمی روشنی نے شبِ تاریک کا سیاہ بُرقع اُتار کر ایک نوری جامہ پہنا دیا تھا۔ ہر طرف ایک پُرفضا عالم چھایا ہُوا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہَوا کے جھونکے کھیتوں کے نونہالوں کو زمین بوس کر رہے تھے۔ جُوں جُوں سورج بلند ہوتا جاتا تھا۔ دھوپ میں چمک اور تیزی بڑھتی جاتی تھی۔ اب اسکی شعاعیں اُن کھنڈرات پر منعکس ہو رہی تھیں جن کی قدامت کا ثبوت ہر پتھر کی کلونس سے ظاہر ہے۔ زمانے کے تغیر نے اُن عالیشان محلات کو جہاں کبھی زندوں کے لئے عیش و عشرت کے سامان مہیا تھے۔ مُردوں کی آرامگاہ بنا دیا ہے۔ دو چار قبریں جو نئی معلوم ہوتی ہیں اُن کی سفیدی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ یہ کالے کلوٹے پتھر جنکو آج کسی بے نام و نشان کے سنگِ مزار ہونے کا فخر حاصل ہے کبھی میری طرح آب و تاب رکھتے ہونگے۔ اِن قبروں کے برابر ہی ایک مٹی کا چبوترہ ہے جس پر نیم کے درخت نے چھاؤں کر رکھی ہے۔ اس کی جڑ سے کچھ فاصلہ پر ایک راکھ سے بھرا کونڈا دھرا ہے اور اس میں تھپواں اُپلے کی چنگاری سے تھوڑا تھوڑا دھواں نکل رہا ہے۔ جو نیم کے پتوں تک جاتے جاتے غائب ہو جاتا ہے۔ کونڈے کے پاس ہی ایک حقہ دھرا ہے جس کے نیچے پربان کی بندش ہے اور بوریئے کے ٹکڑے پر نیلا تہبند باندھے ایک شاہ صاحب بیٹھے حقہ کا دم لگا رہے ہیں۔ اور ان کے برابر

ایک اَور فقیر جنکے گلے میں ایک جوگیا کفنی پڑی ہے حقّے کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ دو چار گھونٹ لیکر نیلے تہ بند والے شاہ صاحب نے اپنے ہم مشرب کے آگے حقّہ سرکایا اور کہنے لگے" کہو میاں قلندر شاہ! آج کہاں کی پھیری رہیگی۔ جمعرات ہے مَیں تو چاندنی چوک میں دوکانوں کا چکّر لگاؤنگا۔ بھائی ڈیوڑھیوں پر صدا لگانے سے یُوں گھبراتا ہوں کہ روٹی کے سُوکھے ٹکڑوں کا ڈھیر ہو جاتا ہے۔ اور ان کے کوڑے کرنے میں اپنے کو کچھ بچت نہیں ہوتی" اس پر قلندر شاہ بولے" شاہ جی! جمعرات کے دِن تو مَیں گھروں کی پھیری لگاتا ہوں۔ پنجابیوں کی گلی میں بہت سی سخی مائیاں ہیں۔ بس میری صدا لگانے کی دیر ہے کہ گرم گرم چپاتیوں پر کچھ سالن ترکاری رکھکر بھجوا دیتی ہیں اور کئی گھروں سے ایک ایک پیسہ مل جاتا ہے سو تم جانتے ہو اس سے اپنی افیم اور ٹھنڈائی کا خرچ چلتا ہے" یہ گفتگو ختم کرکے قلندر شاہ نے حقّے کا ایک اَور دم لگایا مگر چونکہ تمبا کو جل چکا تھا انکو کچھ مزا نہ آیا اس لئے چلم لیجاکر ڈیل میں اُلٹ دی۔ اس پر دُوسرے شاہ صاحب بولے" مَیں نے کہا پہلے تھوڑی سی سبزی گھونٹ لو۔ پھر چلم بھی بھر لینا"۔ قلندر شاہ کی سمجھ میں یہ بات آگئی اور اُنہوں نے کونڈی سونٹا سنبھال جو چبوترے سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا۔ کنوئیں کا رُخ کیا۔ یہ کنُواں قبروں سے کچھ بہت فاصلہ پر نہیں ہے۔ اس کی مینڈھ پر ایک درخت کا دوشاخا تنا گڑا ہوا ہے۔ جس کی گھرنی پر سن کی بٹی ہوئی رسّی پڑی رہتی ہے۔ اس کے اِرد گرد پانی گرنے کی وجہ سے لمبی لمبی گھاس اُگ آئی ہے اور ایک طرف کو ایک حوض سا بنا ہوا ہے۔ جس میں مویشیوں کے لئے پانی بھرا رہتا ہے۔ قلندر شاہ نے کنُوئیں پر جاکر ڈول میں پانی کھینچا اور کنارے پر بیٹھکر بھنگ گھوٹنے لگے۔ جب اپنے دل کے موافق اس کو خوب حل کر چکے تو دُوسرے فقیر صاحب کو

آواز دی ”شاہجی! ٹھنڈائی تیار ہے آنکے دو چار گھونٹ لے لو“۔ اس پر وُہ بولے
”میاں یہیں لے آؤ! میں اِتنے شُلفہ بھرتا ہوں“ غرض جب یہ دونوں شاہ صاحب
ٹھنڈائی پی پلا کر فارغ ہُوئے اور حُقّے کا اچھی طرح دم لگا چکے تو قلندر شاہ نے
جھولی گلے میں ڈالی اور کچکول ہاتھ میں لیکر شہر کی طرف روانہ ہُوئے۔ کچھ تو صبح
کی ٹھنڈی ہوا اور اُس پر بھنگ کا نشہ ان دونوں نے ملکر شاہ جی کے دماغ پر ایسا
اثر کیا کہ سارے راستے اپنے آپ خُرافات بکتے چلے جاتے تھے۔ اور جو کوئی
پنہاری یا راہگیر کسان ملتا اُسکو خواہ مخواہ گالیاں سُناتے۔ وہ بیچارا یہ سمجھتا
کہ فقیر کی موج ہے۔ اِن کی گالیوں ہی میں اللہ میاں نے دعاؤں کا اثر دیا ہے
اور اِس لئے سُنکر چپکا چلا جاتا۔ مگر جب شاہ صاحب شہر کے اندر داخل ہوئے
تو انکو ہوش آیا کہ یہاں گالیوں کی چال چلنے والی نہیں۔ کیونکہ اگر کسی بڑے
دِل کے سامنے ایک آدھ ناپاک لفظ بھی زبان سے نکلا تو وہ دو ایک چپت
رسید کر بیٹھیگا اِس لئے اب اُنہوں نے اِلّا اللہ [illegible] لگانے
فراش خانے کی کھڑکی میں گھستے ہی ان کی نظر ایک [illegible] علم پر پڑی
ہاتھ میں لئے اپنے مدرسے کی طرف چلا جا رہا تھا چونکہ اس کے لباس سے
تھا کہ کسی امیر گھرانے کا لڑکا ہے اس لئے شاہ صاحب نے اس کی طرف
کہ شاید ایک آدھ پیسے کا بھلا ہو جائے۔ اگرچہ اُس کی شیروانی اچکن اور [illegible]
سے اِن کے دل میں یہ خیال ضرور گذرا کہ کہیں ایسا نہ ہو وُہ دھتکار دیتا ہے مگر ہمت کر
کے سوال کر ہی بیٹھے کہ ”بابا! فقیر کو سویرے سویرے کچھ دلوا دے۔ جا! تیرا بھلا
ہو جائیگا۔ اللہ تجھ کو صاحب نصیب اور صاحب علم کریگا“ اوّل تو اُس بچے نے یہ کہکر ٹالنا چاہا
کہ ”اسوقت معاف کرو“ مگر جب فقیر صاحب نہ ٹلے اور لگے اپنی یہ ہانکنے کہ ”بچہ!
فقیر کی موج ہے اس وقت دلوا دے جو کچھ حاضر ہے۔ سویرے ہی نانہ کر۔ اللہ تجھ کو

ڈبل پاس کریگا" تو اس نے جواب دیا کہ "شاہ صاحب! تم جوان آدمی ہو۔ تمہارا بدن کثرتی معلوم ہوتا ہے۔ ہر طرح پر تندرست ہو پھر کچھ کام کر کے کیوں نہیں روٹی کماتے جو اس مُفت خوری پر کمر باندھ رکھی ہے۔ میاں کہیں نوکری کرو اور یہ بھیک مانگنی چھوڑو۔ ہمارے ہاں تم جیسے ہٹے کٹے سائل کو دینا روا نہیں" اِس پر تو فقیر صاحب کا مارے غصہ کے چہرہ لال ہو گیا اور کہنے لگے کہ "بابا! ہم نے تجھ کو سخی داتا جانکر سوال کیا تو ہم کو حرام خور بتاتا ہے۔ ہم کو دُنیا کی نوکری کی خواہش نہیں۔ ہم اپنے مولا کے نوکر ہیں۔ وُہ ہم کو سخی بندوں کے ہاتھوں اپنے خزانۂ غیب سے دلواتا ہے۔ اگر دُنیا میں تجھ جیسے مائی باپ ہونے لگیں تو ہم درویش لوگ تو بھوکوں مر جائیں۔ بابا! چلا جا اپنا رستہ لے! فقیر کا دل نہ دُکھا! مُنہ سے کوئی بد دُعا نکل جائیگی۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ!!" غرض وُہ نوجوان تو قدم بڑھا کے آگے چلا گیا کہ فقیر کے مُنہ نہ لگے اور شاہ صاحب اِلَّا اللّٰہ کے نعرے مارتے پیچھے رہ گئے اور اپنے دل میں سوچنے لگے کہ آج پہلا ہی سوال رد ہُوا۔ خُدا خیر کرے کہیں سارا دِن خالی نہ جائے وُہ ابھی اِسی شش و پنج میں تھے کہ دُور سے ایک اَور سخی داتا کو تاڑا جو اُنکی طرف چلا آ رہا تھا۔ یہ شخص وضع قطع سے کوئی دوکاندار معلوم ہوتا تھا اور ہاتھ میں کُنجیوں کا گُچھا لئے اپنی دوکان کھولنے جا رہا تھا کہ اِتنے میں شاہ جی نے سامنے آکر دُعا دی "خُدا سوداگر صاحب کو سلامت رکھے۔ کاروبار بنا رہے۔ بابا! فقیر کا سوال پُورا کرتا جا۔ اللہ ایک کے چوگنے دے" اس پر سوداگر صاحب نے ایک پیسہ اپنے انگرکھے کی جیب سے نکال کر فقیر کے حوالے کیا اور شاہ صاحب خوشی خوشی دُعائیں دیتے کسی ایسی ہی اَور اسامی کی تلاش میں آگے بڑھے۔ مگر پھر جو اُنکو کچھ خیال آیا تو ایک گلی میں مُڑ گئے اور اوّل ہی گھر سے اپنی صدا لگانی شروع کی۔ وہاں سے کچھ جواب نہ ملا تو اپنے مُنہ ہی مُنہ میں

بڑبڑاتے ہوئے اُس سے اگلے مکان پر جا کر سوال کیا تو اندر سے ایک مردانی آواز آئی کہ آگے بڑھو! یہاں کچھ نہیں دھرا۔ اس پہ اَور بھی جز بز ہوئے اور تیسرے گھر کی ڈیوڑھی پر صدا لگائی تو اوّل تو کچھ جواب نہ آیا۔ دوسری صدا پر کسی نے زنانی آواز میں کہا کہ "شاہ جی! اِسوقت برکت ہے"۔ اِس پر تو شاہ جی کو یقین کامل ہوگیا کہ آج اوّل ہی اوّل جو اُس ترکی ٹوپی والے سے سوال کر بیٹھا تھا۔ اِس لئے سارا دن منحوس جائیگا۔ اور دل ہی دل میں اُس طالب علم پر خرافات بکنے لگے۔ مگر جب گلی کا یہ رُخ چھوڑ کر دُوسری طرف سوال کیا تو کسی بیوی نے ڈیوڑھی کے پردے میں سے ہاتھ باہر نکال کر دو باسی چپاتیاں جن میں رات کی پکی ہُوئی چنے کی دال رکھی تھی کچکول میں رکھدیں۔ اب فقیر صاحب کے دل کو ذرا سہارا ہوا اور وہ صدا لگاتے ہوئے آگے بڑھے اِس طرح کہیں سے چاول اور کہیں سے روٹیوں کا خاصا ڈھیر اُنکی جھولی میں ہوگیا۔ جب تقریباً سب گھروں پر سوال کر چکے تو سب سے آخر کی ڈیوڑھی پر جا کر کھڑے ہوئے۔ چُونکہ ساری گلی میں یہی ایک سب سے بڑا مکان تھا۔ اِس لئے انکو یہ اُمید بندھی کہ یہاں سے کچھ نقدی ہاتھ لگیگی لہذا شاہ صاحب نے کھنکار کر نہایت موثر الفاظ میں صدا لگائی کہ "قلندر شاہ کا اس گلی میں آج پہلا پھیرا ہے۔ اللہ کو کچھ بہتری منظور ہے۔ بجوا دے اِس وخت (وقت) جو حاضر ہے۔ اِلّا اللہ! سخی کی کمائی میں فقیر کا بھی ساجھا ہے: بھیج! بھیج! بھیج!!! اِلّا اللہ"! تھوڑی دیر تک تو کچھ شنوائی نہ ہُوئی۔ مگر اس کے بعد ایک عورت جس کے چہرے سے پایا جاتا تھا کہ ابھی پُوری طرح ماگیری کی عادی نہیں ہُوئی ہے۔ کٹورے میں آٹا لئے فقیر کے دینے کو باہر ڈیوڑھی میں آئی لیکن اِس سے پہلے کہ وُہ کچکول میں آٹا ڈالے فقیر کی اور ماما کی آنکھیں چار ہوئیں۔ آٹے کا کٹورا تو اس کے ہاتھ سے چھُوٹ کر زمین پر گرا اور خود بھی ایک لمحہ ساکت کھڑے

رہنے کے بعد غش کھا کر دھڑ سے گر پڑی۔ شاہ صاحب کے بھی ماما کو دیکھکر کچھ اوسان خطا
سے ہو گئے تھے اِس لئے اُنہوں نے آٹے کو تو زمین پر بکھرا ہُوا چھوڑا مگر جلدی سے تانبے
کا کٹورا اپنی جھولی میں ڈال وہاں سے چمپت ہُوئے۔

دُوسرا منظر

جب سے ہندوستان میں کلوں کی بنی ہوئی چیزیں آنی شروع ہُوئی ہیں ہر ایک
پیشہ والے کو ایک تباہی کا سامنا ہے۔ زری گوٹے کا کام کچھ کچھ بچا ہُوا تھا مگر اب
اُسکے متعلق بھی ہر ایک چیز ولایت سے بنی بنائی آتی ہے۔ کندلہ کشوں کا الگ دیوالہ
نکلا ہُوا ہے۔ دیکھئے جنکی معاش فقط تار دبکنے پر منحصر تھی اُنکو روٹیوں کے لالے پڑ گئے
بیچارے تارکش ہیں کہ اُنکی مزدوریاں آدھی سے بھی کم رہگئی ہیں۔ اکبر خاں کو دیکھو!
دس بارہ برس ہُوئے کہ تارکشی کر کے ہنستے کھیلتے دِن بھر میں روپیہ کی مزدوری کر لیتے
تھے اور اپنے گھر میں بیوی بچّوں کے ساتھ نہایت بے فکری سے اوقات بسر کیا
کرتے تھے۔ اس زمانے میں اپنی حیثیت کے موافق کپڑا بھی اُجلا پہنتے تھے۔
مکان بھی خاصا فراخ تھا اُس پر خوبی یہ کہ کسی کے ایک کوڑی کے قرضدار نہ تھے۔
ہر ایک سے ہاتھ ملا کر بات کرتے تھے اور جہاں تک اُنکے مقدور میں تھا اپنے
یار دوستوں کے ساتھ روپے پیسے سے سلوک کرنے میں کبھی دریغ نہ کرتے تھے۔
خدا کے فضل سے بیوی بھی نیک ملی تھی۔ اگرچہ غریبوں کی بیٹی تھی اور سوائے قرآن شریف
کی دو چار سورتیں پڑھنے کے اور کسی قسم کی تعلیم سے آشنا نہ تھی۔ مگر سگھڑاپا اُسکی
طبیعت میں اوّل ہی سے موجود تھا۔ دُوسرے اپنے گھر کی تنگی دیکھے ہُوئے تھی
اور اب جو خوش قسمتی سے چاہنے والا اور نسبتاً خوش حال خاوند ملا تھا تو گویا اُسکے
لئے دُنیا کی ساری نعمتیں مہیّا تھیں لیکن اِس نیک بیوی نے عاقبت اندیشی کا

خیال ہرگز دل سے نہ بُھلایا اور ہمیشہ گھر کا خرچ کفایت شعاری سے اُٹھاتی رہی۔ جب موقع ہوتا وقت بیوقت کے لئے روپیہ پیسہ الگ ڈال رکھتی تاکہ ضرورت ہو تو کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ پڑے۔ دو چار ہی برس کے اندر اس سلیقہ اور عقلمندی کا یہ نتیجہ نکلا کہ گھر میں اس کے پاس تیس روپے کی جمع ہو گئی چنانچہ ایک دن خاوند سے کہنے لگی کہ تھوڑے دنوں میں لڑکی جوان ہو جائیگی۔ میں نے اس کے جہیز کے لئے اوّل ہی سے پیسہ پیسہ کر کے جوڑنا شروع کر دیا تھا۔ اب میرے پاس تیس روپے ہو گئے ہیں تم اسکی کچھ تو چاندی کی چوڑیاں اور کچھ بالیاں بنوا دو کہ بچی کے پاس کچھ نہ کچھ تو ہو جائے"۔ اکبر خاں نے اپنی بیوی کے کہنے کے موافق بیٹی کے لئے چاندی کی دو چار چیزیں بنوا دیں اور اسی طرح ایک ایک کر کے تانبے کے برتن بھی خرید لئے۔ جہیز کے جوڑوں پر ظہورن نے پیسہ یہ سوچکر خرچ نہ کیا کہ میرے جو دو چار جوڑے رکھے ہیں وُہی لڑکی کے کام آئینگے۔ مختصر یہ کہ اس طرح محنت اور دُور اندیشی کے ساتھ اِن دونوں میاں بیوی نے ملکر اپنی خانگی حالت کو حیثیت کے مطابق ایک اعلےٰ پیمانہ پر کر لیا تھا۔ مگر یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جب اِنکے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ آئیندہ ہر چیز کلوں کے ذریعے سے بننے لگیگی۔ اس اثنا میں جو اس چھوٹے سے گھرانے پر آفتیں ٹوٹیں اور مصیبتیں نازل ہُوئیں اُن کا بیان کرنا مشکل ہے۔ مگر آفرین اس پہ ہے کہ باوجود زمانے کی ناسازگاری اور لکھے کی بدنصیبی کے اس مصیبت زدہ بیوی نے خاوند کی تابعداری اور محبت میں فرق نہ آنے دیا اور ہر حالت میں قناعت کے ساتھ گذار دی۔ انکی گردش کا آغاز یُوں ہُوا کہ ایک دن صبح ہی اُٹھکر اکبر خاں نماز وغیرہ سے فارغ ہو اپنے معمول کے موافق کارخانے گئے وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ سوائے پانچ چھ کاریگروں کے اور سب کے ٹھیئے خالی پڑے ہیں۔ اِنکو یہ خلافِ دستور بات دیکھکر بہت تردد ہُوا۔ مگر کارخاندار نے بہت جلد یہ کہکر اِن کا تردّد رفع کر دیا کہ خانصاحب!

آج میرے پاس اِتنا کام نہیں آیا جو سب کاریگروں کو بانٹتا مگر مَیں نے تمہارے لئے کچھ تار رہنے دیا ہے۔ ہمارے لالہ جی کہتے ہیں کہ اب ہم تیار مال ولایت سے منگایا کرینگے اور خانصاحب تم جانتے ہو کہ آجکل بازار میں پہلے ہی مندا ہوا ہے۔ دُوسرے لالہ کے سر میں ولایت کا سودا سما گیا ہے۔ سو مزدوری بھی دھیلی میں پاؤ سے کی رہ جائیگی۔ یہ سُنکر اکبر خاں کے دل پر اگرچہ ایک صدمہ پہنچا مگر اُنہوں نے زبان سے ایک حرف نہ نکالا اور خاموشی کے ساتھ جو تار کنگے حقے کا رکھا ہُوا تھا اُسکو جنتری میں سے نکالنے لگے اور تیسرے پہر تک ختم کر کے کارخاندار کے حوالے کیا اُس نے مزدوری کے آٹھ آنے کے پیسے انکے ہاتھ پر رکھدیتے۔ خانصاحب نے انہیں کو غنیمت جانا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ آج جو سویرے سے گھر آئے تو بیوی نے سبب پوچھا اور اُنہوں نے ساری حقیقت سُنائی وہ بیچاری بھی افسردہ ہو گئی مگر خاوند کا دل رکھنے کیلئے کہنے لگی کہ "یہ بھی کوئی دنوں کی بات ہی۔ جب چلتی ہو جائیگی تو پھر وُہی مزدوری ملنے لگیگی" اور اُسی دن رات کو عشا کی نماز کے بعد خدا کے آگے ماتھا رگڑا کر دعا مانگی کہ "یا الٰہی اپنے حبیب کے صدقے سے میرے بچّوں پر رحم کر اور اِن کے باپ کے کام میں برکت دے" مگر دُوسرے دن بھی خانصاحب کو سوائے اٹھنّی کے کام کے اور زیادہ نہ ملا۔ کچھ عرصے تک تو اُنہوں نے اسی اُمید پر گذاری کہ اگر گرمیوں میں نہیں تو جاڑے میں شاید چلتی ہو جائے اور کچھ بہتری کی صُورت دکھائی دے مگر جب جاڑا بھی گذر گیا اور اُنکی مزدوری میں بجائے اضافے کے اَور کمی ہوتی نظر آنے لگی تو ازحد تشویش دامنگیر ہوئی اب تک تو خیر جس طرح گذارہ ہو سکا اُس طرح کر دیا مگر آگے کو بالکل ناممکن ہو گیا۔ اِس لئے اخراجات کے کم کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے۔ اوّل تو گھر کے اخراجات ہی کونسے ایسے شاہانہ تھے۔ ایک فقط مکان کا کرایہ سمجھو کہ تارکش ہوکر چار روپے ماہوار کے گھر میں

رہتے تھے سو اب یہ سوچکر کہ ہماری حیثیت اس مکان میں رہنے کے قابل نہیں رہی اپنے دل میں یہ فیصلہ کرلیا کہ جتنے جلدی ہوسکیگا اسکو چھوڑ کر کسی اور سستے کرایے کے گھر میں جاکر رہینگے۔ مگر اُنہوں نے اس کا اظہار بیٹی کے آگے کرنا مناسب نہیں جانا کیونکہ فخرن اسی گھر میں پیدا ہوئی پلی بڑھی۔ اب جو اس کے سامنے اُٹھنے کا نام لیا جائیگا تو اُس کے دل کو بے حد رنج پہنچیگا۔ دُوسرے اس کو اوّل ہی سے درختوں اور کیاری کا شوق تھا اور کوئی تین برس کا ذکر ہے کہ ایک بیر کی گٹھلی انگنائی میں بو دی تھی جس کا اب ایک خاصہ بڑا درخت ہو گیا تھا اور وہ روز صبح اُٹھکر اپنی بیری کی جڑ میں پانی دیا کرتی تھی کہ جلدی جلدی بڑھے اگر کوئی یہ کہتا کہ بیری کے لئے فلاں چیز اچھی ہے تو اپنا پیسہ پیسہ جوڑ کے اپنے بھائی کے ہاتھ وُہی چیز منگواتی اور اس کی جڑ میں ڈال دیتی۔ کئی دن کا ذکر ہے کہ کسی نے بتایا اگر بکرے کا خون بیری کی جڑ میں ڈالا جائے تو بہت جلدی پھل آتا ہے۔ فخرن نے اسی دن اپنے بھائی اصغر کو قصائی کی دکان پر دو پیسے دیکر کہلا بھیجا کہ کیملے سے دُوسرے روز ایک آبخورے میں بکرے کا خون لیتا آئے۔ غرض اسی طرح اللہ آمین کرکے اُس نے تین برس میں اس ننھے سے پودے کو اتنا بڑا کیا تھا اور اب اس دُنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف لڑکی کے دل کو یہ خوشی لگی ہوئی تھی کہ میری بیری اگلے برس پھل لائیگی۔ اسی لئے باپ نے اپنی بیوی کے کان میں تو یہ بات ڈالدی کہ ہم کو بہت جلد یہاں سے اُٹھنا پڑیگا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی جتا دیا کہ ابھی فخرن کو اس کا حال نہ معلوم ہو ورنہ اسکو سخت صدمہ پہنچیگا۔ لیکن باوجود اس کے ماں نے دوسرے روز فخرن کو پاس بلاکر یُوں تمہید اُٹھائی کہ بیٹی! تمہارے باپ کے کام کا تو مندا ہی اور کہیں اور جگہ سے آمدنی کی صورت نہیں۔ اب وہ یہ کہتے ہیں کہ میرے پاس اُتنا نہیں کہ

اِس مکان کے چار روپے کرایہ دوں - مکاندار کے پاس گئے تھے اور اُس سے ساری
حقیقت کہی کہ اس اس طرح کا معاملہ ہے: لالہ ولایت سے کام بنوا کر منگواتا ہے -
بزار میں تار کی مانگ نہیں ہے اِس لئے جب تک یہ مندا ہے تم کرایہ کچھ ہلکا کردو- دیکھو
ہم اتنی مدت سے اس میں رہتے چلے آئے ہیں اور تمہارا کرایہ ہر مہینے کی اوّل
تاریخ کو پہنچتا رہا ہے - اس لئے تم کو کچھ نہ کچھ تو رعایت کرنی ضرور چاہئے اس پر وہ
بولا کہ خانصاحب! یہ بھی آپ کی خاطر ہے کہ مَیں چار روپے پر چپکا ہوں اور سب
سے ہوش کس لگا ہے اپنی گرہ سے دے رہا ہوں - یہی سوچکر کہ آپ بھلے مانس
ہیں کرایہ تاریخ پر پہنچا دیتے ہیں - دوسرے اتنی مدت سے رہتے چلے آتے
ہیں- ورنہ آج اگر آپ اُٹھیں تو کل ہی یہ مکان چھ روپے ماہوار کو جاتا ہے -
خانصاحب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ اپنی گرہ سے خرچ کئے جاؤں - سو بیٹی! تمہارے
باپ یہ جواب سُنکر چپکے چلے آئے اور مجھ سے کہنے لگے کہ میں اور سستے سے
مکان کی تلاش میں ہوں - تم مخزن سے نہ کہنا - مگر مَیں نے تم سے اِس لئے کہدیا
کہ بیٹی تم کو اوّل خبر ہوئی آخر خبر ہونی پھر چپکے رہنے سے کیا فائدہ - یہ ضرور ہے
کہ بیری چھُٹنے کا تم کو رنج ہوگا مگر اللہ رکھے تم خود ہوشیار ہو سب باتیں جانتی
ہو تم کو چاہئے کہ دل پر اس کا خیال نہ لاؤ" مخزن اوّل تو چپکی بیٹھی اپنی ماں کی
نصیحت سُنا کی - مگر جب بیری کے چھُٹنے کا ذکر آیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو
ڈبڈبا آئے - اُسوقت تو کچھ نہ بولی لیکن تھوڑی دیر کے بعد اپنی بیری کے پاس
جاکر بے اختیار رونے لگی - اگرچہ بہتیرا ضبط کرنا چاہا مگر اُس کے دل پر کچھ
ایسا صدمہ بیٹھا تھا کہ آنسوؤں کا دریا اُمڈا چلا آرہا تھا- یہانتک کہ روتے
روتے ہچکی بندھ گئی اس پر ماں نے غصہ ہو کر سمجھایا کہ بیٹی تیری عقل تو نہیں
جاتی رہی! کوئی بھی ایک ذرا سے درخت کے لئے اس طرح آنسو بہایا کرتا ہے

کوئی اپنا پرایا سنیگا تو کیا کہیگا ؟ لوگ تو ایک ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے ہیں - کل ہی اللہ دی کی ماں کہہ رہی تھیں کہ اس پیڑ پر تو جن رہتا معلوم ہوتا ہے اگر وہ تجھ کو روتا دیکھ لیں تو سچ مچ اُنکے ہاتھ ایک بات لگ جائے اور سارے محلے میں کہتی پھریں کہ اکبر خاں کی بیٹی کے سر پر تو سید صاحب کا عمل ہے - بیری کی جڑ میں بیٹھکر رویا کرتی ہے - اس لئے بیٹی تم اپنے دل کو ذرا سنبھالو - مجھے تمہارا بیری کے واسطے رونا اچھا نہیں معلوم ہوتا - لوگ سچ کہتے ہیں کہ گھر میں بیری کا پیڑ ہونا نحوست کی نشانی ہے - جب سے یہ اُگا ہے سوائے تواِئی کے کوئی آرام کی شکل ہی نظر نہ آئی - اُنکے کام کا مندا ہوا سو الگ اور گھر سے ہر چیز کی برکت اُڑی سو جُدا" - فخر النسا پر ماں کے کہے کا یہ اثر ہوا کہ اپنی آنکھیں پونچھ انگنائی میں سے اُٹھ دالان میں آگئی اور اپنا دھیان بٹانے کی خاطر بھائی کا کُرتا لے کر سینے بیٹھی - شام کو جب اکبر خاں گھر آئے تو بیٹی کو خلافِ معمول افسردہ پاکر بیوی سے پوچھنے لگے کہ "آج فخرن چپ چپ کیوں ہے ؟" اس پر بیوی نے سارا حال کہہ سنایا - بیٹی کے رنج کا قصہ سنکر اُنکو بھی بہت صدمہ ہوا - مگر اسکی تشفی کرنیکے لئے کہنے لگے کہ "بیٹی ! خدا کے کارخانے میں کس کو دخل ہے ؟ وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے بندوں کی بہتری کے لئے کرتا ہے - کیا خبر ہے کہ اس مکان سے اُٹھانے میں اسکی کوئی مصلحت ہو اور آئندہ کے لئے ہمارے حق میں کوئی بہتری کی صورت نظر آئے" - باپ کے منہ سے یہ تسلی آمیز کلمہ سنکر فخران کے دل کو بھی تقویت ہوتی معلوم ہوئی اور اُسنے اپنے دل میں مضبوط ارادہ کر لیا کہ آئندہ جو کچھ پڑے گی اس کو صبر و شکر کے ساتھ جھیلوں گی - یہ دن تو یوں گذر گیا - دوسرے دن جمعہ تھا - اکبر خاں نے یہ سوچا کہ آج کارخانے تو جانا نہیں - چلو مکان ہی تلاش کر لیں - اس لئے سویرے سے حجام کی دوکان پر گئے اور خط بنوا کر وہیں غسل کیا - گھر واپس آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں اصغر کو ماں نے نہلا دھلا کر پہلے ہی سے اُجلا انگرکھا پہنا

رکھا تھا اور وہ راہ دیکھ رہا تھا کہ کب ابا آئیں اور کب اُنکے ساتھ مَیں جامع مسجد جاؤں لے چلتے وقت خانصاحب نے کہا کہ "بیٹا اصغر تم کو اس شرط پر لے چلتا ہوں کہ نماز پڑھکر میرے ساتھ نچلی والوں تک چلنا ہوگا تھک نہ جانا اس پر وہ بولا "نہیں ابا مَیں نہیں تھکنے کا" غرض کوئی پونے بارہ بجے کے قریب یہ دونوں باپ بیٹے اپنے گھر سے جامع مسجد کی طرف سدھارے اور راستے میں خانصاحب کو جو کچھ خیال آیا تو انہوں نے ایک یکہ والے کو ٹھہرا کر پوچھا جمعہ مسجد تک ڈیڑھ سواری کا کیا لیگا۔ اُس نے کہا میاںجی دو آنے کے پیسے دیدینا۔ اس پر خانصاحب بولے "چھ پیسے دونگا چلنا ہے تو موڑ لے" غرض یکہ والا اچھا ہی پیسوں پر راضی ہوگیا اور یہ دونوں اُس میں بیٹھ تھوڑی دیر بعد جامع مسجد جا اُترے۔ نماز میں ابھی آدھ گھنٹے کی دیر تھی۔ اُنہوں نے حوض پر جاکر خود وضو کیا اور لڑکے کو کرایا۔ پھر باہر کے دالان میں ایک صف میں جاکر بیٹھ گئے اور سنتیں پڑھنے کے بعد جیب میں سے تسبیح نکال کر درود شریف پڑھنے لگے جب نماز وغیرہ سے فارغ ہوئے اور خطبہ بھی سُن سُنا چکے تو اصغر کی اُنگلی پکڑ کر کہنے لگے کہ "چلو بیٹا تم کو مولانا ہدایت رسول کی زیارت کرا لاؤں۔ وہ بڑے پہنچے ہوئے درویش ہیں" اور اُسکو دالان کے کونے کی طرف لے گئے جہاں بہت سے آدمیوں کا مجمع تھا اور بیچ میں ایک سن رسیدہ بزرگ آنکھیں نیچی کئے یادِ خدا میں مشغول تھے اور اُنکے گرد حلقہ باندھے اُن کے مرید دوزانو بیٹھے ہوئے تھے۔ بعض کے مُنہ پر چادریں پڑی ہوئی تھیں۔ بعض عالمِ بیخودی میں جھوم رہے تھے اور اللہ ہو کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ اصغر چپکا کھڑا ان رازدارانِ حقیقت کی ظاہری کیفیت اس تعجب و حیرت کی نگاہ سے دیکھتا رہا۔ جو کمسنی کا اقتضا ہے۔ مگر جب اس کے برابر ہی جو مرید صاحب بیٹھے ہوئے

تھے انہوں نے ایک دفعہ ہی اللہ ہو کا نعرہ لگا کر سنگ مرمر کے فرش پر ماہی بے آب
کی طرح تڑپنا شروع کیا تو خوف کے مارے اسکی چیخ نکل گئی۔ اس پر خانصاحب بھیڑ
بھاڑ میں اُسکو نکال کر باہر لائے اور اس طرح سمجھانے لگے کہ "بیٹا اس طرح نہیں
ڈرا کرتے۔ یہ اللہ کے نیک بندے ہیں۔ ان پر اللہ میاں نے چودہ طبق روشن
کر رکھے ہیں جب یہ خدا کا نور دیکھتے ہیں تو اسکی تاب نہیں لا سکتے اور انکا حال غیر
ہو جاتا ہے" اس پر اصغر نے اپنے بچپن کی سادگی کے لہجے میں پوچھا "ابا
کیا اللہ میاں کے نور سے ان کے سر میں دُکھ ہوتا ہے"؟ اسی اثنا میں چار پانچ
اور آدمی وہاں آن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اُن میں سے ایک بولا بڑے صاحب
بچے فقیروں کی رموز کیا جانیں۔ انکو اس عمر میں ایسی باتیں سکھانی نہیں چاہیئے۔
اس پر ایک اور صاحب بولے "دیکھئے نا لڑکے کے دل میں سہم بیٹھ گیا" اکبر خاں
اس پر کچھ خفیف سے ہو گئے اور تھوڑی دیر ٹھہر کر وہاں سے دروازے کی طرف
بڑھے۔ جمعہ کے روز جامع مسجد کی سیڑھیوں پر اکثر قلفی کی برف والے اپنا اپنا
ہنڈا لیکر بیٹھ جاتے ہیں۔ اُن میں سے ایک اکبر خاں کو جانتا تھا اور جب اُنکو
اپنے بیٹے کی انگلی پکڑے سیڑھیوں پر سے اُترتا دیکھا تو آواز دی "اجی خانصاحب
خانصاحب!! اکبر خاں نے مڑ کر دیکھا تو برف والیکو پہچان کر اُس کے پاس
گئے اور کہنے لگے "کہو بھئی مولا بخش اچھے ہو"؟ وہ بولا "خانصاحب آپکی عنایت
ہے۔ آج میں نے آٹھ دس قلفیاں کھرچن کی جمائی تھیں۔ اُن میں سے دو رہ گئی
ہیں۔ آپ کھرچن کے شوقین ہیں اس لئے میں نے آواز دے لی کہئے تو نکالوں"
اس پر خانصاحب خود بھی وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئے اور اصغر کو بھی اپنے پاس بٹھا کر
اُس کے ہاتھ میں اپنا رومال دیدیا کہ برف کی قلفی کو آسانی سے پکڑ سکے۔ جب
دونوں باپ بیٹے اپنی اپنی قلفیاں ختم کر چکے تو خانصاحب نے دوانی برف والے کو

دیکر اصغر سے کہا کہ "چلو بیٹا اب ذرا محلے والوں کی طرف چلیں" وہاں جا کر جب
خوب اچھی طرح کئی گلیوں میں چھان بین کر چکے تو ایک مکان انکی پسند آیا اور انہوں
نے دو روپیہ ماہوار پر مکان دار سے فیصلہ بھی کر لیا۔ اس گھر میں کوئی مشکل سے
تین چار پائیوں کی گنجائش ہوگی اور فقط ایک دالان دو کوٹھریاں اور باورچیخانہ
تھا جس کی وسعت ایک کوٹھی کے برابر تھی۔ وہاں سے جب واپس گھر آئے
تو بیوی سے کہنے لگے کہ میں نے مکان لے لیا ہے۔ اب کوئی مبارک دن دیکھ کر
وہاں چلے چلینگے" بیوی نے کہا کہ "اگلی جمعرات ہی کو کیوں نہ چلے چلو۔ دن بھی
اچھا ہے اور یہ مہینا بھی پورا ہو جائیگا"۔ قصہ مختصر خانصاحب مقررہ تاریخ کو اپنے
قدیم گھر کو جہاں انکی جوانی کا بہت سا حصہ گذرا تھا۔ خیرباد کہ اور اپنے بال بچوں
کو ساتھ لے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ چلتے وقت فخرن نے ایک
آخری حسرت بھری نظر اپنی بیری پر ڈالی مگر آنسوؤں کو ضبط کر کے فوراً ماں کے
ساتھ ڈولی میں سوار ہو گئی۔ اکبر خاں نے بدلنے کو مکان تو بدل دیا مگر تقدیر کا
لکھا نہ بدل سکے۔ انکا ستارہ کچھ ایسی گردش میں آیا ہوا تھا کہ جو سوچتے تھے وہ الٹی
پڑتی تھی۔ مکان یوں بدلا کہ کرائے میں دو روپے کی بچت ہوگی۔ اس سے کچھ کے
ناک کان ڈھکنے میں مدد دیگی۔ مگر بازار میں ایسا مندا ہونا شروع ہوا کہ اٹھنی کی
مزدوری کی بجائے مشکل سے چھ آنے اور پانچ آنے کما کر گھر لاتے تھے اور اس
آمدنی کے برتے پر لڑکی کے لئے کوئی چیز بنانی تو کجا روٹی کپڑے کا گزارہ
چلنا محال تھا۔ دونوں بچوں کا خرچ ماشاءاللہ دو آدمیوں کا تھا۔ بی فخرن خالی
کے چاند سولہویں برس میں لگ چکی تھیں۔ میاں اصغر خدا کے فضل سے آٹھویں
برس میں تھے۔ باپ کی خواہش تو یہ تھی کہ میں اپنے لڑکے کو مدرسے میں بٹھاؤں
کیونکہ آجکل کسی کام میں کچھ نہیں دھرا۔ مگر اتنی بساط کہاں کہ مدرسے کی فیس ادا کریں

دوسرے کارخانے میں جانے سے آنے ڈیڑھ آنے کے فائدے کا خیال اس لئے لاچار انہوں نے اصغر کو ٹپی کے کام پر بٹھا دیا اور وہ کارخانے سے دن بھر میں ایک آنہ روز لانے لگا مگر جب اس طرح بھی گھر کا گزارہ چلتا معلوم نہ ہوا تو بیوی نے گوٹا بننا شروع کر دیا اور خانصاحب ٹپی کے لئے بازار سے ٹوپیاں کاڑھنے کو لا دیتے جب جا کر اُنکے گھر میں شام کو آٹھ آنے کی صورت نظر آتی۔ وہ بولی کہ پانچ آنے تو خانصاحب مزدوری کر کے لاتے۔ بیوی دو دن میں ایک گوٹا کر کے اٹھاتی جس کی مزدوری دو آنے ہوتے ہیں اور اصغر کے اُستاد فقط ایک آنہ روز دوال تھے اور جو اُن سے کہا کہ چھ پیسے کر دو تو بولے کہ کوئی اَور کارخاندار ایک آنہ بھی نہیں دیگا"۔ رہی فخرن وہ بیچاری دن بھر میں مارا مار کر کے دو کوڑی ٹوپیاں کاڑھتی جب ٹکے کوڑی کے حساب سے ایک آنہ شام کو آتا۔ خانصاحب کو اس نفسا نفسی کے زمانے میں اِتنی ہی آمد غنیمت معلوم ہوتی تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اَور کاریگر بیچاروں پر دو دو وقت کے فاقے گزرتے ہیں اور وہ مُنہ سے بھاپ تک نہیں نکالتے۔ دوسرے اب تک خدا نے اُنکو کسی کا قرضدار نہیں کیا تھا اور فراخی کے زمانے میں بیوی نے جمع کر کے جو فخرن کے لئے چاندی کا گہنا بنوا لیا تھا۔ اُس پر اُنکا بہت سہارا تھا کہ اگر خدانخواستہ کوئی ایسا ویسا وقت آن کر پڑا تو فاقے نہ مرینگے مگر یہ خبر نہ تھی کہ ابھی تو فقط مصیبتوں کا آغاز تھا۔ اِس مکان میں آئے ہُوئے اُنکو ڈیڑھ برس سے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ایک روز شام کو جھٹپٹے کے وقت ظہورن اپنے چھوٹے سے باورچیخانے مین بیٹھی۔ توے پر روٹی ڈال رہی تھی۔ فخرن جیلوں کے کوچے اپنی خالہ کے ہاں مہمان گئی ہوئی تھی اور خانصاحب بارہ وفاتوں کا پنکھا دکھلانے اصغر کو قدم شریف لے گئے تھے۔ اِس لئے ظہورن گھر میں بالکل اکیلی تھی۔ پیٹڑے پر

بیٹھے بیٹھے اس کے دل میں خود بخود خیال آیا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں اور دونوں طرف کے مکان خالی پڑے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی چور چکار آ نکلے گھر کا سارا صفایا کر جائے۔ میں تو چیخوں گی بھی تو کوئی آواز نہ سنیگا مگر پھر اپنے تئیں خود ہی بیوقوف ٹھہرانے لگی کہ "بھلا اگر چور کو چوری ہی کرنی ہے تو کسی ایسے گھر جائیگا۔ جہاں سے کچھ مال ہاتھ آئے۔ ہم جیسے غریبوں کو ستا کر کیا لیگا اور یہ سوچ کر چپکی بیٹھی روٹی ڈالے گئی۔ تھوڑی دیر میں ایک فقیر نے آن کر صدا لگائی اور اپنے ساتھ کی لڑکی کو مٹی کا پیالہ دیکر اندر بھیجا۔ ڈیوڑھی پر ایک ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا جس میں کئی جگہ بڑے بڑے چھید تھے لڑکی تو اندر بھیک لینے گئی اور فقیر نے پردے کے پیچھے سے چھیدوں میں جھانکنا شروع کیا۔ انگنائی میں ایک بان کی چارپائی بچھی ہوئی تھی اور دوسری کھڑی تھی اور دالان میں گوٹے کے کارخانے کے برابر ایک چھوٹی سی پٹاری رکھی تھی جس پر نئی قلعی ہوئی تھی اس کو دیکھکر فقیر کا دل للچا گیا اور جب لڑکی پیالے میں آدھی چپاتی لیکر باہر آئی تو اس سے پوچھا کہ "اری اندر کوئی مرد بھی ہے یا نہیں"؟ اس نے جواب دیا "نہیں بس ایک عورت بیٹھی ہے"۔ اس پر فقیر نے اسکو تو وہیں چھوڑا اور خود پردہ اٹھا کر دندناتا دالان میں گھسا چلا گیا۔ ظہورن کی جو ایکدفعہ ہی اس موٹے مسٹنڈے فقیر پر نظر پڑی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا "ارے تو کون؟ اور تو چھوڑا انگنائی میں آئی اس پر فقیر نے جھپٹ کر اس کی کنپٹی پر اس زور سے ایک مکا مارا کہ یہ چکر کھا کر آدھی زمین پر اور آدھی چارپائی پر گری اور فقیر پٹاری جھولی میں ڈال وہاں سے چلتا بنا۔ کوئی پون گھنٹے کے بعد ظہورن کو ہوش آیا۔ تو کیا دیکھتی ہے کہ پٹاری غائب۔ اس پر اس نے اپنا سر پیٹ لیا کہ "ہائے میری بچی کے پاؤں کی چوڑیاں اس میں رکھی تھیں۔ ارے لوگو کوئی تو اس فقیر کو

بگڑو - ہائے اللہ میں کیا کروں ! مگر وہاں کون بیٹھا تھا جو اُس کی مدد کو آتا۔ محلے کے سارے مرد میلے میں گئے ہوئے تھے - یہ واویلا سُنکر دو ایک عورتیں ہمسائے میں سے نکل کر آئیں اور جتنی اُنکے امکان میں تھی اُتنی تسلی و تشفی کی۔ رات گئی اکبر خاں قدم شریف سے تبرک لیکر آئے تو گھر میں گھُستے ہی بیوی کا حال پریشان دیکھا اور جب سارا قصہ سُن چکے تو ایک آہ سرد کھینچی اور کہنے لگے کہ تمہاری قسمت نے کچھ ایسا پلٹا کھایا ہے کہ ہر روز کوئی نہ کوئی نئی تو ائی کا سامنا ہوتا ہے۔ خیر ہر حال میں اُسکا شکر ہے کہ اُس نے تمہاری جان تو بچا لی ورنہ اُس بدمعاش بھیک منگے نے مار ڈالنے میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ ہاں ! یہ تو بتاؤ کہ فخرن کے پاؤں میں کے چوڑیاں ہیں۔ یا وُہ سب کی سب پٹاری میں چھوڑ گئی تھی ؟ بیوی بولی "یہی تو غضب ہوا ! وُہ تو کہہ رہی تھی کہ اماں میں اپنی چوڑیاں پاؤں میں ڈالے جاتی ہوں مگر مجھ مُردار نے کہا کہ بیٹی چوڑیاں پہن کر کیا کرےگی - فقط بالیاں کان میں ڈال لے" اِس پر خانصاحب بولے کہ "اچھا بس اب صبر کرو۔ خُدا کو جو منظور تھا وُہ ہوا - اب واویلا مچانے سے کچھ فائدہ نہیں۔ اگر کوتوالی تک بات پہنچی تو اور لینے کے دینے پڑ جائینگے"۔ اِس حادثے کے دُوسرے دن فخرن کو خبر معلوم ہُوئی اور اُس نے روتے روتے اپنی آنکھیں سُجا لیں کیونکہ وُہ خوب جانتی تھی کہ اب ساری عُمر میں ویسی چوڑیاں نصیب ہونگی اور اُسی وقت خالہ کے گھر سے اپنے ہاں آگئی تاکہ ماں کا غم بھلائے۔ کاش کہ اکبر خاں کی مصیبتوں کا یہیں خاتمہ ہوتا مگر نہیں ! فلک کو ستم رسیدوں پر ظلم کرنے کا کچھ ایسا چسکا پڑا ہوا ہے کہ زخمی دلوں پر ٹھہر ٹھہر کر نشتر زنی کرتا ہے۔ اس واقعہ کا غم والم اِن گرفتارانِ بلا کے دِل پر سے ابھی پُورے طور پر محو نہ ہونے پایا تھا کہ ایک اُور چرکا لگا جس نے رہی سہی آس بھی توڑ دی - ایک دن شام کو

اکبر خاں پریڈ کے میدان میں سے چلے آ رہے تھے کہ پیچھے سے کئی آوازیں اُنکے کان میں آئیں "ہٹو! بچو!! گھوڑا نکل گیا ہے!!!" اُنہوں نے مڑکر دیکھا تو ایک بے لگام گھوڑا دوڑا چلا آ رہا ہے۔ یہ تو اُس کے راستے میں سے ایک طرف کو ہو گئے مگر سامنے ایک چماری کی لڑکی کھیل رہی تھی اُنہوں نے چیخ کر کہا "ارے ہٹ جا! ہٹ جا!!" مگر وہ کچھ ایسی بولا سی گئی کہ اُلٹی گھوڑے کی طرف کو بھاگنے لگی۔ اُن سے نہ رہا گیا اور دوڑ کر اسکو گود میں اُٹھا لیا۔ اتنے میں گھوڑا بھی وہاں تک پہنچ گیا اور ابھی لڑکی گود ہی میں تھی کہ اُس کی جھپیٹ میں گھٹنوں کے بَل زمین پر گرے۔ لڑکی کے تو چوٹ نہ آئی مگر اُن کے دائیں گھٹنے میں ایک نوکدار کنکر چینی کو توڑ کر اندر گھس گئی اور گر کر اُن سے اُٹھا نہ گیا۔ اُسی وقت دس پندرہ آدمی اُن کے گرد جمع ہو گئے اور ڈولی منگوا کر خانصاحب کو شفاخانے بھجوا دیا۔ اسی تکلیف کی حالت میں انہوں نے ایک شخص سے کہا کہ "خدا کے واسطے آپ جا کر میرے گھر میں خبر کر دیں"۔ چنانچہ اُس بھلے مانس نے پتہ پوچھ یہ خبر وحشت اثر اُن کے بیوی بچوں کو جا سنائی۔ اس پر دونوں ماں بیٹیاں سر جوڑ کر رونے لگیں اور ظہورن نے ایک دفعہ پھر گڑگڑا کر خدا سے دُعا مانگی کہ "یا ربّ العالمین میرا تیرے سوا کوئی والی وارث نہیں تو اپنی رحمت سے انکو شفا عطا کر اور انکی کمائی میں برکت دے! یا اللہ تو بڑا کریم و کارساز ہے مجھ عاجز بندی کے بھی دن پھیر دے"۔ اس کے بعد دوسرے دن صبح ہی اُٹھکر سر پر برقع ڈال اور اصغر کا ہاتھ پکڑ ہسپتال گئی اور اپنی جوان بیٹی کو ہمسائی کے سپرد کر گئی۔ وہاں پہنچکر میاں سے کہا کہ "میں تمہاری خدمت کے لئے یہاں ہی آئی ہوں" مگر خانصاحب نے سمجھایا کہ یہاں کے لوگ میری اچھی طرح خبرداری کرتے ہیں۔ تم اگر یہاں رہیں تو اپنا خرچ کرنا پڑیگا اور گھر کا سارا اسباب بیچنے پر

نوبت آئیگی۔ جب تک میں اچھا ہوں تم گھر ہی رہو اور اصغر کو بھیج کر بازار سے گوٹا اور ٹوپیاں منگوا لیا کرو۔" خاوند کی مرضی نہ پا کر ظہورن نے وہاں رہنے کا خیال ترک کر دیا لیکن تیسرے چوتھے دن شفاخانے ہو آیا کرتی۔ مگر جب اصغر کو بھی بخار آنا شروع ہوا تو ایک اور مصیبت نازل ہوئی۔ اگر بیٹے کے پاس بیٹھتی ہے تو گوٹا رہتا ہے اور رات کو فاقے سے سونا پڑتا ہے اور جو گوٹا کرتی ہے تو ممتا چین نہیں لینے دیتی۔ دُوسرے مخزن کا ایک آنہ اصغر کی دوا اور دودھ میں صرف ہونے لگا۔ جب دونوں ماں بیٹیوں پر دو وقت کے فاقے گذرنے لگے تو ایک دن ظہورن سے بالکل ضبط نہ ہو سکا اور اپنے بیمار اصغر کو چھاتی سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جب خوب دل کا بخار نکال چکی تو مخزن سے کہا کہ "بیٹی تو بھائی کی خبرداری کر۔ میں کسی کی ماگیری کرونگی یا چکی پیسونگی مگر تم دونوں کے لئے کہیں نہ کہیں سے روٹی کا ٹکڑا لاؤنگی"۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرکے ہمسائی کے ہاں جو وزیر خانم آیا کرتی تھیں۔ اُنکے پاس گئی۔ اُس نے کہا کہ "بوا تم ابھی چلی چلو۔ ایک بڑے اچھے گھرانے میں رکھوا دونگی۔ ڈیڑھ روپیہ ماہوار اور دونوں وقت کی روٹی"۔

تیسرا منظر

مرزا باقر علی بیگ کی بیوی رقیہ بیگم اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے لگی بیٹھی۔ اپنی ماما کی راہ دیکھ رہی تھیں کہ فقیر کو آٹے کی چٹکی دیکر آئے تو سمدھیانے میں پرچہ دے کر بھیجوں۔ خدا جانے بہو اُن کی کس طرح طبیعت ہے۔ کئی روز سے اُن لوگوں کے ہاں کی خیریت نہیں معلوم ہوئی۔ نصیرہ ماں کے برابر ہی بیٹھی اپنے دھانی دوپٹے میں پیازی بوٹیاں ڈال رہی تھی۔ جب خاصی

دیگذر گئی اور ماما ڈیوڑھی میں سے واپس نہ پھری تو رئیسہ بیگم نے خفگی کے لہجے میں نصیرو کی ددا کو آواز دیکر کہا کہ اے بی وزیر خانم ذرا ڈیوڑھی میں تو جاکر دیکھو تمہاری ظہورن پر کیا آفت ٹوٹی۔ فقیر کو آٹا دینے گئی تھیں یا وہیں کی وہیں چپکی رہ گئیں۔ وزیر خانم ڈیوڑھی میں جاکر کیا دیکھتی ہیں کہ آٹا زمین پر بکھرا پڑا ہے کٹورے کا کہیں پتہ نہیں اور بی ظہورن زمین پر ایک غشی کے عالم میں پڑی ہیں۔ یہ سماں دیکھکر تو وزیر خانم کے حواس باختہ ہوگئے اور تپچھلے پیروں دوڑی دوڑی اندر گئی اور کہنے لگی "اے ہے بیوی غضب ہوگیا۔ آپ چلکر ڈیوڑھی میں دیکھئے"۔ دروازے کے کواڑ بند کرکے رئیسہ بیگم خود گئیں اور ماما کا یہ حال دیکھکر ددا سے کہا کہ تم عطار کی دوکان پر جاکر لخلخہ لاؤ اور اُس سے کہو کہ مرزا صاحب کے حساب میں لکھے عطار نے پُوچھا کہ آج سویرے سویرے مرزا جی کے گھر میں کس کو لخلخے کی ضرورت پڑی۔ ددا نے جو حال تھا وہ بیان کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ آج جب وہ دکان کھولنے آرہا تھا تو ایک فقیر مجھ کو ادھر آتا ملا تھا۔ کہیں وہی نہو؟ چونکہ زیادہ گفتگو کا وقت نہ تھا اِس لئے وزیر خانم جلدی سے لخلخہ لیکر گھر آئی اور اس کے اثر سے ظہورن کو ذرا ہوش آیا اور وزیر خانم کی مدد سے اُٹھکر ڈیوڑھی میں سے اندر آئی۔ جب اس کی طبیعت اچھی طرح سنبھل گئی تو رئیسہ بیگم بولیں کہ "بی ظہورن تم نے تو ہم لوگوں کو ڈرا دیا۔ یہ تو بتاؤ کہ تم پر کیا گذری جو اس طرح غش کھاکر گر پڑیں" اس پر ظہورن نے اول سے لیکر آخر تک اپنی ساری رامکہانی سُنا کر کہا کہ "بیوی جس دن سے اُس موئے نے میری کنپٹی پر گھونسا مارا جب سے مجھ کو غشی کا مرض ہوگیا ہے اور آج جس فقیر کو آپ کے حکم سے آٹا دینے گئی تھی اُس کی شکل ہو بہو اُسی فقیر کی سی تھی جو میرے گھر میں گھس آیا

تھا۔ اس کی صورت دیکھکر میرے دل میں دھاکہ بیٹھ گیا اور میرے ہاتھ سے کٹورا
چھٹ پڑا اس کے بعد مجھ کو خبر نہیں رہی کہ کیا ہُوا" ظہورن کی مصیبتوں کا قصہ رئیسہ بیگم
اور نصیبو نہایت غور سے سُنتی رہیں اور جب وُہ خاوند کی اور بیٹے کی بیماری کے
حال پر پہنچی تو اِن دونو ماں بیٹیوں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے اور اپنی ماما
کا دِل رکھنے کے لئے رئیسہ بیگم کہنے لگیں کہ "جتنی میرے مقدور میں ہے اتنی امداد
کرنے میں مجھ کو ذرا گریز نہیں۔ مگر اِن حرام خور فقیروں کا ضرور کچھ نہ کچھ انسداد ہونا
چاہیئے۔ دیکھو ہاشم کے والد گھر میں آئیں تو میں اُن سے کہونگی" کوئی گھنٹہ بھر
دوپہر سے پہلے ہاشم کتابیں ہاتھ میں لئے گھر میں داخل ہُوا اور اپنی بہن نصیرہ سے
پُوچھنے لگا کہ آج ڈیوڑھی میں آٹا ساکیوں بکھرا پڑا ہے۔ نصیرہ نے سارا قصہ
اُسکے آگے دُہرایا جسکو سُنکر ظہورن پر بہت ترس آیا اور کہنے لگا کہ کہیں وہی
فقیر تو نہیں جو صبح کو مدرسے جاتے ہوئے مجھ کو ملا تھا اور مَیں نے اُسکو دھکا
بتائی تھی؟ پھر ظہورن کو پاس بُلا کر اُس نے حلیہ دریافت کیا۔ اس نے اُس کی
آنکھ ناک کا نقشہ بیان کیا تو ہاشم کو یقین کامل ہو گیا کہ وُہ وہی فقیر تھا اور کہنے
لگا کہ "تم خاطر جمع رکھو۔ اب کے اگر کہیں بازار میں وُہ مجھکو ملگیا تو فوراً کوتوالی میں
لے جاؤنگا" اس پر رئیسہ بیگم بولیں کہ "بیٹا اُس ایک کے گرفتار ہونے سے کیا ہوگا
اُس جیسے اَور سینکڑوں پڑے پھرتے ہیں۔ سرکار کیوں نہیں اُنکی بندش کرتی۔
ڈھنڈورا پٹوا دے۔ کہ کوئی اچھا بھلا آدمی بھیک نہ مانگے" اس پر ہاشم نے کہا کہ
"اماں جان! سرکار کی بھی تو اس میں مشکل ہے۔ وُہ تو بہتیرا چاہتی ہے کہ ایسی خیرات
جس پر بدمعاش اور لچے پھلتے پھولتے ہیں بند کر دے۔ مگر وُہ لوگوں کی جہالت
کو کیا کرے۔ اگر آج ہی ایسا حکم صادر ہو تو کل آپ سُن لیجیئگا۔ لوگ سرکار پر تہمت
لگا دینگے کہ خیرات بند کرنا چاہتی ہے۔ بتایئے اس کا کیا علاج؟" رئیسہ بیگم بولیں

بیٹا کچھ نہ کچھ تو اس کا بندوبست ہونا چاہیئے۔ اپنے والد کو آنے دو۔ اُن سے تذکرہ کرونگی۔ تیسرے پہر کو مرزا باقر علی بیگ جب کچہری کے کام سے فارغ ہو کر گھر آئے تو بیوی نے اپنی ماما کی کہانی اُنکے آگے بیان کی۔ اُنکے دل پر بھی اس کا بڑا گہرا اثر ہوا اور کہنے لگے کہ "تم سچ کہتی ہو کہ ان مُسٹنڈے بھیک منگوں کا کچھ نہ کچھ علاج ہونا چاہیئے۔ مگر سرکار اس میں مجبور ہے۔ اصل میں ہمارا کام ہے کہ اس بیجا خیرات کا انتظام کریں۔ دیکھو مَیں کوئی تدبیر سوچونگا" اس گفتگو کے بعد گھر میں سب اپنے اپنے دھندوں سے لگ گئے۔ شام کو جب ظہورن گھر جانے لگی تو زینت بیگم نے اسکو اپنے پاس بلایا اور پانچ روپے اُس کے ہاتھ پر رکھکر کہا کہ یہ تمہارے بیٹے کی دوائی ٹھنڈائی کے لئے ہیں۔ ظہورن نے اپنی بیکسی اور زینت بیگم کی سچی ہمدردی کا خیال کر کے اُنکو نہایت تامل کے ساتھ منظور کیا۔ مگر چونکہ اس قسم کا یہ پہلا موقع تھا اُس کی پیشانی پر پسینا جھلک آیا۔ دوسرے دن صبح ہی اُٹھکر مرزا باقر علی بیگ بیوی سے کہنے لگے کہ "میرے خیال میں ایک تجویز آئی ہے اور انشاءاللہ وہ ضرور کارگر ثابت ہوگی۔ اُس کے لئے مَیں ابھی سے انتظام کرتا ہوں"۔ چنانچہ باہر جا کر اُنہوں نے اپنے ملازم سے کہا "عظیم اللہ! پہلے تو چاندنی چوک جا کر ہمارے باورچی سے کہو کہ ایک دیگ سلونے کی اور ایک میٹھے کی تیار کر کے دیوانخانے میں پہنچا دے اور اس کے بعد اپنے محلّے میں اوّل گھر سے لیکر آخر تک کہہ آؤ کہ گھر کے مرد آج شام کا کھانا مرزا جی کے ہاں تناول کریں"۔ عظیم اللہ نے اپنے آقا کا حکم بجا لانے میں ذرا تاخیر نہ کی۔ چنانچہ مغرب کی اذان سے پہلے پہلے دونوں دیگیں تیار ہو کر آگئیں اور محلّے والے نمازیں پڑھکر دیوانخانے میں جمع ہونے شروع ہوئے۔ اس محلّے میں کوئی ڈیڑھ سو گھروں کے قریب تھے اس لئے مہمانوں کی کل جمعیت ایک سو تیس یا چالیس آدمیوں سے زیادہ نہ تھی۔ جب یہ سب لوگ کھانے

فارغ ہوگئے تو مرزا صاحب نے صدر میں بیٹھے ہی بیٹھے یوں سلسلۂ
لیا۔ "حضرات! آج جس مقصد کے لئے میں نے آپکو تکلیف دی ہے وہ
م ہے اور اگرچہ مجھ میں اتنی لیاقت نہیں کہ اس کے حصول کے لئے احسن
ع سکوں لیکن اپنی قابلیت کے مطابق ایک تجویز میرے خیال میں
د آپ صاحبوں کے سامنے پیش کرونگا۔ یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ
ن نہایت پستی کی حالت میں ہیں اور اس کی چند در چند وجوہات ہیں چنانچہ
ے ایک یہ بھی ہے کہ ہم کو خیرات دینی نہیں آتی۔ اول تو ایسے لوگ
ودے چند مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں جنکو خیرات کی پوری توفیق ہو
وہ اس بے پروائی کے ساتھ دیتے ہیں کہ اس کا زیادہ تر حصہ اُن لوگوں
جاتا ہے جو بالکل مستحق نہیں اور اس طرح خیرات کا اصل مطلب فوت ہو جاتا ہے
میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آپ جو ایک پیسہ کسی ہٹے کٹے فقیر کو دیتے
وہ جا کر اس پیسے کی افیم یا بھنگ خریدتا ہے وہ مستحق خیرات ہے یا وہ جہاں
کسی بھوکے اپاہج کے پیٹ میں روٹی ڈالتا ہے یا کسی یتیم لڑکے کی تعلیم میں
ہے۔ آپ متفق ہو کر یہی کہیں گے کہ اصل خیرات وہی ہے جس سے بھوکے
بھرے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہم یہ سب کچھ جان بوجھکر دیتے وقت اسکا
خیال نہیں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ فقیروں کی تعداد دن بدن بڑھتی جاتی
علاوہ بریں ہماری پردہ نشین عورتیں اگرچہ یہ چاہتی ہیں کہ خیرات مستحق
مگر اُن کے پاس کوئی ذرائع نہیں جس سے سائل کا استحقاق معلوم کر سکیں
لئے ہر ایک پھیری والے فقیر کو وہ اپنی حیثیت کے موافق کچھ نہ کچھ ضرور
ہیں۔ چنانچہ مجھ کو یقین کامل ہے کہ ہمارے اس محلے میں سے کوئی فقیر خالی
ہیں جاتا۔ لیکن اگر ان فقیروں کی کرتوت آپ لوگوں کے آگے بیان کروں تو

آپکو حیرت ہوگی ۔ کل ہی کا ذکر ہے کہ میرے ہاں کی ما فقیر کو آٹا دینے گئی اور تھوڑی دیر کے بعد وہ بیہوش پڑی ہوئی پائی گئی اور تانبے کا کٹورا غائب ہوگیا۔ خیر اس مصیبت زدہ کا تو قصہ بہت طولانی ہے مگر آپ مثال کے طور پر اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ لوگ جنکو آپ فقیر تصور کرتے ہیں ۔ ان میں سے اکثر بلکہ تقریباً سب چوٹے اور بدمعاش ہوتے ہیں اور ایسوں کی خیرات سے پرورش کرنی گویا دیدہ و دانستہ چوری اور بدمعاشی کی امداد کرنی ہے ۔ لہذا کم از کم اپنے محلے کو اس الزام سے بری کرنے کی خاطر میری یہ تجویز ہے کہ اگر آپ اصحاب کی مرضی ہو تو اوّل تو پھاٹک پر ایک چوکیدار رکھا جائے اور اس مہینے میں اُس کا علاوہ رکھوالی کے یہ کام ہو کہ جو فقیر یا فقیرنی اس محلے میں داخل ہو اسکی بجائے کاغذ پر پنسل سے ایک لکیر کاڑھ لے تاکہ مہینے کے ختم پر فقیروں کی تعداد معلوم ہو سکے اور دُوسری بات یہ ہے کہ حاضرین میں سے ہر ایک شخص اپنے گھر میں جاکر ہدایت کردے کہ جو فقیر یا فقیرنی آن کر دروازے پر سوال کرے اور گھر میں سے اُسکو کچھ دینا منظور ہو تو اسکو دینے کی بجائے اُس کے نام کا علیحدہ رکھدیا جائے ۔ مثلاً میرے گھر میں سے عموماً فقیروں کو آٹا ملتا ہے تو مَیں گھر میں جاکر یہ کہدوں کہ ہر فقیر کے نام کا آٹا ایک علیحدہ گول میں ڈال دیا جائے اور مہینے کے اختتام پر مَیں ایک دفعہ پھر آپ صاحبان کو تکلیف دُونگا تاکہ تمام گھروں کی جمع کو آپکی رائے کے مطابق اصل غربا و مساکین میں تقسیم کردیا جائے ۔ مجھ کو جو کچھ عرض کرنا تھا وہ کردیا ۔ اب آپ لوگ اپنی رائے کا اظہار فرماویں"۔

اِس تقریر کا حاضرین پر بہت اثر ہوا اور کئی آدمیوں نے ہم آواز ہو کر کہا کہ "مرزا صاحب ہم کو آپ کی رائے سے پُورا اتفاق ہے" اور ایک شخص کھڑا ہو کر کہنے لگا کہ "مرزا صاحب ! آپ ہمارے بزرگ ہیں اور میر محلہ ہیں اور ہم سب آپ کی

مرضی کے مطابق چلنے کو تیار ہیں (پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر) کیوں بھئی میں جھوٹ تو نہیں کہتا"؟ اس پر دو چار آوازیں آئیں "نہیں بالکل سچ کہتے ہو" اس پر مرزا صاحب بولے کہ "میں آپ سب اصحاب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ آج ہی سے اپنے اپنے گھر میں ہدایت کر دینگے اور اس ماہ کی آخری تاریخ کو میں اپنے آدمی کو بھیجونگا۔ آپ جو کچھ جمع ہو اُسکو عنایت فرماویں اور اسی وقت اُس دن بھی میرے غریب خانے تک قدم رنجہ فرمائیں"۔ اس جلسے کے بعد مہمان رخصت ہوئے اور اُس کے دوسرے دن سے مرزا صاحب نے پھاٹک پر چوکیدار مقرر کر دیا۔ مہینہ بھر کی مدت آنکھ بند کرنے میں گذر گئی۔ اور تیسویں تاریخ عظیم اللہ نے سویرے ہی اُٹھکر ہر گھر کی پونجی لا کر دیوانخانے میں رکھنی شروع کر دی۔ شام کو محلے والے بھی ایک ایک کر کے آنے لگے اور جب تقریباً سب جمع ہو گئے تو مرزا صاحب نے بآواز بلند کہا کہ سب صاحب اس دالان میں آکر اپنے محلے کی ماہواری خیرات کا ملاحظہ فرمائیں۔ وہاں جا کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک طرف سوکھے ٹکڑوں کی ڈھیری چُنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف آٹے کا انبار لگا ہوا ہے۔ برابر ہی چاولوں کی ایک ڈھیری ہے اور پرلی طرف پیسوں کی ڈھیری کے برابر کوڑیوں کا ڈھیر لگا ہے اور بیچ میں کچھ دوانیاں چونیاں اور روپے پڑے ہیں۔ یہ سماں دیکھکر سب کی آنکھیں کھل گئیں اور مرزا صاحب کی تعریف کرنے لگے۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے مہینے کی کارروائی بیان کی۔

"حضرات! آپ کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرنے کے بعد مجھ کو یہ عرض کرنا ہے کہ اس محلے میں کل ایک سو پچاس مکان ہیں اور یہ جو کچھ آپ کے سامنے موجود ہے اس میں ہر گھر کا تھوڑا بہت حصہ شامل ہے۔ خالص آٹا تین من دس سیر جمع ہوا ہے۔ روٹی کے سوکھے ٹکڑے ڈیڑھ من۔ چاول اور دال وغیرہ

دس سیر اور کوڑیوں کو ملا کر کل نقدی تیس روپے چار آنے ہوتے ہیں۔ پچھلے مہینے میں کل فقیر فقیرنیاں معہ بچوں کے ستر کے قریب اس محلے میں داخل ہوئے۔ مہینے کے شروعات میں تو بہت آئے مگر جب کسی کو کچھ ہاتھ نہ لگا تو انہوں نے غالباً دوسروں سے جا کر کہہ دیا کہ اس محلّے میں کنجوسوں کی بستی ہے (قہقہہ) کیونکہ آخر تاریخوں میں ان بھیک منگوں کی آمد میں بہت کمی ہو گئی۔ اب جس طرح آپ کی مرضی ہو اس سرمائے کو تقسیم کیا جائے" اس پر کئی آدمی ہم آواز ہو کر بولے کہ ہم سب کام آپ کی مرضی پر چھوڑتے ہیں" مرزا صاحب کہنے لگے کہ "میری مرضی یہ ہے کہ آپ اپنے میں سے چار پانچ آدمی پنچوں کے طور پر مقرر کر دیجئے اور اس کی تقسیم انکے فیصلے پر چھوڑ دیجائے۔ اُنکا فرض یہ ہو کہ پہلے اپنے محلّے کے مستحقین کی پوری طرح امداد کریں اور پھر دیگر مساکین کی لیکن ہر حالت میں اُن کا فیصلہ آپ کی رائے کے مطابق ہو۔ دوسری بات یہ کہ اب ہماری خیرات فقیروں کی آمد پر منحصر رہنی نہیں چاہیے۔ بلکہ آپ سب صاحبان اپنی اپنی حیثیت کے موافق ماہواری رقم مقرر کر دیں اور اپنے میں سے ایک شخص مقرر کر کے اس کے پاس جمع کرا دیں۔ اور وُہ اس کا باقاعدہ حساب رکھے"۔ اس کے ساتھ ہی اپنے بیٹے ہاشم کو کاغذ پنسل دیکر کہا کہ جا کر سب اصحاب کے نام کے آگے جو رقم وُہ دینی منظور کریں وُہ لکھ لو۔ پھر حاضرین کی طرف مخاطب ہو کر۔ صاحبو! یہ کسی پر جبر نہیں ہے۔ جتنی جس کی توفیق ہو اور ماہواری نکال سکے اتنا لکھے۔ یہاں وُہ معاملہ نہیں ہے کہ ڈپٹی کمشنر کی نظر میں چڑھنے کے لئے بڑی بڑی رقمیں لکھدی جائیں۔ اس پر سب ہنس پڑے۔ غرض کسی نے ایک آنہ اور کسی نے دو آنے چار آنے ماہوار دینا منظور کیا۔ مرزا صاحب نے خود پانچ روپے لکھے۔ اس طرح کر کے ماہواری چندے کی رقم کل پنتالیس روپے ہوئے۔ اس کے

بعد سب نے متفق الرائے ہو کر اپنے میں سے پانچ آدمی منتخب کر کے مرزا صاحب کو اُن کا صدر بنایا اور ہاشم کے سپرد روپے کا حساب کتاب اور دیگر ضروری کام کیا۔ برخاست ہونے سے پہلے مرزا صاحب نے یہ تجویز پیش کی کہ "ہم سب متفق ہو کر چوکیدار کو یہ اختیار دیتے ہیں کہ کسی فقیر۔ فقیرنی یا بھیک مانگنے والے لڑکا لڑکی کو اس پھاٹک کے اندر نہ گھسنے دے اور اس مجلس کا بڑا جلسہ ہر سال کے سال ہُوا کرے لیکن اگر پنچ چاہیں تو بیچ میں منعقد کر لیں۔" جب اس تجویز کو بھی سب نے قبول کر لیا تو جلسہ ختم ہُوا۔

پانچ برس بعد

ہاشم نے پانچویں سال کی کارروائی اس طرح بیان کی :- حضرات ! ماہ گذشتہ میں اس تحریک کے بانی اور میرے والد مرحوم کے انتقال پر جو اظہار ہمدردی آپ سب اہلِ محلہ نے میرے ساتھ کیا اُس کا میں تہ دل سے مشکور ہوں۔ درحقیقت جب تک یہ محلہ قائم ہے اُنکا نام اس سے وابستہ رہیگا۔ اللہ تعالیٰ اُنکو غریق رحمت کرے۔ اب میں سالانہ کارروائی کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرنی چاہتا ہوں۔ سال گذشتہ کی کل آمدنی ساٹھ روپے ماہوار کے حساب سے سات سو بیس روپے ہوتے ہیں۔ معمولی آمدنی میں پندرہ روپے اضافہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مجلس قائم ہونے کے ایک ہی سال بعد اس محلے کے ایک طالب علم نے امداد کی درخواست کی۔ تاکہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکے آپ کے پنچوں نے تحقیقات کے بعد اس شرط پر وظیفہ منظور کیا کہ اختتام تعلیم پر اپنی آمدنی کا ایک حصہ پندرہ فیصدی کے حساب سے پانچ سال تک اس جلسے کو دیا کرے چنانچہ طالب علم مذکور پار سال رڑکی سے کامیاب ہو کر سو روپیہ ماہوار کا ملازم ہو گیا۔

اور اپنے عہد کے موافق جب سے برابر پندرہ روپے ماہوار دیتا رہا۔ اس سال کامل امید ہے کہ انکی تنخواہ میں ترقی ہوگی۔ جس سے اس محلّے کے خیراتی سرمایہ کو مزید فائدہ پہنچیگا۔ پچھلے سال کے اخراجات مجمل طور پر یہ ہیں۔ ایک بڑے صاحب کا انتقال ہوا جو عرصے سے اس محلّے میں رہتے تھے اور جو تا زیست دو پیسے ماہوار چندہ دیتے رہے چنانچہ اُنکی تجہیز و تکفین جلسے کی طرف سے ہوئی۔ محلّے کی دو لاکتخدا لڑکیوں کی شادی کی گئی۔ یہ بے ماں باپ کی بچیاں تھیں اور اپنی نانی کے ساتھ رہکر بڑی مشکل سے گزارا کرتی تھیں۔ مجلس کیطرف سے اُنکی نانی کو پانچ روپے ماہوار ملتے ہیں۔ محلّے کے پانچ لڑکوں کو تین تین روپے ماہوار وظیفہ بغرض تعلیم دیا جاتا ہے۔ دیگر اخراجات مختصراً یہ ہیں۔ مسجد کے مُلّا کی تنخواہ میں اضافہ۔ مسجد کا رکھ رکھاؤ وغیرہ اور محلّے کے سقّے کی ٹانگ ٹوٹ جانے کی وجہ سے پنچوں نے اُنکی خدمت کے صلہ میں چار روپے ماہوار منظور کئے۔ نیز مفلسی کی بنا پر تحقیقات کے بعد پانچ روپے ایک شخص مسمّی اکبر خاں تارکش کے لئے منظور ہوئے۔ یہ شخص اگرچہ اس محلّے کا رہنا والا نہیں مگر اس کی بیوی کی مُصیبت کا حال سُنکر والد مرحوم کے دل میں اس جلسے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ دیگر یہ کہ اس سال مجلس کو خدا کے فضل و کرم سے زیادہ آمدنی کی اُمید ہے اس لئے مَیں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ اس محلّے کے ہر لڑکے لڑکی پر آپ کی کثرت رائے سے تعلیم لازمی کر دیجائے اور وُہ اصحاب جو خود تعلیم کی زیر باری نہیں برداشت کر سکتے اُن کے بچوں کے تعلیمی اخراجات جلسہ اپنے ذمّے لے"۔ اس تجویز کی اگرچہ دس پندرہ آدمیوں نے مخالفت کی۔ مگر کثرت رائے سے منظور ہوگئی اور ہاشم نے کہا کہ مَیں یہ کارروائی اس دُعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں کہ یارب جس طرح تو نے اپنے خیراتی معاملات کو سرانجام دینے کی توفیق ہم کو عطا فرمائی ہے اسی طرح سب ہندو مسلمان بھائیوں کو یہ توفیق عطا کر کہ وُہ نہ صرف خیراتی بلکہ اپنے قومی انتظام میں خود ایکدوسرے کی مدد کر کے اپنے مقاصد کو پہنچیں آمین

(از لندن) (رؤف)

ہوا میں اُڑنا

"انجمن مہدویہ حیدرآباد دکن کی تحریک پر مولوی سید شہاب الدین صاحب ممبر انجمن نے ایک رسالہ ہوا میں اُڑنے پر لکھا تھا۔ آجکل چونکہ یورپ میں جا بجا ہوا ئیں اُڑنے کے تجربے ہو رہے ہیں اور ہندوستان میں بھی نئے غبارے پہنچنے والے ہیں۔ جن پر ہیلوں سے زیادہ تیقن کے ساتھ پرواز کا نمونہ دکھایا جائیگا اس لئے ہوا میں اُڑنے کا اصولی اور تاریخی بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا اور ہم اُس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

یہ کون نہیں جانتا کہ پانی میں تیرنا اور ہوا میں اُڑنا مچھلی اور پرندوں سے مخصوص ہے لیکن آدمی میں خدا تعالیٰ نے عقل کا جو بیش قیمت جوہر اور اُس کی فطرت میں جو نامحدود قابلیت ودیعت رکھی ہے۔ اس کے وسیلہ سے جس طرح اُس نے بہت سے بظاہر ناممکن کاموں کو ممکن کر دکھایا اور ہر وقت دکھا سکتا ہے۔ اسی طرح وہ بغیر پر کے پانی میں تیرنے اور ہوا میں اُڑنے میں کامیاب ثابت ہوا اور ہو سکتا ہے۔ پانی میں تیرنا انسان سے اتنے قدیم زمانہ اور بقدر کثرت سے صادر ہوتا رہا ہے کہ وہ کوئی اچنبھے کی بات ہی نہیں رہی ہے۔ چنانچہ بلا واسطہ آلات صرف اپنے ڈنڈ اور مونڈھوں کے بل سطح آب پر تیرنا اور تہ آب غوطہ لگانا ایک معمولی کرتب ہو گیا ہے۔ اسی طرح بواسطہ آلات و اوزار یعنی کشتیوں اور جہازوں کے ذریعہ سطح آب پر خشکی سے بھی کہیں زیادہ سہولت و آسانی کے ساتھ سمندروں کو ناپتے پھرنا ایک معمولی کام سمجھا جاتا ہے۔ لیکن جہاں یہ کرتب اپنی کثرت وقوع سے معمولی بات ہو گیا ہے۔ وہیں یہ قابل غور ہے کہ بعض بعض صورتوں میں انسان سے

یہی معمولی کام بھی اس غیر معمولی حیثیت سے ادا ہوا ہی کہ دیکھنے والوں کو حیران و ششدر بنا دیا ہے۔ یہی انسان جو اپنے ڈنڈ مونڈھوں کے بل مختصر پیمانوں پر مینڈک کی طرح ہاتھ پیر مارتا دکھائی دیتا ہے کبھی اپنا سینہ سپر کر کے کشتیوں جہازوں کی طرح جوش زن دریاؤں سے پار اُترتا۔ بڑی بڑی جھیلوں تالابوں کو عبور کرتا سمندروں میں میلوں تیرتا نظر آتا ہے اور کبھی زیر آب چلنے والے اسٹیمروں کی ایجاد سے غوطہ زنوں کی طرح منٹوں گھنٹوں نہیں بلکہ کئی کئی روز پانی کے اندر ہی اندر مسافت طے کرتا گویا دُرِ مقصود کی تلاش میں سمندر کی تھاہ کو ٹٹولتا پھرتا معلوم ہوتا ہے۔ غرضکہ انسان نے اپنی عقل کے پرزور ہتھیار کے ذریعہ دُنیا کے تین ربع غیر مسکون یعنی تری اور طبعی مادوں میں ایک بہت زیادہ مادے یعنی پانی کو بالکل مسخر اور اپنا پورا پورا مطیع و منقاد بنا لیا ہے جو ہر طرح اسکی مرضی کے موافق کام دینے کے لئے کافی طور پر رام ہو گیا ہے۔

اِس کامیابی سے انسان کا فطرتی و طبعی مرضِ جوع البقر اور بڑھا اور وہ ایک اور کثیر الوجود اور اس کے لئے سب سے زیادہ ضروری مادہ یعنی ہوا کو رام کر کے اس سے بھی وہی کام لینے پر آمادہ ہوا۔ یا یوں کہو کہ انسان کی جبلی طبیعت یا اُسکی روز افزوں ترقی کرنے کی قابلیت نے اسکو اس بات پر اُبھارا کہ جب دُوسرے بری حیوانات کی طرح خشکی پر چلنے اور مچھلی کی طرح پانی پر تیرنے کی ہوس نکال کر بر و بحر کو ناپ لیا ہے تو آؤ پرندوں کی طرح سما میں اُڑ کر عالم سماوی کی بھی سیر کریں۔ پس جس طرح ریل اور جہاز کے ذریعہ خشکی اور تری کی طنابیں کھینچ کر مشرق کو مغرب سے متصل کر دیا تھا اسی طرح کسی "مستقل ہوائی سواری" کے ذریعہ جنوب[۵۱] و شمال کو باہم قریب کر دینے کا خیال شروع ہو گیا۔

[۵۱] جب قطبِ شمالی کی تحقیق میں سمندر کے منجمد رہنے سے لاکھوں روپیہ صرف اور سیکڑوں جانیں نذر

سائنس کے رُو سے ہوا میں اُڑنے کے اصول

دُنیا میں جتنے مادّے ہیں اُن کی از رُوئے استقرا دو قسمیں ہیں - ایک "جامد" اور ایک "سیّال"۔ جامد ٹھوس چیز کو کہتے ہیں جس کے اجزا میں باہم کشش اتصال زیادہ ہوتی ہے۔ جسکی وجہ سے اس کی شکل بغیر کسی کاٹ چھانٹ یا غیر معمولی دباؤ کے سہولت و آسانی سے نہیں بدل سکتی۔ جیسے پتھر۔ لکڑی۔ لوہا۔ تانبا وغیرہ۔ "سیّال" یعنی بہنے والا مادہ، وہ ہے جس کے اجزا میں کشش اتصال کم ہو۔ اس کے اجزا سہولت سے حرکت کر سکتے ہوں اور اس وجہ سے اسکی شکل بلا کاٹ چھانٹ اور بغیر کسی دشواری کے آسانی سے بدل سکتی ہو جیسے پانی تیل۔ پارا وغیرہ اس بیان کی توضیح کے لئے فرض کرو کہ ہمارے روبرو لکڑی یا پتھر یا اور کسی دھات کا ایک گول پیالہ رکھا ہے۔ اس میں پانی بھر دو۔ اب پانی کی شکل ٹھیک ویسی ہی ہوگی جیسی اس پیالہ کی اندرونی شکل ہے۔ پھر اسی پانی کو ایک ایسی لمبی نلی میں انڈیل دو جس میں پیالہ کے ٹھیک برابر برابر گنجائش ہو۔ اب پانی کی شکل بلا کاٹ چھانٹ اور خراش تراش کے اسی نلی کی ٹھیک اندرونی شکل سی یعنی لمبوتری ہو جائیگی۔ اب بتاؤ پانی کی گول پیالہ سی شکل کو جس سہولت و آسانی سے ایک لمبی نلی کی شکل کا بنا دیا گیا۔ اسی طرح بغیر توڑ پھوڑ اور خراش تراش کے لکڑی یا پتھر وغیرہ کے اس پیالہ کو نلی کا سا بنا دے سکتے ہو؟ ہرگز نہیں! پس "سیّال" اور "جامد" کی خاصیت اور حالت میں بھی بیّن فرق ہے۔

"سیّال" کی تعریف کے بعد ہمیں یہ بتانا ہے کہ "سیّال" کی دو قسمیں ہیں ایک "مائع" اور دوسری "گیس"۔ مائع یعنی رقیق - پتلا جیسے پانی - تیل - پارا وغیرہ "گیس" جیسے

ہونے کے باوجود بادبان ناکامی ہوتی رہی تو یہی خیال کیا جاتا تھا کہ بیلون سے کام لینا چاہئے - اب اس تحقیق میں ایک حد تک کامیابی ہوجانیکے بعد قطب جنوبی کی دریافت کیجانب توجہ مبذول ہورہی ہے جو قطب شمالی کی نسبت بہت زیادہ دُور تر ہے۔ یقین کیا جارہا ہے کہ یہ تحقیقات ہوائی جہاز کے بغیر نہیں ہوسکے گی۔

ہوا - پانی کی بجانب - دھواں وغیرہ "سیال" کی جو تعریف ہے وہ ان دونوں پر پوری پوری صادق آتی ہے - لیکن ان دونوں میں باہم حالت وہیئت کے علاوہ جو ظاہر ہے دوسرا بڑا فرق یہ ہے کہ "مائع" کا حجم دباؤ سے سکڑ نہیں سکتا اور "گیس" کا سکڑ سکتا ہے۔ "مائع" کے اجزا میں باہم کشش اتصال کم ہے اور اسی وجہ سے وہ کسی خارجی طاقت کے سبب سہولت کے ساتھ جدا ہو جاتے اور مائع زائل ہو جائے تو پھر باہم مل جاتے ہیں - مگر "گیس" کے اجزا میں کشش اتصال مطلق نہیں ہوتی - بلکہ اُن میں میلانِ ابتعاد (ایک دوسرے سے دور اور جدا جدا رہنے کا میلان) پایا جاتا ہے اور اسی سبب سے وہ صرف کسی خارجی طاقت یا دباؤ کے باعث باہم متصل رہتے ہیں اور جب دباؤ کم ہو جائے تو فوراً ایک دوسرے سے جدا جدا ہو کر پھیلنے لگتے ہیں - اسی خاصیت کو "قوتِ تمدد" (پھیلنے یا چڑھنے کی قوت) کہتے ہیں - غرض اسی لحاظ سے مادہ کی تین حالتیں ثابت ہوئیں - جامد - مائع - گیس -

کل "سیال مادوں" کا عام اس سے کہ وہ مائع ہوں یا گیس یہ خاصہ ہے کہ جو چیز ان میں گرے اگر وہ اپنے "مساوی الحجم سیال"[سلہ] سے بھاری ہو تو اس میں ڈوب جائے گی - جو ہلکی ہو اس کی سطح پر تیرے گی - اور اگر ٹھیک مساوی الوزن ہو تو

سلہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اسی چیز کی مقدار کے موافق اس سیال کا بھی ایک حصہ یا ٹکڑا لیا جائے مثلاً کسی چیز کا ایک گول گیند ہے تو یہ دیکھا جائے کہ وہ اسی حجم کے پانی کے گیند سے بھاری ہوگا یا ہلکا - اسکی دریافت کا آسان طریقہ یہ ہے کہ کسی برتن کو رکابی میں رکھ کر اس میں اسقدر لبالب پانی بھر دو کہ ایک قطرہ کی بھی گنجائش باقی نہ رہے ایسے برتن میں وہ گیند ڈبو دو تو اس سے برتن کا جس قدر پانی رکابی میں گر پڑے وہ اسکا مساوی الحجم ہوگا - اب اس پانی اور اس گیند کو باہم وزن کرنے سے اس کا اپنے مساوی الحجم پانی سے بھاری یا ہلکا پن ثابت ہو جائیگا - دوسرے سیالات کو بھی اسی پر قیاس کر لو -

وُہ ٹھیک اپنی جگہ قائم رہیگی۔ کسی بیرونی شے کے لئے جو قاعدہ ہو وہی اُس "سیال" کے اجزا کے لئے بھی حاوی ہو یعنی "سیال مادے" کے جو اجزا بھاری ہونگے وُہ نیچے کی جانب اُترینگے اور جو اجزا ہلکے ہونگے وہ اُوپر کو چڑھینگے۔ چنانچہ ہَوا یا پانی کے جو اجزا حرارت سے گرم ہو جاتے ہیں وُہ سرد اجزا کی نسبت ہلکے ہوتے ہیں اور اسی لئے جہاں کہیں ایسی صورت پیش آتی ہے۔ وہاں گرم گرم اجزا اوپر کو چڑھتے جاتے ہیں اور سرد اجزا نیچے کو اُترتے آتے ہیں۔

یہ ایک ایسا مسلّمہ قانون طبعی ہو جو بہت سے واضح تجربوں سے ثابت ہوا ہے۔ چنانچہ ان صاف صاف مثالوں سے یہ قاعدہ اچھی طرح سمجھ میں آسکتا ہو۔ ایک خالی کیئے یا تنگ مُنہ کے مٹکے کا مُنہ مضبوط بند کرکے گہرے پانی میں ڈبو دو۔ وُہ فوراً اُوپر کو آجائیگا۔ اِس میں کوئی سنگین شے مثلاً ریت یا چون یا ذرا پانی بھر کر پانی کی سطح پر چھوڑ دو تو وُہ جھٹ ڈوب جائیگا۔ یہ کیوں؟ صرف اسلئے کہ پہلی صورت میں وُہ اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکا تھا۔ کیونکہ اس میں کسی بھاری چیز کے عوض ہَوا بھری ہُوئی تھی۔ یہ تو بھاری اور ہلکی ہونے کی صورت تھی۔ اب اسی خالی مٹکے کا مُنہ کھولکر اسکو ترچھا کرکے اُس میں ذرا سا پانی داخل کرو اور پھر پانی میں چھوڑ کر دیکھو اگر ڈوبنے لگے تو تھوڑا سا پانی اونڈیل دو اور جو اسی طرح اوپر کو تیرتا رہے تو اور پانی داخل کر دو۔ غرض تھوڑی سی اُلٹ پلٹ میں یہ مٹکا اس حالت پر پہنچ جائیگا کہ پانی میں جہاں چھوڑ دو۔ ٹھیک اُسی حد پر قائم رہے اور اوپر یا نیچے ذرا بھی ہٹے بغیر اِدھر اُدھر منڈلاتا پھرے۔

یہ تو پانی کی مثال تھی۔ اب ہَوا کو دیکھو تو اُس پر بھی یہی قاعدہ پُورا پُورا صادق آتا ہے۔ آتشبازی کے کاغذی غباروں کو جو عموماً تقریبوں میں اُڑائے جاتے ہیں۔ زمین پر رکھدو تو جہاں تھے وہیں پڑے رہینگے۔ اگر کسی غبارے کے

مُنہ کے قریب ایک شعلہ جلا کر اُس میں دُھواں[1] بھر دیا جائے تو وُہ خود بخود اُوپر کو اُٹھتا اُٹھتا اسقدر بلند ہو جاتا ہے کہ آسمان کا تارا معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس کی بھی یہی وجہ ہے کہ دُھواں بھرنے کے بعد غبارہ کا ڈھانچہ اپنی مساوی الحجم ہوا سے ہلکا ہوتا ہے اور یہ اُسی قاعدہ کے موافق ہوا میں اُوپر چڑھنا شروع ہوتا ہے۔ اور جب دُھواں خارج ہو کر غبارے میں ہوا بھر جاتی ہے تو پانی بھرے مشکی کی طرح یہ اپنی مساوی الحجم ہوا سے بھاری ہو جاتا اور اسی لئے نیچے کو اُترنا شروع ہوتا ہے۔ اسی طرح جو غبارہ ایک مناسب بلندی پر پہنچنے کے بعد اوپر کی لطیف ہوا کے مساوی الحجم ہو جاتا ہے تو جب تک یہ حالت قائم رہے اوپر یا نیچے ہٹے بغیر ہوا کے رُخ پر اُفقی حرکت کرتا اور اِدھر اُدھر منڈلاتا رہتا ہے۔

یہانتک تو یہ ثابت ہوا کہ کسی سیال مادے کی مساوی الحجم ہلکی چیز اسی سیال میں ڈوبنے نہیں پاتی بلکہ تیرتی رہتی ہے۔ لیکن ہر تیرنے والی چیز اپنے حجم اور وزن کے اعتبار سے اسی قاعدہ کے موافق دُوسری شے کو بھی تیرا سکتی ہے۔ کسی دھات کا ایک رقیق پیالہ ایک ٹب میں پانی بھر کر اسکی سطح پر سیدھا چھوڑ دو۔ وُہ اپنے مساوی الحجم پانی سے ہلکا ہونے کے باعث تیرتا رہیگا۔ اب اس پیالہ میں ایک چھوٹا سا پتھر رکھدو۔ پھر بھی وُہ تیرتا اور پتھر کو بھی تیراتا رہیگا۔ یہ کیوں؟ اسی لئے کہ وُہ پیالہ پتھر سمیت اپنے مساوی الحجم پانی سے پھر بھی ہلکا ہے۔ یہ پیالہ جس قدر بڑا اور ہلکا ہوگا اسی قدر بڑے پتھر یا اور کسی وزنی شے کو تیرا سکتا ہے۔ چنانچہ خود اس ٹب کو جس میں پانی بھر کر یہ تجربات کئے گئے تھے خالی کر کے کسی لبریز حوض میں چھوڑ دو تو وُہ خود پانی کی سطح پر تیرتا رہیگا۔ اور ایک اچھے خاصے تنومند شخص

[1] دُھواں بھرنا ظاہری لحاظ سے لکھا گیا ہے ورنہ اصل میں آگ کے ذریعہ اندرونی ہوا گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی اور غبارہ اپنے مساوی الحجم ہوا سے ہلکا ہو جاتا ہے۔

کو تیر ائیگا۔ یہی وُہ کلیہ ہے جو فنِ جہازرانی کا اصل اصُول ہو اور اسی قاعدے کے موافق کشتیوں اور جہازوں میں ہزاروں لاکھوں من وزنی سامان و اسباب اور سینکڑوں ہزاروں آدمی لدے ہوئے سطح آب پر تیرتے مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق کو پہنچ جاتے ہیں۔ یہ قاعدہ جس طرح پانی پر صادق ہو اسی طرح ہوا پر بھی ٹھیک ٹھیک حاوی ہے۔

آتشبازی کے مذکورہ غبارے میں دھواں بھرنے کے بعد اس کے حجم اور وزن کے موافق کوئی وزن اس سے باندہ دو۔ تو وُہ اپنے ساتھ اسکو بھی لے اُڑیگا جس طرح پانی پر تیرنے والی چیز جس قدر زیادہ بڑی ہوگی اُسی نسبت سے زیادہ وزنی شے کو تیرا سکیگی۔ اسی طرح ہوا میں اُڑنے والا غبارہ بھی جس قدر زیادہ بڑا اور اپنی مساوی الحجم ہوا سے جتنا زیادہ ہلکا ہوگا اسی قدر زیادہ وزن کو اپنے ساتھ اُڑا سکیگا۔ حتّٰی کہ غبارے کا ڈھانچہ اگر زیادہ بڑا ہو تو ایک یا کئی آدمی کو بھی اُڑا لیجا سکتا ہو۔ چنانچہ جس بیلون یا غبارہ کا قطر تیس فٹ ہو اور اس میں ۱۴۱۲۲ مکعب فٹ ہیڈروجن گیس بھری جائے وُہ بیلون کے ڈھانچہ کے علاوہ ۱۱ من ۲۴ سیر وزن اُڑا لیجائیگا جو ایک چھوٹی کشتی کے بارسے بہت زیادہ ہے۔

"سیال" مادوں کی اس خاصیت اور اس قاعدہ کلیہ کے ذکر کے بعد یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ ان میں تیرنے والی چیزوں کا ہلکا یا بھاری پن جو اُن کے تیرنے یا ڈوبنے کا باعث ہو "سیال" مادوں کی لطافت و کثافت کے اعتبار سے مختلف ہُوا کرتا ہے۔ جو چیز کسی لطیف سیال میں ڈوب جاتی ہو وُہ اس سے کثیف سیال میں تیرنے لگیگی۔ اس کو تجربہ کرنا ہو تو بارش کے پانی یا کشید کئے ہوئے لطیف پانی میں کوئی ایسی وزنی شے ڈالدو جو اپنے مساوی الحجم معمولی پانی کے ہموزن یا اُس سے کچھ ہی بھاری ہو اس صورت میں وُہ ڈوبی رہیگی۔ اب اس پانی میں نمک ڈالتے جاؤ تو پانی کثیف ہوتا جائیگا اور آخر وُہ شے پانی پر تیرنے لگیگی۔ اسی طرح جو

چیز کثیف سیال میں تیرتی ہو وہ لطیف سیال میں ڈوب جائیگی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کشتی یا اسٹیمر سمندر کے کھارے پانی میں انتہائی حد تک بھر دیا جائے تو وہ کسی دریا کے میٹھے لطیف پانی میں پہنچکر ضرور ڈوب جائیگا۔

پانی کی طرح ہوا کی بھی یہی کیفیت ہے۔ کرہ زمین کے اطراف تقریباً پچاس میل عمیق ہوا کا سمندر ثابت ہوا ہے۔ اس میں جو ہوا زمین سے متصل ہے وہ گرد وغبار اور کاربانک ایسڈ گیس وغیرہ کی آمیزش سے کثیف ہے اور جیسے جیسے اوپر بڑھتے جائیں وہ لطیف ہے۔ پس جو غبارہ سطح زمین سے متصل کثیف ہوا سے ہلکا ہونے کی وجہ اڑ سکتا ہے وہ تھوڑی دور اوپر پہنچکر لطیف ہوا کے مساوی الوزن یا اس سے ہلکا ہونے سے اور اوپر نہیں چڑھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ بیلون جب مناسب بلندی پر پہنچنے کے بعد لطیف ہوا کے مساوی الوزن ہوکر رک رک جاتا ہے تو اور اوپر چڑھنے کے لئے صابورہ[1] پھینک پھینک کر اسکو ہلکا کرنا اور نیچے اترنے کے لئے اس میں بھری ہوئی ہلکی گیس کو خارج کر کرکے اس کو اپنے مساوی الحجم ہوا سے بھاری کر دینا پڑتا ہے جس کے بغیر وہ کبھی اوپر یا نیچے چڑھ یا اتر نہیں سکتا۔

پانی یا ہوا کے سمندر میں تیرنے کی ایک اور بھی صورت ہے وہ یہ کہ تیرنے والی چیز گو اس "سیال" سے ہلکی نہ ہو۔ لیکن وہ ہر دم اپنے مساوی سیال کو ہٹاتی یا کاٹتی رہے تو وہ بھی اس کی سطح پر تیر سکتی ہے مثلاً آدمی وغیرہ جو پانی میں تیرتے اور پرندے جو ہوا میں اڑتے رہتے ہیں وہ اپنی قوت ارادی کے ساتھ جو اس کا جزو اعظم ہے اپنے ہاتھ پیر یا پروں سے اپنے مساوی پانی یا ہوا کو ہٹاتے یا کاٹتے رہنے سے تیر اور اڑ سکتے ہیں اور اپنے اعضا یا پروں کی مختلف حرکتوں

[1] وہ مٹی یا ریت وغیرہ جو صرف اسی غرض سے بیلون میں بھری جاتی ہے۔

سے پانی یا ہوا میں متضاد تموّج پیدا کر کے ہر طرف پلٹ سکتے اور کبھی اوپر چڑھ سکتے اور کبھی نیچے اُتر آسکتے ہیں۔

ہوا میں اُڑنے کا تاریخی بیان ہوا میں اڑنے کی اصولی بحث کے بعد ہم اس کے تاریخی پہلو کی جانب متوجہ ہو کر یہ بتاتے ہیں کہ اس کا وجود کب سے پایا جاتا ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے کیا کیا کوششیں کی گئیں اور اس میں وقتاً فوقتاً کیا تبدیلیاں کی گئیں۔

مذہبی لحاظ سے تختِ سلیمان کا ہوا پر اُڑنا مشہور ہے جو آزاد خیال جنٹلمینوں کے نزدیک خلافِ عقل اور ایک ڈھکوسلا متصوّر ہوتا ہے۔ لیکن جس شخص کا دماغ سائنس کی وسیع معلومات کی ضیاء سے منوّر ہو اور خدا تعالیٰ کی قدرت یا نیچر کی نامحدود صناعیوں کے حیرت انگیز کرشمے جو بڑے بڑے عقلمندوں کی عقلوں کو حیران کئے دیتے ہیں۔ اُس کے پیشِ نظر ہوں۔ اس کے نزدیک یہ بالکل ممکن اور موافقِ عقل ہے۔

اسی زمانہ کے قریب قریب کا ایک اور واقعہ ہوا میں اُڑنے کا مؤرخینِ فارس وغیرہ بیان کرتے ہیں۔ یعنی کیکاؤس شاہِ ایران نے ستارہ شماری اور بقولِ بعض خدا سے مقابلہ کے مقصد سے آسمان پر چڑھ جانے کے لئے یہ تجویز کی تھی کہ ایک تخت کے بیچوں بیچ ایک بھالے پر جو تخت میں جما ہوا تھا گوشت لٹکا دیا گیا اور اس کے چار گوشوں پر چار زبردست بھوکے عقاب باندھ دیئے گئے۔ جب عقاب گوشت پر جھپٹے تو انکے زور سے تخت بھی اُڑتا گیا۔ وہ گوشت کے لئے جس قدر زیادہ گرم پرواز ہوتے تخت اُسی قدر بلند ہوتا جاتا تھا۔ جب تک اُن عقابوں کے بازو پرنے یاری دی وہ تخت کو لئے جو سما میں منڈلاتے رہے اور جب اُن کی قوتِ پرواز سلب ہونی شروع ہوئی تو تخت بھی سرِ نشیب ہونے لگا اور ارضِ آمل کے قریب زمین پر آرہا۔ فردوسی کے طرزِ بیان سے یہ پایا جاتا ہے کہ کیکاؤس نے کیہ

سے ابر کی بلندی سے اونچا پہنچ گیا تھا۔ تاریخ طبری میں لکھا ہے کہ تخت پر کیکاؤس کے
ہمراہ اور کئی آدمی تھے لیکن سب کے سب نذرِ اجل ہوئے اور صرف کیکاؤس
بخت و اتفاق کی مدد سے جانبر ہوا۔

قدیم قصّوں سے خاص ہندوستان میں بھی اگلے زمانہ میں اُڑن کھٹولوں
کا صرف وجود ہی نہیں پایا جاتا بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستقل سواری کا کام
دیتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ ہندوستان کی تاریخ کا بالکل تاریک زمانہ ہے
جسکی وجہ سے ہم انکی ہیئت کذائی کے متعلق کچھ بھی بحث نہیں کر سکتے۔ تاہم جب یہ
مسلّم بات ہے کہ قوانینِ قدرت یا نوامیس طبعی کبھی خلل پذیر نہیں ہو سکتے اور ہر زمانہ میں
صحیح و صادق ہیں مثلاً پانی و ہوا اُس وقت بھی جبکہ وہ پہلے پہل دُنیا میں پائے گئے
آج ہی کی طرح سیال تھے اور سیالات کی کل خاصیتیں رکھتے تھے اور جس طرح آج ہیں
اُسی طرح آیندہ زمانہ میں بھی رہیں گے۔ جس طرح ہوا یا پانی میں پھینکا ہوا پتھر آج سطح
زمین کی طرف اُتر آتا ہے پہلے بھی اُس کی یہی حالت تھی۔ اگر آج خس و خاشاک اور
دُوسری ہلکی چیزیں سطحِ آب پر تیرتی اور دُھواں۔ بخارات وغیرہ زمین سے اُٹھکر ہوا
میں بلند ہوتے ہیں تو پہلے وہ پانی میں ڈوب نہ جاتے اور یہ زمین پر گر نہ پڑتے
تھے۔ رہی یہ بات کہ اُس زمانہ میں اُن قوانین کا علم بھی حاصل تھا یا نہیں۔ اسکی نسبت
اگلے زمانہ میں جب حکمائے مصر و یونان ہندیوں کے زلّہ ربا تسلیم کئے گئے ہیں
تو اس قسم کے علم کا خواہ مخواہ انکار کرنے کی جواز عقلی اجازت نہیں دے سکتا۔
اسکے قطعِ نظر کسی نتیجہ طبعی کے ظہور پذیر ہونے کے لئے قانونِ طبعی کا علم کچھ ضروری
نہیں۔ بیشمار آدمی پانی میں تیرتے ہیں مگر اس قاعدہ کی اُنہیں مطلق خبر نہیں۔
سینکڑوں ملّاح ایسے ہیں جن کی عمریں جہازرانی میں صرف ہو گئی ہیں۔ حالانکہ انہیں
سیالات کی نسبت قوانینِ طبعی کا کما حقّہ علم ہی نہیں ہے اور انکی یہ لاعلمی اُن کے

ڈوب جانے کا سبب یا اُن کے اس فعل کے انکار کا باعث نہیں بن سکتی۔

حکیم ارخیتاس نے سنہ عیسوی سے چار سو سال قبل لکڑی کا ایک کبوتر بنایا تھا جو چند لحظے ہوا میں اُڑتا رہتا تھا۔

سوٹیوتوس کا بیان ہے کہ قیصر روم نیرون کے عہد میں سیمون نامی ساحر نے مصنوعی پر لگا کر ایک مکان سے اڑ کر دوسرے مکان پر پہنچنے کی کوشش میں اپنی جان دی۔

روجر بیکن متوفی سنہ ۱۲۹۲ء یا سنہ ۱۲۹۴ء میں کسی ایسے آلہ کی ایجاد کو ممکن بتاتا تھا جو مصنوعی بازوؤں سے پرندہ کی طرح اُڑے اور اُڑا سکے۔

پندرھویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں ڈانتی جو اعلیٰ درجہ کا ریاضی دان گذرا ہے مصنوعی بازوؤں کے وسیلہ سے جنہیں جسم سے باندھ لیا تھا بمقام پیروجیا بحیرہ ٹراسیمینی پر ہوا میں کسیقدر بلند اُڑا تھا۔

سنہ ۱۶۱۷ء میں مسٹر فلیڈر نے ٹیوٹنگن کے گرامر اسکول میں "ہوا میں اُڑنے" پر ایک لکچر دیا جس میں اس کے متعلق بعض اصول بیان کئے تھے۔ اس سے گیارہ سال بعد جب مسٹر فلیڈر نے اپنا لکچر شائع کر دیا تو اسکو دیکھکر ایک شخص کو ہوا میں اُڑنے کا خیال پیدا ہوا اور پر لگا کر اُڑنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا اور زمین پر گر کر مر گیا۔

سینٹ آگسٹائین کا ایک راہب مسمّی البرٹ سیکزنی جس کی نظر سے ارسطالیس کی اکثر تصانیف گذری تھیں یہ بیان کرتا تھا کہ آگ رقیق ہوتی اور ہوا پر اُڑتی ہے اگر یہ بخارات کسی کھوکھلے گولے میں بھر دیئے جائیں تو وہ بھی ہوا میں اڑ سکتا ہے لیکن اس کے کچھ عرصہ بعد ایک پرتگالی شخص فرانسس مندکوزا نے جسکا انتقال سنہ ۱۶۲۶ء میں ہوا ہے کچھ تجربات کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اِس جلانے والے مادے میں بذاتہٖ یہ صلاحیت نہیں ہے بلکہ آگ سے ہوا گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی ہے اور اس میں تموّج پیدا ہوتا ہے۔

سنہ ۱۶۷۰ء میں فرانسس لانا نے ایک ایسی مشین بنائی جو خود بخود ہوا میں اُڑسکتی تھی یہ مشین دراصل ایک چھوٹی کشتی تھی جس کے بیچ میں ایک دراز مستول اور بادبان تھا اور چاروں گوشوں پر پچیس پچیس فٹ قطر کے چار مجوف گولے لگائے تھے جن میں گرم گرم ہوا بھری ہوئی تھی۔ یہ گولے اِس قدر رقیق تھے کہ انکا حجم بہت ہی صرف $\frac{1}{215}$ انچ تھی اِس لئے وُہ ہوا کے دباؤ کی تاب نہ لاسکے اور فوراً پھٹ گئے۔

اسی طرح سترھویں صدی عیسوی کے ختم اور تقریباً اٹھارہویں نصف صدی تک کئی ایک شخصوں نے جنہیں "فلسفہ میکانیکل" میں کما حقہ مہارت نہیں تھی اسی خیال میں بہتیری کوششیں کیں لیکن کسی کو خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر سنہ ۱۷۶۶ء میں جب پروفیسر کیا وندش نے ہیڈروجن گیس دریافت کی جو معمولی ہوا سے تخمیناً ۱۴ گنی ہلکی ہے تو گویا ہوا میں اُڑنے کی کنجی ہاتھ لگ گئی۔

سنہ ۱۷۶۷ء میں مسٹر بلاک نے بمقام ایڈنبرگ تلانذہ کے روبرو یہ تجربہ کر دکھایا۔ کہ جب کسی کھوکھلے خالی گولے میں یہ گیس بھر دیجاتی ہے تو وُہ خود بخود ہوا میں اُٹھنے لگتا ہے۔

اِس کے کچھ عرصہ بعد یعنی سنہ ۱۷۸۲ء میں کافلو نے بہتیرے تجربات کئے لیکن صابون کے بلبلوں سے زیادہ سنگین چیز نہیں اُڑاسکا۔ قصبہ انونے کے باشندے پیٹر مانٹگلفر کاغذ ساز کے دو لڑکے اسٹیفان اور جوزف مانٹگلفر نے بادلوں کو ہوا میں اُڑتا دیکھکر یہ خیال کیا کہ اگر کسی ہلکے تھیلے میں انہی بادلوں کی خاصیت کی ہوا بھر دیجائے تو یقیناً وُہ بھی ہوا میں اُڑ سکے گا۔ لیکن اِس وقت تک اُنہیں ہیڈروجن کی مطلق خبر نہ تھی اور قطعی طور پر صرف یہی معلوم تھا کہ ہر وقت آگ جلانے سے دھواں ہوا میں اُڑجاتا ہے پس اُنہوں نے اپنے خیال کی تکمیل کے لئے دھوئیں سے کام لینے کا مصمم ارادہ کرکے ۱۰۵ فٹ ململ کا ایک تھیلا بنا کر اس پر کاغذ منڈھا

اس کے نیچے ایک سوراخ رکھکر اس کے مُنہ پر روغنی مادّوں کا ایک شعلہ رکھدیا۔ جس سے تھیلے کے اندر دھواں بھر گیا اور آخر وہ تھیلا خود بخود زمین سے بلند ہوکر دس منٹ ہوا میں اُڑتا رہا۔ اور جب دُھواں خارج ہوگیا تو رفتہ رفتہ اُترتا اُترتا زمین پر بیٹھ گیا۔ یہی سب سے پہلا غبارہ یا بیلون تھا جس کا وزن ۱۴۹ اونس تھا اور ۵ جون ۱۷۸۳ء کو اُڑایا گیا اور تقریبًا ایک میل بلند ہوکر ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر گرا۔

اِس واقعہ کی بہت جلد یورپ میں شہرت ہوگئی خصوصًا اہلِ پیرس کو اس کی جانب بہت توجہ ہوئی اور ایم فاکس ڈی سینٹ عالم علمِ حیوانات نے پھر دوبارہ یہ تجربہ کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اس کا کل خرچ اپنے ذمہ لیا۔ پس جوزف مانٹگلفر نے ریشمی کپڑے کا ایک اَور غبارہ بنایا جس کا قطر ۱۲ فٹ تھا۔ ہزاروں تماشائیوں کے سامنے ۲۷۔ اگست سنہ مذکور کو پھر دوبارہ غبارہ اُڑایا گیا۔ جو پندرہ میل کے فاصلہ پر ایک کھیت میں گرا۔ دیہاتیوں کے لئے یہ بالکل انوکھی چیز تھی جس کو دیکھکر وہ سخت متحیر اور خوف زدہ ہوئے اور اسکو پھاڑ ڈالا۔

مانٹگلفر نے ستمبر سنہ مذکور کو بمقام ورسلز بادشاہ اور ملکہ کے روبرو ایک اَور غبارہ اُڑایا جو نہایت خوشنما تھا۔ غبارہ پندرہ سو فٹ بلند ہوکر آٹھ منٹ میں زمین پر اُترا۔ ان تجربات سے اکثر لوگوں کے خیالات بیلون کی جانب منعطف ہوگئے اور اسی کے قریب قریب بہت سارے غبارے اکثر لوگوں نے اُڑائے۔ اِسی سال سب سے پہلے لندن میں بھی غبارے کا تجربہ کیا گیا۔

اس وقت تک کسی شخص نے غبارہ میں بیٹھ کر اُڑنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ سب سے پہلے بلانشارڈ کو جسے سب سے پہلا پرواز کنندہ کہا جاتا ہے یہ خیال پیدا ہوا کہ یہ غبارے جس قدر طاقت سے اُڑتے [illegible] پر نظر کرتے عجب

نہیں کہ یہ آدمی کو بھی لے اُڑیں۔ پس اس خیال سے اس نے اور روزیر دو شخصوں نے
غبارہ میں بیٹھکر اُڑنے کی جرأت کی اور ایک غیر محفوظ بیلون میں سوار ہو کر تقریباً
تین ہزار فٹ بلند اُڑ کر پیرس کے قریب صحیح سالم زمین پر اُترے۔ پھر کیا تھا انکی
اس کارروائی نے تمام یورپ میں ہلچل ڈالدی اور لوگ بیلون کو ایک کارآمد چیز
خیال کرنے لگے اور اس سے مفید کام لینے کا خیال شروع ہو گیا۔ چنانچہ اسی سال
کانون اول میں شارل نے جو اپنی عمر میں ۶۶ مرتبہ غبارہ میں سفر کرنیکی وجہ سے پہلا
مسافر ہوا مشہور ہے غبارہ میں بیٹھکر اُڑنیکا قصد کیا۔ اس وقت تک جتنے غبارے
اُڑائے گئے تھے وہ سب دخانی تھے۔ اور اول اول یہ خیال کیا جاتا تھا۔
کہ دھواں اپنی طاقت سے غبارہ کو لے اُڑتا ہے۔ لیکن بعد میں یہ خیال غلط نکلا
اور غبارہ کے اُڑنے کی وجہ اُس کی اندرونی گرم گرم ہوا کی خفت ثابت ہوئی
لیکن شارل کو ہیڈروجن کی ایجاد اور اس کی خفت وغیرہ خاصیتوں کا علم ہو چکا
تھا اس لئے مانٹگلفر کے غبارہ کی طرح آگ جلا کر ہوا کو ہلکا کر دینے کی مطلق
ضرورت نہیں رہی تھی۔ جو اس سے پہلے رائج اور نہایت پُرخطر طریقہ تھا۔ اس نے
ریشمی کپڑے کا ایک غبارہ بنایا۔ غبارے میں کاغذ منڈھنے سے وہ زیادہ بھاری
ہو جاتا تھا اور بیٹھکر اُڑنے کے لئے وہ جس قدر ہلکا ہو اُسی قدر مفید تھا۔ اس لئے
مسامات بند کرنے کے لئے اُس نے ریشم کو السی کے تیل اور تارپین
تیل میں پکا کر اس پر پالش کر دی جس سے کپڑے کے مسامات بند ہو گئے اور
گیس کے خارج ہونے کا مطلق اندیشہ نہیں رہا۔ غبارہ سے ایک کشتی لٹکائی
گئی تھی۔ جس میں شارل اور اس کا دوست رابرٹ اور بقول بعض روبیل بیٹھے
ہوئے تھے۔ جوں ہی غبارہ میں گیس بھر گئی وہ فوراً [illegible] سرعت سے
ہوا میں بلند ہونا شروع ہوا۔ (دیکھو فقرہ۔ ۵) اور بہت بلند ہو کر تھوڑے عرصہ

کے بعد یہ دونوں شخص پیرس سے پچیس میل پر صحیح سالم اُترے۔ اس کے بعد شارل اکیلا بیلون میں بیٹھا۔ اس مرتبہ پہلے کے بہ نسبت بیلون زیادہ ہلکا ہونے کی وجہ سے بہت سُرعت سے اُڑا۔ شارل نے دیکھا کہ سوار ہونے کے وقت آفتاب جو غروب ہو گیا تھا وُہ پھر نظر آنے لگا۔ مقیاس الحرارت (تھرمامیٹر) اور مقیاس الہوا (بارومیٹر) جو اس کے ساتھ تھے دم بدم اُترنے شروع ہوئے۔ چنانچہ اوّل ۲۱ ف درجہ پر آرہا اور ثانی ۵...۲ ڈگری تک اُتر گیا۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ تقریباً ۹ ہزار سوفٹ بلندی پر پہنچ گیا تھا۔ نتیجتاً ۲۵ منٹ کے بعد ۹ میل کے فاصلہ پر شارل صحیح سالم زمین پر اُترا۔

شارل کے اس تجربہ نے لوگوں کو بیلون کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ کر دیا اور بہتیرے شخصوں کو بیلون میں بیٹھکر عالم سماوی کی سیر کرنے کا شوق چرایا چنانچہ ۱۷۸۴ء میں شارل کے علاوہ پچاس سے زیادہ آدمیوں نے بیلون میں سوار ہو کر ہوا میں اُڑنے کی ہوس نکالی۔ جن میں ایک فرنچ لیڈی میڈم تھیبلے بھی تھی جو بمقام لیون بیلون کے ذریعہ ۱۳ ہزار ۵ سوفٹ بلند اُڑکر صحیح سالم اُتر آئی۔ غالباً یہی پہلی عورت ہے جس نے یہ قابلِ تعریف جرأت دکھا کر جنس اناث کے لئے اس جرأت کی بنیاد قائم کر دی۔

سید شہاب الدین مہدوی

ہسٹوریکل سوسائٹی

ہمیں معلوم کرکے نہایت خوشی ہوئی ہو کہ پنجاب میں ایک علمی سوسائٹی قائم ہوئی ہو جسکا نام پنجاب ہسٹوریکل سوسائٹی رکھا گیا ہو۔ اسکا مقصد یہ ہو کہ پنجاب اور نواحِ پنجاب کی تاریخ اور اسکی قدیم عمارات کی عالمانہ تحقیقات کیجائے۔ اوقاتِ معینہ پر اس سوسائٹی کے جلسے ہوتے رہینگے اور ان جلسوں میں تاریخ پنجاب کے مختلف شعبوں پر مضامین پڑھے جائینگے اور اُن مضامین پر مباحثے ہونگے۔ جلسہ کی رُوداد کے انتخابات بھی وقتاً فوقتاً شائع کئے جائینگے۔ یکم اکتوبر سنہ۱۹۰۱ء بمقام شملہ ایک جلسہ ہوا جس میں اس سوسائٹی کی بنیاد رکھی گئی۔ آنریبل مسٹر مکلگن صاحب بہادر سی۔ ایس۔ آئی اس سوسائٹی کے پہلے پریزیڈنٹ مقرر ہوئے ہیں۔ اور جے۔ پی۔ ٹامسن صاحب بہادر وائس پریزیڈنٹ جناب نواب لفٹنٹ گورنر صاحب بہادر پنجاب کو مقاصدِ مجلس سے دلی ہمدردی ہو اور اُنہوں نے اس مجلس کا مربی ہونا منظور فرمایا ہو۔ اُمید کیجاتی ہو کہ مقاصدِ مجلس سے ہندوستانی اور یورپین علم دوست صاحبان کو یکساں ہمدردی ہوگی۔ گو رُوداد انگریزی میں شائع ہوگی تاہم مضامین اُردو یا پنجابی میں بھی پڑھنے کی اجازت ہوگی۔ پنڈت ہری کشن کول صاحب سپرنٹنڈنٹ مردم شماری پنجاب اس سوسائٹی کے خزانچی مقرر ہوئے ہیں۔ دیگر معززین جو اس سوسائٹی کی ترقی میں کوشاں ہیں حسب ذیل ہیں:۔ آنریبل ملک عمر حیات خاں صاحب سی۔ آئی۔ ای آنریبل خان ذوالفقار علیخاں صاحب۔ راجہ سر ہرنام سنگھ صاحب کے۔ سی۔ آئی۔ ای چندہ ممبری دس روپیہ سالانہ قرار پایا ہو۔ مسٹر اے۔ سی۔ وولنر صاحب رجسٹرار پنجاب یونیورسٹی نے فی الحال سکرٹری کی خدمت اپنے ذمہ لی ہیں۔ جو صاحبان سوسائٹی کی بابت کچھ دریافت کرنا چاہیں وہ صاحب موصوف سے خط و کتابت کریں۔ وولنر صاحب خوشی سے اُنکے سوالوں کا جواب دینگے۔ اس سوسائٹی کے مقاصد کے مفید ہونے میں کلام نہیں اور اسکے سرپرستوں اور عہدہ داروں کے ممتاز نام اس بات کی کافی ضمانت ہیں کہ یہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوگی +

کلامِ اکبر

بہت ہی عمدہ ہے اے ہمنشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہے

جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو
کہ تیل بیچ میں ہے ڈھیلی اُسکی چول بھی ہے

نگاہ کرتے ہیں حاکم بہت تعمق سے
تمہاری عرض ہے گو کچھ زیادہ طول بھی ہے

خلل نہ شغل میں ہے لغو کے ہے نہ حشو کے
کہ شیخ سدّو بھی ہیں اور قدمِ رسول بھی ہے

عطا ہوئی ہے یہ اسپیکروں کو آزادی
کہ حاکموں میں ہے قال تو یاں اقوال بھی ہے

محلِ صلِ علیٰ ڈاک و تار کی ہے روش
اگرچہ دل میں نہاں عظمتِ رسول بھی ہے

جگہ بھی ملتی ہے کونسل میں آنریبلی کی
جو التماس ہو عمدہ تو وہ قبول بھی ہے

طرح طرح کے بنالو لباس رنگارنگ
علاوہ روئی کے ریشم بھی اور وُول بھی ہے

چمک دمک کی وہ چیزیں ہیں ہر طرف پھیلی
کہ آنکھ محو ہے خاطر اگر ملول بھی ہے

اندھیری رات میں جنگل میں ہے عیاں انجن
کہ جسکو دیکھ کے حیران چشمِ غول بھی ہے

شگفتہ پارک ہیں ہر سمت رہرونکے لئے
نظر نواز ہے پتّی حسین پھول بھی ہے

جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو ہرج کیا ہے جو ساتھ اُسکے ڈیم فول بھی ہو

خطّۂ پنجاب

انتخابِ ہفت کشور خطۂ پنجاب ہے
پانچ دریاؤں سے جس کی سرزمیں سیراب ہے

اِسکی سرسبزی و شادابی و رونق پر گواہ
راوی و ستلج بیاس و جہلم و چناب ہے

مشکبو اسکی ہوائیں مشکبار اسکے چمن
منظر اسکا دلفریب اسکی فضا نایاب ہے

بسکہ تا حدِ نگہ ہے سبزہ و گل کا ہجوم
پہلوئے نظارہ وقفِ بسترِ سنجاب ہے

سینچنے کو نور کے پانی سے اسکی کیاریاں
روز اُبلتا چشمۂ خورشید عالمتاب ہے

خاک میں اکسیر اور پانی میں امرت کا اثر
حبذا کیا خاک ہے اور مرحبا کیا آب ہے

اشتیاق اسکا ہے طوقِ گردنِ اہلِ وطن
اُلفت اسکی سرمۂ چشمِ اُولوالالباب ہے

نعمتیں اس کی ہیں ذوق افزائے کامِ اہلِ ہند
جسکو دیکھو اسکی شیرینی سے لذت یاب ہے

زندہ دل وہ لوگ ہیں رہتے ہیں جو اس دیس میں
سید احمد خاں کا یہ بخشا ہوا القاب ہے

پہاڑ کا منظر

اے خدا کی قدرتوں کے منظرِ زیبا پہاڑ
اے خدا کی صنعتوں کے خلعتِ زیبا پہاڑ

دیکھکر تیری بلندی ہیں اُترتی پگڑیاں
تیری رفعت کے مقابل سرنگوں ہے آسماں

تیری ہیبت دیکھکر بس دل پہ چھا جاتا ہے رعب
دل ہیں ہیبت ناک صورت لیکے بھاتا ہے رعب

تیرا استقلال سے رہنا تعجب خیز ہے
تیرا ہلنا تیری جنبش بھی بلا انگیز ہے

تجھ میں پنہاں ہے خدا کی عظمت و قدرت کا راز
ہے عجب تیرا نشیب اور ہے عجب تیرا فراز

کالے کالے بادلوں کا گھر کے آنا روز و شب
بھرکے دریاؤں کے دریا پانی لا لا روز و شب

وہ گھٹاؤں کا اُمڈنا اور بجلی کے تڑاکے
وہ ہواؤں کا خرامِ ناز پھولوں کی بہار

آہ عاشق بنکے چڑھنا آسماں پر ابر کا
چشمِ عاشق کی طرح رونا جہاں پر ابر کا

وہ درختوں کی قطاریں اور وہ پھولوں کا رنگ
بادہ نوشوں کے دلوں میں بادہ نوشی کی ترنگ

جام مے مینا و ساقی وہ بہارِ خطر بار
چشم عاشق اور جمالِ رُوئے یارِ گلعذار

وہ شعاعِ آفتاب اور صاف پانی کی چمک
تارِ زریں مہر کی شفاف پانی کی چمک

آب تازہ کی روانی اور اس کی آب و تاب
منظرِ زریں دکھاتی ہے شعاعِ آفتاب

نالیاں ہیں گر زمرد کی تو پانی سیم خام
جدولیں ہیں سبز دیبا کی روپہلی اُنپہ کام

تختۂ دیبا پہ ہم پیچ لونگی گلکاری کہیں
سبزہ زارِ کوہ پر یا صنعتِ باری کہیں

چار سوئے کوہ تا حدِ نظر سرسبز ہے
ہے نظر سرسبز چشمِ دیدہ ور سرسبز ہے

یہ اُڑا جاتا ہے بادل روئی کا گالا ہے کیا
یہ جو ہے برقِ تپاں آتش کی پرکالہ ہے کیا

تھی ابھی ظلمت ابھی ظلمت میں پیدا نور ہے
جلوہ دہ زلفِ سیہ میں تابِ روئے حور ہے

آب تھمے سینۂ جوئے رواں لبریز ہے
آبِ زر سے گل کی دامانِ جہاں زرخیز ہے

رحمتِ حق اسکے بندوں کے لئے ہے موجزن
صنع و قدرت جہانِ کوہ پر پرتو فگن

ہم کہاں اور کوہ کے یہ منظرِ زیبا کہاں
سبزہ زارِ کوہ کے یہ خلعتِ دیبا کہاں

کلفتیں سب مٹ گئیں سب کھل گئے دل کھل گیا
گلشنِ اُمید میں اک آ گئی تازہ بہار

آمد وجے دل میں شانِ دلکشائی آ گئی
عقدۂ دشوار میں مشکل کشائی آ گئی

حضرتِ دل ہو گئے اب تو تمہارے غم غلط
کر دیئے قدرت نگاری نے وہ سارے غم غلط

ہیں یہ ساری رحمتیں آقائے گیہان کی طفیل
دولت جم مرتبت احمد علیخاں کے طفیل

[illegible]

ثاقب آقا کے لئے ہر دم دعا کرتے رہو
روز و شب صبح و مسا شکرِ خدا کرتے رہو

سلہ ہز ہائی نس حضور نواب احمد علیخاں بہادر دام اقبالہ والی ریاست مالیر کوٹلہ کیطرف اشارہ ہے۔ جناب ثاقب حضور ممدوح کے اہل دربار میں ہیں اور انکے ہمرکاب سیر کوہسار کیلئے تشریف لے گئے تھے۔ یہ اشعار اس سیر کا نتیجہ ہیں ۔۔

ماریاسمین

آ! کلیجے سے لگا لوں تجھکو مارِ یاسمیں
ہیں کسی گیسو کے خم تجھ میں۔ کسی اژدر کی ہیں

یہ قیامت کی شکن۔ اور یہ بلا کے پیچ و خم
آہ! کس کافر ادا کی تو ہے زلفِ عنبریں

ہے ترے حسنِ سیہ سے دل کو اک دل بستگی
قیس میں ہوں۔ آہ! تو ہے لیلیٰ محمل نشیں

آہ! ظالم۔ اُف ری! تیری گرمیِ جانسوزِ حسن
دل کو پھونکے دیتی ہے تیری نگاہِ آتشیں

مجھ کو وہ لذت ہے ملتی آہ! تیرے زہر میں
میں سمجھتا ہوں کہ ہے تیری زباں میں انگبیں

شب کو بانبی سے دلہن بنکر نکلتا یوں ہے تو
بال کھولے گھر سے نکلے جیسے کوئی مہ جبیں

گرمیوں میں جیسے صندل ہے حسینوں کو پسند
ڈھونڈھتا پھرتا ہے یوں ہی تو بھی شاخِ صندلیں

پھن اُٹھا کر آہ! مستی میں وہ لہرانا ترا
جیسے ہو جوبن کی متوالی کوئی ناز آفریں

سبزہ زاروں میں ہے شب کو اک عروسِ بے نقاب
دن کو بانبی میں ہے تو اک شاہدِ پردہ نشیں

او فسوں گر! آہ! ہوں میں کشتۂ زلفِ دراز
مجھ کو ڈس لے تیرے ڈسنے کا مجھے شکوہ نہیں

تجھ سے میرے گیسوؤں والے کی ملتی ہے ادا
میری نظروں میں تو ہے تُو سو حسینوں کا حسیں

او ستمگر! آہ! کب کالا سمجھتا ہوں تجھے
میں تو اپنا گیسوؤں والا سمجھتا ہوں تجھے

طولِ شبہائے جدائی تو ہے۔ یا زلفِ دراز
تجھ کو ظالم! اپنے قامت کی درازی پر ہے ناز

اک ادائے عشق بھی مضمر ہے تیرے حسن میں
تو وہ نیرنگِ فسوں ہے آہ! او عشوہ طراز

مہ وشوں کی شامِ خلوت میں ہے تو زلفِ سیاہ
اور شبِ غم میں ہے دُودِ نالہائے جانگداز

کر دیئے گل آہ! کتنے قلبِ سوزاں کے چراغ
تیری آنکھوں نے کئے کیا کیا درِ فتنہ نہ باز

مرنے والے کیوں نہ جی اُٹھیں تیری آواز میں
بین کے نغموں کی ہے ظالم! صدائے جاں نواز

پاؤں میں پڑتا جو میرے بنکے تو زنجیرِ عشق
اپنی زلفوں پر نہ ہوتا گیسوؤں والوں کو ناز

جب نظر آئے کسی گیسو میں تیری پیچ و خم
مجھ پہ ظالم! کھل گیا دل کی گرفتاری کا راز

ہوں اسیرِ زلف۔ ہاتھوں پر کھلاؤں آ! تجھے
میں نہیں ہوں شیوۂ رسمِ وفا سے بے نیاز

میری نظروں میں ہیں دونوں مار گیسو آہ ایک
دے نہ دھوکا آہ! مجھ کو تو نگاہِ امتیاز

ٹوٹ بھی جا اے طلسمِ دامِ ہستی ٹوٹ جا
اٹھ بھی جا آنکھوں سے تو اے پردۂ عشقِ مجاز

دوست دشمن میں رہی باقی نہ تا مجھ کو تمیز
کھینچ دے تصویرِ یکرنگی۔ دلِ آئینہ ساز

میں سمجھ کر تا کسی کافر کی زلفِ عنبریں
آستیں میں اپنی پالوں آہ! ماریاسمیں

سرور جہان آبادی

ناطقہ

بیاں کیا کروں تجھ سے اعجازِ نطق
کہ ہوں بسملِ طرزِ اندازِ نطق

عجب راز ہے قوتِ ناطقہ
اک اعجاز ہے قوتِ ناطقہ

تنزل کے آثار اس سے عیاں
ترقی کے اسباب اس میں نہاں

یہی زندہ تاریخ دنیا کی ہے
یہی شرحِ آثارِ عقبیٰ کی ہے

یہ ہے روح کی سلطنت میں سفیر
زباں ہے خزانہ کی جس کے وزیر

اسی سے ہوا بند کسبی کا نام
ملا اس سے اک دوسرے کو پیام

یہی منبرِ وعظ پر خطبہ خواں
یہی پیکرِ علم و معنی کی جاں

یہی تو ہے وہ دلبرِ شوخ و شنگ
اداؤں پہ ہے جس کی خود عقل دنگ

بتوں کو بہت اس کی حسرت رہی
ہمیشہ مگر اس کو نفرت رہی

کبھی دل پہ عشاق کے نیشتر — کبھی مرہم زخمہائے جگر
کبھی نالۂ صور کی ہم نوا — کبھی شور محشر کی یہ ہم صدا
انا الحق کا نغمہ کبھی زیر لب — کبھی ہے انا العبد سے مست یہ
کبھی جام تلخابۂ زہر ہے — کبھی کوزۂ سمّیِ قہر ہے
دم غیظ اگر ہو یہ آتش فشاں — قیامت ہے اک الاماں الاماں
ہے فہرست آثار دنیا یہی — ہے فرہنگ شرح تمنا یہی
لغت دان جملہ علوم جہاں — زباں دان اسرار کروبیاں
مہیا کن پیکر واہمہ — "تلفظ سے صورت گر واہمہ
ہوئی محنت چارہ گر رائگاں — بھرا آجتک تو نہ زخم زباں
حکیم الٰہی جو لقمان تھا — بہت اس کی صنعت پہ حیران تھا
یہ قول اُس کا ہے آجتک یادگار — جو ہے مظہر صنع پروردگار
ہیں قدرت کے جتنے خزائن نہاں — کلید اُن کی انسان کی ہے زباں
اسی سے مسیحا مسیحا ہوئے — اسی نطق سے مردے زندہ ہوئے
صدا قُم کی اس نے سنائی جہاں — وہیں جسم خاکی میں پھر آئی جاں
ذرا غور کر اسکی صنعت پہ تو — ذرا فکر کر اسکی حکمت پہ تو
دکھائی ہے کس نے تجلیٔ طور — یہ تھا قوت ناطقہ کا ظہور
کوئی جاکے موسیٰ سے پوچھے ذرا — خطاب کلیم آپ کو کیوں ملا
کبھی اسکو ذوق عبادات ہے — کبھی محو کشف و کرامات ہے
جہاں میں یہی مبداء خیر و شر — یہی ہے بہشت اور یہی ہے سقر
اسی میں تو قوت ہے تسخیر کی — بیاں کس سے لذت ہو تقریر کی
یہی نطق ہے وحی رب قدیر — نہیں یاد ما ینطق اے خبیر

یہ معروف ہے قول زردشت کا / زباں اسکی قدرت کا ہے معجزا
اسی سے ہے دُنیا کی نظم و نسق / ہر اک لے رہا ہے اسی سے سبق
تماشائے نیرنگِ دُنیا بھی ہے / یہ قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی ہے
اسی سے سب آثار غیبی کھُلے / طلسماتِ اسرار غیبی کھُلے
ہیولے کو ملبوس صورت دیا / ہر اک شخص کو درس حکمت دیا

قول ارسطو

ارسطو کا یہ قول مشہور ہے / کہ جو شارحِ رازِ مستور ہے
زباں ہے وُہ اِک آلۂ بے عدیل / عیاں جس سے قدرت کی جر ثقیل
ارے نطق ہر حرف و فقرہ ترا / بسائط میں داخل ہے مثل ہوا
تری آفرینش پہ صانع کو ناز / ترا قول قانونِ حکمت کا راز
کبھی تلخیِ پندِ ناصح ہے تو / کبھی باہمی صلح کی گفتگو
کبھی تجھ میں دُشنام کی لذتیں / ٹپکتی ہیں تجھ سے کبھی حسرتیں
کبھی تیغِ بُرّاں کبھی ہے سپر / کبھی نغمہ ریز اور کبھی نوحہ گر
کبھی درس آموزِ عرفاں ہے تو / کبھی باہمی صلح کی گفتگو
کبھی گرم افسانۂ راز و نیاز / کبھی حجلہ آرائے راز و نیاز
کبھی سازِ مطرب سے تو ہم نوا / کبھی چاشنی گیر لحن و غنا
کبھی اپنی جودت سے خودمست ہے / کبھی اپنی مدحت سے خودمست ہے

معانی پرستوں کے ہم داستاں
عزیزِ سخن سنج کے ہم زباں

مرزا محمد ہادی عزیزؔ لکھنوی

زندگی

یہ نظم امریکہ کے مشہور مصنف اور انگریزی کے جادو نگار شاعر لانگ فیلو کی انگریزی نظم "سام آف لائف" کا ترجمہ ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع لفظی ترجمہ ہو اور مطلب بھی ادا ہو جائے۔

(علی الدین عجز۔ بدایونی)

کیوں دردناک لفظوں میں کرتے ہو یہ کلام — انساں کی زندگی کا ہے خواب و خیال نام
جس خفتہ بخت سے نہ ہو تفریق اصل و نقل — ۱ سمجھو تم اس کی رُوح کو مُردہ ہے لاکلام

ہے زندگی قدیم گنواؤ نہ اسکو مفت — مرنے کو یہ نہ سمجھو کہ ہے اُسکا اختتام
تو خاک سے بنا ہے ملیگا تو خاک میں — ۲ تھا جسم کے لئے نہ کہ یہ رُوح کو پیام

منشا ہماری زیست کا یہ ہی فقط نہیں — رنج و خوشی کے ہو رہیں اور کچھ کریں کام
ہر روز بلکہ شغلوں میں ایسے لگے رہیں — ۳ جن سے ترقیات زیادہ ملیں مدام

کرنا بہت ہے کام مگر وقت ہے قلیل — دل میں ہمارے گو نہیں خوف و خطر کا نام
تاہم دُہل کی طرح دھڑکتے ہیں دم بدم — ۴ اور موت کی خبر ہمیں دیتے ہیں صبح و شام

دُنیا کو سمجھو جنگ کا میدان دوستو — اور اس کے عیش جانو ہیں آرام کا مقام
تقلید چاہو تم نہ بہائم کے طور پر — ۵ مردوں کی مثل شوق سے خود ہو شریک لام

آئندہ وقت پر نہ بھروسہ کرو کبھی — گذرے ہوئے زمانہ پہ بھیجا کرو سلام
لیکر خدا کا نام کرو حوصلہ بلند — ۶ موجودہ وقت کام میں لاؤ بعد نظام

بتلا رہے ہیں ہم کو بزرگوں کے واقعات — ہم بھی بنیں زمانہ میں یکتا و شاد کام
اور کام ہوں [illegible] کہ جو مرنے کے بعد بھی — ۷ قائم رہیں جہان کا جب تک ہے قیام

تاگر کسی [illegible]ریز کا دُنیا کے بحر میں — ق ڈوبے جہاز اور نہایت ہو مستہام

یعنی جو آگیا ہو زمانہ کے پھیر میں — یہ واقعات دیکھ کے حاصل کرے مرام
پس ہو کے مستعد رہیں مصروف کار ہم — نقصان و فائدہ کا مقدر سے ہے کام
جب تک کہ اسکو پورا نہ کرلیں نہ چھوڑیں ہم — محنت اٹھائیں صبر کریں عجز ہم مدام

نیکی

کون کہتا ہے زمانہ ہی نہیں نیکی کا — رائگاں جاتا ہے برتاؤ کہیں نیکی کا
بدسلوکی کو نہیں اب تہِ افلاک فروغ — دور دورہ ہے اب اے ماہ جبیں نیکی کا
راستی منکسر النفسی و صبر و تہذیب — آج دم بھرتا ہے ہر ایک حسیں نیکی کا
خوف حق - پیرویِ راہبرانِ کامل — ہے یہی مذہب و ملت یہی دیں نیکی کا
دور پھر رہتی ہے ہر ایک برائی اس سے — کرلیا جس نے سبق ذہن نشیں نیکی کا
لبِ انصاف سے آئیگی صدا محشر میں — خلد اس کا ہے مکاں جو ہے مکیں نیکی کا
بیوقوف آپ ہیں نیکوں کو کہیں جو احمق — مرتبہ جانتے ہیں اہلِ یقیں نیکی کا
اپنے پردہ کا جو منظور ہے پردہ رکھنا — دھیان ہر دم ہے اسے پردہ نشیں نیکی کا
نیکی نیکی تو کہا کرتے ہیں منہ سے لیکن — حیف کرتے نہیں کچھ کام ہمیں نیکی کا
رائگاں ساری عبادت ہے ریاضت بیکار — کرسکیں گر نہ عمل گوشہ نشیں نیکی کا
قول یہ اور ترا عرض یہ کس کام کا ہو — مادہ تجھ میں نہیں چرخِ بریں نیکی کا
دولت و زر کی تمہارے نہیں ہمکو پروا — منعمو! رکھتے ہیں ہم نقش نگیں نیکی کا
کون مذہب نہیں کہتا کہ برائی سے بچو — مرتبہ ثابت ہے یہ آیات مبیں نیکی کا
جو برائی کرے اس سے بھی بھلائی کیجے — حکم ہے اہلِ جہاں کو ہے کہیں نیکی کا
کوئی جھگڑا نہ رہے - گر کریں آپس میں سلوک — اہلِ زر، اہلِ زماں، اہلِ زمیں نیکی کا

رحم و الطاف ہیں نیکی کے لئے سینہ سپر کر نہیں سکتا ہی کچھ غضب کبھی نیکی کا

گر چھٹے شاہدِ اقبال بلا سے چھوٹے
چھوڑنا ساتھ نہ اے بخت کہیں نیکی کا

بخت اکبر آبادی۔ از لکھنؤ

تازہ غزلیں

(از حضرت حفیظ جونپوری)

ٹھہر اب کونسی دن میں پرسش مظلوم ہوتی ہی
یہ سمجھا تا ہوں جب حسرت مری مغموم ہوتی ہی

یہی کہہ کہکے میری خاک پر لاتے اُسے ہمدم
اُدھر دیکھو کسی کی قبر وہ معلوم ہوتی ہی

وفا کا ذکر جب آتا ہی پہروں ہاتھ ملتے ہیں
وہاں اب یاد تیری لئے دل مرحوم ہوتی ہی

یہی جی چاہتا ہی منہ چھپا کر روئے پہروں
طبیعت خود بخود ایسی کبھی مغموم ہوتی ہی

وفاداروں سے نفرت ہی تو پھر دیکھی وفا تمنے
حسینوں میں تو سنتا ہوں یہ شی معدوم ہوتی ہی

یہاں تو بیچکر گھر جشن جمشیدی مناتے ہیں
بہار آتے ہی دستاویز اک مرقوم ہوتی ہی

ابھی سے ہی یہ عالم تو خدائی کا خدا حافظ
جدھر سے تم گذرتے ہو اُدھر اک دھوم ہوتی ہی

مری باتوں ہی پر برہم ہو گیا تو بھی تو اے ناصح
نصیحت ہو کسی کی بھی بری معلوم ہوتی ہی

حفیظ اک عمر اس فن میں پڑا ہے خون دل پینا
بڑی مشکل سے دنیا میں سخن کی دھوم ہوتی ہے

(از جناب سید حیدر حسن صاحب احسن لکھنوی)

عجب میں عالم ایجاد میں مشکل پسند آیا کہ جو آیا نظر سب کے سامنے وہ دل پسند آیا

بھری محفل میں جب وہ رونقِ محفل پسند آیا
بہت مشکل سے قابو میں دلِ مشکل پسند آیا

کیا در پردہ رسوا گرمئ سوزِ محبت نے
پسینہ کس لئے اے لیلیٰ محمل پسند آیا

فراقِ یار میں مژگاں تک آ کر تھم گیا آنسو
مسافر کو تماشائے لبِ ساحل پسند آیا

کلیجہ سے لگا کر اسکو اپنے ساتھ لایا ہوں
ازل میں آپ کے قابل مجھے جو دل پسند آیا

مرادیں سب بر آئیں ہر تمنا ہو گئی پوری
ہمیں جب مدعائے سعیِ لاحاصل پسند آیا

مبارک غیر کو ہو آرزوئے رسمِ دلجوئی
کہ اس بیدرد کو شغلِ شکستِ دل پسند آیا

دعائیں مانگتا ہوں زیرِ خنجر اپنے جینے کی
خدا جانے مجھے کیا کیا دمِ بسمل پسند آیا

عزیز و آبر کی خاطر ہمیں منظور ہے احسن
اگر انکو طریقِ غالبِ کامل پسند آیا

(از مولوی سید محمد حسین صاحب شوق سہارنپوری)

پاؤں نجات مر کے شبِ انتظار میں
یہ بھی مگر نہیں ہے مرے اختیار میں

کچھ اور بھی ہے دم ترے خنجر میں دیکھ تو
باقی ابھی ہے جان ترے جاں نثار میں

اچھی تسلیاں ہیں یہ بیتابِ عشق کی
لیتے ہیں چٹکیاں دلِ امیدوار میں

سایہ پڑا ہے کیا مرے بختِ سیاہ کا
ایسی نہ تیرگی تھی شبِ ہجرِ یار میں

دیدوں میں جان بھی تو نہ وہ مرحبا کہیں
دل کس حساب میں ہے جگر کس شمار میں

شاہد خیالِ یار ہے اسکا کہ صبح تک
جھپکی نہیں ہے آنکھ شبِ انتظار میں

وارفتہ یوں ہوئے تھے نہ مرغِ چمن کبھی
شاید ہے بوئے یار نسیمِ بہار میں

بلبل کو ذبح کر کے کیا باغباں نے قہر
دھبہ لگا یا حسنِ عروسِ بہار میں

دیکھو مٹا کے شوق کو پچھتاؤ گے بہت
شیدا نہ اس سا ایک ملے گا ہزار میں

(از میر ولی اللہ صاحب بی۔ اے)

ہاتھوں میں اب تو خنجر خونخوار بھی نہیں — قبضہ میں اپنے مطبع و اخبار بھی نہیں
طوفانِ دہر نے اسے ایسا کیا خراب — گلشن میں ہرے گل بھی نہیں خار بھی نہیں
عظمت ہی ایک ہوتے ہیں۔ اپنا یہ حال ہے — ہمنوا و فریق ہیں دو چار بھی نہیں
بنتی ہے قوم علم سے دولت سے اور ہم — اہلِ سکول و صاحبِ بازار بھی نہیں
محنت کرو تو غیر کے محتاج کیوں بنو — سروس نہیں تو جانے بھی دو یار بھی نہیں
ڈنکا تھا شش جہات میں عظمت کا جن کی کل — ایسے مٹے کہ باقی اب آثار بھی نہیں
آئے تجھے اب ہی ساحلِ دریائے عمر پر — یارب کہاں ہیں پار ہیں وار بھی نہیں
لاکھوں ہیں جن کو یاد ہے یہ گر معاش کا — کچھ بھی نہیں تو گدیہ و بیکار بھی نہیں

کیا لطف اس غزل میں ولی آپ ہی کہو
اس میں تو حسن و عشق کا اظہار بھی نہیں

تمنا ہے تجھے آنکھوں سے اے آرامِ جاں دیکھوں — اِدھر دیکھوں اُدھر دیکھوں یہاں دیکھوں وہاں دیکھوں
نہ بالائے زمیں دیکھوں نہ زیرِ آسماں دیکھوں — نگاہیں وہ عنایت کر فرازِ لامکاں دیکھوں
کہوں کس سے ملوں کس سے مصیبت سی مصیبت ہے! — نہ جب ہمدم کوئی دیکھوں نہ کوئی رازداں دیکھوں
اجازت دے ذرا صیاد جا کر آشیاں دیکھوں — وہاں کے ساکنیں دیکھوں وہاں آزردیاں دیکھوں
کہاں تک نفسِ بد! تیری یہ نافرمانیاں دیکھوں — چھڑاؤں کیوں نہ دامن جب تجھے آزارِ جاں دیکھوں
بنا جس میں ہو ناپیدا کوئی ایسا مکاں دیکھوں — کہاں ممکن اگر خورشید صورت سب جہاں دیکھوں
بناؤں کونسی ڈالی پہ اے دل آشیاں اپنا — فلک پر تاک میں بیٹھی ہوئی جب بجلیاں دیکھوں

جلا دوں خرمنِ ہستی کو خاکستر بنا ڈالوں
اگر اس حسنِ عالم سوز کو طورِ طپاں دیکھوں

مخزن ایجنسی کی عمدہ کتابیں

منتخبات [illegible] مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا (ایڈیٹر مخزن) پہلا ایڈیشن بکے صرف چند نسخے [illegible]

بچوں کا [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کا انتظار کرنا پڑیگا - قیمت [illegible]

[illegible] مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ - قیمت [illegible]

ناول [illegible] مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن [illegible]

[illegible] - مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن - [illegible]

[illegible] خراسانی رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے - مولوی [illegible] دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے اسکو اُردو میں ترجمہ کیا ہے - [illegible]

مکتوبات آزاد - اُردو زبان کے محسن شمس العلماء آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ بالتصویر -

کلام نیرنگ - سید غلام بھیک نیرنگ بی - اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن -

انتخاب مخزن - مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب - - .. قیمت [illegible]

درد جانستاں - مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی، دہلی کی [illegible]

دربار نمبر - دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا [illegible]

مثنویات میر حسن - مثنوی بے نظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کر کے [illegible]

سیرت [illegible] - انگریزی کتاب [illegible] کا بامحاورہ ترجمہ اور [illegible] کے متعلق معلومات کا ذخیرہ [illegible]

مرقع [illegible] - [illegible] کی ابتدائی [illegible] جسکو منشی فضل الہٰی صاحب مرغوب رقم لاہور نے [illegible] نہایت [illegible] کاتبوں اور شائقین خط کے واسطے تیار کیا - جسکو دیکھ [illegible] خط کے [illegible] تمام [illegible] سمجھ میں آسکتی ہیں علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب مصنف نے اسکے اہتمام میں [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تو اس کی اصلی قدر و قیمت ملک میں [illegible] نہیں بغیر منشی صاحب [illegible]

درخواستیں [illegible] مخزن - لاہور کے نام آنی چاہئیں -

بڑکی مُہر اور مُہر کنی کا مشہور و معروف کارخانہ

راستی موجب رضائے خداست
کس ندیدم کہ گم شد از رہ راست

عالی یوں تو ہندوستان میں ربڑکی مُہر اور مُہر کنی کے بہت سے کارخانے ہیں مگر یہ کارخانہ
سیس سال سے نہایت صفائی اور دیانتداری سے کام کرتا ہے اس کارخانے نے بڑے بڑے رئیسوں
اہوں کے کام بنا کر سندیں حاصل کی ہیں اور اس کارخانہ میں سب قسم کا کام اور سب زبانوں میں یا
ی گورمکھی ناگری۔ ہندی۔ بنگلہ۔ فارسی۔ عربی۔ انگریزی میں بہت صفائی کے ساتھ بنایا جاتا
ہے اور ہر چیز مثلاً چاندی۔ لوہا۔ پیتل۔ پتھر۔ لکڑی پر کھدائی بہت عمدہ ہوتی ہے۔ اور ہر قسم
ے بلاک بھی بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں اور مونوگرام اور سلطانی طغرائے وغیرہ لوہے
ڈوالی پر بہت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ عقیق کی مُہر کی قیمت ایک نام کی اعلیٰ درجہ کی معہ
نگشتری چاندی کے (عا) اور معمولی درجہ کی معہ انگشتری چاندی کے (عہ)

ربڑکی مُہریں بھی نہایت عمدہ تیار ہوتی ہیں

جنکی قیمت اعلیٰ درجہ کی (عا) معہ سامان معمولی درجہ کی (عہ) اور روزمرہ تاریخ بدلنے والی
ربڑکی مُہر کی قیمت معہ سامان (مہ) اور وہ مُہر ربڑ جو خود سیاہی لیکر چھپتی ہے
معہ سامان (عہ) اور ربڑکی مُہر معہ انگشتری چاندی کے بغیر سامان پنسل (عہ)
پنسل والی ربڑکی مُہر ۱۲ بغیر سامان علاوہ ہمارے کارخانہ میں ہر رنگ کی ربڑکی
مہریں سیاہی معہ انگوٹھا لگانے کے بکس و ربڑ کے حرفوں کے بکس و بلو بلیک سیاہی
غرض سب سامان مل سکتا ہے

المشتہر

احمد بیگ مُہر کن و ربڑ سٹامپ میکر چاندنی چوک دہلی

ترقی اردو

کی

جو کوشش رسالہ ادیب الٰہ آباد کے ذریعہ سے شروع کی گئی ہے وُہ ہر علم دوست کی اعانت اور سرپرستی کی مستحق ہے۔ اس میں علاوہ ان ادبی مضامین کے جو مسلمہ قابلیت کے اہلِ قلم سے لئے جاتے ہیں اور ہندو مسلمان مرد و عورت ہر فرقے ہر طبقہ کے لئے یکساں خوشگوار ہوتے ہیں۔ ہر مرتبہ ایک اعلیٰ درجہ کی رنگین اور سات عکسی تصاویر بھی دیجاتی ہیں۔ جن میں مشاہیر حضرات کے فوٹو تاریخی عمارات کے نقشے اور آثار قدیمہ کے مرقعے ہوتے ہیں۔ سائز ماڈرن ریویو وغیرہ انگریزی رسالوں کے مطابق ہے اور کاغذ وغیرہ بھی بعینہٖ ویسا ہی عمدہ اور چمکدار لگایا جاتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ

ادیب عُمدہ سے عُمدہ انگریزی رسالوں سے ہمسری کر سکتا ہے

مضامین نظم و نثر کا اتنا سرمایہ ہر مرتبہ ہوتا ہے جو کئی روز تک پڑھنے کے لئے کافی ہے۔ باینہمہ **قیمت** سالانہ صرف چار روپیہ (للعہ) فی پرچہ ۶؍
نمونہ مُفت نہیں دیا جائے گا۔ مُلک کے تمام نامور اخبارات اور اہلِ الرائے نے بالاتفاق اس کوشش کی داد دی ہے۔

المشتہر

مینجر ادیب۔ انڈین پریس۔ الہ آباد

پانچ روپیہ کے لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شراکت غیرے مالک و مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپے تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فواید اور سفر طبیہ تجاتیہ سے محروم رہا ہے۔ تھیئے روح کیا چیز ہے روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بن جاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب جج اکرلی۔ این صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور روسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک پیدا کر کے ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی لاگ سے چاق و چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چٹ ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچروں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سائنٹیفکوں اور موجودہ ممتاز زمانہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور (۸۸۳) روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اس وقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کے بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت عامل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کامل ہے بے حد دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت افزا غذا ہے۔ یہ وہ قوی غذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ چہرے میں رونق آبداری حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔

قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (۲/۸)

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیاگر پروپرائٹر شفاخانہ عام لاہور سے طلب کرو۔

کیا واقعی سچائی نہیں ہے

تازہ شہادت
صاحب اسسٹنٹ کمشنر تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات کی جسقدر تعریف کیجائے کم ہے

خضاب عالمگیر
اسکی تعریف اس قدر ہی کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی ؏

مرشد افیون
اس عرق کے چار روزہ استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے درد وغیرہ درست نہیں قیمت ؏

دافع بواسیر
خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسّے بلا ضرر نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ بھر میں صحت کامل۔ قیمت ؏

ممیرے کا سُرمہ
دھند غبار جالا پھولا سرخی پڑوال۔ ککروں۔ رسونکا شرطیہ علاج ہے عینک کیلئے بیترین نسخہ آنکھوں کے جملہ امراض کیلئے اکسیر ہے فی تولہ ؏ خالص ممیرہ فی تولہ ؏

اکسیر الحیات
حلق سے اُترتے ہی فوراً کمزور اور مردہ اعضا پر اثر کرتی ہے۔

اکسیر الحیات
دل وجگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دُور کرکے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات
طاقت کیلئے بیترین ہے اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات
ضعف مثانہ کیلئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے۔

اکسیر الحیات
کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالحہ پیدا ہوتا ہے اور چہرہ کی بے رونقی اُڑ جاتی ہے چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دُبلے پتلے آدمی کو پر زور بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات کی ان گنت خوبیاں بیان میں نہیں آسکتیں۔ غرضکہ تمام امراض جسمانی کا حکمی علاج۔ فی شیشی ؏

تازہ شہادت
جناب شیخ فرزند علی صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات مسیحا سے بڑھکر مسیحا ثابت ہوئی ہے۔ آپکے علاج کا قائل ہوں۔

گلگونہ ترنجی
اگر آپ حسن اور حسن میں دلفریبی کا نشان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو ضرور گلگونہ ترنجی منگائیں یہ چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیل چھائیاں اور چھلے دُور کرکے رخسار مثل گلاب بنا دیتا ہے۔ حسن پرست احباب قدردانی فرمائیں۔ قیمت ؏

ہیر آئل خوشبودار
زندہ دل دوستو! ہم نے آپ کی خاطر ایک اعلیٰ اور خوشبودار ہیر آئل بنایا ہے جسکی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے۔ بالونکو نرم اور ملائم اور چمکدار بنانے کے علاوہ دردسر کو مفید ہے۔ دماغ کی کمزوری اور خشکی دُور کرتا ہے اور بالوں کو گرنے سے بچاتا ہے اور بڑھاتا ہے۔ قیمت ؏

صاف
لگاتے ہی اثر دُور خود علی خود قیمت ؏

ڈاکٹر محمد علی شفیع یافتہ ایل ایم ایس شفاخانہ اکسیر صحت شہر فیروزپور پنجاب

روغن [illegible]

[illegible] تمام انڈیا میں [illegible]

فائدہ (۱) جس کی تصدیق [illegible] آپ استعمال کرکے [illegible]

فائدہ (۲) [illegible] اس مرکب کے استعمال سے دور ہوگئے۔

فائدہ (۳) جسکی تصدیق [illegible]

فائدہ (۴) جسکی تصدیق [illegible]

فائدہ (۵) جسکی تصدیق [illegible]

فائدہ (۶) جسکی تصدیق [illegible]

فائدہ (۷) جسکی تصدیق [illegible]

فائدہ (۸) جسکی تصدیق [illegible]

[illegible]

پتہ حکیم [illegible] موچی دروازہ لاہور

قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ

[illegible] ایک [illegible] کا معجزہ [illegible] پاکستان
کو معلوم ہے [illegible] ایک نیا معجزہ [illegible]
[illegible] الصنعت جس کا [illegible]
[illegible] ہر صفحہ [illegible] درمیانی سطر ہے اور
[illegible] سطریں [illegible] صنعت [illegible]
[illegible] صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر سے
اوپر والی پانچوں سطروں کا [illegible] والی پانچوں سطروں سے مقابلہ
ہر صفحہ میں [illegible] حرف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں اسی
[illegible] والی سطریں [illegible] اور درمیانی [illegible]
[illegible] درمیانی [illegible] سطر ہے [illegible]
[illegible]

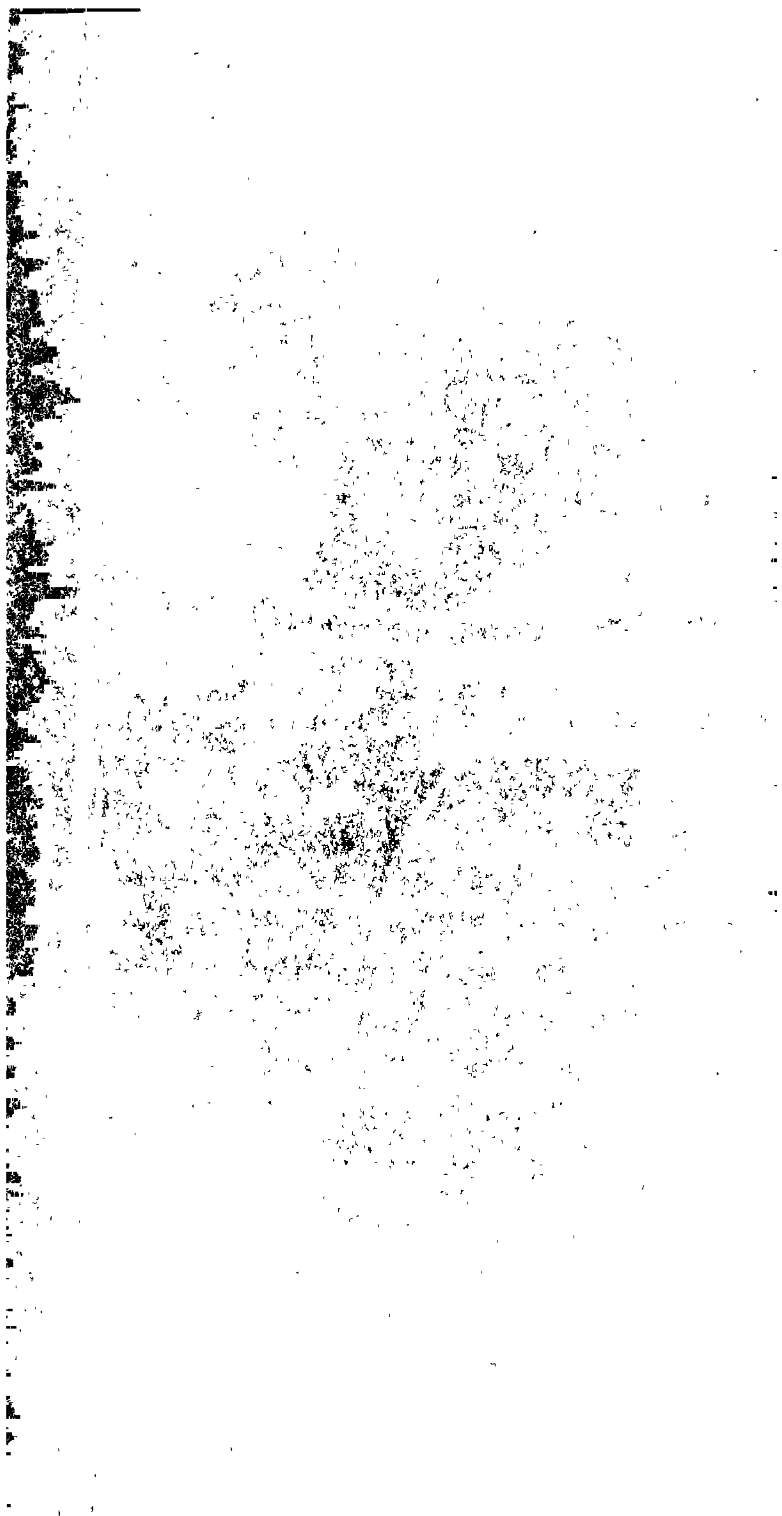
طب یونانی

جناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب [illegible]

[illegible] خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف [illegible] سب کی نظریں ان ہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے [illegible] خدمت گذار ہیں تو وہ ان ہی کی ذات سے ہیں اور ان ہی کے خاندان سے وابستہ [illegible] [illegible] کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور [illegible] کو ملک کی اس عظیم الشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ [illegible] انہی کی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی کاروبار کی [illegible] حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طب یونانی کی [illegible] سے بکو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں [illegible] جیسا کہ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز شناخت میں [illegible] کا مقصد ہر حصے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے [illegible] ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف روسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصلی [illegible] تیار ہوتے ہیں اور وہ اچھی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ کی آمدنی [illegible] مستقلا [illegible] جاتی ہے۔ نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی ادویہ [illegible] [illegible] اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں۔ صحت و تندرستی ایک [illegible] [illegible] کا [illegible] ہر لئے تمام ارباب وطن کو ان اعلیٰ اور [illegible] [illegible] بنی ہوئی [illegible] اور اس کے [illegible]

[illegible]

[illegible]







مخزن

خدمتِ قوم کے طریقے

خدمتِ قوم کے مختلف طریقے ہیں۔ اُن میں بعض مشکل ہیں بعض آسان کچھ دیر طلب ہیں کچھ زود اثر۔ کچھ بار آور ہیں کچھ بے ثمر۔ بعض طریقے ایسے ہیں جن میں شور و غل بہت ہو اور اصلی فائدہ کم۔ بعض میں شور و غل کم ہے اور ان کے نتائج بہت مفید ہیں۔ ہندوستان میں اوّل تو ابھی بہت تھوڑے سے لوگ ایسے ہیں جو یہ شوق رکھتے ہیں کہ خادمانِ قوم میں اُن کا شمار ہو۔ اور جو ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہیں جو لہو لگا کے شہیدوں میں ملنا چاہتے ہیں اور جن کی یہ خواہش ہو کہ محنت تو پڑے کم۔ مشکلات سے جہاں تک ہو سکے بچے رہیں۔ انتظار کی تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ لیکن یہ چرچا ہو جائے کہ ہم ملک و قوم کے خیر خواہ ہیں۔ کسی ملک میں خدمتِ قومی کا شوق کم ہونا یا سچے خادمانِ قوم کی تعداد محدود ہونا قابلِ افسوس تو ہے۔ مگر خطرناک نہیں۔ کیونکہ قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ مفید افرادِ قوم کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور جو کمی قومی خدمت کے شوق کی پہلے محسوس ہوتی تھی۔ اس کی تلافی ہوتی جاتی ہے۔ لیکن خادمانِ قوم میں ایسی اسپرٹ ہمت جاہت کا پیدا ہو جانا جو کام کئے بغیر مزدوری

مانگے اور اصلی خدمت کے بغیر صلہ کی طلبگار ہو۔ قوم کے مستقبل کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ کیونکہ یہ ایک ایسا میلان ہے جو قومی ہستی کو اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا جاتا ہے۔ اور قوم کے مجموعی کیرکٹر کو ناقص بنا کر اسے روز بروز پستی کی طرف لیجاتا ہے۔

ہمارے ملک میں قومی خدمت کا خیال ایک جدید خیال ہے۔ اور اس کو عمل میں لانے کی جو صورتیں مروج ہیں اُن میں سے اکثر مغربی دُنیا کے نمونہ پر مبنی ہیں۔ جو چیزیں انگریزی حکومت کے ساتھ ساتھ اس ملک میں آئی ہیں اور جنھیں انگریزی راج کی برکتوں میں شمار کرنا چاہئے۔ اُن میں خدمت قومی کا وُہ طریق ہے۔ جسے سوسائٹی یا انجمن قائم کرنا کہتے ہیں۔ یعنی کوئی کام جو ایک فردِ واحد سے نہ ہو سکے اس کے اہتمام کے لئے چند افراد جو اس کے مفید ہونے کے معترف ہوں اور ہم خیال ہونے کے سبب مل کر کام کر سکیں۔ جمع ہو جائیں اور جماعت کی برکت سے وُہ کام سرانجام ہو۔ اس نہایت کارآمد طرزِ عمل سے انگلستان کی حالت پر بیحد مفید اثر پڑا ہے اور اس کی آدھی ترقی اس اجتماعی قوت سے کام لینے کی بدولت ہو۔ ہمارے انگریز دوستوں نے تو اس دلچسپی کی وجہ سے جو وُہ ہمارے معاملات سے رکھتے ہیں یہ مفید اور مجرب نسخہ ہمیں بتا دیا۔ لیکن آفرین ہے ہم پر کہ اس کا ایسا غلط استعمال شروع کیا کہ اس کے فائدے نقصان سے مبدل ہو جاتے ہیں۔ "انجمن سازی" بجائے قومی قوت کے قومی ضعف بنتی جاتی ہے اور اگر انجمنیں اسی طرح بنتی اور بگڑتی رہیں اور محبت اور اتفاق کی جگہ عداوت اور نفاق کا سامان ہوتی گئیں تو یہ یاد رکھنا چاہئے۔ کہ جو نسخہ قوم کے ضعیف جسم میں قوت بھرنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ ایک دن وُہی اس کی ہلاکت کا باعث ہوگا۔

ہم بہت سے امُور میں انگلستان کی تقلید کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہماری انجمنوں اور سوسائٹیوں کے قواعد انگریزی سوسائٹیوں کے نمونہ پر ڈھالے جاتے ہیں

لیکن جو خیال وہاں تحریک عمل کرتا ہے۔ اس خیال کا وجود ہماری سوسائیٹیوں کے بانیوں میں کم پایا جاتا ہے۔ انگلستان میں ایک شخص جب اس خیال سے اُٹھتا ہے کہ اپنی قوم کو نفع پہنچائے۔ تو سب سے پہلے وُہ اپنے گرد و پیش نظر دوڑاتا ہے کہ کون کون سے کام ہیں جو اچھی طرح ہو رہے ہیں اور کون سا کام ہے جس کی طرف ابھی کسی نے توجہ نہیں کی۔ وُہ دیکھتا ہے کہ بہت سے کام خوش اسلوبی سے ہو رہے ہیں۔ مگر بہت سے ابھی ہونے باقی ہیں۔ اُن میں سے وُہ کوئی ایسی چیز اختیار کرتا ہے جس سے اس کی طبیعت کو خاص مناسبت ہو اور جس میں وُہ اپنی عمر بھر صرف کر دے تو اس کا جی نہ اکتائے۔ اس انتخاب کے بعد وُہ اپنے ہم خیال دوستوں سے مدد مانگتا ہے اور ایک چھوٹی سی جماعت قائم ہو جاتی ہے جو چپکے چپکے کام شروع کر دیتی ہے اور جب تک وُہ ایک درجہ کامیابی کا حاصل نہیں کر لیتی کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ پھر یہ نوبت آتی ہے کہ اس خیال کو عام کیا جائے اور پبلک سے مدد چاہی جائے۔ اخبار والے اور دیگر اہل الرائے جن کے ہاتھ میں جمہور کی باگ ہوتی ہے۔ یہ دیکھ کر کہ کام صحیح اصُول پر شروع ہوا ہے اور اس کا ذمہ لینے والوں نے کچھ کر بھی دکھایا ہے۔ خوشی سے اس سوسائٹی کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور وہاں کی فیاض خوش حال اور روشن خیال پبلک امداد پر جھک پڑتی ہے اور سوسائٹی کو مالی اور اخلاقی مدد دے کر بڑے پیمانے پر مفید اور کامیاب بنا دیتی ہے۔ برعکس اس کے ہندوستان میں "انجمن سازی" ایک خبط کے درجہ کو پہنچتی جاتی ہے۔ جسے دیکھو انجمن سازی کو بجائے قوم کے اُبھارنے کے اپنے اُبھرنے کا زینہ بنانے کی طرف مائل ہے۔ قوتِ فکر و تخیل میں کچھ ایسا ضعف آیا ہے۔ کہ کوئی نیا کام تجویز کرنے کی بجائے ہر شخص کا یہ میلان ہے کہ وُہی چیز اختیار کرے جو پہلے سے موجود ہو۔ فرض کیجیے

کسی ہمدردِ قوم نے کہیں ایک مقامی مدرسہ کھول رکھا ہو تو جو دُوسرا دعویدار ہمدردی قوم کا وہاں پیدا ہوگا۔ نوّے فیصدی یہ امکان ہے کہ وُہ بھی مدرسہ ہی جاری کرنا چاہیگا۔ اور دونوں مدرسوں اور دونوں بانیوں میں رقابت اور جدال کی بنیاد ڈالیگا۔ اگر کسی قدر دور اندیش ہُوا اور نئے مدرسہ کے قائم کرنے کی مشکلات اور صعوبتیں اس کے ذہن میں آگئیں تو وُہ پہلے مدرسہ کی کمیٹی میں شامل ہو جائیگا۔ مگر وہاں دنوں میں "دو بادشاہ در اقلیمے نہ گنجند" کی کیفیت پیدا ہوگی اور عُہدۂ سکرٹری یا عُہدۂ پریزیڈنٹ معاملہ متنازعہ فیہ بنجائیگا۔ کمیٹی ایک اکھاڑا ہوگی جس میں آدھے اہل شہر ایک طرف اور آدھے اہل شہر دوسری طرف مدّتوں لڑا جھگڑا کرینگے۔ ہماری چھوٹی بڑی انجمنوں اور سوسائیٹیوں میں یہ موادِ فاسدہ موجود ہے اور ابھی وُہ قائم نہیں ہونے پاتیں کہ یہ فسادات شروع ہو جاتے ہیں۔

ایک زمانہ میں ہم لوگوں کو یہ شکایت ہوتی تھی کہ ہمارے حُکّام وقت صرف اسی اعزاز کے قدردان ہیں جو وُہ خود ملک کے ممتاز اشخاص کو بخشتے ہیں اور اُن عزتوں کی قدر نہیں کرتے جو خادمانِ مُلک اپنی قوم سے خدماتِ قومی کے صلہ میں حاصل کرتے ہیں۔ اب کچھ عرصہ سے حکام نے اپنی روش کو ذرا بدلا ہے۔ اور وُہ بھی اُن اصحاب کی طرف قدرے متوجہ ہوئے ہیں جو خدمتِ قومی میں نام پیدا کر چکے ہیں۔ اس سے امید تھی کہ سچے خدمتگزار لوگوں کی ہمت بڑھے گی اور انہیں نظر آئیگا۔ کہ اُن کے لئے قوم کی شکرگزاری یا اپنے خالق کی خوشنودی کے علاوہ دُنیاوی اعزاز اور وجاہت کا صلہ بھی موجود ہے۔ مگر ہماری خوبیٔ قسمت۔ یہ تدبیر بھی اُلٹی ہی پڑتی نظر آتی ہے۔ حکّام کی توجہ ہوتے ہی۔ رقابتوں کی آفت اور ترقی کر گئی۔ بہت سے ایسے

اشخاص جو زری پری قومی خدمت کی طرف بھولے سے بھی رُخ نہیں کرتے تھے اور اپنا شوقِ جاہ طلبی حکام کی دلجوئی تک ہی محدود رکھتے تھے۔ حکام کی نگاہ اس طرف پھرتی دیکھکر زور شور کے ساتھ خدمتِ قومی کے میدان میں کود پڑے ہیں۔ اور اپنی تمام عادات جو پہلے جاہ طلبی میں استعمال کیجاتی تھیں اپنے ساتھ لائے ہیں۔ اب قومی مجالس میں یہ کوئی غیر معمولی نظارہ نہیں کہ ایک دوسرے کو دھکیل کر آگے کھڑا ہو جائے تاکہ لوگوں کی نگاہیں اُس پر پڑیں۔ شاید کہ حکام میں سے کسی کی نظر کیمیا اثر بھی اُن نگاہوں میں شامل ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ قومی جلسے بجائے قوم کے نبض شناسوں کے مشورۂ باہمی کے جلسے ہونے کے ایک دنگل ہو گئے ہیں۔ جن میں ہر پہلوان اپنا دم خم دکھاتا ہے اور اپنے داؤں پیچ سے ناظرین کو محظوظ کرتا ہے۔

قوم ایک طرف تو اس مشکل میں ہے۔ کہ وہ اس طریقِ خدمتِ قومی کے سوا کسی اور طریق سے آگاہ نہیں۔ ایسے لوگ تو بہت کم ہیں جو ان نقائص کو جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ دیکھ سکیں اور اُنکے متعلق اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکیں۔ وہ انہی قومی دنگلوں اور تماشوں کو قومی خدمت سمجھتے ہیں۔ اور انہی پہلوانوں کو قومی خادم۔ یہ سمجھکر بعض تو صرف اندھا دُھند اُن کی پیروی کئے جاتے ہیں۔ اور بعض بدظن اور بددل ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر یہ نہیں کرتے یا کر سکتے۔ کہ اس خرابی کی جو ہمارے قومی جلسوں اور ہماری انجمنوں میں راہ پا گئی ہے۔ اصلاح کریں اور انجمنوں کو مفید قومی کاموں کا حقیقی مرکز بنائیں۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہو گا کہ لوگ یہ سمجھنے لگیں کہ قومی خدمت کے بیشمار طریقے ہیں۔ ایک یہی نہیں کہ کوئی شخص کسی سوسائٹی کی بنا ڈالے۔ یا اس کا اعزازی عہدہ دار بنجائے۔ یا اس میں لکچر دے۔ یا جابجا قومی جلسوں میں شرکت کے لئے

تک پہنچے۔ یا چندہ جمع کرتا پھرے۔ یہ سب باتیں مفید ہیں اور ہوسکتی ہیں۔ اگر نیک نیتی سے کیجائیں۔ لیکن اگر صرف نمود کے واسطے یا اور ذاتی اغراض کے لئے ہوں۔ تو چنداں مفید نہیں۔ بلکہ بعض اوقات مضر بھی ثابت ہوتی ہیں۔ بہرحال یہ انجمنوں یا سوسائیٹیوں کے قیام کے لوازم ہیں اور اسی ایک صورتِ خدمت کے انواع ہیں جس کا ہمارے ملک میں زیادہ تر رواج ہے۔ اس کے سوا جو صورتیں قومی خدمت کی ہیں۔ جن سے لوگ کم آگاہ ہوتے ہیں۔ مگر جو مفید ہونے کے لحاظ سے کسی دوسری قسم خدمت سے کم نہیں۔ اُن کو پہچاننا اور اس قسم کے خادموں کی قدردانی کرنا۔ یہ بھی ملک اور اہل ملک کا فرض ہے۔ وہ صاحب جو خدمت کے خاموش طریقوں میں سے کسی پر کاربند ہیں۔ خود تو اس کی پروا نہیں رکھتے۔ کہ ملک اُن کی قدردانی کرے یا نہ کرے۔ مگر اُن کی قدرافزائی سے اور خادمانِ ملک کو ترغیب ہوسکتی ہے۔ کہ وہ بھی چپ چاپ ایسے طریقوں کو اختیار کریں۔ جن سے نفع تو زیادہ پہنچے اور چرچا کم ہو۔ یہ چرچا اور داد گو ترغیب و تحریص کے لئے ضروری اور فائدہ مند چیزیں ہیں۔ لیکن ان کا حد سے زیادہ رواج ہونا خلوص کو زائل کرتا ہے۔ اور ملک کو ضرورت ہے ایسے خادموں کی جو اپنا فرض اس لئے ادا کریں کہ وہ ان کا فرض ہے۔ نہ اس لئے کہ فلاں جماعت ہم سے خوش ہوگی۔ یا ایک خاص اثر ہم کو حاصل ہو جائیگا۔ یا حکام ہمیں صلہ و انعام دینگے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو کوئی لیکر بہشت کو

جو شخص اپنے کتب خانہ میں بیٹھکر مدت العمر میں ایک ایسی کتاب لکھتا ہے جسکے مطالعہ سے ہزاروں افرادِ قوم مستفید ہوتے ہیں۔ جس سے ملک کے

ذخیرۂ لٹریچر میں ایک مفید اضافہ ہوتا ہے اور جس سے کسی غیر ملک یا قوم کے پڑھنے والے کی نظر میں مصنف کی قوم کی نسبت اچھی رائے پیدا ہو سکتی ہو۔ ہماری رائے میں وہ شخص باوجود گوشہ نشین ہونے کے۔ اور باوجود اپنی سادگی وضع کے ایک سچا خادم قوم یا دُوسرے لفظوں میں محسن قوم ہے۔ جس کی خدمت کا شکریہ کافی طور پر ادا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح ایک عہدہ دار سرکاری جو اپنا فرض منصبی دیانت۔ محنت اور لیاقت سے ادا کرتا ہے۔ خاصکر اس نیت سے کہ اس کی قوم کی نسبت گورنمنٹ کی رائے اچھی ہو۔ اور آئندہ اس کے ہم قوموں کو زیادہ سہولتیں اور زیادہ ترقیاں ملیں۔ یا اپنے ادائے فرائض میں اپنی قوم کے افراد کو جائز فائدے پہنچانے کی طرف مائل رہتا ہو۔ ملک و قوم کے دلی شکریہ کا مستحق ہے۔ اور اس کا نام خادمان قوم کی معزز فہرست میں درج ہونا چاہئے۔ علیٰ ہذا القیاس وہ تاجر جو کوئی نیا صیغہ تجارت کا ڈھونڈ نکالتا ہے اور اس سے آپ بھی فائدہ اُٹھاتا ہے اور دُوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتا ہے۔ ملک کی ایک اعلیٰ خدمت کر رہا ہے۔ ایک شخص کسی دُوسرے ملک میں جاکر اقامت اختیار کرتا ہے۔ اس ارادہ سے کہ وہاں جو اس کے ابنائے وطن جائیں۔ انکی خدمت کرے۔ اور اپنی نیکی اور خوبی سے انہیں فائدہ پہنچائے۔ ملک کی خدمت میں مصروف ہے گو ملک سے باہر ہے اور گو اکثر اہل ملک اس کی خدمات سے ناواقف ہیں۔ کئی لوگ ہیں کہ عام جلسوں کے ذریعے سے نہیں۔ بلکہ خانگی طور پر گھر گھر جاکر اپنے ہمسائیوں اور دوستوں کو امور خانہ داری میں۔ تربیت اطفال کے متعلق یا تعلیم کے متعلق مشورہ اور امداد دیتے رہتے ہیں۔ یا ان میں پڑھنے لکھنے کا شوق پھیلاتے ہیں۔ یا انہیں کتابیں پڑھ پڑھ کر سناتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ حقیقت میں زیادہ خدمت کر رہے ہیں۔ بہت سے

اُن لوگوں کی نسبت جن کی تقریروں سے مجلسِ قومی کے ہال گونج رہے ہیں اور جن کے کارناموں کے تذکروں سے اخبارات پُر ہیں۔ وُہ اخبار نویس جو ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض اخبار نویسی انجام دیتا ہے اور جس کا مُدعا یہ ہے کہ مُلک میں واقفیتِ عامہ ترقی کرے۔ اہلِ مُلک روشن خیال ہو جائیں اور واقعاتِ عالم پر اُنکی نظر وسیع ہو۔ مُلک کے سچے بہی خواہوں اور خُدامِ وطن میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ خواہ کسی عام جلسہ میں ایک مرتبہ بھی لب کشا نہ ہوا ہو۔ اور کسی انجمن کے اراکین میں اس کا نام درج نہ ہو۔

غرض غور کرنے سے بے انتہا مثالیں ایسی خدمات کی جمع کیجا سکتی ہیں جو خواہ چھوٹے پیمانے پر ہوں خواہ بڑے پیمانے پر حقیقت میں قومی خدمات ہیں اور قوم کے دِلی شکریہ کا استحقاق رکھتی ہے اور ہر قوم کا جو ترقی کی آرزومند ہے۔ فرض ہے کہ وُہ سچے خادموں اور مدعیانِ خدمت کی شناخت حاصل کرے۔ اور صادق دوستوں کے دِل بڑھائے اور نرے دعویداروں کو جتا دے کہ وُہ اُن کے فریب میں نہیں آتی۔ اور یہ جان لے کہ انجمن اور چندہ اور سکرٹری اور پریزیڈنٹ۔ اور جلسہ اور وعظ گو نہایت مفید چیزیں ہیں۔ جنکے بغیر متمدّن زندگی خصوصًا زمانۂ حال میں ممکن نہیں۔ تاہم یہ خدمتِ قومی کی مختلف صُورتوں میں سے ایک صُورت کی علحدہ علحدہ شکلیں ہیں اور خدمتِ قومی اس سے بھی اچھی اچھی صُورتیں رکھتی ہے اور وُہ صُورتیں اپنی اپنی دلفریبیاں اور ادائیں رکھتی ہیں +

عبدالقادر

مسٹر خواہ مخواہ

ہز نگین رول پہ مسٹر خواہ مخواہ
کندہ ہے طغرا تمہارے نام کا

جون ۱۹۱۱ء کے پرچہ مخزن میں مسٹر خدائی فوجدار برادر معظم بالقابہ مسٹر خواہ مخواہ کا ذکرِ خیر ناظرینِ رسالہ پڑھ چکے ہونگے۔ خدائی فوجدار اور مسٹر خواہ مخواہ بالقابہ کا خاندان ہندوستان بھر میں ایک مشہور اور قابلِ تعظیم خاندان گنا جاتا ہے۔ چشمِ بد دور خدائی فوجدار پانچ بھائی ہیں ایک سے ایک اعلیٰ اور ایک سے ایک عجیب۔ حسب و نسب کے لحاظ سے اُن کے خاندان سے باعتبارِ وجاہت مفلسانہ متانت نادمانہ کوئی خاندان ٹکرا نہیں کہا سکتا۔

خطِ عذار یار کا کیا وصف کیجئے
نور وز کا یہ زائچہ خطبہ ہے عید کا

ہر پانچ بھائیوں کا سلسلہ باعتبارِ عمر اور اوصافِ ذاتی کے حسبِ ذیل ہے۔

الف ۔ خدائی فوجدار۔

ب ۔ مسٹر خواہ مخواہ۔

ج ۔ ہوائی مجسٹریٹ۔

د ۔ کھسٹر پنچ۔

ہ ۔ وکھی بھن [1]

[1] پنجابی لفظ ہے۔ جسکا ترجمہ اردو میں پسلی توڑ ہوگا۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر خدائی فوجدار کا یہ بھائی پنجابی نژاد ہے۔ ا۔ص

ہر پانچ بھائی باعتبار خصلت سیرت مشغلہ جُدا جُدا ہیں گو باعتبار نسل ایک ہی شمار ہوتے ہیں۔ اور اُن کے طبائع اور مزاجوں کی قریبًا ایک ہی سی اُفتاد ہے۔ لیکن پھر بھی اُن کے خیالات سے پایا جاتا ہے کہ ہر گوشۂ دُنیا میں اُن کی جداگانہ حکومت اور جداگانہ تصرفات ہیں۔ ان ہر پانچ بھائیوں کی جدتِ طبع اور تصرفِ علم اس بات کا ثبوت ہے کہ انسان تھوڑی سی کوشش اور دخل درمعقولات سے کہاں تک دُنیا میں شہرت پاسکتا ہے اور کہاں کہاں اس کی رسائی اور رسُوخ ہوسکتا ہے جس طرح سرزمین ہند میں خدائی فوجدار کی ذریات کی دن بدن کثرت ہی۔ اسی طرح اس کے دوسرے بھائیوں مسٹر خواہ مخواہ وغیرہ کی شہرت اور ذریات بھی کم نہیں ہے۔ بازاروں میں کوچوں میں۔ شہروں میں۔ دیہات میں۔ گھروں میں۔ محلوں میں۔ بنگلوں میں۔ ٹرینوں میں۔ یکہ ٹمٹم میں۔ راہ میں۔ سڑک میں۔ باغوں میں۔ جنگل میں۔ خلوت میں۔ جلوت میں۔ پارٹی میں، میٹنگ میں مسٹر خواہ مخواہ کی خدمات کا بصدقِ دل اعتراف کیا جاتا ہی۔

کوئی چاہے نہ چاہے مسٹر خواہ مخواہ کمال عقیدت سے بجا آوری خدمات میں شب و روز خواب میں بیداری میں لگے رہتے ہیں۔ ہر میدان اُنکی جاگیر ہے اور ہر جگہ اُن کا علاقہ۔

ملکِ وحشت میں ہمارا کیوں نہ ہوجائے عمل
خطِ شمع رُخ نے پروانہ دیا جاگیر کا

ان سے کتنا ہی چھپو پیچھا نہیں چھوڑینگے۔ اگر تم اُن سے کبھی ٹرین میں پہلے سوار ہوگے تو یہ بعد میں آموجود ہونگے۔ اور اگر تم بعد میں آؤ تو یہ حضرت خود بدولت تم سے پہلے موجود ہونگے۔ چاہے کوئی ہوائی جہاز میں ہی سوار ہوکر نکلے اُنکا غبارہ غبارِ خاطر کے زور سے آگے ہی ہوگا

باوجود بجاآوری ان خدمات کے یہ پتہ نہیں چلتا کہ خود بدولت کہاں تشریف فرما ہیں اور کس طرح مختلف مجالس اور محافل ہیں اُنکا دخل و قبض ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی انہیں اپنی مجلس سے بیگانہ رکھنا چاہے تو کیا مجال کہ وہ کبھی اس پر کامیاب ہو سکے بقول مسلمانوں کے ہر انسان کے کندھوں پر کراماً کاتبین سوار رہتے ہیں۔ کراماً کاتبین کو تو کسی نے دیکھا نہیں حضرت مسٹر خواہ مخواہ اور انکی ذریات ہر مجلس میں موجود ہوتی اور اپنا تعترف جماتی ہے۔ بیچارے کراماً کاتبین تو خاموشی سے گزارتے ہیں۔ کبھی آواز تک نہیں سُنائی دی اور نہ کبھی آہٹ آئی۔ مسٹر خواہ مخواہ کی طلاقت اور خوش گفتاری سے جان چھڑانا مشکل ہے۔ حضرت کی زبان اتنی لمبی اور اتنی تیز ہے کہ اسکی زد اور اس کی سیفِ طلاقت سے کوئی محفوظ ہی نہیں رہ سکتا اور پھر اس قدر شیریں کہ حلاوتِ کلام حلاوتِ عسل سے بھی کہیں زیادہ ہے۔ گو اس کی مخفی نیش زنی گمِ انگبین سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی اس کی حلاوت ایک خاص مزہ رکھتی ہے۔

جہاں کو وضعِ جہاں پائمال رکھتی ہے
نئی طرح کی یہ شطرنج چال رکھتی ہے

انکی پہچان خاص کوئی نہیں۔ انسان ہیں۔ مہذب ہیں۔ جنٹلمین ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں۔ شستہ کلام۔ شستہ گفتگو۔ شستہ زبان۔ مؤدب آدابِ مجالس سے واقف۔ شبہ ہی نہیں گذرتا کہ خود بدولت اپنے ذمہ ہمت پر یہ خدمات رکھتے ہیں۔ اور انکا طائرِ ضمیر اس قدر پرواز کر سکتا ہے۔ لاکھ غور کرو۔ انکی چال سمجھ میں آتی ہی نہیں۔

دیر کی راہ بتاتا ہے نہ کعبہ کی شیخ

کچھ سمجھ میں میرے آتا نہیں مسلک تیرا

حضرت کی شکل سبحان اللہ کیسی بھولی بھالی ہے۔ چہرہ نورانی۔ صورت رحمانی۔ تقریر ایسی دلاویز۔ کلام ایسا مسلسل کہ گویا لارڈ مکالے ایک جوش سے تسبیح دے رہے ہیں۔ کوئی خیال نہیں کرسکتا کہ حضرت کا رشتہ بھی خدائی فوجدار سے ملتا ہے اور خود بدولت بھی اس خاندان کی یادگار عظمیٰ ہیں اور وہی خو بو رکھتے ہیں کہ جو اعلیٰ حضرت خدائی فوجدار کے حصہ میں آئی ہو۔ کس بے تکلفی سے پوچھتے ہیں۔

کیوں حضرت! آپ کے کتنے لڑکے اور کتنی لڑکیاں ہیں۔ سب کی شادی ہوچکی یا ابھی تک کوئی کنوارا کنواری بھی ہے۔

غریب مخاطب حیران ہے کہ یہ کون حضرت ہیں جنہیں اس کے لڑکے لڑکیوں کی منگائی سگائی کی سوجھی ہو۔ اور یہ اس طرح متانت سے پوچھتے ہیں کہ گویا کچھ انتظام بھی سوچ کر آئے ہیں۔ مخاطب خاموش ہو کیا جواب دے اس سوچ میں ہے کہ شاید خودبدولت خود ہی خاموش ہوں مگر مسٹر خواہ مخواہ کے دل میں ایک دفعہ جو آجائے وہ کیسے نکلے۔ مخاطب ٹال مٹول کر کے کچھ اور باتیں کرنا چاہتا ہے اور حضرت اسی دھن میں لگے ہیں۔

ہاں حضرت بتائیے تو سہی آپ کے لڑکے کتنے ہیں اور بیویاں کتنی۔ آپ تو مسلمان ہیں۔ دو تو ضرور ہونگی۔ کوئی لڑکا نوکر بھی ہو خدمت بھی کچھ کرتا ہے۔ اوپر سے بھی آخر کچھ نہ کچھ آمدن ہوگی۔

یک نشد دو شد۔ مخاطب بدقسمت پہلے دخل در معقولات کو ہی رو رہا تھا۔ اب سلسلہ اور بھی بڑھ چلا۔ مسٹر خواہ مخواہ کی زبان رکتی ہی نہیں۔ لگائے تجھ میں جو قید جہت وہ کافر ہے

نہ ابتدا ہے نہ اے یار انتہا تیری

مخاطب اور بھی خاموش ہو گیا۔ اسی خیال سے کہ شاید خود بدولت کی زبان رشک مقراض اب بھی اس کتر بیونت سے رکے۔ مگر مسٹر خواہ مخواہ کی زبان اور اُس کے حاشا و کلا سے

نخل ہستی سے نمودار ہے کثرت تیری
اصل وحدت ہے تری فرع ہے کثرت تیری

اچھا حضرت! بیوی کے ساتھ محبت تو ہو گی۔ سوٹیبل میچ[1] ملنا اگرچہ مشکل ہے لیکن آپ کی گفتگو سے ٹپکتا ہے کہ آپ اپنے گھر میں خوش ہیں خدا ہر ایک کو ایسا ہی موقع دے۔

غریب مخاطب کی مزید خاموشی کا یہ جواب پایا یہ نتیجہ ہوا کہ مسٹر خواہ مخواہ بیرونی دنیا سے اندرونی دنیا میں جا گھسے اور ساتھ ہی یہ پیشینگوئی بھی کی کہ آپ ایک متناسب جوڑہ رکھتے ہیں اور بیوی سے آپ کی محبت ہے۔

مخاطب ناچار بولا میں کیا کہوں ایسی باتوں کی کیا ضرورت ہے کوئی اور بات کیجئے۔

مسٹر خواہ مخواہ کوئی ایسی نرم آسامی نہ تھی کہ اس جواب شریفانہ سے ساکت ہو جاتے۔

ہنس کر کیا فرماتے ہیں۔

بھلا یہ تو معلوم ہو گیا کہ آپ کی بیوی سے بہت محبت ہے۔ ساس اور بہو کی بنتی بھی ہے یا نہیں۔ گھروں کے بعض معاملات بہت ہی تکلیف دہ ہیں۔ مگر پھر بھی غریب مخاطب خاموش منہ کی طرف تکتا ہے اور سوچتا ہی

[1] انگریزی لفظ۔ معنے ہیں مناسب جوڑ۔

کہ خود بدولت رفتہ رفتہ کیسے بے لگام ہوتے جاتے ہیں۔ چُپ ہی نہیں رہتے
خواہ مخواہ۔ ہاں ہاں فرمائیے تو سہی۔ بات کیا ہے؟ عُہدہ تو آپ کا
چشم بد دُور معقول ہے۔ زیور تو خوب بنایا ہوگا اور کچھ جمع بھی کیا ہوگا۔
مخاطب۔ آپ کیوں ایسی باتیں پُوچھتے ہیں!
خواہ مخواہ۔ ٹرین کا وقت کیونکر کٹے۔ اور اس میں عیب ہی کیا ہے۔
مخاطب۔ اور فائدہ کیا ہے۔
خواہ مخواہ۔ فائدہ کیوں نہیں۔ واقفیت بڑھتی ہے۔ شرم ہی کیا ہے۔ کچھ گانے
سننے کا بھی شوق ہے۔ مَیں تو پسند نہیں کرتا۔
مخاطب۔ مجھے ایسا مذاق نہیں۔
خواہ مخواہ۔ کیوں۔
مخاطب۔ مَیں کیا بتاؤں۔
خواہ مخواہ۔ ہاتھ پر ہاتھ مارکر (یہ جابرانہ بے تکلفی ملاحظہ فرمائیے) یار
بتاتے کیوں نہیں معلوم تو شوقین ہوتے ہو۔ منشی کہہ ہو بے تکلف ہو۔ پھر
یہ بات کیا۔
مخاطب۔ مَیں معافی مانگتا ہوں۔
خواہ مخواہ۔ معافی کیسی۔ فرمائیے آپ کی تنخواہ کیا ہے۔ اور اوپر
سے کیا کچھ آمدن ہو جاتی ہے۔
مخاطب۔ بندۂ خدا! ایسی باتوں سے کیا حاصل۔
خواہ مخواہ۔ حاصل کیوں نہیں۔ عیب کیا جو بتا دیا۔
مخاطب۔ تنخواہ کی کمی وبیشی سے آپ کو کیا تعلق۔
خواہ مخواہ۔ بیشک کوئی تعلق نہیں ولیکن بتانا تو چاہئے۔ اچھا یہ تو

کہیے۔ آپ کا مذہب کیا ہے؟۔
مخاطب ۔ میرے مذہب سے کیا سروکار۔ کچھ ہو۔
خواہ مخواہ ۔ فرقہ بھی ساتھ ہی بتا دیجیے۔ تاکہ پھر نہ پوچھنا پڑے۔
مخاطب ۔ میں مذہب نہیں بتاتا اور آپ فرقہ بھی پوچھتے ہیں۔
خواہ مخواہ ۔ کہیں آپ لامذہب تو نہیں ہیں۔ نوجوانوں خصوصاً انگریزی خوانوں میں اس کا بہت کچھ چرچا ہے خدا پناہ میں رکھے۔
مخاطب ۔ آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔
خواہ مخواہ ۔ ڈاڑھی کا منڈوانا تو اس بات کی دلیل ہے کہ آپ خدا کو نہیں مانتے ہیں۔
مخاطب ۔ ڈاڑھی اور خدا سے کیا تعلق ہے۔
خواہ مخواہ ۔ خیر یہ تو بتائیے۔ نیچ بچرا تو سنتے ہونگے۔
مخاطب ۔ (تنگ آکر) ۔ ہاں جناب سنتا ہوں۔ پھر فرمائیے!
خواہ مخواہ ۔ فرمائیے ولایت میں بھی یہ فرقہ ہے۔
مخاطب ۔ مجھے نہیں معلوم۔
خواہ مخواہ ۔ یار بتلاتے نہیں ہو۔ ہم سے ہی پردہ۔ آخر کچھ تو کہو۔
مخاطب ۔ میں کچھ نہیں کہونگا۔ آپ خواہ مخواہ سوال پر سوال کئے جاتے ہیں۔ بلا پہلی واقفیت کے اس قسم کے سوالات کرنا تہذیب اور ایٹیکٹ کے خلاف ہے۔
خواہ مخواہ ۔ معاف کریں۔ بھلا کہیئے تو سہی کہ نند رام اور ابراہیم آپکے واقف ہیں؟
مخاطب ۔ ہاں دونوں میرے دوست ہیں۔

خواہ مخواہ۔ ان کا کیا حال ہے؟

مخاطب۔ بفضل خدا اچھا ہے۔

خواہ مخواہ۔ وہ تو دونوں تماشہ بین ہیں۔ اُنکا کیرکٹر خراب ہے اور اُن کی شہرت بُری۔

مخاطب۔ مَیں تو اُنہیں اچھا جانتا ہُوں۔

خواہ مخواہ۔ آپ کی غلطی ہے۔ ابراہیم تو بے نماز ہے اور نند رام شرابی۔ پھر اچھے کیسے ہُوئے۔

مخاطب۔ اگر یہ نقص ہوں بھی تو اُنکی خوبیاں کہاں گئیں۔

خواہ مخواہ۔ ایک بُرائی تمام نیکیوں کو لیجاتی ہے۔

مخاطب۔ میری رائے میں تو ایک نیکی بہت سی بُرائیوں کو لیجاتی ہے۔

خواہ مخواہ۔ فرمائیے۔ مَیں تو انگریزی لباس پسند نہیں کرتا۔ آپ کیوں پہنتے ہیں؟

مخاطب۔ میری پسند اور میرا مذاق آپ کی پسند اور مذاق کے تابع نہیں ہے۔

خواہ مخواہ۔ آپ کے والد صاحب کیا کام کرتے تھے۔

مخاطب۔ (ذرا غصّہ میں آکر) آپ کو اِس سے کیا!

خواہ مخواہ۔ بہت اچھا خفا نہ ہوں۔ مگر یہ تو فرمائیے۔ آپ کی ذات کیا ہے؟

مخاطب۔ بندۂ خدا۔ ذات وات کا کیا سوال ہے۔ تمہارے پاس تو بیٹھنا بھی ایک ناگہانی مصیبت ہے۔ سفر سقر ہو گیا۔ معاف کیجئے۔

خواہ مخواہ۔ یہ خفگی تو اچھی نہیں مَیں تو آپ کا رفیق ہوں۔ سفر کاٹنے کی خاطر یہ گفتگو تھی۔ ورنہ مَیں بیوقوف نہیں۔ جنونی نہیں۔ بات

سے بات نکل آتی ہے۔ اچھا سلام علیکم۔ بشرط زندگی پھر کبھی۔
بھلا پتہ آپ کا کیا ہے۔ خط تو ضرور لکھا کریں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو حاضر ہوں۔

مخاطب۔ خدا خوش رکھے۔ سلام۔

مسٹر خواہ مخواہ اور مخاطب کی جو گفتگو ہوئی اس سے ناظرین قیاس کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک کے لوگوں کی زندگی اور معاشرت کس گرداب میں چکر کھا رہی ہے اور اس کی بدولت فرحت اور خوشی یا ذہنی طمانیت کس ضغطہ میں ہے۔ ہر شخص دوسرے شخص کے واسطے کوتوالی کا منصب لئے ہوئے ہے۔ جب کوئی شخص دوسرے سے ملتا ہے اس کے ذاتیات میں دخل دیکر اس کی زندگی پر حملہ کرتا اور اسے ایک ناگوار بحث میں لا ڈالتا ہے۔ یہاں تک کہ اسرار مخفیہ کے پوچھنے سے بھی احتراز نہیں۔ ہر شخص کا یہ حق ہے کہ وہ بعض راز کسی سے نہ کہے مگر مسٹر خواہ مخواہ یا اس کی ذریات چاہتی اور زور دیتی ہے کہ ضرور اس کا اظہار کیا جائے۔ معمولی رنگ میں نہیں بلکہ مجبور کیا جاتا ہے تنگ کیا جاتا ہے۔

کوئی دو شخص سرگوشی کریں مسٹر خواہ مخواہ خواہ مخواہ دخل دیتے اور کسی منصوبہ بازی پر محمول کرتے ہیں۔

کوئی شخص چار روز گھر سے نہ نکلے چاہے بوجہ بیماری۔ چاہے کسی اور وجہ سے مسٹر خواہ مخواہ خواہ مخواہ پوچھتے پھرتے ہیں۔

"یار آج ا بوجی گھر سے نہیں نکلے۔ بات کیا ہے۔ تلبیس سکہ تو نہیں کرتے؟ دو چار روز سے کچھ اداس ہیں۔ وجہ کیا ہے۔ اگر کچھ سراغ چلے تو مجھے ضرور خبر دینا۔"

"مولوی صاحب اس کوچہ سے روز گذرتے ہیں۔ کوئی بات ہے خبر رکھنا"۔
"منشی جی بھی کیوں جاتے ہیں۔ اتنا روپیہ کہاں سے بٹورلہتے"۔
"عزیزالدین اور نندلال الگ الگ کیوں پھرتے ہیں۔ ذرا خیال رکھنا کوئی بھید ہے"۔
"یہ اتنے لمبے چوڑے خط کہاں لکھے جاتے ہیں۔ یار کوئی راز ہے"۔
"آجکل تو حاجی صاحب خوب نمازیں پڑھتے ہیں۔ خدا خیر کرے"۔
"یہ آجکل کیوں صاحب بہادر کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ کوئی مطلب نکالا ہوگا"
"ان دونوں کا خوب جوڑ ہے گھُٹی رہتی ہے لیکن یہ کب تک"۔
"ذرا وہ اس راہ سے گذریں تو مہربانی کر کے انہیں ذرا ٹھہرانا۔ میں کچھ دریافت کرونگا۔ وُہ اس بازار میں روز کیوں آتے ہیں"۔
"اب تو خوب لٹھہ خاصہ پہنتے ہیں۔ کہاں سے لوٹ آئی ہے"۔
"بڑے نیک جو ہوئے شرابی کبابی داڑھی مُنڈے"۔
"تماش بین عیاش پانی کی طرح روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ خدا بچائے"۔
"اگرچہ نمازی ہیں مگر داڑھی مُنڈوں کا کیا اعتبار"۔
"بڑے تعلیم یافتہ ذات تو پُوچھو"۔
"بھئی اِن کا کیا حق تھا کہ یہ میر مجلس بن بیٹھے"۔
"یہ ہیں مُلک کے نوجوان پتلون پوش"۔
یہ نمونہ ہے ہماری تہذیب اور آداب کا۔ یہ نظیر ہے ہماری تربیت کی۔ خیر کا نام ہی نہیں۔ جب سوجھتی ہے بدہی سوجھتی ہے۔ خواہ کوئی کسی رنگ میں ہو۔ مسٹر خواہ مخواہ چپ نہیں رہتے۔ کون ان سے پُوچھے آپ کو اس سے مطلب ہی کیا۔ کسی کی کچھ تنخواہ ہو اور کچھ مواجب۔ کوئی کسی طرح گذارہ کرے۔ آپ اگر ایسے ہی ہمدرد

ہیں تو ﷲ مخلصانہ کچھ اُس کی امداد کیجئے ۔ نہ کہ اُلٹی سردردی اور نکتہ چینی ۔
ایک دفعہ ایک پادری صاحب سے کسی خواہ مخواہ نے پُوچھا کہ آپ کے لڑکے لڑکیاں کتنی ہیں ۔

پادری صاحب نے کہا کہ ۔

"مَیں پچھلی مردم شماری میں لکھا چکا ہُوں ۔ آپ وہاں سے نقل لے سکتے ہیں"

ایک خواہ مخواہ نے کسی سے پُوچھا کہ :۔

"آپکی تنخواہ کیا ہے" ؟

اُس نے کہا کہ :۔

"آپکی بیوی کا کیا نام ہے" ۔

اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ مسٹر خواہ مخواہ کی باتوں اور سوالات کا اثر دُوسروں پر کیسا پڑتا ہے اور لوگ کیا خیال کرتے ہیں ۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ

مسٹر خواہ مخواہ اور ذریاتِ خواہ مخواہ کی موجودگی میں کوئی شخص ہندوستان میں آرام سے زندگی بسر کر سکتا ہے ۔ یا کوئی شخص سازش سے سفر کر سکتا ہے خدا کی پناہ ۔ بات بات میں سوال ۔ بات بات میں شک ۔ بات بات میں تحکم بات بات میں نکتہ چینی ۔ احباب بھی اتنا تنگ نہیں کرتے جتنا یہ خواہ مخواہ کرتے ہیں ۔ کوئی کام کی بات نہیں ۔ کوئی علمی ذکر نہیں ۔ کوئی قومی بحث نہیں کوئی تفریحی داستان نہیں ۔ ہندی کی چندی نکالتے اور خواہ مخواہ ستاتے ہیں ۔ بیشک ہمیں اس بات کی بھی ضرورت ہو کہ ایک دوسرے سے اُنسیت پیدا کریں اور تمدنی ضروریات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے شناسائی حاصل ہو ۔ مگر نہ یہ کہ دُوسرے کے گھر کی تلاشی لیتے پھریں اور جو کچھ وہ کہنا نہیں

چاہتا ہے وُہ خواہ مخواہ اس سے کہلوایا جائے۔ اور اُسے مجبور کیا جائے۔

کسی کی بیوی کا کچھ نام ہو تمہیں کیا غرض۔

کوئی کچھ تنخواہ پائے تمہارا کیا تعلق۔

کسی کی کچھ آمدنی ہو تمہیں کیا واسطہ۔

کوئی کچھ کھائے کچھ پیئے تم کیوں جانچ لیتے ہو۔

کوئی سوتے کوئی جاگے تمہیں کیا پڑی ہے۔

کوئی اُٹھے کوئی بیٹھے تمہیں کیا مطلب۔

کوئی جائے کوئی آئے تم ہو کون۔

تکمیل تمدن اور تکمیل آسائش کے واسطے لازمی ہے کہ اُن طریقوں اور اُن روشوں سے قطعی احتراز کیا جائے جو اس کی مخل ہیں خلوص اور محبت سے رہنا سیکھو اور ایک دُوسرے کی امداد کرو۔ ایک دُوسرے کی ستر پوشی کرو۔ اور ایک دوسرے کے واسطے مخلص ثابت ہو۔ خواہ مخواہ ہر کام میں روڑے نہ اٹکاتے پھرو۔ نہ تو تم کوتوال ہو اور نہ کراماً کاتبین انسان ہو خلوص سے کام لو اور خلوص سے کام کرو۔

غلطی اور لغزش سے کوئی شخص خالی نہیں۔ ہر شخص کوئی نہ کوئی راز رکھتا ہے وُہ اس کا ایک حق ہے۔ کوئی شخص سوائے خلوص کے اس کے افشا پر کسی کو مجبور نہیں کرسکتا۔

بیشک نکتہ چینی بھی ایک فرض ہے۔ مگر جو خلوص سے ہو اور دوستی کی وجہ سے۔ اور وُہ بھی مناسب حد تک اور مناسب طریق سے۔ نہ ایسی طرح کہ دُوسرے کا دِل دُکھے۔ یا اپنی خوبی اور برتری کا اظہار ہو۔ میل جول اس لئے بنا ہے کہ اس سے لُطفِ ملاقات بڑھے۔ اور ایک دُوسرے کو مدد پہنچے۔

نہ اس لئے کہ ایک دُوسرے کا محتسب بنے۔ اور بیجا راز جوئی اور بے ضرورت نکتہ چینی سے دُوسرے کی عافیت میں خلل ڈالے۔ نہ خلوص نہ ارادت نہ محبت نہ الفت۔ خواہ مخواہ دخل درمعقولات۔ یہ عادت اچھی نہیں۔ کوئی ان حضرات سے پوچھے۔ میاں سب سے اوّل تم ہی کیوں اپنے گھر کے حالات کسی اخبار میں نہیں چھاپ دیتے۔ کہ میں ایسا کپڑا پہنتا ہُوں اور یہ کھاتا ہُوں یہ پیتا ہُوں۔

جب تک ایسی حالت ہی۔ اس کا تو یہ مطلب ہی کہ کوئی بدقسمتی سے کسی کے پاس ہی نہ بیٹھے۔ بات بھی نہ کرے۔ اگر کرے تو اس مخمصہ میں نہ پھنسے۔

نہ جایا کرو بزم رنداں میں شیخ!
یہ مندیل اِک دن اُتر جائے گی

تمدنی اغراض کے لئے ضروری ہے کہ جس طرح زبانی کہانیوں میں چھوٹے چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو بھُوتوں اور پریتوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اسی طرح ان خدائی فوجداروں اور خواہ مخواہوں سے لڑکوں اور لڑکیوں کو ڈرایا جائے اور اُن کے ذہن نشین کیا جائے کہ خدائی فوجدار اور مسٹر خواہ مخواہ اور انکی ذریات بھی بھُوتوں پریتوں کی طرح خوفناک ہیں۔ اُنکی سنگت اور انکی صُحبت انسان کو انسان نہیں رہنے دیتیں۔ وہ ایک باضابطہ حکومت سے زیادہ تر حکومت کرتے ہیں اور ایک حکمران سے بڑھ کر دباؤ ڈالتے ہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مناسب یافتہ حالات نہ کیجائے۔ میرا اعتراض یہ ہی کہ خواہ مخواہ ایک دوسرے کی زندگی موردِ آلام اور معرضِ الزامات نہ بنائی جائے۔ زندگی کا زمانہ بہت ہی مختصر اور پہلے ہی سے خاصہ تاریک ہی۔ اور ہندوستان میں پہلے ہی امنگ اور تفریح مہنگی ملتی ہے۔

عمرِ عزیز قابلِ سوز وگداز نیست   ایں رشتہ را مسوز کہ چندیں دراز نیست

سلطان احمد (از بہاولپور)

میر انیس اور ہم

شاہِ اقلیمِ سخنوری۔ رشکِ ہومر و فردوسی۔ جناب میر ببر علی صاحب انیس
اعلی اللہ مقامہٗ دُنیائے اُردو میں وُہ باکمال و معجز نگار شاعر گذرے ہیں
ہی بزرگ یورپ میں پیدا ہوئے ہوتے تو آج اُن کے بے مثل کمال کی
ک عالم میں دُھوم مچی ہوتی۔ اُنکے نام پر کلب قائم ہوتے۔ لائبریریاں
جاتیں۔ طلباء کو "انیس اسکالرشپ" کے نام سے وظائف دیئے جاتے
کے مسودے۔ ان کے قلم کی لکھی ہُوئی نایاب تحریریں۔ ان کے خطوط
ب خانوں میں تبرکًا محفوظ ہوتے۔ اُن کے ارفع و اعلیٰ تخیل لطیف و
استعارات۔ نادر اور اچھوتی تشبیہات۔ پُر لُطف روزمرّہ اور دلنشین
رات۔ غرض اُن کے مرصع کلام پر مستند معنی سنج اور مسلم الثبوت ادیب۔
ح و تحشیہ لکھ کر دادِ سخن سنجی او نکتہ فہمی دیتے۔ ان کی قابلِ رشک تصنیفات
نہایت اہتمام اور تکلف سے انتخابات چھپوا کر۔ اہلِ ذوق کے پیش کرتے
کے سوانح لکھے جاتے۔ غرض انیس کی شہرتِ عام اور بقائے دوام کے
انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جاتا۔ بچے بچے کی زبان پر آج
سرکردہ سخنورانِ ملک کا نام ہوتا۔ اور کلامِ انیس کی گویا پرستش کیجاتی
سے نہ صرف اس بے مثال قادر الکلام کی علمی دُنیا میں ممتاز یاد تازہ رہتی
اہلِ ملک کی علم دوستی۔ لٹریری دلچسپی۔ مشاہیر پرستی۔ اور رُوحانی برتری
ادی اور محسوس ثبوت ملتا۔ جو ان کی علمی اور قومی ترقی کا راز ہے۔

اور ہم نے کیا کیا؟ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا جواب سخت افسوسناک

اور ندامت کے ساتھ دیا جا سکتا ہے۔ سچ پوچھئے تو ہم یہی نہیں سمجھے۔ کہ انیس کون تھے؟ کیا تھے؟ اور کیا کام کر گئے؟ کتنی شرمناک بے حسی ہے۔ کہ انیس کا سا آفتاب جہانتاب اردو دنیا سے اٹھ جائے۔ اور کروڑوں کی تعداد میں ہوا خواہانِ اردو موجود ہوں۔ لیکن اس قدر بھی غور نہ کریں۔ کہ انہوں نے اردو کی کیا خدمت کی؟ زبان کو صاف اور فصیح کیا؟ اور اس کو وسعت دیکر ہم پر کیا احسان کر گئے؟ اور ہمارے ذمے اُن کے کیا حقوق و خدمات ہیں!!

چشم بد دور یوں تو اس وقت بھی ملک میں سینکڑوں "انیسئے" موجود ہونگے مگر بڑی سے بڑی اڑان بھری۔ تو کسی عقیدت مند و مخلص نے ایک آدھ قطعہ تاریخ وفات لکھکر حقِ عقیدت وارادت ادا کر دیا۔ اور ان کے کلام کو جزدان میں باندھ کر ہوا نہ لگنے دی۔ گویا اسی قدردانی تک اُن کا فرض تھا۔ اِس سے زیادہ کے لئے وہ مکلف نہیں۔

میر صاحب کی سوانح عمری۔ ان کے حالاتِ زندگی۔ ان کے کلام پر تنقید لکھنا تو ایک مہتم بالشان کام تھا۔ اُن کے معتقدین بلکہ اعزہ اور اقربا تک سے اِتنا بھی نہ ہو سکا۔ کہ مرحوم کے کلیات کا ایک صحیح و مستند نسخہ تو تیار کر دیتے۔ اس بے دردی۔ مُردہ دلی۔ بے حسی اور بے پروائی کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہانتک بخل روا رکھا گیا۔ کہ میر صاحب کے جو اعلیٰ سے اعلیٰ مرثیئے پریس تک نہ پہنچے تھے۔ مرحوم کے گھرانے والوں نے آپس میں اس طرح تقسیم کر لیئے جیسے جائداد۔ اور انہیں اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کا مال۔ اکثر متداول اور مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند الحاقی بیان کئے جاتے ہیں۔ رسم الخط اور کتابت کی غلطیاں تو اس قدر ہیں۔ کہ ناقدردانی اور بے توجہی پر غصہ اور افسوس آتا ہے۔

اور یہ افسوس اور بڑھ جاتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں۔ کہ خود جناب میر صاحب کے خلف الصدق جناب میر خورشید علی صاحب نفیس مرحوم و مغفور نے بھی ادھر کچھ توجہ نہ فرمائی۔ باوجودیکہ ممدوح اس صیغے کے بلند مرتبہ شاعر تھے اور اپنے والد مرحوم کے پاس شناس۔ لیکن اس کام کو غیر ضروری سمجھا کئے۔ چنانچہ شمس العلما مولینا محمد حسین صاحب آزاد دہلوی نے اپنی ناکامیابی پر نسخہ آب حیات میں اظہار حسرت و افسوس فرمایا ہے۔

شاید یہی وجوہ ہوں کہ ملک کے بیشتر اہل ذوق میر انیس کی سرزمین شاعری کے حدود اربعہ سے ناواقف ہیں۔

یوں تو اردو کی حمایت میں م کے رم کاغذ سیاہ کئے جاتے ہیں۔ جلسوں میں پرزور تقریریں ہوتی ہیں۔ گورنمنٹ کی خدمت میں حفاظت و قیام اردو کے لئے میموریل پیش کئے جاتے ہیں۔ انجمن ترقی اردو قائم کی جاتی ہے۔ انعقاد اردو سبھا کی تجویزیں ہوتی ہیں۔ اور اردو کو تمام ملک کی مشترکہ زبان بیان کیا جاتا ہے لیکن ایسے لوگوں کی قابل فخر کوششوں کو۔ ان کے سرمایہ ناز حاصل کو کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ جو قلم کے دھنی لاوارث۔ حقیر اندر انیس میرس اردو کو پاکیزہ و پرلطف اردوئے معلی بنا گئے۔ جو اس چٹیل میدان کو گلزار پر بہار کر گئے۔ اس تلوار کو سان پر چڑھا گئے۔ اس چشمے کو صاف و شیریں کر گئے۔ اس سکے کو ٹکسالی بنا گئے۔ اور اس بازار میں الفاظ و محاورات کے انبار لگا گئے!!

اس میں کچھ شک نہیں کہ میر انیس علیہ الرحمۃ کا خاندان شرافت نشان سات پشت سے علمی خاندان چلا آتا ہے۔ ادب اردو کی اتنی مستقل اور مسلسل خدمت زبان اردو کو ایسی پاکیزگی و لطافت روزمرہ اور محاورات اردو کو اتنی حیرت انگیز وسعت کسی مصنف سے نہیں دی جا سکی۔ جیسی اس خاندان نے دی۔ میر ضاحک سے

لیکن میر مونس - میر وحید - میر نفیس (غرض کس کس کا نام لیا جائے) کسی کی تصنیف اُٹھا کر دیکھ جائیے - ایک سے ایک بڑھ کر گوہر نایاب اور دُرِ خوش آب پائیے گا - اور میر انیس تو وہ معجز نگار بزرگ ہیں جن کی ذات جامع الکمالات پر زبانِ اُردو جب تک زندہ ہے - بجا ناز کر سکتی ہے -

بہر حال زبانِ اُردو کی جو گراں قدر اور مہتم بالشان خدمت اِس خانوادۂ سیادت نے کی ہے نہ کسی انجمن سے ہو سکی - نہ اخبار سے اور نہ رسالے سے - اور یہ نہیں کہ معمولی گنواری بول چال - یا بجدلیل الفاظ کی بھرتی کر دی ہو - زبان بھی وہ زبان ہے جس کو کل اساتذۂ اُردو نے مستند اور ٹکسالی تسلیم کیا ہے -

دبیر اور انیس کی شاعری سے متعلق اہلِ مُلک کی مختلف رائیں ہیں - میری نظر میں دونو بزرگ یکساں واجب التعظیم ہیں - مگر جو چیز دبیر اور انیس کی شاعری میں ما بہ الامتیاز ہے - کلامِ انیس کو کلامِ دبیر سے قطعۃً علیحدہ کرتی اور ممتاز بناتی ہے - وہ لطافتِ زبان ہے - جو بجز میر صاحب کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی - میر انیس کے محاورات اور روزمرہ نہیں - آفتابِ فصاحت کی شعاعیں ہیں کہ صفحۂ قرطاس کو روشن اور عالمِ اُردو کو نورانی کر رہی ہیں -

مگر قلق ہے تو اسکا کہ ابنائے وطن نے میر صاحب کو خالص مذہبی شاعر اور اُن کے کلام کو محض مذہبی شاعری فرض کر کے - ان کی تصنیف سے بے اعتنائی فرمائی - اور جن حضرات نے میر صاحب کے کلام کو ملاحظہ بھی فرمایا - تو اُسی دقتی ضرورت اور نیت سے جس سے وہ اکثر تحفۃ العوام کو دیکھتے ہیں - میرے نزدیک دونو گروہوں سے ایک نے بھی وسعتِ نظر سے کام نہیں لیا - ورنہ وہ دیکھتے علاوہ مذہبی شاعری کے میر صاحب کے مرثیوں میں ہزاروں اخلاقی نکتے - تاریخی واقعے جغرافیائی اشارے - جنگی کارنامے - جذبات کے مُرقعے - مناظرِ قدرت

کی کیفیتیں۔ ظلم وعدل کی تصویریں۔ قساوت و رقتِ قلب۔ بے رحمی وخوف خدا۔ گمراہی و رہنمائی۔ صادق و بے ریا محبت۔ مادی ترقی و روحانی عروج عشق الٰہی کے بہترین نمونے۔ اور محاسن اخلاق کے ہوبہو فوٹو موجود ہیں۔

اگر غور و تدبر اور امعان نظر سے دیکھا جائے تو اسی مذہبی شاعری سے معلوم ہوسکتا ہے کہ آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں فوجوں کے لڑنے کا کیا ڈھنگ تھا؟ معرکۂ جنگ میں کون کون سے باجے بجتے تھے؟ میدان جنگ میں فوجیں کس طرح صف آرا ہوتی تھیں؟ آلات حرب کیا کیا تھے؟ اسلحہ کیا کیا؟ فوجیں آج کل کی طرح لڑتی تھیں یا کوئی اور طریق تھا؟ سرداران فوج اپنے اپنے لشکریوں کو کس طرح ہٹاتے بڑھاتے تھے؟ اور کس طرح رجز خوانیاں ہوتی تھیں؟ وغیرہ وغیرہ۔

میر صاحب کی شاعری کی اس صنف میں یہ ایک امتیازی اور مذہبی خصوصیت ہے۔ کہ ظالم و مظلوم کی تصویریں بالمقابل کھینچ دی گئی ہیں۔ جس سے ہر شخص کو ظلم و بے رحمی۔ شقاوت و قساوت سے نفرت و تنبیہ اور کل محاسن اخلاق سے رغبت و محبت ہوسکتی ہے۔ اور یہ سمجھ میں آسکتا ہے۔ کہ اگر انسان کو معرفت حق کی کماحقہ حاصل ہوجائے۔ تو اسکو سخت و صعب ترین مصیبت اور انتہائی سے انتہائی صدمہ رنج و غم صراط مستقیم سے بھٹکا نہیں سکتا۔ نیز یہ کہ عاشقان خدا کسی حالت میں اخلاق حسنہ اور شریعت حقہ کے خلاف ہرگز کوئی کام نہیں کرتے۔ صلۂ رحم۔ انسانی ہمدردی۔ اقربا نوازی۔ ایثار علی النفس۔ غرض کل محاسن مذہب و اخلاق کی تکمیل ہر حالت میں انکو مدنظر رہتی ہے۔

بہر تقدیر جو باتیں کہ دماغی تربیت اور تہذیب اخلاق کے لئے ضروری ہیں اس کا بیشتر حصہ اس مذہبی شاعری میں موجود ہے۔ اور ایپک پوئم کا اعلیٰ نمونہ

اُردو شاعری میں اگر کہیں مل سکتا ہے۔ تو وہ میر صاحب کا کلام ہے۔

مَیں تو کہتا ہوں علامہ شبلی آپ جُگ جُگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار چاند لگیں۔ کہ آپ نے میر صاحب کے کلام کو اصُولی نظر سے مُلاحظہ فرمایا۔ "موازنہ دبیر و انیس" کو میں آپ کی اولیات سے سمجھتا ہوں۔ آپ وُہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمانہ حال کے اصُولِ تنقید کے موافق میر صاحب کے کلام پر ریویو لکھا۔ اور بعض ایسے نکات کی تشریح فرمائی۔ کہ ہر شخص کا ذہن اُدھر منتقل نہیں ہو سکتا۔

موازنۂ انیس کے بعد۔ مولینا اشہری اور حضرت احسن نے اِدھر توجہ فرمائی اگرچہ یہ ہر دو تالیفات نقشِ ثانی و ثالث ہیں۔ اور ان سے بہت سے مفید گو اجمالی حالات میر صاحب کی تعلیم و تربیت کے متعلق معلوم ہو گئے۔ تاہم کلام کے متعلق جو باتیں لکھنے کے قابل ہیں۔ انکے لکھے جانے کی ضرورت باقی ہے۔ مثلاً یہ کہ میر صاحب کے مرثیوں کے خصوصیات کیا ہیں؟ اور ہر موقع کی تصویر کھینچنے میں جو مختص الاستعمال الفاظ۔ اصطلاحات اور محاورات استعمال کئے گئے۔ اس سے کلام میں کیا خوبی اور شان پیدا ہو گئی ہے۔ فنِ سپہگری سے متعلق اصطلاحات کی فٹ نوٹ کے ذریعے سے کچھ تشریح و صراحت ضرور ہے۔ جس سے محاسن کلام ہر شخص پر آئینہ ہو جائیں۔ کیونکہ میر انیس علیہ الرحمۃ نے بیسیوں ایسی اصطلاحیں اور سیکڑوں ایسے محاورے استعمال فرمائے ہیں۔ جو اکثر بلحاظِ محل استعمال ادق معنی ہو گئے ہیں اور بغیر تشریح جن کا لطفِ نظم اور تو اور بیشتر اہلِ لکھنؤ نہیں اُٹھا سکتے۔ رفعتِ تخیل۔ وسعتِ معلومات۔ شانِ کلام اور اندازۂ کمال۔ عام طور پر ہونا بالکل ناممکن ہے۔ بس یہی میرے اس مضمون کا موضوع ہے۔

میری رائے ہے کہ میر صاحب کے کلام سے نہایت اعلیٰ اور چوٹی کے مرثیے منتخب کئے جا کر تصحیح اور تحشیہ کے ساتھ ایک ایسا رسالہ تیار کیا جائے

جس میں کے لغات۔ محاورات۔ روزمرہ اور اصطلاحات کی فٹ نوٹس کے ذریعہ سے تشریح کی گئی ہو۔ اور اس کو احتیاط کے ساتھ نہایت تکلف اور اہتمام سے چھپوایا جائے۔ اول ایک مبسوط مضمون اغراض و اہمیت شہادت سے متعلق دیباچے کے طور پر لکھا جائے۔ اور ایک دوسرا مضمون مؤلف کی جانب سے ایسے ضروری مطالب ظاہر کرے۔ جس سے اصلی مناظر کربلا اور عراق کا نقشہ آنکھوں میں پھر جائے۔ پھر اصل کلام پر حاشیہ لکھا جائے۔

مثلاً میر صاحب کے کلام میں جا بجا تلمیحاً "احد" "خندق" "خیبر" "صفین" "نہروانی" "بدر" وغیرہ کا ذکر آیا ہے۔ تو فٹ نوٹ کے ذریعے سے یہ بتانا چاہیئے۔ کہ یہ لڑائیاں کب ہوئیں؟ کیوں ہوئیں؟ کس کے ساتھ ہوئیں؟ اور کس سنہ میں؟ اور نیز یہ بھی بتانا چاہیئے۔ کہ "احد" یا "خیبر" یا "بدر" کہاں واقع ہیں؟ ان تشریحات سے علاوہ اور دلچسپیوں کے حضرت رسالت صلعم کی حیات مقدس کے حالات سے بھی ایک گونہ واقفیت اور معلومات حاصل ہو سکتی ہے۔

اگرچہ علم اسماء الرجال عرب کی خصوصیات میں شمار ہوتا ہے۔ اور مسلمانوں کے حصہ کی چیز ہے۔ لیکن آجکل کے لوگ۔ جنرل کروگی۔ جنرل لاکھارٹ۔ جنرل سائمسں۔ لارڈ کچنر۔ سینڈو اور کیکر سنگھ کے حالات پڑھنے والے نہیں جانتے۔ کہ عمر ابن سعد کون تھا؟ خولی کون؟ شمر کس روسیاہ کا نام ہے؟ اور سنان بن انس کس مردود کا؟ اور عنتر و مرحب کن جانوروں کے نام ہیں؟ لہٰذا ان کے علیحدہ علیحدہ پترے کھولنے چاہئیں۔ کہ یہ کون تھے؟ کہاں کہاں کے رہنے والے تھے؟ خاندان رسالت سے ان بے رحموں کو اسقدر بغض کیوں تھا؟ کب کب پیدا ہوئے؟ اور کس کس سال واصل جہنم ہوئے؟ کچھ پڑھے لکھے تھے؟ یا محض کندۂ ناتراش؟

جہاں فوج حسینی کا ذکر آیا ہے۔ وہاں حر۔ وہب۔ حبیب ابن مظاہر۔ مسلم بن عوسجہ۔ زہیر وغیرہ انصار امام اور جوانانِ بنی ہاشم کے حالات اپنے اپنے موقعہ پر بطور حاشیے لکھنے چاہئیں۔

لڑائی کے موقع پر فن سپہگری سے متعلق جو اصطلاحات صرف فرمائی ہیں۔ اُن کی تشریح کی جانی ضروری ہے۔ آلاتِ حرب جو اُس وقت کام آتے تھے۔ اُن میں سے صرف نیزہ اور تلوار باقی ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں۔ آج مارٹن ہنری بندوقوں ڈائنامیٹ اور بم کے گولوں کے ہاتھ میدان ہے۔ "تیر" اور "کمان" "گرز" اور "کمند" وغیرہ کے نام ہی نام رہ گئے ہیں۔ آج کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ "تیر" اور "ناوک" اور "خدنگ" (جنکا میر صاحب کے کلام میں بار بار نام آتا ہے) میں کیا فرق ہوتا ہے۔ "سوفار" "پیکان" "تیری" کس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح "کمان" "چلّہ" "گوشہ" وغیرہ سے ناواقف ہیں۔ پس ان سب اجزائے تیر اور کمان کی جداگانہ تعریف بیان کرنی چاہیئے۔ "تیر" "کمند" کی تعریف اور اس کے داؤ پیچ کی تشریح۔

علیٰ ہذا جہاں نیزے کا ذکر آیا ہے تو "بوڑی" "برچھی" "پھل" "انی" "سنان" "دانڈ" "بند" وغیرہ اجزائے نیزہ کے نام بھی آتے ہیں۔ اور بڑی بے تکلفی اور خوبصورتی سے۔ "اور بند باندھنا" وغیرہ اصطلاحات بھی آئی ہیں۔ جس سے حسنِ کلام دوچند ہو گیا ہے۔ پس ان اجزائے نیزہ اور فنِ نیزہ بازی سے متعلق اصطلاحات کی تشریح بھی کیجائے۔ کیونکہ بغیر اس کے کلام کی حقیقی اور اضافی خوبیاں ہر شخص نہیں سمجھ سکتا۔

"تلوار" کے ذکر میں میر صاحب نے ایک تلوار کے بہت سے نام لئے ہیں۔ مثلاً "تلوار" "شمشیر" "سیف" "تیغ" "پٹیلا" "کھانڈا" "سروہی" "نیمچہ" وغیرہ

ظاہر ہے کہ "تلوار" کا ذاتی نام صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ "تلوار" "تیغ" یا "سیف" باقی صفاتی ہیں۔ جب صفاتی ہیں تو اُن کی نوعیت میں بھی کم و بیش فرق ہونا چاہیئے۔ پس فٹ نوٹ کے ذریعے سے یہ بتایا جائے۔ کہ ان سب ناموں کا مسمیٰ یہ ایک تلوار ہے۔ جو ہم ہمیشہ سپاہی کی کمر میں بندھی دیکھتے ہیں یا مختلف صورتیں ہوتی ہیں۔ اور وہ اختلاف بتایا جائے۔

"تلوار" کے ساتھ اس کے اوصاف "گھاٹ" "کس" "بل" "دم" "خم" "آب" "تاب" "چمک" "دمک" "برق" "شرق" "نوک" "جھوک" "گھیت" "پانی" "منہ" "زبان" "باڑہ" "پشہ" "ابی ہوئی" وغیرہ کی جداگانہ تشریح و تعریف کیجائے۔ اس سے نہ صرف میر انیس کی پایہ شناسی میں مدد ملے گی۔ بلکہ ساتھ کے ساتھ "ادبی" "عروضی" "اخلاقی" "تاریخی" اور "اصطلاحی" معلومات کی ایک نہایت عمدہ فرہنگ تیار ہو جائیگی۔

مجھے اس وقت ایک بات یاد آئی۔ جو بجائے خود لطیفہ ہے۔ کوئی دو برس ہوئے۔ راقم کو ایک لکھنوی ذاکر کی عزتِ میزبانی نصیب ہوئی۔ قابلِ زیارت نوجوان۔ مشہور ذاکر۔ خاندانِ میر صاحب سے تعلق تلمذ بیان فرماتے تھے۔ بے تکلف صحبت تھی۔ میر صاحب کے مرثیوں کے چیدہ چیدہ بند سنانے لگے۔ "پیلا" "سروہی" "کھانڈا" وغیرہ الفاظ جو آئے تو ایک صاحب پوچھ بیٹھے کہ "حضت"! پیلا، سروہی اور کھانڈا میں کیا فرق ہوتا ہے"؟ تیور بدل کر فرمایا "اے حضت! یہ بال کی کھال نکالنا بز قصابوں کی طرح کچھ پنجابیوں ہی کو خوب آتا ہے۔ یہ کوئی لنڈھن (لنڈن) تو ہے نہیں۔ کہ طرحاں طرحاں (طرح طرح) کی تلواریں بنتی ہوں۔ بس یہی ایک تلوار ہے۔ جو آپ ہمیشہ دیکھتے ہیں"۔ ماشاء اللہ!

اُنھوں نے پھر پوچھا۔ "او حضور! یہ "آپی ہوئی" کیا؟" بڑی سنجیدگی سے جواب دیا: "اے جناب! یہی "آپی ہوئی" ہوتی نہیں کیا؟ "آپی ہوئی" اس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

پس جب اہلِ لکھنؤ کا یہ حال ہو۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جن کو وہ عجم سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خود میر انیس علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے۔ کہ "اس کلام کو اسی شہر کے لوگ سمجھ سکتے ہیں۔ اور کوئی اس کی قدر کیا جانیگا! اور ہماری زبان کے لطف کو کیا سمجھیگا" لہٰذا واجب آیا۔ کہ میر صاحب کا کلام اور لطفِ زبان بھی خواہان و خیر اندیشانِ اُردو کو سمجھایا جائے۔ اور یہ اسی طرح ممکن ہے۔ کہ میر صاحب کے کلام کو بتصحیح و تحشیہ نہایت تکلف۔ صحت اور اہتمام سے چھاپا جائے۔ جس طرح منشی رحمۃ اللہ رعد نے اپنے نامی پریس کانپور میں "مسدس حالی" نہایت صحت صفائی تشریح اور حواشی کے ساتھ چھاپا ہے۔ اس میں تلمیحات کی تشریح نہایت اہتمام اور التزام سے کیگئی ہے۔ چنانچہ مسدس مذکور کا ایک مصرع ہے۔ "جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی"۔ علاوہ ٹیگس اور گنگا کی جغرافیائی کیفیت بیان کرنے کے۔ ناظرین کی دلچسپی اور تعارف کے لئے ٹیگس اور گنگا کا نقشہ بھی شاملِ کتاب کر دیا ہے۔

بہرحال "منتخبات انیس" اسی حسن و اہتمام سے چھپنا چاہئے۔

عرصہ ہوا میں نے اپنا یہ خیال علامہ شبلی کی خدمت میں عرض کیا تھا۔ ممدوح نے اس رائے کی پُرزور الفاظ میں تائید اور اس خیال کی بیحد تعریف فرمائی تھی۔ بلکہ خود اس کے سرانجام فرمانے کا وعدہ فرمایا تھا۔ مگر غالباً بوجہ کثرتِ مشاغل اس کے لئے وقت نہ نکال سکے۔

پھر مولوی فضل الحسن حسرت موہانی کی خدمت میں لکھا۔ انہوں نے تحریر فرمایا "کہ میر انیس مرحوم کے باب میں جو کچھ آپ نے تحریر فرمایا ہے اس سے مجھ کو بھی

اتفاق ہے۔ میرے ایک دوست منشی میر احمد علوی بی۔ اے کاکوروی جو مولوی محسن صاحب کاکوروی کے لائق نواسے ہیں۔ وہ پہلے ہی سے منتخبات میر انیس کی ترتیب کا تہیہ کرچکے ہیں۔ میں آپ کا خط اُنکو بھیجوں گا۔ اُمید کہ جناب موصوف اپنی تالیف میں آپکے مشورہ صائب کا لحاظ رکھیں گے۔ میں خود بھی اُنکو تاکید کرونگا"۔

لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ منشی میر احمد صاحب کی تالیف کی نوعیت جدا ہے۔ لہٰذا میں اس مضمون کے ذریعے سے خاص طور پر بہ ادب علامہ شبلی نعمانی کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں۔ کہ آپ اس کام کو سرانجام فرمانے کا وعدہ فرمائیں۔ چھپوانے کا میں ذمہ وار ہونگا۔

مولوی محمد عزیز مرزا صاحب بی۔ اے ہلوی اور جناب میر رشید صاحب (یادگار جناب میر نفیس مرحوم) کی خدمت بابرکت میں بصد عجز التجا ہے۔ کہ آپ بوجہ احسن اس کام کو سرانجام فرماسکتے ہیں۔ آپ اپنے بے بہا وقت کا کچھ حصہ تھوڑے عرصہ کے لئے اس کام کے واسطے وقف فرماکر۔ ملک و قوم پر احسان فرمائیں۔ بلکہ بعض وجوہ سے یہ آپ کا فرض ہے۔ آپ ضرور اسے ادا فرمائیں۔

اگرچہ یہ کام چنداں مشکل نہیں۔ زندہ دلانِ پنجاب بھی اس کو سرانجام کرسکتے ہیں (اور ممکن ہے بالآخر اُنہی کو کرنا پڑے) لیکن میں چاہتا ہوں کہ اس کی تکمیل کا سہرا لکھنؤ کے سر رہے۔ تحریک کی عزت پنجاب کو حاصل ہے۔

سید علمدار حسین واسطی

(از پٹیالہ)

آگ اور پانی

عام خیال تو یہ ہے کہ پانی آگ کو بجھا دیتا ہے کیونکہ پانی تر ہے۔ اور آگ اور پانی میں ہمیشہ سے عداوت چلی آتی ہے۔ ان میں نہ کبھی موافقت ہوئی ہے اور نہ ہونی ہے۔ مگر در اصل یہ مسئلہ اس قدر آسان نہیں ہے جیسا بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ جب آگ اور پانی ملتے ہیں تو کارکنان قضا و قدر کیا کر رہے ہوتے ہیں۔ ہمیں اوّل یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ آگ کیا چیز ہے اور جب یہ بات سمجھ میں آجائے گی تو سائنس کے اس مشہور حصّہ کا جسے علم کیمیا کہتے ہیں ایک اہم مسئلہ نہایت آسانی سے حل ہو جائیگا۔ جب کسی گھر کو آگ لگ جاتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ وہ جل رہا ہے مگر کوئی چیز بغیر ہوا کی امداد کے نہیں جل سکتی۔ ہوا کو ہٹا لو تو پھر جس طرح ایک دیا سلائی دکھانے سے لوہے کا شہتیر نہیں جل سکتا۔ اسی طرح پھونس اور لکڑی کے گھر کو بھی آگ نہیں لگ سکتی۔ جس طرح انسان کے زندہ رہنے کے لئے ہوا درکار ہے اسی طرح آگ کو بھی ہوا کی ضرورت ہے۔

ہوا میں خاصکر دو دکھائی نہ دینے والی گیسیں شامل ہیں۔

(۱) آکسیجن۔

(۲) نائٹروجن۔

آگ جلانے کے لئے صرف آکسیجن کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ جب کوئی چیز جلتی ہے تو ہوا کی آکسیجن جلنے والی چیز کے ساتھ مل جاتی ہے۔ اور اس چیز کی بجائے دوسرے نئے مرکبات تیار ہو جاتے ہیں۔ جلنے والا گھر راکھ کے تودے اور اڑنے والے دھوئیں کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ مگر اس قلب ماہیت

سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی - بلکہ وُہ ایک نئی صورت اختیار کر لیتی ہے - اور نیچر کے کارندے جو آگ کی ماتحتی میں کام کرتے ہیں - لکڑی کے باریک ذرّوں کو دوبارہ ترتیب دیکر اُن کی صورت بدل دیتے ہیں - اور لکڑی کا کچھ حصّہ سیاہ مادّہ کی صورت میں زمین پر پڑا رہجاتا ہے - اور کچھ حصّہ بڑے بڑے بادل بنکر آسمان کیطرف اُڑجاتا ہے -

جلنے سے پہلے لکڑی یا اور کوئی شے حرارت کے اُس درجہ تک گرم ہونی چاہئے جسے "جلانے والی حرارت" کہتے ہیں - اور جس کا درجہ بہت اونچا ہوتا ہے مختلف چیزوں کے جلنے کے لئے مختلف درجوں کی حرارت - یا گرمی کی مختلف مقدار درکار ہوتی ہے -

لکڑی یا اور مختلف اشیاء کو جنہیں ہم رات دن برتتے ہیں جلانے کے لئے اوّل ہم انہیں جلانے والی حرارت کے درجہ تک گرم کرتے ہیں - پھر ہوا کی آکسیجن اُن کے ساتھ ملتی ہے اور وُہ جلنے لگتی ہیں -

خُدا کے جہاں ہم پر اور بہت سے احسان ہیں اُن میں سے ایک یہ بھی بڑا احسان ہے - ورنہ اگر کہیں جلانے والی حرارت کا درجہ اُونچا ہونے کے بجائے نیچا ہوتا تو ہوا میں اس کثرت سے آکسیجن موجود ہے کہ وُہ روئے زمین کی تمام جلنے والی چیزوں کے ساتھ مل کر انہیں خاک سیاہ کر دیتی -

پانی آگ کو کیونکر بجھاتا ہے ؟

اس مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اوّل ہمیں یہ بھی جان لینا چاہئیے کہ خود پانی کیا چیز ہے ؟ پانی میں بھی نہ دکھائی دینے والی دو گیسیں ہیں - یعنی

(۱) آکسیجن -

(۲) ہائیڈروجن -

گر یہ ہوا میں آکسیجن اور نائٹروجن کی طرح یُوں ہی نہیں ملی ہوئیں۔ بلکہ کیمیاوی طریقے سے اِس طرح ملائی گئی ہیں کہ اُن سے ایک تیسری چیز بن گئی ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے مگر گرمی سے ان دونوں گیسوں کا یہ کیمیاوی اتصال اور ارتباط ٹوٹ جاتا ہے اور سیال مادہ ضائع ہو کر آکسیجن اور ہائیڈروجن ایک دُوسرے سے علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر جس قدر حرارت سے یہ دونوں گیسیں ایک دوسرے سے علیحدہ ہوتی ہیں اُس سے کم درجے کی حرارت سے وُہ پانی سے بھاپ کی صُورت اختیار کر لیتی ہے۔

پس اب پانی سے آگ بجھ جانے کا مسئلہ حل ہوا چاہتا ہے۔

فرض کرو کہ ایک گھر جل رہا ہے اور آگ بجھانے والے لوگ انجن سے اُس پر پانی چھڑک رہے ہیں۔ اور چُونکہ جلتی ہُوئی لکڑیوں کی حرارت اس قدر تیز ہوتی ہے کہ وُہ پانی کو فوراً بھاپ بنا دیتی ہے۔ پس اس طرح جو حرارت پانی کو بھاپ بنانے میں خرچ ہوتی ہے وُہ خود لکڑی کی حرارت میں سے کم ہو جاتی ہے۔ اور اگر پانی کی مقدار زیادہ ہو تو وُہ رفتہ رفتہ جلتی ہُوئی لکڑی میں سے اس قدر حرارت جذب کر لیتا ہے کہ آخر کار خود لکڑی کی حرارت جلانے والی حرارت کے درجہ سے کم ہو جاتی ہے۔ اور حرارت کے اس درجے سے کم ہونے ہی ہَوا کی آکسیجن لکڑی کے ذرات کے ساتھ ملنی بند ہو جاتی ہے۔ اور آگ بجھ جاتی ہے۔

پس معلوم ہوا کہ کارکنانِ قضا و قدر جو آگ اور پانی کے ماتحتی میں علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہیں۔ وُہ چیزوں کے ذرات کے باہمی اتصال کے متعلق لڑا کرتے ہیں۔ جب آگ جلتی ہے تو وُہ ہَوا کی آکسیجن کو لکڑی کے ذرات کے ساتھ ملا کر اُنہیں راکھ اور دُھوئیں کی صُورت میں ترتیب دیتی ہے یا لکڑی جل کر کوئلا ہو جاتی ہے۔

مگر جب پانی کی رگِ حمیت جوش میں آتی ہے تو وُہ آگ کی یہ دراز دستی نہیں

گوارا کرتا۔ اور میدان میں آکر جلتی ہوئی آگ پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ اور جلتی لکڑی کی حرارت کا اس قدر حصّہ بھاپ بننے میں جذب کر لیتا ہے کہ آخر کار وُہ جلانے والی حرارت کے درجہ سے کم ہو جاتی ہے۔ اور ہوا کی آکسیجن آگ کو قائم رکھنے کے لئے لکڑی کے ذرّات کے ساتھ نہیں مل سکتی۔ اور لکڑی اپنی اصلی صورت میں قائم رہتی ہے یا لکڑی کا گھر بنا رہتا ہے۔

پانی بیچ میں پڑ کر اوّل ہوا کی آکسیجن کو لکڑی کے ساتھ نہیں ملنے دیتا۔ پھر اپنے قدم جماتا ہے۔ پھر بھاپ بنکر لکڑی کی حرارت کم کر دیتا ہے اور پھر اگر آکسیجن میدان میں آبھی جاتی ہے تو محض لاشے اور بیکار ثابت ہوتی ہے۔

لیکن یہ لڑائی دم کے دم میں سر نہیں کر لی جاتی۔ بلکہ اگر دونوں طرف طاقت برابر ہوتی ہے تو گھنٹوں جاری رہتی ہے۔ اور دونوں طرف سے داؤ گھات ہوتے رہتے ہیں۔ اور نہیں معلوم ہوتا کہ کون فتحیاب ہوگا اور کس کو شکست ملیگی۔ کبھی پانی کی ایک زبردست رَو آگ کے شعلوں کے ساتھ ٹکرا کر آسانی سے پہلے ہی حملہ میں اُنہیں نیم جان کر کے فتح حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن اگر اور پانی کی کمک وقت پر نہ پہنچے تو حرارت زیادہ ہو کر آگ کے شعلے پہلے سے بھی زیادہ زور کے ساتھ بھڑکنے لگتے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پانی تیل کا کام دے رہا ہے۔ یا پانی میں آگ لگ رہی ہے +

محمد سعید صوفی (از سمالی لینڈ
افریقہ)

پیرس کا ایک سوداگر

موسیو شوشارد پیرس کی تجارتی دنیا میں ایک نہایت نامور شخص تھا جو تھوڑا عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے۔ کپڑے کی دوکانوں میں شاید سب سے بڑی دوکان پیرس میں اسی کی تھی۔ یہ شخص بالکل اپنی قوتِ بازو سے دولتمند بنا تھا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ تجارت میں اس کا دماغ خوب لڑتا تھا۔ مگر اس کی طبیعت کی بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ نئے نئے خیال اور نئی نئی ترکیبیں کاروبار کی ترقی کی ایجاد کرتا رہتا تھا پیرس کی عورتوں میں اس کا نام زیادہ تر اس لئے یادگار رہیگا کہ وہ کپڑوں کے ٹکڑوں کی "سیل"[1] کا بانی تھا۔ سُنا ہے کہ جب اُس نے پہلے پہل اپنے کارندوں کو حکم دیا کہ قیمتی ریشموں کے ہزاروں نئے تھانوں کو پھاڑ کر مختلف ماپ کے چھوٹے بڑے پارچے کر دیئے جاویں اور وہ یوں بیچے جائیں کہ گویا بچے کھچے ٹکڑے ہیں نہ صرف اور سوداگر اس خبر کو سُن کر حیران ہوئے بلکہ خود اس کے ملازم متحیر تھے کہ یہ کیسا حکم ہے۔ مگر جس قدر کامیابی اس کی دوکان کو اس تدبیر سے ہوئی اِس سے ثابت ہو گیا کہ اس کا خیال بہت دور پہنچا تھا۔ اس کے ہمسروں نے بھی تھوڑی دیر بعد اس کی تقلید شروع کی اور اب فرانس میں یہ رواج بہت عام ہے اور دوسرے ملکوں میں بھی پسند کیا جانے لگا ہے۔

دوکان کے اشتہار کے لئے ایک اور خوبصورت تجویز اسے سوجھی تھی اور وہ یہ کہ رنگا رنگ کے چھوٹے چھوٹے بیلون ربر کے اس نے بنوا کے

---

[1] لفظی معنے فروخت کے ہیں۔ اصطلاح میں فروخت کے اس طریق کو کہتے ہیں۔ جس میں مال تمام کے موقع پر دوکان کی سب چیزیں رعائتی قیمت پر بیچی جاتی ہیں۔

جن پر دوکان کا نام لکھا ہوا تھا۔ یہ بیلون ان بچوں کو جن کے والدین اس دوکان سے سودا لینے آتے تھے۔ مُفت دیئے جاتے تھے اور اس طرح ہر بچہ اس دوکان کا اشتہار ان بیلونوں کو ہوا میں اُڑا اُڑا کر دیتا پھرتا تھا۔

آجکل کپڑے کی بڑی بڑی دوکانوں میں گاہکوں کے چائے پانی کا انتظام اور اس کے لئے ایک خاص کمرہ ایک معمولی بات ہے جہاں دوکان کی طرف سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ مگر شاید پیرس میں سب سے پہلے موسیو شوشارد کو ہی یہ سوجھی تھی کہ اپنے ہاں کے خریداروں کو مفت چائے قہوہ وغیرہ پلائے۔ اور اس زمانہ میں اس خاص صیغے کی طرف خلقت کا اس زور سے رجوع ہوا تھا کہ وہ خود اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ اس تجویز کی کامیابی تکلیف دہ ثابت ہونے لگی ہے۔

موسیو شوشارد نے بے انتہا روپیہ پیدا کیا اور مرتے وقت نہایت فیاضی سے اُسے مفید عام اور خیراتی کاموں میں لگا گیا۔ وہ لاوارث تھا مگر اپنے دوستوں اور ملازموں سے جاتے جاتے ایسا سلوک کر گیا جو عزیزوں اور رشتہ داروں سے بھی مشکل ہو سکتا ہے۔ ایک لاکھ بیس ہزار پاؤنڈ یعنی اٹھارہ لاکھ روپیہ اپنے کارخانے کے ملازموں میں تقسیم ہونے کے لئے اُس نے چھوڑا۔ اپنے دوست اور مشہور ملکی مدبر جارج لیگ کو چار لاکھ اسی ہزار پونڈ۔ اس کی بیوی کو چالیس ہزار پونڈ اور اس کے دونوں بیٹوں کو چالیس چالیس ہزار پونڈ دے گیا۔ فگارو نام ایک اخبار پیرس سے روزانہ نکلتا ہے وہ اُسے پسند تھا۔ اس کے ایڈیٹر کے حق میں اسی ہزار پونڈ کی وصیت کی۔ پیرس کے غربا کے لئے آٹھ ہزار پونڈ اور ایسی ہی متعدد اور رقمیں وہاں کے خیراتی کارخانوں کے لئے چھوڑ مرا۔ ایک نیکدل خاتون

میڈم بورسین جس کے حق میں یہ وصیت تھی کہ جو کچھ مندرجہ بالا تقسیم کے بعد بچے وہ اسے مل جاوے۔ فیاضی میں وصیت کرنے والے کے برابر ثابت ہوئی اور متوفی کے جنازے کے روز اس نے اعلان کیا کہ وہ غربا پیرس کے واسطے چالیس ہزار پونڈ وقف کرے گی۔ جنازہ اس دھوم سے اُٹھا کہ سارے پیرس میں یہ چرچا تھا کہ اس شان کا جنازہ کم دیکھنے میں آیا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ متوفّی نے اپنی تجہیز و تکفین کے متعلق سارا انتظام خود کر رکھا تھا اور کسی کو اس کے مرنے کے بعد کچھ تکلیف اس اہتمام کے لئے اُٹھانی نہیں پڑی۔ اس نے اپنی محنت نیکی اور لیاقت سے اپنی زندگی میں بڑے سے بڑے اعزاز حاصل کئے۔ پریزیڈنٹ لوبے اس سے دوستانہ مراسم رکھتا تھا۔ اور اس کی بڑی عزّت کرتا تھا۔ جیا تو نیک نام جیا اور مر کے بھی نام کر گیا +

رمسز عبدالقادر



"قدرِ نعمت بعدِ زوال"

وقار۔ دادا جان میں تو اسکا قائل نہیں ہوں کہ پرانے زمانے کا طرز معاشرت اس زمانہ سے بہتر تھا۔ ہزاروں ایسی چیزیں ہماری راحت کے لئے ایجاد کی گئی ہیں کہ بغیر انکے گزارا نہیں ہو۔ پرانا نائیٹیما تو زمانہ گذشتہ کا دلدادہ نہیں ہوں"۔

میر افتخار علی۔ بیٹا وقار یہ تو سب سچ ہے لیکن اگلے زمانے کی بات کہاں! کیسی سادہ زندگی تھی۔ اگلے وقتوں کے اخلاق اُن لوگوں کی مروت۔ وضع کی پابندی! آج کل روزمرہ جو جھگڑے بکھیڑے پیش آتے رہتے ہیں ان سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ آج ہی صبح کا حال سنو! میں ایک ضروری کام سے جا رہا تھا۔ اثنائے راہ میں میری موٹر بگڑی۔ خدا نے فضل کیا کہ میرے ایک دوست ادھر سے گذرے جو میں اُنکے ساتھ ہولیا ورنہ میرا بڑا ہرج ہوتا۔ میں تو بعض وقت اس نئی روشنی سے بہت اُکتا جاتا ہوں۔ انسان کا کام کبھی بند نہیں رہتا ہے۔ کاش وُہ اگلا زمانہ ہوتا تو عذاب سے نجات ہوتی"۔

وقار۔ دادا جان! میں آپ سے اس خیال میں اتفاق رائے نہیں کرتا۔

کتب خانہ کے کمرہ میں یہ گفتگو میر صاحب اور انکے پوتے میاں وقار علی میں ہو رہی تھی جو ٹیلیفون کی گھنٹی میز پر بجی۔ اس کمرہ میں چند نہایت عمدہ الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی تھیں۔ یہ کمرہ بہت وسیع اور روشن تھا۔ کھلی ہوئی چوڑی کھڑکیوں میں سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے خوشگوار جھونکے آ رہے تھے۔ مشہور شعرا اور مصنفوں کے چھوٹے چھوٹے مجسمے جابجا رکھے ہوئے تھے۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی میر صاحب میز کے پاس آئے۔ اور وقار اپنے کمرہ میں چلا گیا۔

میر افتخار علی صاحب بڑے لائق اور ذی علم شخص تھے۔ انگلستان کے تعلیم یافتہ اور بارسٹر تھے۔ وُہ ایک نہایت ہی عالیشان کوٹھی میں جس کا نام "افتخار ہال" تھا اپنے اہل و عیال کے ساتھ رہتے تھے۔ یہ عمارت سہ منزلہ تھی اور انواع و اقسام کے انگریزی عمدہ فرنیچر سے آراستہ تھی۔ مکان کے سامنے ایک خوبصورت باغ تھا جس میں ٹینس اور بیڈمنٹن کورٹ تھے۔

صاحب موصُوف دولتمند آدمی تھے اور بالکل انگریزی طریقہ سے رہتے تھے۔ افتخار ہال نہایت پُرتکلف سجا ہُوا تھا۔ ہر کمرے میں برقی روشنی اور برقی پنکھے لگے ہُوئے تھے۔ دیواروں پر جابجا نامی گرامی مصوّروں کی کھینچی ہُوئی نفیس رنگین تصویریں قرینہ سے لٹکی ہُوئی تھیں۔ سیڑھیوں کے سوا "لفٹ" بھی تھے۔ جن پر بیٹھ کر آدمی نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے پل بھر میں پہنچ جاتے اور چڑھنے اُترنے کی زحمت سے بچے۔ غرض یہ کہ زمانہ جدید کی کوئی ایسی ایجاد نہ تھی جو وہاں مہیا نہ ہو۔

میر صاحب نے چند خطوط لکھے۔ پھر کچھ غنودگی سی معلوم ہونے لگی تو ایک کتاب لے کے آرام کُرسی پر جا بیٹھے۔ اِتنے میں انکو خیال آیا کہ ڈاک کا وقت نکلا جاتا ہے۔ چاہا کہ ٹکٹ لگا کر لفافے نوکر کے حوالہ کریں کہ ڈاک میں ڈال آئے۔ لیکن اب نہ وُہ میز تھا اور نہ سٹامپ کی ڈبیا۔ کمرے کا رنگ ہی کچھ نرالا تھا۔ اس آراستہ کُتبخانہ کے عوض میں اُنہوں نے اپنے تئیں ایک پُرانے زمانہ کے دیوانخانہ میں پایا۔ جس میں نہایت عمدہ فرش بچھا ہُوا تھا اور ایک طرف قلمدان رکھا ہُوا تھا۔ برقی گھنٹی کی جانب گئے تو وُہ بھی غائب تھی۔ اب بیچارے بہت حیران ہُوئے۔ نوکر کو بُلانا شروع کیا۔ مگر صدائے برنخاست۔ انہیں ایک مقدمہ میں تار دینا تھا۔ کمرہ میں نہ تو فارم تھے۔ نہ کوئی اور چیز اپنے ٹھکانے

پر تھی۔ اب اُنہوں نے شور مچانا شروع کیا تو وقار دوڑتا ہُوا اندر چلا آیا اور گھبرا کے پُوچھا کہ "دادا جان خیر تو ہے آپ کا مزاج کیسا ہے"؟

میر صاحب۔ "میرا مزاج تو اچھا ہے لیکن نوکر کہاں چلا گیا ہے۔ نہ مجھ کو ٹیلیگراف فارم ملتے ہیں اور نہ اسٹامپ ہی ہیں۔ یہ خط ٹپہ؎۱ میں ڈالنے کے لئے تیار ہیں اور ایک اشد ضروری تار فی الفور مجھ کو دینا ہے مگر یہاں سے خدا جانے سب چیزیں کہاں غائب ہو گئی ہیں"۔

وقار۔ "دادا جان یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ اسٹامپ اور ٹیلیگراف فارم کیا چیزیں ہیں"؟

میر صاحب۔ "سنو وقار یہ وقت تمسخر کا نہیں ہے۔ میرا کام برباد ہُوا جاتا ہے۔ اگر میرے بلانے سے کوئی نہیں آتا ہے تو مَیں خود ٹیلیگراف آفس جاتا ہُوں"۔ یہ کہکر وُہ وقار کو حیران و پریشان چھوڑ کر جلدی سے باہر چلے گئے۔ وہاں گئے تو اَور ہی تماشا دیکھا۔ نہ وُہ انگریزی وضع کے مکانات تھے اور نہ وُہ عمدہ سڑکیں۔ کچھ عجیب طرح کی دیسی عمارتیں جنکا اُنہوں نے اپنے بچپن میں حال اکثر سُنا تھا نظر آئیں۔ بہرحال اُنہوں نے ٹیلیگراف آفس کی طرف رُخ کیا۔ مگر وہاں اُسکا نام و نشان نہ پایا۔ اس جگہ پر ایک پُرانی بارہ دری تھی جس کے آگے چند میلے کچیلے بچے کھیل رہے تھے۔ تب تو میر صاحب ذرہ گھبرائے کہ یہ ماجرا کیا ہے؛ لڑکوں سے پُوچھا کہ پوسٹ اور ٹیلیگراف آفس جو اس جگہ پر تھے وہ کیا ہُوئے؛ یہ سُنکے لڑکوں نے بے تمیزی سے خوب ہی قہقہے لگائے اور کہنے لگے کہ "بڑے میاں کہیں تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا ہے"؟ یہ کہکر وُہ ہنستے ہُوئے پھر کھیل میں مشغول ہو گئے۔

بیچارے میر صاحب واپس گئے۔ اب گھر کا منظر کچھ اَور ہی پایا۔ جاتے وقت

؎۱ دکن میں ڈاک خانہ کو ٹپہ کہتے ہیں۔

جلدی میں انہوں نے خیال نہیں کیا تھا لیکن اب دیکھا کہ افتخار ہال کا کہیں پتا نہیں ہے
اسی کی جگہ ایک نفیس اگلے زمانے کی عمارت ہے۔ انہوں نے اسکو مطلق نہیں پہچانا مگر
وقار کو اور چند خدمتگاروں کو دروازہ پر دیکھ کے وہ اندر چلے گئے۔ اور کہنے لگے
کہ "دیکھو بیٹا نہ تو کہیں پوسٹ آفس ہے اور نہ تارگھر جو میں تار دیدوں۔ میری
موٹر کار تم جلدی سے منگوا دو تاکہ میں ریل کے اسٹیشن پر ٹھیک وقت پہنچ جاؤں"
یہ کہہ کر وہ جیب میں ہاتھ ڈال کے جیبی گھڑی نکالنا چاہتے تھے جو انہوں نے
پہلی مرتبہ خیال کیا کہ وہ انگریزی "سوٹ" پہنے ہی نہیں ہیں اور نہ کہیں جیبی گھڑی کا
پتہ ہے۔

میر صاحب۔ "لاحول ولا قوۃ واچ بھی غائب ہو گئی اور میں نے یہ کپڑے
خدا جانے کہاں سے لے کے پہن لئے ہیں۔ خیر وقار ذرا جلدی سے
موٹر منگوا لو۔ یہ تم سب کے سب میرا منہ کیوں تک رہے ہو؟"

وقار۔ (دبی ہوئی آواز سے) "دادا جان موٹر کیا چیز ہے؟ یہاں تو نہ واچ
ہے اور نہ ریل۔ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ یہ کیا چیزیں ہیں"۔

میر صاحب۔ (چیں بجبیں ہو کر) وقار میں تم پر خفا نہیں ہونا چاہتا
ہوں لیکن تم کو آج ہو کیا گیا ہے۔ "جو میری بات تم سمجھتے ہی نہیں ہو۔ بہرحال
خدا کے لئے کوئی سواری کیوں نہ ہو جلد ان نوکروں سے کہکر منگاؤ۔ کیونکہ میرا
بنا ہوا کام بگڑا جاتا ہے"۔

وقار۔ "اگر آپ سواری کے واسطے پہلے ہی کہتے تو میں منگوا دیتا (نوکر سے
مخاطب ہو کر) دیکھو میانہ جلد منگواؤ"۔

میر صاحب۔ "میانہ کیا! اس میں تو بیمار سوار ہوتے ہیں۔ بلا سے مری لینڈو گاڑی
اور جوڑی ہی تیار کرا دو۔ میں موٹر سے باز آیا"۔

وقار۔ دادا جان یہاں سوائے گھوڑوں رتھوں اور میانوں کے اور کوئی سواری نہیں ہے۔ اسی وقت سولہ کہار عمدہ وردیاں پہنے ہوئے میانہ کے لئے حاضر ہوئے۔ میر صاحب بہزار دقت اس پر بیٹھ کر سوار ہوئے اور اسٹیشن کا راستہ لیا۔ وہاں پہنچ کے دیکھتے کیا ہیں کہ اسٹیشن کیا ہو گیا" تو وہ کہنے لگے ہم نے تو ریل ویل کوئی چیز سنی نہیں۔

ایک شخص نے کہا کیا افسوس کی بات ہو کہ میر صاحب دیوانوں کی سی باتیں کر رہے ہیں"۔ دوسرے نے جواب دیا کہ سچ تو ہے کچھ بہکی بہکی باتیں کرتے ہیں۔ یہ ریل خدا جانے کیا بلا ہے۔ اب وہ شاید ستر سے بہتر ہو گئے ہیں!"

میر صاحب بیچارے سراسیمہ اور پریشان حال پھر گھر واپس گئے۔ یہ وجع مفاصل کے مارے ہوئے تھے اور ان سے فرش پر بیٹھا نہیں جاتا تھا۔ کرسیاں اور میز اُنہوں نے طلب کیں تو نوکر چاکر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ غصہ کے مارے اُن کا بُرا حال تھا۔ آخر کو اُنہوں نے کہا "خدا کے لئے کچھ بیٹھنے کو بھی دو گے یا نہیں"۔ وقار نے دوڑ کے ایک مونڈھا لا دیا۔ جب یہ بیٹھے۔ لیکن اُن نرم نرم آرام کرسیوں کی بات کہاں! شام کو شمعیں روشن کی گئیں۔ انہیں کسی طرح برقی روشنی کی یاد نہیں بھولتی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد وقار آیا اور اس نے کہا کہ "دادی جان آپ کو کھانا کھانے کے لئے بلاتی ہیں"۔

میر صاحب "بیٹا تم کیوں آئے۔ کھانے کی گھنٹی کیوں نہ بجا دی"۔

وقار۔ کھانے کی گھنٹی کیسی ہوتی ہے"؟

میر صاحب "(حیرت میں) کیسی ہوتی ہے! سیکڑوں مرتبہ تو تم ہی نے بجائی ہوگی"۔

دونوں اندر گئے۔ وہاں فرشی دسترخوان پُر تکلف اور لذیذ ہندوستانی

کھانوں سے چنا ہوا دیکھا اور پوچھنے لگے کہ آج کھانا میز پر کیوں نہیں منگایا۔ تم کو خوب معلوم ہے کہ مجھ سے فرش پر نہیں بیٹھا جاتا ہے۔ کیونکہ میرے پاؤں میں سخت درد ہے"۔ شہر کے "چمچے کانٹے کیا ہوئے"؟

دل آرا۔ "دادا جان یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ کانٹے تو جنگلوں میں ہوا کرتے ہیں اور چینی کے چمچے موجود ہیں"۔

میر صاحب جھنجھلا کے رہ گئے۔ سب کے حواس باختہ تھے اور ان سب کو یقین ہوا جاتا تھا کہ وہ دیوانے ہو گئے تھے۔ وہ سکتے کی حالت میں تھے اور اپنے جی میں کہتے تھے کہ "خدایا یہ کیا واردات ہے کہ کوئی میری بات نہیں سمجھتا"۔ کھانے سے فارغ ہو کے انہوں نے سگرٹ اور سگار مانگے۔ وہ بھی جب نہ ملے تو انہوں نے حقہ طلب کیا۔ پھر آرام کرنے کو خوابگاہ تشریف لے گئے۔ وہاں بھی روزمرہ کی چیزوں کا جن کے وہ عادی تھے نام نہ پایا۔ اور انکو بے انتہا تکلیف ہوئی۔ لیکن مہذب اس قدر تھے کہ انہوں نے دم نہ مارا۔ صبح کو جب یہ باہر آئے تو چائے وائے کچھ بھی نہ تھی۔

میر صاحب۔ "آج چائے کیوں نہیں بنائی گئی ہے"۔

خدمتگار۔ (دست بستہ) گستاخی معاف۔ حضور تو کبھی چائے کا استعمال نہیں کرتے تھے جو خادم تیار کرتا"۔

میر صاحب۔ "تم لوگوں کو کچھ جنون تو نہیں ہو گیا ہے۔ خیر چائے جلد لاؤ"۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے جو دوا کے واسطے رکھی تھی ایک چاندی کے کٹورے میں بنا کر لے آیا۔ اور شکر بھی لایا۔

میر صاحب۔ "دودھ کیوں نہیں لایا۔ چائدان میں چائے کیوں نہ دی۔ چائے کا سیٹ کس دن کے لئے رکھا ہے"؟

دِل آرا۔ "دادا جان! چائے کا رسٹ پٹ کیا چیز ہے؟"

میر صاحب چُپکے ہو رہے۔ کچھ جواب نہ دیا۔ جُوں تُوں کر کے چائے پی لی تو ذرہ حواس درست ہُوئے۔ پھر وُہ باہر گئے۔ دیوانخانہ میں اُنہوں نے اپنا قلم بہت ڈھونڈا لیکن وُہ بھی عنقا رد۔ آخر کار انہوں نے وقار کو پاس بلا کر پُوچھا کہ "بیٹا وقار میرا فونٹین پن کہیں نہیں ملتا ہے کیا تم نے اسکو کہیں دیکھا ہے؟"

وقار۔ "جی نہیں دادا جان! دیکھنا تو کجا۔ میں نے اس کا نام تک کہیں نہیں سُنا ہے"۔

میر صاحب (ٹھنڈی سانس لیکر) "ہاں بیٹا سچ ہے۔ یہ ایک اچنبا ہے۔ میری تو عقل کام ہی نہیں کرتی۔ خیر جانے بھی دو۔ تم تو سب کے سب نرالے ہو گئے ہو" وہ بیچارے پھر سراپا غریق بحر حیرت ہو رہے تھے اور کہتے تھے کہ "یا الہی میں نے کونسا گناہ کیا ہے۔ جو اس کی سزا پا رہا ہوں۔ مجھ کو تمام عیش و راحت سے محروم کر کے اس حالتِ پراگندہ میں گرفتار کیا ہے"۔

اسی اثنا میں دفعتاً کسی نے ایسے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا کہ میر صاحب چونک پڑے اور دیکھتے کیا ہیں کہ کتاب ہاتھ میں لئے ہُوئے آرام کرسی پر اپنے قدیم کتبخانہ میں بیٹھے ہیں۔ پہلے تو اکو سکتہ سا ہو گیا۔ اس کے بعد خوب ہنسے اور آواز دی کہ "چلے آؤ"۔ وقار ہاتھ میں ٹینس کا بلا لئے ہُوئے اندر آگیا اور کہنے لگا کہ "دادا جان کیا آپ سو گئے تھے"؟

میر صاحب۔ "ہاں بیٹا! میری آنکھ لگ گئی تھی اور مَیں نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا ہے"۔

وقار۔ "باہر چل کے کہنے گا۔ مَیں بڑی دیر سے آپکا منتظر تھا کہ آپ آئیں تو ٹینس شروع کروں۔ وہاں چائے تیار رکھی ہے اور آپ کا انتظار ہو رہا ہے"۔

میر صاحب: "میں ابھی آتا ہوں۔ وقار میں لاکھ شکر اس کریم کارساز و بے نیاز کا کرتا ہوں کہ وہ صرف میرا خواب وخیال تھا۔ میں درحقیقت زمانہ حال میں ہوں۔ اور میں نے اگلے زمانے سے نجات پائی۔" وقار ہکا بکا ہو کے اُنکا مُنہ تکنے لگا۔ اور اس نے کہا کہ "دادا جان کیا سچ مچ آپ کی رائے بدلگئی ہے"۔

میر صاحب: "ہاں بیٹا واقعی اس خواب نے مجھے بڑا سبق دیا ہے۔ جو جو آسائشیں آج کل ہمیں حاصل ہیں۔ انکی ہمیں قدر نہیں۔ میں نے ان سب کو کھو کر دوبارہ پایا ہے اس لئے اب میں جانتا ہوں کہ یہ کس قدر غنیمت ہیں۔

جب تک یہ مُنہ ہاتھ دھوکے کپڑے بدل کے آئے وقار دوڑتا ہوا باہر باغ میں گیا اور چلا کے کہا "ابا جان! ایک خوشخبری سُناتا ہوں کہ آج سے دادا جان نے عہد کر لیا ہے کہ زمانہ حال کی مذمت نہ کرینگے"۔

یہ سُنکر سب تعجب کرنے لگے کیونکہ میر صاحب اور وقار میں اس بارہ میں بڑی بحث ہوا کرتی تھی اور وہ پُرانے زمانے کی سادہ زندگی کے زبردست طرفدار تھے تھوڑی دیر کے بعد وہ آئے اور اُنہوں نے ہنسکے کہا کہ "ہاں اب میں آج سے معتقد ہو گیا ہوں کہ اپنے بزرگوں کا طرز زندگی اختیار کرنا ہمارے لئے غیر ممکن ہے۔ وہ زمانہ انہیں کے لئے موزون تھا"۔

رمس شجاعت علی (از حیدرآباد دکن)



امیر خسرو

خسرو۔ آپ کا نام ابوالحسن تھا۔ آپ لڑکپن میں لفظ خسرو سے یاد کئے جاتے تھے۔ اسی لحاظ سے آپ نے اپنا تخلص خسرو رکھا۔ آپ سنہ ۶۵۲ھ مطابق سنہ ۱۲۵۴ء کو بمقام مومن آباد ضلع ایٹہ میں پیدا ہوئے۔ سنہ پیدائش میں مورخوں کو اختلاف ہے مگر آپ نے خود اس کا فیصلہ اپنی تصنیف قران السعدین میں کر دیا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

آنچہ بتاریخ ز ہجرت گذشت | بود سنہ ششصد و ہشتاد و ہشت
سال من امروز اگر بر رسی | راست بگویم ہمہ شش بود و سی

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن السعدین سنہ ۶۸۸ھ ہجری مطابق سنہ ۱۲۹۰ء کی تصنیف ہے اور اسوقت آپ کی عمر ۳۶ سال کی تھی اس لئے وہی سنہ صحیح معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

خزانۂ عامرہ و سیر اولیا میں لکھا ہے کہ جس وقت آپ پیدا ہوئے اسوقت آپ کے والد ماجد (سیف الدین) آپ کو ایک پارچہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کی خدمت میں لے گئے انہوں نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ بڑے عارف باللہ ہونگے اور تعجب نہیں کہ خاقانی سے دو چار قدم بڑھ جائیں۔

آپ نے سنہ ۶۵۶ھ ہجری مطابق سنہ ۱۲۵۸ء تک وطن ہی میں پرورش پائی اور سنہ ۶۶۰ھ مطابق سنہ ۱۲۶۲ء تک دہلی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ افسوس کہ نویں سال سنہ ۶۶۱ھ مطابق سنہ ۱۲۶۳ء کو آپ کے والد ماجد نے دہلی میں انتقال فرمایا۔ آپ نے اس عمر میں اتنا علم حاصل کیا تھا کہ بخوبی شعر کہہ سکتے تھے چنانچہ

اپنے والد کے انتقال پُر ملال کی خبر سُن کر یہ شعر لکھا ؎

سیف از سرم گذشت دِل من دو نیم شد دریائے ما رواں شد و دُر یتیم شد

والد کے انتقال کے بعد آپ نے اپنے نانا عماد الملک سے مدت تک علم و فضل حاصل کیا اور ساتھ ہی ساتھ شاعری بھی شروع کر دی۔ کچھ دنوں تک تو اپنے بھائی اعزالدین علی شاہ سے صلاح لی اور اس کے بعد شمس الدین خوارزمی کی شاگردی اختیار کی۔ جب آپ علوم و فنون ظاہری میں کامل ہو چکے تب آپکو علومِ باطنی کا اشتیاق پیدا ہوا۔ اس لئے آپ حضرت نظام الدین محمد قدس سرہٗ کے مرید ہوئے اور اُس میں بھی کمال حاصل کیا۔ آپ کے مرشد نے آپ کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا۔ چنانچہ آپ خود فرماتے ہیں کہ :۔ ؎

بر زبانت چون خطاب بندہ ترک اللہ رفت دستِ ترک اللہ بگیر و ہم باللہش سپار

چوں من مسکیں ترا دارم ہمینم بس بود شیخ من کس مہربان و خالقم آمرزگار

آپ نے اپنے مُرشد کی مدح میں بہت سے قصائد لکھے ہیں۔ مگر ہم یہاں چند اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔

در حُجرۂ فقر بادشاہے در عالمِ دل جہاں پناہے

شاہنشہ بے سریر و بے تاج شاہانش بخاک پائے محتاج

حاصل کلام امیر خسرو کے کمالاتِ ظاہری و باطنی شاعری اور فضیلتِ علمی کا شہرہ جب عالمگیر ہو اتب غیاث الدین کے بڑے بیٹے محمد سُلطان نے آپکو اپنی مصاحبت میں رکھنے کا اشتیاق ظاہر کیا آپ نے بھی بقول ؎

مرا اہلِ طریقت لباس ظاہر نیست کمر بخدمتِ سُلطان بہ بند و صوفی باش

قبول فرمایا ایک دفعہ شاہزادہ محمد سُلطان نے آپ کے کچھ اشعار لکھ کر شیخ سعدیؒ کی خدمت میں روانہ کیے۔ شیخ نے آپ کی بہت تعریف لکھی اور یہ بھی لکھا کہ یہ

تم کو مبارک باد دیتا ہوں کہ تم نے ایک ایسے فاضل شخص کی مصاحبت اختیار کی۔

آپ پانچ سال تک شہزادے کی مصاحبت میں رہے ۶۸۳ھ مطابق ۱۲۸۴ء کو تیمور مغل نے غیاث الدین کے ملک پر حملہ کیا۔ فریقین میں سخت لڑائی ہوئی۔ شاہزادہ مارا گیا۔ اس کے مصاحب گرفتار ہو گئے۔ لوگوں نے انکو بھی گرفتار کر لیا۔ اور جہول اور توا آپ کے سر پر رکھ کر قید خانہ تک لے گئے۔ چنانچہ آپنے لکھا ہے: -

من کہ بر سرنمی نہادم گل ۔۔۔ یار بر سر نہاد گفتا جل

آپ نے دو سال کے بعد اس قید بلا سے رہائی پائی اور دو پُر زور مرثیے سلطان غیاث الدین کو سنائے جو شاہزادہ کے ماتم میں لکھے گئے تھے۔ جسے سنکر حاضرین دربار بہت ہی روئے۔ خصوصًا بادشاہ نے سب سے زیادہ گریہ وزاری کی اتنی کہ بخار آنے لگا اور تیسرے دن اپنے فرزند سے جا ملا۔ افسوس کہ ہمیں ان مرثیوں کا کوئی شعر نہ ملا۔ ورنہ ہم یہاں نقل کرتے۔ اس کے بعد آپ نے امیر علی میر جاندار کی مصاحبت اختیار کی۔ پھر چند دنوں تک معزالدین کیقباد کی مصاحبت میں رہے پھر سلطان جلال الدین کی ملازمت اختیار کی۔ سات یا آٹھ سال کے بعد اس کا زمانہ بھی ختم ہو گیا۔ پھر آپ سلطان علاءالدین خلجی کی مصاحبت میں آئے۔ یہ بادشاہ علم سے بے بہرہ تھا۔ شاید حرف شناسی آتی تھی لطف یہ کہ بادشاہ کو اس لیاقت پہ غرور بھی تھا۔ اپنے برابر کسی عالم کو نہ سمجھتا تھا چند سال کے بعد اس کا بھی آفتابِ اقبال غروب ہو گیا۔ پھر آپ نے شہاب الدین کی مصاحبت اختیار کی۔ تین ماہ تک اس کے یہاں ملازم رہے اور یہ بھی تین ماہ تک اس کے یہاں ملازم رہے اور یہ بھی تین۔ تک بادشاہ رہا۔ بعد ازاں قطب الدین تخت نشین ہوا۔ آپ اس کے یہاں ملازم رہے اور مثنوی نہ سپہر

اسی کے نام پر لکھی اور اس نے ہاتھی کے ہموزن جواہر صلہ میں عنایت کیے۔ چنانچہ آپ خود لکھتے ہیں :-

شہا گنج بخشا کرم گسترا   معانی شناسا سخن داورا
مرا عمر کو شصت و بالا گذشت   ہمہ پیش شاہان والا گذشت
ازاں پس کہ در شہ ستائی شدم   تونگر ز گنج عطائی شدم
چنیں بخششے کز تو جسم یافتم   در ایام پیشینہ کم یافتم

قطب الدین مبارک شاہ کے بعد خسرو خاں کا زمانہ آیا۔ لیکن آپ نے اس سے کچھ تعلق نہ رکھا۔ چھ ہی سات ماہ کے بعد غازی الملک غیاث الدین تغلق کے خطاب سے سریر آرائے سلطنت ہوا۔ آپ نے اس کی مصاحبت اختیار کی اور تغلق نامہ کو اسی بادشاہ کے نام سے موسوم کیا۔ اس کے بعد محمد شاہ کا زمانہ آیا آپ نے کل گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ہر بادشاہ آپکی عزت و توقیر کیا کرتا تھا۔ آپ کے حالات جن جن مصنفوں نے لکھے ہیں۔ ان کی تصانیف سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے اخلاق و آداب بہت ہی عمدہ تھے۔ آپ سُنّی تھے۔ تعصب چھو نہ گیا تھا۔ راست باز تھے خوش مزاج یار باش۔ بُرد بار اور حق شناس بھی تھے۔ تکلف نام کو نہ تھا۔ کسی کی دلشکنی نہ کرتے تھے اور جو کچھ انعام ملتا تھا اُسے خیرات کر دیا کرتے تھے۔ آپ بہ نسبت بادشاہوں کے اپنے مرشد کے یہاں زیادہ رہا کرتے تھے۔ اکثر رات کو ایک ایک دو دو بج جاتے تب بھی آپ اُٹھنے کا نام نہ لیتے تھے۔

چنانچہ ایک روز آپ اپنے مرشد کے یہاں بیٹھے تھے۔ اتفاقاً ایک مہمان بھی تشریف لائے۔ باتیں جو شروع کیں تو دو بجا دیئے۔ آپ کے مرشد نے اخلاق کی وجہ سے باتیں سُنیں لیکن جب بہت ہی پریشان ہو گئے تب آپ

سے کہا کہ خسرو کیا وقت ہے۔ آپ نے کہا کہ آدھی رات کی نوبت بج رہی ہے۔ اور یہ کہہ رہی ہے۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ خانہ برو۔ خانہ برو۔ نان کہ خوردی خانہ برو۔ نہ کہ بدست تو کردم خانہ گرو۔

آپ کو ایجاد و اختراع کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ آپ نے گیت قوالی ستا اور چار راگنیں۔ قول۔ فارسی۔ ترانہ۔ تصانیفی وغیرہ وغیرہ ایجاد کیں۔ سنہ ۷۲۵ھ مطابق سنہ ۱۳۲۴ء میں حضرت نظام الدین محمد قدس سرہٗ کا انتقال ہوا۔ جب اس کی خبر آپ کو ہوئی تو آپ سیاہ لباس پہنکر چھ ماہ تک مزار مبارک کے پاس بیٹھے رہے۔ آخر الامر ۱۸۔ شوال سنہ ۷۲۵ھ مطابق سنہ ۱۳۲۴ء میں آپ بھی اپنے مرشد سے جا ملے اور اپنے مرشد کے پائین مدفون ہوئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون آپ کے لوح مزار پر یہ اشعار کندہ ہیں ؎

مرا نام نیک است خواجہ عظیم دو شین و دو لام و دو قاف و دو میم
اگر نام یابی دریں حرف ہا بدانیم ہستی تو مرد فہیم

سید شریف الحسن

سلہ مصرعہ ثانی کے دو (ش) دو (ل) دو (ق) دو (ج) کے جو اعداد ہونگے وہی لفظ خسرو کے ہیں

چشمِ تحقیق

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ۷۵۵ سال قبل عظیم الشان ہمالیہ کے زیر سایہ ریاست کپی لا وست میں ایک اختر تاباں راجہ کے محل میں نمودار ہوا۔ عیش و تنعم کی دیوی نے ہاتھ پھیلا کر اس کو اپنے سنہری آنچل میں لے لیا، وہ پھولوں کی سیج پر آرام کرتا۔ سونے چاندی کے کھلونوں سے کھیلتا تھا۔ رقیق القلب ابتدا ہی سے تھا اس لئے راجہ نے اس کے لئے مسرت انگیز سوسائٹی موجود کر دی تھی۔ چاند سے چمکنے والے چہرے عنفوان شباب کے خون سے بھرے ہوئے دل اس کی صحبت کی گرم بازاری کیا کرتے تھے کسی کا کیا مقدور جو بدھا (منور) کے سامنے افسردہ دلی سے بات بھی کرے یہی وجہ تھی کہ اختر تاباں جو بڑھتے بڑھتے ماہ شب چہاردہم ہو گیا تھا حیات و ممات پیری و نوجوانی کی ماہیت تو دُور رہی - نام سے بھی آشنا نہ تھا۔ دستِ قدرت اپنی کتاب کے جو بعضوں کے نزدیک جانفزا اور بیشتر جانفرسا خیال کیجاتی ہے اوراقِ لیل و نہار الٹتا رہا کہ اس عرصہ میں ہمارے ہیرو نے خوابِ طفلی سے بیدار ہو کر باغ نوجوانی کی سیر شروع کر دی۔ راجہ نے وہ بندشیں جو اس کے رقیق القلب ہونے کے باعث جکڑ دی تھیں اب ڈھیلی کر دی ہیں - بدھا اب بدر ہے اور اس کے قریب دو ستارے ایک چھوٹا اور ایک بڑا ہر وقت لگے رہتے ہیں۔ یہ ستارے اس کی بیوی اور خورد سال بچے کے نام سے عوام میں مشہور ہیں - بدھا ایک دن ڈانڈی پر سوار شام کے وقت ہوا کھانے چلا جا رہا ہے - منظر عجیب دلکش ہے - ٹھنڈی ٹھنڈی

ہواؤں کے جھونکے غروب ہونے والے آفتاب کا ڈر کے مارے زرد ہو جانا گھاٹیوں دروں اور وادیوں میں پیلی پیلی دھوپ کے مختلف منظر گلہائے رنگ رنگ سے پُر رونق پہاڑ شجر اور حجر کی مختلف الاشکالی قدرت کی اعلیٰ صناعی کو ثابت کر رہے ہیں۔ اس وقت پہاڑ لاکھوں پرندوں سے بھرا ہوا ہے جو دامنِ کوہ سے اپنے آب و دانہ معمولی کو لیکر اس وقت خالقِ اکبر کی حمد اپنی جنس کی زبان میں گا رہے ہیں۔ اس محظوظ کر دینے والے منظر نے بڈھا کے دل کو لبھا لیا وُہ دل میں خیال کرنے لگا "کاش یہ منظر ہمیشہ میرے پیش نظر رہتا - ہر وقت یہی شام ہوتی یہی پہاڑ یہی منظر ہوتا۔ میں اسی جگہ ہوتا غرض جو حالت اسوقت موجود ہے بعینۂ وُہ ہر وقت مجھے اپنے دامن عاطفت میں لئے ہوئے ہوتی لیکن یہ کیونکر ممکن ہے؟ تو کیا میری آرزو فضول ہے؟ بیشک بیشک انسان کے قبضۂ قدرت سے یہ باہر ہے! افسوس بیچارہ انسان کتنا معذور پیدا کیا گیا ہے!! بڈھا کے دل میں ان خیالات کے ساتھ ہی رنج و افسوس پیدا ہو گیا۔ جس نے سارے لطف کو کرکرا کر دیا ڈانڈی کا پہیہ گھوم رہا تھا۔ سُورج کی الوداعی کرنیں اس کے سایہ کو لمبا لمبا کر رہی تھیں۔ آبادی سے دُور ڈانڈی جانے نہ پائی تھی کہ یکا یک ایک اندھا بڈھا جو ضعف کے ہاتھوں جان شیریں کو فروخت کرنے کے لئے بالکل تیار تھا لاٹھی ٹیکتا اور لڑکھڑاتا ہوا چلا آرہا ہے۔ سانس بھٹی کی دھونکنی کی طرح چل رہا ہے۔ قدم قدم پہ ٹھہر جاتا ہے اس لئے کہ تازہ دمی کی ضرورت نے مجبور کر دیا ہے آہ اس اخیر وقت میں معلوم ہوتا ہے کہ بوڑھا کئی مصیبتوں کا شکار ہو رہا ہے یعنی افلاس پیری ضعف موسمی تکلیف وغیرہ وغیرہ نے آپس میں سمجھوتا کر کے اس پیر بیکس کی مٹی خراب کرنے کا بدمنصوبہ گانٹھ لیا ہے۔ اِس مسئلہ پر

کہ مصیبت تنہا نہیں آتی ایک انگریزی شاعر نے خوب کہا ہے "جانور جب بہت بوڑھا ہوجاتا ہے تو مالک اُسے نکال دیتا ہے۔ جنگل میں پہنچکر اُسے معلوم ہوتا ہے کہ اتحادِ دشمنانِ جانداران کیسی خوفناک چیز ہے؛ موسم کی تکلیف، ناطاقتی؛ بھوک اور پیاس سے آگے بیچارہ سر تسلیم خم کرکے مُنہ زمین پر ڈال دیتا ہے۔ ایک گدھ جو اس سے بہت بلندی پر اڑ رہا ہے اس کو دیکھ نیچے اترتا ہے پھر گدھوں کے جُھنڈ کے جھنڈ جمع ہوجاتے ہیں اور اس کی انتڑیاں کھینچنے لگتے ہیں" میرے خیال میں اس حالت میں یہ زیادتی اور ہوجاتی ہے کہ جنگل کے درندے بھی اس بُرے وقت میں بُرائی میں حصّہ بڑی بُری طرح لیتے ہیں۔ الغرض اس بوڑھے پر بھی مصیبتوں نے ایکا کرکے حملہ کیا تھا۔ بدھا نے یہ حالت دیکھکر بوڑھے سے مصائب کی ماہیت سے آگاہی حاصل کی اور اسے کچھ نقدی دیکر رخصت کیا۔ بدھا نے معلوم کرلیا کہ کم و بیش نوعیّت میں یہ حالت ایک دن ہر شخص پر طاری ہونے والی ہے۔ اس خیال نے اُسے اور بھی افسُردہ خاطر کردیا۔ جاہ و حشم کی جانب سے وہ بیدل ہوگیا۔ نیرنگیٔ منظر کے خیال سے جو اُداسی اُس کے دل میں پیدا ہوگئی تھی وُہ اَور بھی بھڑک اُٹھی۔ بدھا کے کنارۂ دِل سے سمندر کی مَوجوں کی طرح بار بار یہ خیال ٹکرا رہا تھا کہ یہ حالت جب بدلنے والی ہے تو سارا جاہ و حشم بیکار ہے۔ پھر ہم کیوں اِس میں ڈوبے رہیں۔ کیوں اُس راہ کو اختیار نہ کریں جو نزہت گاہ امن کی جانب جاتی ہے۔ بیوی بچے دوست اور عزیز سب بیکار ہیں۔ جب کہ وُہ ہماری حالت کو نہ بدل سکتے ہیں نہ قائم ہی رکھ سکتے ہیں۔ افسوس یہ سب لوگ کس کام کے ہیں۔ سلسلۂ خیالات نے بدھا کو یہیں تک پہنچایا تھا اس کی نظر ارتھی پر پڑی جسکو قصبہ کے باشندے

تی ہوئے چلے آ رہے تھے۔ بدھا نے اِن لوگوں سے بڑی دیر تک بات چیت کی جس سے اسے موت کی نسبت بھی کچھ علم ہُوا؛ اب تو بدھا کے خیالات نے عجیب خوفناک شکل پیدا کر لی۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنے کو ساتھیوں کے سامنے غیر متاثر ظاہر کیا حالانکہ اسکا دِل ڈوبا جا رہا تھا۔ اب ڈانڈی تیسری مرتبہ پھر روانہ ہوئی اور ایک نوجوان خوش مذاق ساتھی نے ایک دلچسپ کہانی کہنی شروع کر دی۔ بدھا بھی ظاہری طور سے ہاں ہاں کہتا رہا اسی اثنا میں ڈانڈی ایک بلند مقام پر پہنچ گئی جہاں بڑے بڑے پتھر صف بستہ تھے بدھا نے یہاں پہنچکر ساتھیوں پر چہل قدمی کرنے کی خواہش ظاہر کی جسکی فوراً تعمیل کی گئی۔ بدھا کچھ دیر تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا آخر کار ایک بلند ٹیلہ پر چڑھکر جسکے پہلو میں ایک عمیق غار تھا اپنے ساتھیوں سے جو اس سے کسی قدر فاصلہ پر تھے للکار کر کہا۔ تم لوگ اسی وقت محل چلے جاؤ۔ والدین سے کہدینا کہ آج کے واقعات نے میرا دل توڑ دیا ہے۔ مَیں بادشاہت کا خواہشمند نہیں۔ انجام بخیر کے مسئلے کو حل کرنے کے لئے مارا مارا پھرونگا جب تک یہ حل نہ ہوگا۔ والدین یا بیوی بچے کو اپنی شکل نہ دکھاؤنگا۔ تم لوگوں نے مجھ سے بیفائدہ بادشاہی کرنے کی امید رکھی۔ مَیں کسی اَور کام کے لئے پیدا کیا گیا ہوں۔ میرے لئے غم نہ کرو۔ خبردار تم میرے نزدیک آنے کی ہرگز کوشش نہ کرنا ورنہ اس کھڈ میں کود کر اپنی جان ضائع کر دونگا"۔ بدھا کے تمام ساتھی پریشان ہو گئے۔ کسی کو جرأت نہ ہُوئی کہ پتھر پر چڑھکر شاہزادہ کو گرفتار کر لے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ بدھا جو کہتا ہے وُہی کرتا بھی ہے پس وُہ مشورہ کر کے محل کی جانب سب بھاگے تاکہ بادشاہ کو جلد موقع واردات پر لاویں۔ لیکن راجہ نے جس چٹان پر ساتھیوں نے چھوڑا تھا وہاں بدھا کو نہ پایا

دیر تک عالمِ حسرت میں گریہ وزاری کرتا اور بدھا کے مصاحبوں کو بُرا بھلا کہتا رہا۔ آخر کار بادلِ بریاں وچشمِ پُرنم مکان پر واپس آگیا اور سینکڑوں آدمیوں کو اس کی تلاش میں اطراف وجوانب میں چلتا کیا اسی وقت تمام ریاست میں بذریعہ منادی اعلان کیا گیا کہ بدھا کے لانے والے کو اس کی ہموزن چاندی سونا اور جواہرات کا انعام دیا جائیگا

دن پر دن اور رات پر رات گذرنے لگے لیکن بدھا کا کہیں پتہ نہ لگا بوڑھے راجہ کی حالت واقعہ کے بعد بہت خراب ہوگئی وُہ شاذ ونادر ہی دربار کرتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اُس دن سے راجہ کو کسی نے ہنستا نہ دیکھا بہرحال ہمنے تو بدھا کا حال تاریخ ہند کے اس باب میں دیکھا جس کا عنوان "بدھا اور بدھ مذہب کی ترقی ہے"۔ اور معلوم کیا کہ چشمِ تحقیق عمدہ دل پر کسقدر اثر ڈال سکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک عاقل کے لئے اشارہ کافی ہے لیکن گدھا مار پیٹ سے بھی درست نہیں ہوسکتا۔ دُنیا میں جو سانحے ہمیں درپیش آتے ہیں اُنکو قدرت ہماری تادیب کرنے کے لئے پیدا کرتی ہے۔ لیکن ہم چند آنسو بہاکر تھوڑی سی گریہ وزاری کرکے اور قسمت پر لعن وطعن کرکے ہر سانحہ کو فراموش کردیتے ہیں۔ حالانکہ قدرت کا یہ منشا ہے کہ اُس سانحہ کو یاد رکھکر عاقبت بالخیر کے لئے افعال کو درست کریں اور جو مشکلیں درستی افعال میں پیش آئیں ان کو عارضی اور فوری خیال کرکے پروا نہ کریں*

اُردو شارٹ ہینڈ

ریڈ کالج لکھنؤ میں زود نویسی کی جماعت کے افتتاح پر ایک جلسہ ہُوا تھا۔ جس میں سید امیر حیدر صاحب بخت نے قصیدہ شارٹ ہینڈ پر پڑھا تھا ہمارے قدیم کرمفرما مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے پروفیسر کالج مذکور نے وُہ قصیدہ ہمیں بغرض اشاعت بھیجدیا تھا۔ ہم اسکے دیر میں شائع ہونے کی معافی چاہتے ہیں :۔

ہم کو اب تیغ قلم کے ہیں دکھانا جوہر — سیکھنا چاہتے ہیں زود نویسی کا ہُنر
اس نئے دور میں کیا بات ہُوئی ہے پیدا — کہ زباں چل نہیں سکتی ہے قلم سے بڑھکر
بولتے بولتے گو بولنے والا تھک جائے — ہاں مگر اپنا قلم رُک نہیں سکتا دم بھر
مُنہ سے کہنے بھی نہ پایا وُہ ادھر پُوری بات — ہُوئی تقدیر کے لکھے کی طرح ثبت ادھر
کہئے کوزے میں سمندر کا سمانا کیسا — آنکھ سے دیکھئے تو آپ کو آئے باور
کبھی دیکھی تھی قلم اور زباں کی گھوڑ دوڑ — ہم کو اس حرف و حکایت کے سبق ہیں ازبر
بولنے والوں کو سُنتے ہیں کہ ہیں سحر بیاں — اس قلم پر نہیں چلتا کوئی جادو منتر
ق
قلم اپنا کہ انا البرق ہے اب جس کی سر پر — بولنے والے کی آواز سے کہتا ہے ٹھہر
تو بڑی دیر میں پہنچیگی ابھی کانوں تک — پہلے میں صاحب اخبار کو دیتا ہوں خبر
اصطلاحیں وہ جدید اور وُہ نقش انکے عجیب — نہ وہ کانوں سے سنیں اور نہ پڑی اپنی نظر
جب پڑی حرف کی تقسیم بہ جسر و تسریب — ہم کو معلوم ہُوا صوت و صدا کا نیچر
سمت و خط دونوں کی ترتیب بنی شکل تحریر — کھل گیا راز کتابت جو پڑھے دو اچھر
الغرض سب طلبا کام میں اپنے مصروف — بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی دم بھر

چپکے چپکے سبق اپنا کوئی کرتا ہے یاد   اور کسی شخص کو ہے اصل مطالب پہ نظر
کشش خطی و قوسی کا بیاں نوک زباں   حرفِ افقی و عمودی کے نشاں کاغذ پر
کہیں تعریف ہے ممدودہ و مقصورہ کی   کہیں تحدید ثنائی حرکت کی لب پر
سین اور رے کے دوائر کا کہیں ہے مذکور   شتر و ہت کے حلقے ہیں کہیں پیش نظر
انگ اور اب کے حرفونکا کسی جا ہے بیاں   اور کسی کو ہے فسانہ ول و کل کا ازبر
صورتیں پانچ جو ہ کی ہیں وہ ہیں ورد زباں   کبھی مخلوط کبھی نقطہ و خط زیر و زبر
لام اور رے کے بکوں پہ ہے کبھی انکی نگاہ   نون فے ڈال کے اور ٹے کے ہیں نکتے پیش نظر
فکر کرتا ہے کوئی ہیئت فل ٹل ڈل کا   کوئی کرتا ہے بیاں ہیئت فر ٹر ڈر
دال اور ت کو ملاتا ہے کوئی لفظوں میں   اصل تنصیف سے اک حرف کو آدھا لکھکر
کوئی تنصیف سے حرفونکو بڑھا کر دوگنا   لفظ میں جوڑتا ہے مقطع دار و تر در
جو کہ مشکل تھے وہ ترکیب سے اب ہیں آساں   جو کہ اطول تھے وہ تخفیف سے اب ہیں اقصر
کبھی مرسوم کا ہے ذکر کہ ہوں مستقل   کبھی مرموز کی ہے فکر کہ ہوں مستحضر
انکو اصرار کہ صورت نہ کوئی ہو کاواک   انکو اندیشہ کہ حرفوں سے نہ چھوٹے مسطر
انکو یہ رٹ کہ علامت ہو نہ کوئی بیش و پیش   انکو یہ دھن کہ قرینہ سے رہیں زیر و زبر
انکو یہ شک کہ عبادت نہ کہیں ہو مشکوک   انکو یہ وہم کہ فقرہ ہو نہ کوئی مضمر
کوئی کہتا ہے کہ کرسی سے نہ گرجائے نشست   کوئی کہتا ہے کشش حد سے نہ جائے باہر
ایک کہتا ہے ذرا فصل رہے فی ما بین   ایک کہتا ہے کہ مربوط ہوں باہمدیگر
حلقہ و دائرہ حرفوں میں لگاتا ہے کوئی   دوسرا کہتا ہے نقطہ بھی ہو اسکے اندر
انکو حرفوں کی نمائش کا تصور دن رات   انکو اسپیڈ بڑھانیکا خیال آٹھ پہر
انکو آواز کا اور انکو ہے حرفوں کا خیال   انکو الفاظ پہ تو انکو ہے معنی پہ نظر
کہیں اندازۂ تحریر کی ہوتی ہے بحث   کوئی الفاظ لکھاتا ہے منٹ گن گن کر

حفظ کرتا ہے کوئی سلسلۂ مرسومات یعنی وہ لفظ جو رہتے ہیں زباں پر اکثر
ہو ہوا کے کوئی کچھ کون یہاں اور وہاں ایسے ویسے نہیں تم مولوی صاحب مشٹر
الغرض کوشش و محنت کو ہر اک کی انکی بخت دیکھ کر صورتِ آئینہ ہوا میں ششدر
بس زباں سے مرے بیساختہ نکلی یہ دعا مشکلیں انکی سب آسان تو کر اے داور
بخش اِن سب کو صلے محنت و جانکاہی کے یا خدا کھول دے دروازۂ دولت ان پر
یاالٰہی یہ رہیں باغِ جہاں میں سرسبز یا خدا پائیں یہ سب اپنی ریاضت کا ثمر
جاہ و منصب میں ترقی ہو سدا ان کو حصول
حال پہ ان کے رہے حاکموں کی نیک نظر

سید امیر حیدر بخت اکبرآبادی

بلبل و پروانہ

بلبل پروانہ سے

گرا رہا ہے ترا شوق شمع پر تجھکو مجھے یہ ڈر ہے نہ پہنچے کہیں ضرر تجھ کو
فروغِ شعلہ کہاں۔ اور کہاں تجلی حسن ہزار حیف! کہ اتنی نہیں خبر تجھ کو
تڑپ تڑپ کے جو بے اختیار گرتا ہے نہیں ہے آگ کے شعلے سے آہ! ڈر تجھ کو
یہ ننھے ننھے پر و بال۔ یہ بلا کی تپش ملا ہے آہ! قیامت کا کیا جگر تجھ کو
قریب شمع کے آکر جو تھرتھراتا ہے نہیں ہے جان کے جانیکا غم مگر تجھ کو
ملے گی خاک بھی ڈھونڈے نہ تیری محفل میں صبا اڑا لئے پھرے گی دمِ سحر تجھ کو

سمجھ نہ شمع کو دلسوز۔ عاقبت دشمن! جلا کے آہ! رہیگی یہ مشت پر تجھ کو
نہیں ہے تو ابھی سوز و گداز کے قابل
نہیں ہے عشق کے عرضِ نیاز کے قابل
تپش یہ بزم میں فانوس پر نہیں اچھی کہ آگ لاگ کی او بیخبر نہیں اچھی
کھڑی ہو آگ محبت کی۔ شمعِ محفل سے لگاوٹیں ارے آشفتہ جگر نہیں اچھی
تڑپ تڑپ کے نہ دیوانہ وار شمع پہ گر کہ آہ! یہ تپش بال و پر نہیں اچھی
یہ جانگدازیِ سوز وفا سرِ محفل کہیں نہ ہو ترے جی کا ضرر نہیں اچھی
لڑا نہ شمع سے آنکھیں۔ کہ ہے عدو تیری تری نگاہِ محبت اثر نہیں اچھی
یہ ننھے ننھے پروں کی تڑپ۔ یہ بیتابی حریفِ شوخیِ برقِ نظر نہیں اچھی
ہوائے شوق میں فانوس پر ترا گرنا یہ بیخودی ارے شوریدہ سر نہیں اچھی
چمن میں چل! کہ دکھاؤں ادائے شاہدِ گل
ہیں دلفریب عجب خندہ ہائے شاہدِ گل

پروانہ

مَیں بوالہوس نہیں۔ سمجھا ہے تو نے کیا مجھکو پسند شاہدِ گل کی نہیں ادا مجھکو
جنوں نہیں۔ کہ ہو سودائے گل چمن میں مجھ کو سمجھ نہ اپنی طرح آہ! بیوفا مجھ کو
فراقِ گل میں نہیں چیخوں تری طرح۔ اے وائے! یہ داغ سوزِ جدائی نہ دے خدا مجھکو
دلِ گداختہ لیکر ازل سے آیا ہوں بنایا بزم میں ہے سوز آشنا مجھکو
تڑپ تڑپ کے گروں کیوں نہ شمعِ محفل پر فنائے سوزِ محبت میں ہے بقا مجھکو
جلے وہ بزم میں چپ چاپ اور میں جلوں بعید عشق سے ہے۔ ہو غمِ فنا مجھکو
تری نگاہ میں جانسوز ہے۔ جو اے بلبل! وہ آہ! آگ کا شعلہ ہے جانفزا مجھکو

شعور سیکھ - تجھے امتیازِ عشق کہاں
کہاں تو - لذتِ سوز و گدازِ عشق کہاں

سرورؔ جہان آبادی

ابرِ بہار

جھومتی آتی ہے مغرب سے وہ اک کالی گھٹا رقص کرتی، راگ گاتی، منتشر زلف رسا
سر سے لیکر پاؤں تک چھائی ہے متوالی ادا دمبدم طغیانیِ مستی و شورِ نغمہ زا
بھر گئے ارگن ہوا میں ابر کی آواز سے
بزمِ عالم گونج اٹھی نغمہ ہائے راز سے

دامنِ کہسار سے گذری ہے اٹھلاتی ہوئی دخترِ دوشیزۂ دہقاں کو للچاتی ہوئی
پیچھے پیچھے دوڑتی آتی ہے گھبراتی ہوئی ہاتھ آجائے یہ دولت کس طرح جاتی ہوئی
لیجئے کیونکر اسے بڑھ کر کنارِ شوق میں
ہائے کیا ننھا سا دل ہے کس فشارِ شوق میں

بجلیاں دامن میں ہیں شوخی میں اپنی بینظیر بنگئی بڑھ کر نقابِ عارضِ مہرِ منیر
جب افق پر جا کے چمکی باادائے دلپذیر کھینچدی چمکا کے بجلی ایک سونیکی لکیر
ڈر گئے معشوق جب چمکی یہ بجلی زور سے
ہل گئے سینوں میں دل اس کی کڑک کے شور سے

ہوگیا بیدار عالم آگئی فصلِ بہار پڑگئے باغوں میں جھولے گارہی ہیں سب ملار
کھل گئے گلہائے رنگیں لہلہائے سبزہ زار کوئلوں کی کوک نے ڈالی ہے دنیا میں پکار
بلبلوں کے چہچہوں سے بوستاں پرشور ہے

میکشوں کے جمگھٹوں سے اک جہاں پُرشور ہے

نکلے پر بلا نکلی ہو سلما بھی اپنی قبر سے باہر آئی جھوم کر لیلا بھی اپنی قبر سے
نکلے ہیں جمشید بھی دارا بھی اپنی قبر سے اور سکندر سا جہاں پیما بھی اپنی قبر سے
اُٹھ کے بیٹھا ہے جہانگیر شہِ رنگیں مزاج
بزم کہنہ از سرِ نو منعقد ہوتی ہے آج

جامِ جم نکلے زمیں سے بعد مدت اے مغاں انجمن کی دھوم ہو جائے میانِ دو جہاں
اہتمامِ بزم اے ساقی ہو باصد عز و شاں کان میں آئے نہ اب رندوں کی فریاد و فغاں
بزم میں شاہنشہانِ ہفت کشور آئیں گے
نازنینانِ پریوش حور پیکر آئیں گے

جلوہ گر ہوں ایک جانب آج محمود و ایاز بعد مدت کچھ کھُلے کیفیتِ راز و نیاز
ہو نہ کچھ شاہ و گدا میں آج فرق و امتیاز ابرِ رحمت سر پہ چھایا ہے درِ جنت ہے باز
جامِ زریں ہیں لبالب بادۂ گلرنگ سے
گونج اُٹھی بزم آوازِ ربابِ چنگ سے

مستیاں پیدا ہیں گلشن کے در و دیوار سے لغزشِ پا کا مزا پوچھے کوئی میخوار سے
ٹپکی پڑتی ہے جوانی پھول کی ہر خار سے اک سماں ہے نغمہ ہائے عندلیبِ زار سے
سازِ ہستی بج رہا ہے ابر کی رفتار پر
دوڑتے ہیں نغمۂ دلکش ہوا کے تار پر

ابر میں مہ ہے چراغِ زیرِ داماں کی طرح دھیمی دھیمی روشنی ہے داغِ پنہاں کی طرح
جلوہ گر پردے میں ہے شمعِ فروزاں کی طرح چاہ میں بیٹھا ہے چھپ کر ماہِ کنعاں کی طرح
جھانک لیتا ہے جو یہ پردہ اُٹھا کر دور سے
دفعتاً معمور ہو جاتی ہے دنیا نور سے

آسماں پر ابر اندھیری رات میں چھایا ہوا　　چاند کا چھپنا، نکلنا، دل کو دیتا ہے مزا
ٹھنڈی ٹھنڈی چار جانب سنسناتی ہے ہوا　　دُور تک جاتی ہے سناٹے میں نغموں کی صدا
اپنے اپنے رنگ میں سب اہلِ محفل مست ہیں
نخلِ گل پر پہلوئے گل میں عنادل مست ہیں

آج اہلِ امتیازِ دین و ملت کفر ہے　　جس میں ہو تفریقِ انساں وہ شریعت کفر ہے
ناصحِ مشفق کی ایسے میں نصیحت کفر ہے　　شرع کی رُو سے بھی ہمسایوں سے نفرت کفر ہے
یکدلی کا دَور ہو ہندو مسلماں ایک ہوں
متحد اغراض ہوں اجزائے ایماں ایک ہوں

نظر لکھنوی

میرا ربّ

ہندوؤں کا ہے خدا اور نہ مسلمانوں کا　　نہ یہودوں کا مجوسوں کا کرشانوں کا
پاس سکھوں کا اسے ہے نہ کچھ افغانوں کا　　وُہ تو داتا ہے ہر اک قوم کے انسانوں کا
جس نے پیدا کیا ہے لاج اُسی کو سب کی
"پالنا سب کو" یہ تعریف ہے میرے رب کی

فرق اعزاز کا معدوم ہے اُس کے در پر　　کوئی بلبل ہو کہ ہو بوم۔ ہے اسکے در پر
خوانِ یغما ہے بچھا، دُھوم ہے اُس کے در پر　　ایک سفرے پہ سخی شوم ہے اسکے در پر
میز کرسی پہ مٹن چاپ کوئی کھاتا ہے
خاک پر بیٹھ کے روٹی کوئی چھک جاتا ہے

جتنی مخلوق ہے سب زیرِ اثر رہتی ہے — اتنے گُمسان میں کیڑوں کی خبر رہتی ہے
اُس کی مرضی ہر کسی میں جو کسر رہتی ہے — جڑ، تنہ، شاخ کے ریشوں پہ نظر رہتی ہے

اس کی قدرت سے شجر نشو و نما پاتے ہیں
خشک لکڑی سے بھی پھل پھول نکل آتے ہیں

بوٹیاں جتنی یہ اقسامِ نباتات سے ہیں — معدن و کوہ یہ جتنے بھی جمادات سے ہیں
گرچہ وابستہ و معذور ہر اک بات سے ہیں — رزق اپنی جگہ پاتے یہ اسی ہات سے ہیں

اپنی ہستی پہ وُہ احمق ہے جسے غرّہ ہے
اُس کے آگے تو یہ خورشید بھی اک ذرہ ہے

وُہ خدائی کے جزو کل پہ نظر رکھتا ہے — سرو و شمشاد و یہ سنبل پہ نظر رکھتا ہے
پرِ قمری و دلِ بلبل پہ نظر رکھتا ہے — انتہا ہے کہ رگِ گل پہ نظر رکھتا ہے

پھول میں حسن تو کانٹوں میں خلش اسکی ہے
چاند میں خنکی تو سورج میں تپش اسکی ہے

جب سرِ شاخ پہ لب بند کلی آتی ہے — پہلوے گل میں نظر کتنی بھلی آتی ہے
اوٹ میں پتّوں کی نازوں سے پلی آتی ہے — روزی پاتال سے اسکی بھی چلی آتی ہے

راز سربستہ ہیں غنچوں کی طرح کھلتے ہیں
پتّے ہلتے نہیں۔ یہ دستِ دُعا ہلتے ہیں

اسکو ہر پردے میں ہر شے ہے دکھائی دیتی — شبِ دیجور میں کیڑی ہے سوجھائی دیتی
قدمِ مور کی آہٹ ہے سُنائی دیتی — جوگی اب چُپ کہ نہیں طبع رسائی دیتی

نور سے اُسکے ہی آنکھوں نے ضیا پائی ہے
اپنی قدرت کا وُہ خود آپ تماشائی ہے

جوگی جی دکنی

صبح ازل

شفق ہے پھولی فلک پر کہ نالہ زارِ سحر   کچھ اَور رنگ دکھانے لگی بہارِ سحر
ہے نور بار زمانے میں آبشارِ سحر   جبینِ حور کی طلعت ہے خود نثارِ سحر
جو ذرّہ یاں کا ہے مہرِ سپہرِ خوبی ہے
اب آسمان سے کرسی زمیں کی اونچی ہے

نکھار پر ہے حسینانِ باغ کا جوبن   ہر ایک شاخِ گل تر بنی ہوئی ہے دلہن
ہے عطر بیز ہر ایک سو نسیم کا دامن   مثالِ بادہ چھلکتے ہیں اس ہی سبب بن
ہوا کے جھونکے جدھر لیکے بو یہ بڑھتے ہیں
چٹک کے غنچے چمن میں درود پڑھتے ہیں

زباں پہ شور کہ ہے رحمتِ خدا کا نزول   لبِ دعا کی طرح وا ہوئے ہیں بابِ قبول
چمن میں پھولے سماتے نہیں خوشی سے پھول   ہوئے ہیں صورتِ گل باغ باغ قلبِ ملول
نثار حور کا گیسو ہے سنبلِ تر پر
زمیں کے حسن کی ہے دھوم چرخِ اخضر پر

فرشتے جمع ہیں ہر سو پرے جمائے ہوئے   کھڑے ادب سے ہیں سر اپنا سب جھکائے ہوئے
نظر میں شوق تو ارمان دل پہ چھائے ہوئے   کسی کی شمعِ محبت سے لَو لگائے ہوئے
یہ عشق ہے۔ ہمہ تن قلبِ اضطرابی ہیں
ہر ہر نگاہ سے پیدا کہ انتظار میں ہیں

کھڑی ہیں حورِ جناں اک طرف بناؤ کئے   پڑے ہیں ہاتوں میں جنت کے پھول کے گجرے
بتا رہے ہیں اشارے نشیلی آنکھوں کے   خدا کا شکر کہ اب دو جہاں کے دن ہیں پھرے

قبولِ درگہِ ربِ غفور آتے ہیں
اُٹھو اُٹھو کہ ہمارے حضور آتے ہیں

صدائیں دیتے ہیں یہ حاملانِ عرشِ الٰہ   کہ ہے یہ محفلِ میلادِ سرورِ ذی جاہ
وُہ کون جنکی حکومت میں ہر سپید و سیاہ   وُہ کون خلق کے سردار دین کے پشت و پناہ

وُہ کون جنکے اشارے پہ نخل چلتے ہیں
وُہ کون جنکے تکلم سے دل پگھلتے ہیں

محمد سیف الدین آشفتہ

محبّت نامۂ نپولین

بہادر نپولین جو قتل وغارت کو ایک ادنیٰ کھیل سمجھتا تھا۔ محبت سے مغلوب ہے۔ اپنی دلربا جوزافائن کی خدمت میں اپنا بے نظیر دل پیش کر رہا ہے۔ رضاجوئی اور تسلیم اسے کہتے ہیں۔ جوزافائن وُہی ہے جو بعد کو اُسکی مشہور ملکہ ہوئی:-

(احمد شجاع)

تمہارا ہو کے رہوں گر مجھے اجازت ہو   کہو تو زندہ رہوں میں نثار ہونیکو
کہو تو تم سے محبت کروں تمہیں چاہوں   دلِ اسیرِ محبت تمہاری نذر کروں
وہ دل جو صاف ہو۔ پیارا ہو۔ مہربان بھی ہو   تمہاری دید کا مشتاق تم پہ مائل ہو
زمانے بھر میں جو ڈھونڈو ملے نہ ایسی شے   وہ دل تمہارے لئے میری جان حاضر ہے
تمہارا حکم جو اس دل کو ہو کہ مر جائے   تو تنگ ہو کے وُہ زیست سے فوراً وہیں گزر جائے
خوشی فنا میں جو پائے ابھی فنا ہو جائے   کسی طرح اسے حاصل تری رضا ہو جائے

کہو تو اشک بہیں چشمِ زار و حیراں سے — خنک ہیں یہ وہ میدان رُوئے تاباں سے
بلا سے گر نہ ہوں آنکھیں کہو تو دل رو دے — تمہارے حکم پہ لیکن سرِ نیاز جھکے

کہو تو حسرت و ارماں کی زندگی کاٹوں — کہو تو سرو کے سائے میں آہ سر بسر دوں
جو حکمِ موت ہو دم بھر میں خاک ہو جاؤں — ذرا بھی پاؤں اشارا تو نقدِ جاں دیدوں

تو میری جان ہے پیاری ہے دل کا ارماں ہے — سرورِ چشم ہے غارتگرِ دل و جاں ہے

احمد شجاع

مُسلمان صاحبزادے

عمر کا سال ہوا خیر سے جب شانزدہم — رفتہ رفتہ ہوا اسکول کا جانا کچھ کم
کتبِ درسیہ بنتی چلیں دیمک کی غذا — دل کو بھانے لگا ناول۔ وہی افسانۂ غم
ہسٹری دیکھنا معلوم ہوا کارِ فضول — طبع نازک کو کیا جاگرفی نے برہم
نقشے ملکوں کے ٹنگے کمرے کی دیواروں پر — کھولنے کی جنہیں اک عرصے سے کھالی ہے قسم
میز پڑھنے کی جو تھی اس کی یہ آرائش ہے — ایک ٹوٹی سی دوات، ایک پرانا سا قلم
شکلِ استاد سے ہوتی چلی نفرت دل کو — بدمعاشوں کو بصد شوق بنایا ہمدم
کھیل اسکول کے ایک آنکھ نہیں بھاتے اب — شغلِ گنجفہ شطرنج ہے جاری ہر دم
ناموافق ہوئی آبادی سے باہر کی ہوا — چاندنی چوک کی گلگشت کا آیا موسم
شام کی واک کو اب ٹھنڈی سڑک کے بدلے — چلے باجمعِ احباب سوئے کوئے صنم
خط جو آیا کبھی والد کا تو نوکر سے کہا — ابھی فرصت نہیں رکھو اسے پھر دیکھیں گے ہم
صحبتِ ناجنساں ہے کہاں صوم و صلوٰۃ — اب نہ دنیا کی رہی شرم نہ عقبیٰ ہی کا غم

چند ہی دن میں پہ پہونت عنب مُنہ کو لگی | پُھوٹ والن کو سمجھنے لگے آب زم زم

اسی عرصہ میں کہیں آ گئے اُنکے والد | پاس بٹھلا کے کہا لڑکے سے اے لختِ لم
مُنہ ذرا سا نکل آیا ہے تمہارا کیسا | "اتنی محنت نہ کرو پڑھنے پہ نورِ نظرم
خیر اچھا یہ بتاؤ تو پڑھا کیا تم نے؟" | ہو ترقی سے تمہاری دلِ محزوں خرّم"
پہلے کچھ دیر تو شرماتے رہے پھر بولے | "ابا جان! آپ نہ پوچھیں یہی از رہِ کرم
"پڑھ چکا ہیں بہ مسلمانوں کے بچوں کی طرح" | جاؤ کا ترجمہ "گو" "آؤ" کی انگریزی "کم"
اس سے زائد کی ضرورت بھی نہیں ہی پُھوٹ نکلی" | "اِک مسلمان کے بچے کو یہی ہے کیا کم"
"سچ تو یہ ہے کہ بس اب ورد زباں ہیں دو شعر | حضرتِ خواجہ حافظ نے کئے ہیں جو رقم"

"فاش میگویم و از گفتۂ خود دلشادم
بندۂ عشقم و از ہر دو جہاں آزادم
نیست بر لوحِ دلم جز الفِ قامتِ یار
چکنم حرفِ دگر یاد نداد استادم"

ڈاکٹر سعید احمد صاحب سعید

تازہ غزلیں

(از جناب امداد صاحب)

جُدا ہیں تجھ سے نہیں تیرے آستاں سے الگ | ترے فقیر اگر ہیں تو اس جہاں سے الگ
خزاں میں بھی نہ ہُوئی صحنِ بوستاں سے الگ | بھلا بہار میں بلبل ہو آشیاں سے الگ
بُلا کے گھر میں نہ کی اس نے بات تک مجھ سے | وہ میزبان رہا اپنے میہماں سے الگ

تری گلی میں ہو مدفن یہ شوق ہے دل میں
نہ ہو مزار مرا تیرے آستاں سے الگ

چمن میں تجھ سے جو ہے ظلم کا یقیں صیاد
تو فصل گل میں بھی بلبل ہے آشیاں سے الگ

مسافران عدم پہنچے اپنی منزل پر
ہمیں ہیں آج تلک اپنے کارواں سے الگ

بہار میں گل و بلبل پہ سخت آفت ہے
غم خزاں سے الگ دست باغباں سے الگ

اسی کے حسن و ادا پر رہی جو محویت
خیال یار نے رکھا ہمیں جہاں سے الگ

یہ حال قیس تھا گزری جو ہجر سے لیلیٰ
کبھی تھا ساتھ کبھی محمل رواں سے الگ

وہ قافلہ میں ہے اور میں غریب تنہا ہوں
فغاں جرس کی ہے کوسوں مری فغاں سے الگ

فنا کے بعد توقع ہے یہ صبا سے مجھے
رہے نہ خاک مری اس کے آستاں سے الگ

ہمارا شیشۂ دل ان بتوں نے چور کیا
ستم سے اپنے الگ سنگ امتحاں سے الگ

ہزاروں طالب دیدار تھے کہ خاک ہوئے
ہوئی نقاب نہ اس روئے دلستاں سے الگ

کھلی نہ کچھ خبر راہ عشق و راہ عدم
کہ دونوں ایک کہاں تک ہیں اور کہاں سے الگ

یہی دعا سحر و شام اپنی ہے آزاد
سر نیاز نہ ہو اسکے آستاں سے الگ

(از جناب حفیظ جونپوری)

محشر کی باز پرس سے جی بے ہراس ہے
مجھ رو سیاہ کو تری رحمت کی آس ہے

امید وہ عدو کی جو پوری ہی ہو رہے
بندھ کر جو ٹوٹ جائے ہماری وہ آس ہے

ساغر پہ ہے وہ رونق وہ مے میں آب و تاب
ساقی جو اٹھ گیا ہے تو محفل اداس ہے

دیکھا تو رنگ و بو کا یونہیں سا ہے کچھ بناؤ
غنچے کی کچھ گرہ میں نہ کچھ گل کے پاس ہے

اک چھیڑ ہے یہ میرے کڑھانے کے واسطے
بشاش ہو کے پوچھنا تو کیوں اداس ہے

جنس وفا خرید کے ناداں ہے بوالہوس
اسکی خبر نہیں کہ وہ جوہر شناس ہے

(از میر ولایت علی صاحب فردوس)

انفعالِ معصیت تا منظر ہونیکو ہے — آنسوؤں سے نامۂ اعمال تر ہونیکو ہے
ہے امیدوار بیکس ہائے میں ہیں ہر لب درد — دیکھکر ہونٹوں کی خشکی چشم تر ہونیکو ہے
مجھ سے مجنوں سے نہیں کچھ فرق وحشت میں مگر — طائروں کا آشیاں بالائے سر ہونیکو ہے
ہجر میں دیکھوں تو کس کس رنگ میں آتی ہے آنکھ — خونِ دل ہونے کو ہے پانی جگر ہونیکو ہے

(از جناب مولوی محمد عبد الاحد صاحب شمشاد لکھنوی)

تم ہی کو دل دیکے میں بیدل ہوا رسوا ہوا — پھر مجھی سے پوچھتے ہو دل تمہارا کیا ہوا
یہ سمجھنا چاہیے سب کو کہ میں اس کا ہوا — یہ غلط سمجھے ہیں وہ نا آشنا اپنا ہوا
وہ پھرا مجھ سے تو اب ساری خدائی پھر گئی — ایک عالم وہ بھی تھا میں سب ہی کا چاہا ہوا
سچ ہے استغنا زمانے میں عجب اکسیر ہے — خاک کا ہر ذرہ میرے واسطے سونا ہوا
ظلمتِ عصیاں تھی مثلِ تیرہ شب چھائی ہوئی — خوابِ غفلت سے ہمارے چونکتے تڑکا ہوا
دیکھئے کیا رنگ لائی ہے مری دل کی تڑپ — ہاتھ میرے قلب پر رکھکر انہیں کھٹکا ہوا
تیرے رخساروں کا جلوہ تھا عیاں ہر گل پہ کل — بے سبب کب بلبلوں کا باغ میں غوغا ہوا
ایک دن خلدِ بریں میں پائینگے رفعت ضرور — سرنگوں ہونگی ندامت سے اگر نیچا ہوا
رہ گئیں بے سود سب تدبیریں اچھے کام کی — ہاں برائی سے مرے دل میں جو کچھ آیا ہوا
جس پہ استغنا کی تھوڑی سی توجہ ہو گئی — اپنے بیگانوں سے وہ دم بھر میں بے پروا ہوا
غیر سے ممکن نہ تھا کچھ پیرِ کنعاں کا علاج — اپنے ہی نورِ نظر سے آپ جب اندھا ہوا

میں ہوں شمشاد رواں تم لالہ رو غنچہ دہن
میں اگر شیدا ہوا تم پر تو کیا بیجا ہوا

(از میر جالب صاحب دہلوی)

جاتی نہیں جب آگئی شامت کو کیا ہوا؟ کٹتی نہیں ہے اس شبِ فرقت کو کیا ہوا؟
شوخی نے دخل پا کے کہا چشمِ یار میں کس جا گیا حجابِ مروت کو کیا ہوا؟
اے برقِ حسنِ یار سنبھلنے تو دے ذرا مطلق سکت نہیں ہے مری طاقت کو کیا ہوا؟
ہم کو تو مدعا ہے فقط دیدِ یار سے خلوت میں بار گر نہیں جلوت کو کیا ہوا؟
ویرانی چھا گئی مری تربت پہ کس لئے ارماں مرے کہ مر گئے حسرت کو کیا ہوا؟
دہلی کے ساتھ حضرتِ جالب تھی نہ غزل
کچھ کند ہو چلی ہے طبیعت کو کیا ہوا؟

(از جناب بسمل دہلوی)

کوئی لقمہ جو کبھی ہم کو میسر آیا ساتھ ہی دانت کے نیچے کوئی کنکر آیا
کھو کے عزت کو جو گوہر بھی میسر آیا بے بہا ہاتھ سے گوہر گیا پتھر آیا
جامۂ حسن میں تیرے کہیں سلوٹ ہی نہ جھول کیا ہی یہ جامہ ترے قد کے برابر آیا
منہ لگائے کوئی بے آبرو انسان کو کیا کس کے لب تک کبھی چھالی کوئی ساغر آیا
شرق سے غرب کو تیرا جو اشارا پایا سورج آیا وہیں اور کانپتا تھرتھرا آیا
عیش و عشرت نہ سہی رنج و مصیبت ہی سہی شکر کوئی تو رفیق اپنا بھی بنکر آیا
عجب و نخوت سہی تو اس شوخ کے یہ ہی ہے عجب کہ کسی کے وہ تصور میں ہی کبھی نکر آیا
گل بھرے تھے جو مکان دیکھ کے خالی نہیں آج آنکھ بھر آئے نہ کیوں جی ہی مرا بھر آیا
منتظر اب دلِ بسمل کی اگر چاہے سیر
اتنا کہدے کوئی لے وہ ترا دلبر آیا

[illegible]

[illegible]

[illegible] تنخواہ

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

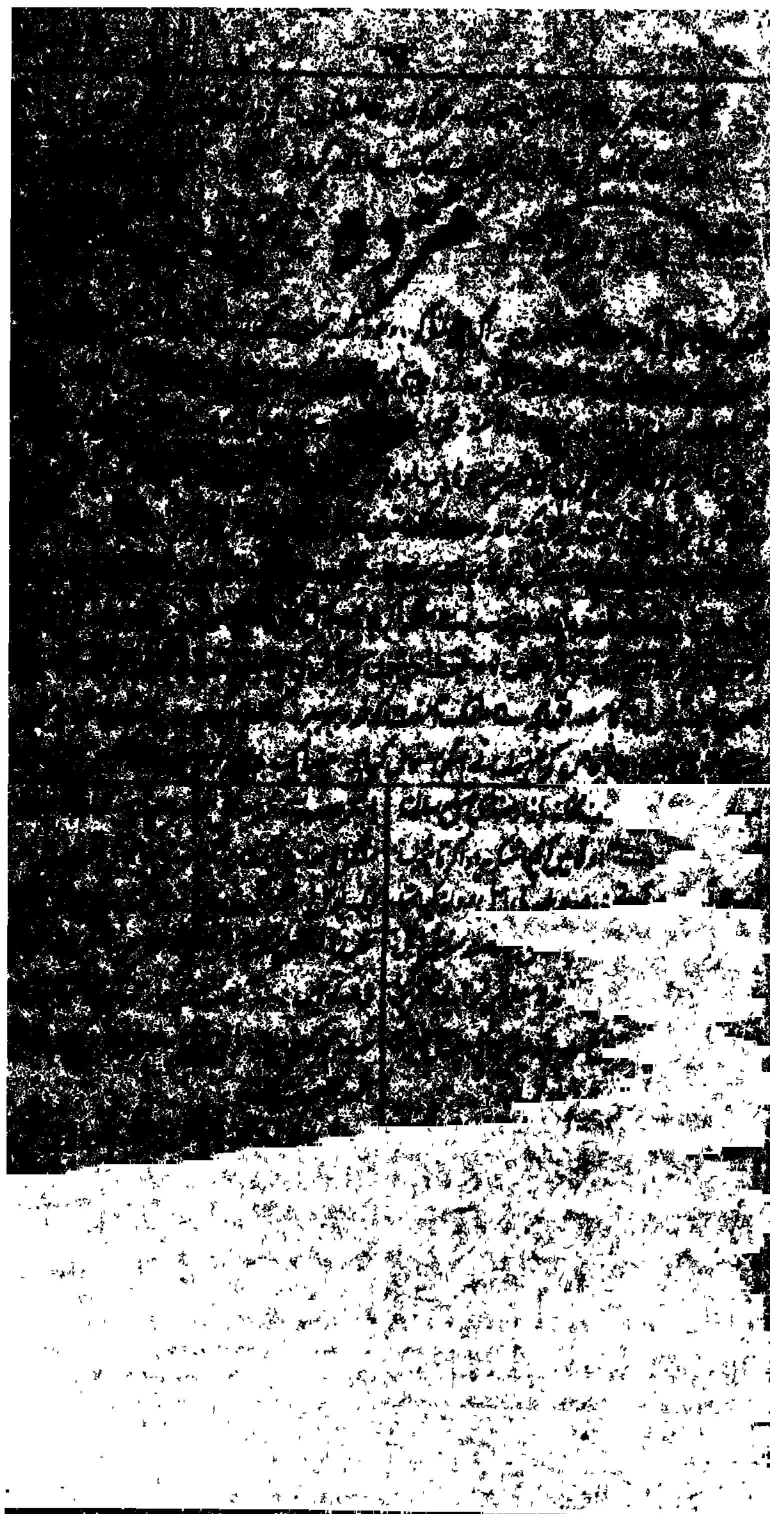
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]



قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ ۵۰

(۱) قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا نمونہ تو قریباً ہر ایک مسلمان کو معلوم ہے [illegible]

[illegible]

اردو علم و ادب کی دلچسپ ... ماہوار

کرشمہ سائنس ۔ سید محمد فاروق صاحب
کیمیا گری ۔ سید محمد علی صاحب ... وکیل
زیور ۔ ... (از ہوشیار پور)
ایلیا ... ۔ محمد سعد الدین خاں ... ۶۱
ایک ہندی گیت ۔ مشتاق احمد صاحب ... بی اے ۴۴
آتش ... ۔ ترجمہ از انگریزی ۴۵
معشوقِ عرب ۔ جناب جواد علی خاں صاحب عالی ۴۳
میکس مولر ۔ مسٹر عبد الغفار ... صاحب ۴۶
حکمتِ علمی ۔ ریویو شمس العلماء مولانا حالی ... ۵۰

نظم

... ۔ ... احمد حسین صاحب ... ایف اے ... ۵۲
مرثیہ شہنشاہ ۔ چودھری ... محمد ... ناظر بی اے ... ۵۳
... فانی ۔ جناب صبیح دہلوی ۵۴
عید کا چاند ۔ سید محمد علی ... محمد ... ۵۸
... ۔ ... محمد ... ۵۹

... قرباں ۔ جناب ... عظیم آبادی ۵۵
... مرحوم ۔ ... محمد ... ۶۰
... ۔ جناب ... ۶۲
عورت ۔ جناب ... ۶۳
قسمت ۔ جناب عبد العزیز صاحب ... ۶۴
عید قرباں ۔ جناب ... صاحب ... ۶۷
جناب توفیق ... ۶۸
جناب آغا شاعر قزلباش (دہلوی) ۶۹
جناب حفیظ جونپوری
میر ولایت علی صاحب فرد ... ۷۰
پنڈت ... صاحب ... لکھنوی
جناب سید ... حضرت ظہیر دہلوی
جناب کاظم حسین ... لکھنوی
جناب ... ۷۲

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ۔ ان شہروں میں اردو مروج ہے ۔ ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

... لاہور میں چھپا ... شائع کیا
قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اول ... فی پرچہ ۸

اعلیٰ حضرت بادشاہ کابل کے مشیر طبی اور لاہور و آگرہ کے سرکاری ڈاکٹری مدرسوں کے استاد ڈاکٹر صاحب کیا فرماتے ہیں +

لاہور میڈیکل کالج کے معلم علم تشریح
جناب ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب فرماتے ہیں کہ

"مخزنِ حکمت"

علم اردو خواں اشخاص کیلئے ایک نہایت ہی مفید اور علم کا خزانہ ہے۔ اس کتاب میں تمام ضروری امراض کا مفصل بیان ہونے کے علاوہ بدن کی ساخت۔ اعضا کے افعال۔ حفظ صحت مردوں عورتوں اور بچوں کے خاص خاص امراض کا علیحدہ علیحدہ بابوں میں ذکر کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا طرز بیان بہت سادہ اور آسان ہے۔ میں سفارش کرتا ہوں کہ گھر کا ڈاکٹر اور حکیم بطور ایک کامل مشیر طب کے ایک گھر میں موجود رہنا چاہئے۔

اعلیٰ حضرت بادشاہ کابل کے مشیر طبی
جناب ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا صاحب فرماتے ہیں کہ:

"مخزنِ حکمت"

واقعی اردو زبان میں اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس میں ڈاکٹری طب یونانی کی تمام اصطلاحات کو موزون اردو زبان میں لکھا ہے اور ہر مرض کے انگریزی عربی اور اردو نام اور ڈاکٹری و یونانی علاج مذکور ہیں۔ غیر تعلیم یافتہ خواتین کو جنہیں میرے خیال میں طب سے واقفیت کی ایسی کتاب کی اشد ضرورت ہے اور نیز ڈاکٹروں و حکیموں کو مخزن حکمت کی بڑے زور سے سفارش کرتا ہوں۔ درحقیقت کوئی گھر اس کتاب سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔

آگرہ میڈیکل کالج کے معلم علم الادویہ و علم کیمیا
جناب ڈاکٹر محمد ماشاء اللہ صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس فرماتے ہیں کہ

"مخزنِ حکمت"

کے اکثر مقامات کو میں نے دیکھا ہے۔ فیملی میڈیسن یعنی علم طب خانگی پر یہ ایک کتاب بے نظیر مکمل اور صحیح کتاب ہے۔ اس میں جا بجا بہت سی تصاویر بھی ہیں۔ قابل مصنف نے بعض جانفشانی سے اس کتاب کو لکھا ہے اس کے لئے درحقیقت وہ اہل وطن کے کمال شکریہ کے مستحق ہیں۔ میری رائے میں

مخزن حکمت

کا ہر ایک گھرانے میں موجود ہونا نہایت ہی مفید ہے۔

حجم کتاب ایک ہزار تین سو چوبیس صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت بلا جلد (لعہ) مجلد (للعہ) ملنے کا پتہ کتبخانہ جناب شمس الاطبا گمٹی بازار لاہور

مخزن

کرشمۂ سائنس

معبودِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا ظہور شجر حجر سے نمایاں ہے۔ صرف دیکھنے والے کی ضرورت ہے۔ دُنیا کا یہ عظیم الشان کارخانہ بجائے خود اس حکیم علی الاطلاق کی حکمتِ بالغہ کا روشن ثبوت ہی۔ شیراز کے حقیقت شناس شاعر نے خدا جانے "برگ درختانِ سبز" میں کیا اسرارِ قدرت دیکھے کہ بے اختیار اس کی زبان سے نکل گیا کہ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار — ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

جو جلوے بلبلِ شیراز نے ایک پتے میں دیکھے ممکن ہے کہ ہم انہیں محسوس نہ کر سکیں۔ لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے گرد و پیش ہزاروں۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں قسم کی اشیاء ایسی موجود ہیں کہ اگر ہم اُن کے متعلق غور کریں تو خلاقِ عالم کی صنعت و قدرت کے دل ہی دل میں قایل ہو جائیں۔ موجودہ زمانہ میں غریب "سائنس" بہت ہی بدنام ہے اور سطحی نظر والوں کے نزدیک وُہ گویا الٰہیات کا پھاٹک ہو۔ ہماری ناقص رائے اس کے خلاف ہے۔ کیونکہ ہم جس قدر سائنس کے

مسائل پر عبور کرتے جائینگے۔ اُسی قدر قدرت کے رموز ہم پر روشن ہوتے جائینگے اور جس وقت ہم سائنس کی امداد سے نیچر کے عجیب و غریب بھیدوں سے واقف ہو جائینگے اس وقت ہمارے دل پر اُس خالق برحق کی عظمت و شوکت کا سکہ بخوبی بیٹھ جائیگا۔ جو اس وسیع عالم کا بنانے والا ہے اور جو اپنی دانش و حکمت کے زور سے یہاں کے کاروبار کو اس طرح سے چلا رہا ہے کہ بڑے بڑے عقلمند دیکھکر متحیر ہو جاتے ہیں۔ قدرت کے سربستہ رازوں پر کافی عبور حاصل کرنا تو انسانی طاقت سے باہر ہے اور یقیناً ہمیشہ باہر رہیگا۔ لیکن سائنس کے انکشافات میں بھی ہم ایسے کوتاہ نظروں کے لئے کچھ کم باعث دلچسپی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دخل دینے کا دعویٰ سائنس نے فی نفسہٖ کبھی نہیں کیا اور نہ اسکا منہ تھا کہ حقیقت و معرفت کے پیچیدہ اور دشوار گذار مرحلوں کے طے کرنیکا حوصلہ کرتا۔ تاہم جن معمولی مسائل پر بھی سائنس نے روشنی ڈالی ہے وُہ ہماری نظروں کے سامنے نہایت دلاویز پیرایہ میں پیش کئے گئے ہیں۔ اور ہمیں یہ کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ سائنس کی معمولی سے معمولی بات بھی "دفتر معرفت" کا "ایک ورق" ہونے کی حیثیت سے اس قابل ہو کہ ہم اُس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور دیکھیں کہ وُہ اپنی بساط کے اندر کیسی سچے کی بات بتاتی ہے۔

سائنس کے دربار میں کیمسٹری کو گوشہ نشین پر جگہ ملی ہے۔ یہ کیمسٹری مشرقی دنیا میں کچھ اجنبی نہیں بلکہ ہمارے خام خیال ہوسوں کی بدولت ہندوستان کا پُرانے سے پُرانا شخص بھی اس سے ناواقف نہ ہوگا۔ کیمسٹری کہو خواہ کیمیا ایک ہی بات ہے۔ دنیا کی مشینری کے چلانے میں کیمسٹری کا بہت بڑا حصہ ہے۔ لیکن اس کہنے سے یہ مطلب نہیں کہ معمولی اسفل دھاتوں کو وُہ ایک دو تاؤ سے چاندی کا

سونا بنا دیتی ہے ۔ تاہم کیمسٹری کے پُر مفاد وجوہ سے جو نفع انسانی سوسائٹی کو حاصل ہے وُہ سونا اور چاندی بنانے سے کہیں افضل ہے ۔ اگر کیمیاوی تغیرات دُنیا میں برابر اور اپنے وقت پر نہ ہوتے رہیں تو دُنیا کے بہت سے کاموں میں ہرج واقع ہو جائے اور انسانی طبقہ کی زندگی دشوار ہو جائے ۔ ہم اس وقت صرف ایک معمولی مسئلے کو اُردو دان اہلِ ملک کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ۔ کیمسٹری کا شاید یہ پہلا ہی سبق ہے ۔ لیکن ہمارے خیال میں جن اصحاب کو سائنس کے مطالعہ کا موقع نہیں ملا ۔ اُن کے لئے مندرجہ ذیل بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا ۔

"انسانی زندگی کا مدار کس چیز پر ہے"؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو اکثر احباب بے معنی خیال کرینگے کیونکہ بنی نوع آدم بلکہ کل ذی رُوح ہستیوں کو حیات و ممات کے معاملے میں براہ راست خدائے واحد سے تعلق ہے ۔ وُہ جسکو چاہے پیدا کرے اور جس کو چاہے فنا کر دے ۔ اس میں کسی کو ذرا دخل نہیں ۔ اِس سے کسی کو انکار نہیں ہے کہ خدائے وحدہٗ لاشریک نے زندگی اور موت اپنے حیطہ اختیار میں رکھی ہے لیکن دُنیا کو اس نے عالم اسباب قرار دیکر یہاں اِس قسم کے سامان بہم پہنچائے ہیں کہ اُس کی مخلوق ایک دُوسرے کی امداد و اعانت سے نشوونما پا سکے اور اپنی زندگی کی مقررّہ مدت پُوری کر سکے ۔ لہٰذا اِس سوال کی تفصیل یُوں ہو سکتی ہے کہ وُہ کونسا ذریعہ ہے ۔ جس سے ذی رُوح مخلوق اپنی مقررہ زندگی کے دن پورے کر سکتی ہے ۔ اور اگر وُہ ذریعہ مفقود ہو جائے تو انسان کے لئے جینا محال ہو؟

اِس سوال کے حل کرنے میں ہم کو کیمسٹری کی امداد ضروری ہے ۔ کیمسٹری کا دعویٰ ہے کہ "انسانی زندگی کا اِنحصار درختوں پر ہے" ۔ کیمسٹری کا یہ انکشاف

حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ کے "برگِ درختانِ سبز" والے تجربہ سے بہت مشابہ ہے۔ لیکن ابھی شاید بہت کم لوگ کیمسٹری کے دعوے کو تسلیم کریں۔ تاہم تفصیلی حالات معلوم ہو جانے پر انہیں معلوم ہوگا کہ دنیاوی اسٹیج پر یہ کٹ پتلیاں (درخت) کیا کچھ اہم پارٹ انجام دیتی ہیں اور انسانی طبقہ کو اُن کی ذات سے کسقدر فائدہ پہنچتا ہے۔

بادی النظر میں اِس سے کسی کو انکار نہیں کہ انسانی سوسائٹی کی ضرورتیں درختوں سے بہت کچھ نکلی ہیں۔ لکڑی فطرت کا ایک ایسا عطیہ ہے جس نے ہمارے مہذب و متمدن بنانے میں بڑی مدد دی ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی وجہ سے ہم کو بہت آرام و آسائش پہنچی ہے۔ لیکن صرف اسی قسم کے امور بنی نوع انسان کو درختوں کا زیر بار احسان نہیں بنا سکتے۔ دنیا کی تمام چیزیں انسان کے لئے ذریعۂ راحت و آرام ہیں۔ پھر درختوں کی کیا تخصیص ہے جو انکو چار چاند لگائے جاتے ہیں۔ درحقیقت درخت کچھ اور ہی فائدہ پہنچاتے ہیں جو حیوانات اور جمادات سے ممکن نہیں۔ اور وہ فائدہ یہ ہے کہ صاف و شفاف ہوا جس کے اوپر حیوانات کی زندگی منحصر ہے۔ درختوں کے ذریعہ بہم پہنچتی ہے۔ ورنہ اگر درخت اس خدمت کو انجام نہ دیتے تو صفحۂ دنیا پر جسقدر ہوا ہوتی وہ جانداروں کے سانس لینے کے سبب سے غلیظ ہوتے ہوتے بالکل بیکار ہو جاتی اور اس کے زہریلے اثر سے سخت نقصان پہنچتے۔ اِس مسئلہ کو ہم کسیقدر وضاحت سے بیان کرتے ہیں تاکہ ناظرین اس کو پورے طور پر ذہن نشین کر سکیں۔

انسانی زندگی کے برقرار رکھنے کے لئے ہوا کی جس قدر ضرورت ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ بلا غذا کے آدمی ایک عرصہ تک زندہ رہ سکتا ہے

اور پانی کے بغیر بھی کچھ مدت تک اُس کا رشتہ حیات قائم رہ سکتا ہے لیکن اگر اُسے صاف اور تازہ ہوا ایک منٹ کے لئے بھی نہ ملے تو اُس کی زندگی غیر ممکن ہے۔ اسی واسطے ہوا کو سب سے زیادہ کار آمد عطیہ قدرت خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ہوا جب انسان کے جسم میں جا کر واپس آتی ہے تو کثیف ہو کر آتی ہے۔ اب اگر اسی کثیف ہوا کو آدمی بار بار استعمال کرے تو اس سے بجائے فائدہ کے ضرر پہنچنے کا خطرہ ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہوا کہ اس کثیف ہوا کی صفائی کا کوئی معقول انتظام ہو۔ اور یہ انتظام قدرتاً درختوں کے تفویض ہوا ہے۔ اور چونکہ اس انتظام کے بخوش اسلوبی انجام پانے پر خود درختوں کو فائدہ ہے اس لئے اُن کے جانب سے ادائے فرائض میں کبھی کسی قسم کی سُستی اور کاہلی عمل میں نہیں آتی۔ اور انسانی اور نباتاتی طبقہ امداد باہمی کے اصول پر ایک دوسرے کے لئے اضطراری طور پر اپنا مفوضہ کام کیا کرتا ہے۔

"آکسیجن" وہ عنصر ہے جو آدمی سانس کے ذریعہ اپنے جسم کے اندر لیجاتا ہے۔ وہاں سے آکسیجن کاربن کے ساتھ ملکر "کاربانک ایسڈ گیاس" کی شکل میں نکلتا ہے۔ اور کاربن وہ جزو ہے جس پر نباتات کی نشوونما کا انحصار ہے۔ لہٰذا قدرت کی تعلیم سے درخت آفتاب کی روشنی میں کاربانک ایسڈ گیاس کو جو انسان سانس کے ذریعہ باہر نکالتا ہے اپنے اندر جذب کرتے ہیں اور اُسے تحلیل کر کے کاربن اپنے لئے رکھکر آکسیجن کو صاف و شفاف حالت میں خارج کر دیتے ہیں۔ گویا کہ اُسے پھر اس قابل بنا دیتے ہیں کہ انسان اس کا استعمال بلا کسی خوف کے کر سکے۔ غرضکہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ اسی طرح سے جاری رہتا ہے کہ ہم سانس لیکر ہوا کو غلیظ کرتے ہیں اور بیچارے درخت اُسے

ہمارے لئے پھر صاف کر دیتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارے بقائے حیات کے لئے درختوں اور پودوں کی کس قدر ضرورت ہے۔ سائنس کے محققین نے اس مسئلہ کو بالکل آئینے کی طرح صاف کر کے دکھا دیا ہے۔ چنانچہ اگر شیشے کے ایک مجوف گولے میں کسی چھوٹے سے جانور کا بچہ اور کوئی ننھا سا پودا رکھ کر اس کو اس طریقے سے بند کر دیں کہ اس میں ہوا نہ جا سکے تو مذکورہ بالا اصول پر دونوں زندہ رہینگے اور نشو و نما پاتے رہینگے۔ جانور کا بچہ جو غلیظ ہوا اپنے جسم سے نکالیگا اُسے پودا پھر صاف کر دیگا اور اس طرح ان دونوں کے قائم اور زندہ رہنے کے اسباب مہیا رہینگے۔

اس جگہ مختصراً یہ بتانے کی بھی ضرورت ہے کہ "کاربانک ایسڈ گیس" کی تحلیل نباتات صرف اسی حالت میں کر سکتے ہیں۔ جبکہ آفتاب کی شعاعیں اُس پر پڑ رہی ہوں۔ اس مسئلہ کی تحقیقات میں ڈاکٹر ولیم ڈریپر[1] نے نہایت کوشش و جانفشانی سے کامیابی حاصل کی ہے۔ پہلے خیال تھا کہ تحلیل کے لئے شعاع بنفشئی[2] کار آمد ہے۔ لیکن ولیم ڈریپر نے عملی تجربات و مشاہدات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ عام خیال بالکل غلط تھا۔ بلکہ فی الحقیقت اس کیمیاوی عمل میں درختوں کی مدد و معاون شعاع اصفری ہے۔

اب آپ غور کریں کہ ایک معمولی سے مسئلہ کی تحقیقات میں شاخ در شاخ

---

[1] ڈاکٹر موصوف ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوا ۱۸۳۲ء میں عازم امریکہ ہوا اور ۱۸۳۶ء میں پنسلوینیا یونیورسٹی سے ایم۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ڈاکٹر موصوف کی علمی تصانیف نہایت مستند و معتبر خیال کیجاتی ہیں۔

[2] نور یا روشنی سات قسم کی شعاعوں سے مرکب ہے۔ بنفشئی۔ سُرمئی۔ ارزقی۔ اخضری۔ اصفری۔ نارنجی۔ احمری۔ اگر کسی شیشے کے چو پہل ٹکڑے کو آفتاب کی شعاع کے مقابل کر کے دیکھا جائے تو اس کے عکس میں کئی قسم کے رنگ جدا ہوتے ہیں۔

کتنی باتیں نکل آئیں۔ مگر کوئی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی قدرت لامتناہی ہے اور اس کی حکمت کے کُنہ تک پہنچنا ہمارے ادراک اور فہم سے بالاتر ہے۔ سچ کہا ہے ؎

توان در بلاغت بہ سحبان رسید نہ در کُنہ بیچونِ سُبحان رسید

اے خدائے جلّ شانہٗ۔ تیری عظمت و سطوت کے جلوے اور تیری قدرتِ کاملہ کے کرشمے ذرّے ذرّے سے ظاہر ہیں۔ ہماری آنکھیں خود روشن نہیں کہ اُنہیں دیکھ سکیں۔ بیشک اُنکو دیکھ کر بڑے بڑے دانا اور عقلمند لوگ بھی تیری صنعت اور حکمت کا اعتراف دل سے کرتے ہیں اور گمراہ ان سے واقف ہو کر تیرے جلال اور ہیبت سے ڈر کر راہِ راست پا جاتے ہیں۔ اِنَّ فِی ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ تحقیق کہ انمیں نشانیاں ہیں ایمان والوں کیلئے۔

سیّد محمد فاروق



کیمیاگری

جو لوگ کہ وسائل طبیعہ سے معاش پیدا نہیں کر سکتے وہ کیمیا کی فکر میں پڑتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کیمیا بھی حصول معاش کا ایک ذریعہ ہے بلکہ انکو یقین ہوجاتا ہے کہ اُس کی مدد سے بہت جلد کیمیاگر مالا مال ہو سکتا ہے۔

یہی خیال ہے جو ہوسوں کو گوناگون محنت اور مشقت کا متحمل بناتا ہے ایسی ایسی مصیبتوں میں پڑتے ہیں کہ جان کے لالے پڑجاتے ہیں۔ اور اس قدر مال کیمیا کی دُھن میں خاک کر دیتے ہیں کہ اگر بالفرض کیمیا بن بھی جائے تب بھی اتنا مال حاصل نہ ہو۔ اکثر ناکامی کے صدمہ میں مرجاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی ہوس لوگوں کو کیمیا کے خیال سے باز نہیں آنے دیتی۔

کیمیاگروں کے سر پر کیمیا کا بھوت اس لئے سوار ہوگیا ہے کہ جب اُنہوں نے دیکھا کہ معادن میں استحالہ ہوتا ہے اور اشتراک مادہ کی وجہ سے بعض معدنیات دوسری صورت میں آجاتی ہیں تو انہیں خیال ہوا کہ اگر تدبیر سے کام لیا جائے تو چاندی سونا۔ اور تانبا رانگ چاندی ہوسکتی ہیں۔

اس خیال کا دل میں پیدا ہونا تھا کہ طرح طرح کی تدبیریں شروع ہوگئیں۔

ہر ایک نے بخیال خود ایک تدبیر نکالی کسی نے نا کدخدا لڑکی کو سنگ پارس ٹھہرایا۔ کسی نے خون کو کسی نے بالوں کو کسی نے انڈے کو کسی نے سنکھیا کو۔

غرض بہرصورت ایک ایسا مادہ ٹھہرایا گیا جو استحالہ کا ذریعہ ہوسکے اور انہیں مادوں سے اکسیر بنانے لگے۔ بھٹی اور دھونکنی درست ہوئی اور

اس مادۂ خاص کو اس میں رکھکر کسی نے اسے کسی خاص قسم کے پانی اور بوٹیوں میں تاؤ دیتے تا کہ کشتہ ہو کر اکسیر ہو جائے۔

کسی نے شورہ لیا اور خاص خاص بوٹی وغیرہ کے تیزاب میں بجھا کر اُس کا نمک نکالا۔ اور پھر اُسے پانی میں حل کر کے آب اکسیر تیار کیا۔

مختصر یہ کہ کسی نے خاک کی چٹکی کو اکسیر سمجھا اور کسی نے تیزابوں کو کیمیا کا اصل الاصول ٹھہرایا۔ اور ۲۵ تولہ پاؤ رتی کی دعوت شروع ہوئی۔ یعنی اگر معدنیات کو پگھلا کر یہ اکسیر اِس میں ڈالی جائے تو چاندی سونا تیار ہو جائیگا۔

اس فن میں جو لوگ محقق و مبصر و ماہر پائے گئے ہیں اُن کا خیال ہے کہ اکسیر ایک ایسا مادہ ہے جو عناصرِ اربع سے مل کر بنتا ہے اور کیمیاوی اعمال سے اس میں ذو قوت طبعی مزاج پیدا ہو جاتا ہے کہ جب معدنیات میں اکسیر ڈالی جاتی ہے یا معدنیات اس میں ڈالی جاتی ہیں۔ اکسیر کا زور آور مزاج معدن کی اصلی طبیعت کو بدل کر اپنا ہمرنگ بنا لیتا ہے نہ عارضی طور پر بلکہ دائمی طور پر۔ جیسے کہ خمیر آٹے میں پڑ کر تمام آٹے کو خمیر کر دیتا ہے۔ یہی حال چاندی سونے کے اکسیر کا ہے کہ ادنیٰ معدنیات کو چاندی سونا بنا دیتی ہے۔

یہ ہے خلاصہ کیمیاگروں کے زعم و استدلال کا جس کے بھروسہ پر وہ دن رات اسی شغل میں لگے رہتے ہیں۔ مَیں نے ایک مرتبہ ایک نہایت ماہر و عالمِ کامل حکیم سے اس معاملہ میں گفتگو کی اور اس فن کی ایک کتاب جو جونپور کے کسی صاحب نے چھاپی ہے انہیں دکھلائی۔ اُنہوں نے دیر تک اُسے بغور دیکھا اور پھر مجھے واپس دیکر کہا کہ اس بات کا مَیں ضامن ہوتا ہوں کہ ان کتابوں سے کچھ حاصل وصول نہ ہوگا اور ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئیگا۔ یہ تو اُن لوگوں کی حالت ہے جو اس دُھن کے پکّے اور اس مرض کے مریض ہیں۔

اب اُن لوگوں کا حال سُنیں جو بجائے اصل کیمیا گری کے حیلہ فریب سے کام لیتے ہیں اور جھوٹی کیمیا بناتے ہیں۔ یہ لوگ چاندی کو سونے کا ہم رنگ اور تانبے کو چاندی کی طرح سفید کرکے اپنی کیمیا گری کا ثبوت دیتے ہیں۔

بعض اُن میں سے محض ملمع کاری سے کام لیتے ہیں اور بعض ہڑتال وغیرہ کے جوہر سے چاندی تانبے کو رنگتے ہیں۔ بعض جوڑا بناتے ہیں۔ یعنی اگر چاندی بنانی ہوتی ہے تو کچھ چاندی اور کچھ تانبہ ملاکر چاندی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح چاندی اور سونا ملاکر سونے کا جوڑا تیار کرتے ہیں۔ اور ایسی صفائی سے کام لیتے ہیں کہ بڑے بڑے نقاد اُسے نہیں پہچان سکتے۔ اور ایسے لوگ کھوٹی چاندی اور سونا بناکر رائج الوقت سکّہ ڈھالنے لگتے ہیں۔ اور کھوٹے سکوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ نہایت بد عاقبت لوگ ہیں۔

ہم نے آجتک کوئی کیمیا گر نہیں دیکھا کہ چاندی سونا بناتا ہو۔ ہاں یہ دیکھا ہے کہ اسی خبط میں اکثر نے اپنی عمریں تباہ کردیں اور ہمیشہ ایک آنچ کی کسر ہی رہ گئی۔

جوہر اور تیزاب تیار کرنے میں عمریں تمام ہوگئیں۔ مگر جلنے پھونکنے اور روپیہ خراب کرنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوا۔ جڑی بوٹیوں کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور نتیجہ بے سود رہا۔ تحقیقات سے اسباب کا ضرور پتہ چلتا ہے کہ کیمیا گری کا خبط قدیم سے چلا آتا ہے اور اکثر متقدمین نے اصولِ کیمیا پر بحث کی ہے اور متاخرین نے اس کی واقفیت پر زور دیا ہے اس لئے ہم اوّل اس فن کے متعلق لوگوں کی رائیں لکھ کر اس پر محققانہ نظر ڈالتے ہیں۔

اس کیمیا سازی کے متعلق مذہب حکما یہ ہے کہ آیا معادنِ ہفتگانہ جو ہنوز طبعی بڑھ سکتی ہیں۔ یعنی سونا۔ چاندی۔ رانگ۔ لوہا۔ سیسہ۔ تانبا۔

کانسی - مختلف النوع نہیں اگر ہیں تو ایک ہی نوع - لیکن خواص مختلف ہیں
اس لئے ایک نوع کی چند صنفیں کہلا سکنے کے مستحق ہیں -

ابونصر فارابی اور اس کے پیرو حکمائے اندلس کی رائے یہ ہے کہ یہ
سب معدنیات ایک ہی نوع کی ہیں - اختلاف رطوبت و یبوست نرمی و سختی
اور رنگت کا ہے اور ابن سینا اور اس کے متبع حکمائے مشرق کی رائے
میں معدنیات ہفت گانہ مختلف النوع ہیں اور ہر ایک جنس و فصل علیحدہ رکھتی

فارابی چونکہ اتحاد نوع کا قائل ہے اسی لئے ان معدنیات میں قلب استحالہ
کو ممکن مانتا ہے اور کیمیا اس کے نزدیک صحیح اور سہل الماخذ ہے -

اور ابن سینا چونکہ معادن کی جداگانہ انواع مانتا ہے - اس لئے وہ
کیمیا سے انکار کرتا ہے اور اسے محال سمجھتا ہے اور کہتا ہے کہ ممکن نہیں کہ
انسانی تدابیر سے اجناس فصول میں رد و بدل ہو سکے - خصوصاً ایسی حالت
میں کہ فصول مجہول الکیفیت اور بعید از تصور رہوں -

طغرائی کیمیا گر بو علی سینا کی تردید کرتا ہے کہ کیمیائی تدابیر سے معدنیات
کے لئے ہم فصلیں پیدا تو نہیں کرتے صرف مادہ کو کسی خاصہ کے قبول کرنے
کے قابل بناتی ہیں - جب مادہ میں یہ صلاحیت اور قبولیت پیدا ہو جاتی ہے
تو فصل اس میں خدائے تعالیٰ کی طرف سے پیدا ہوتی ہے جیسے کہ نور اجسام
شفاف میں نفوذ کرتا ہے - جب تک اجسام شفاف نہوں یا نہ کئے جائیں
نور سے وہ کامل فیض نہیں پا سکتے اس صورت میں ہمیں فصول کے علم و ادراک
کی کیا ضرورت ہے - ہم خود بعض حیوانات پیدا ہوتے دیکھتے ہیں اور ہمیں
ان کی فصول کا علم تک نہیں ہوتا - مثلاً بچھو - مٹی اور مادہ متعفن سے - اور
سانپ بالوں سے - نرسل کھُروالے جانوروں کے سینگوں سے پیدا ہوتا ہے

اور بنتا ہے۔

پھر چاندی سونا بھی گر اسی طرح بنالیں یا اُن کے بنانے کی ترکیب ڈال لیں تو کیا غیر ممکن ہے؟ ان اقوال کی صریح تردید یہ ہے جن سے کیمیا کا بننا محال ثابت ہوتا ہے:۔

قائلانِ کیمیا کے اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم مادۂ قابل بہم پہنچانے کے بعد وہی اعمال کرتے ہیں۔ جو طبیعت معدنیات پر اثر کرکے ایک تو سونا چاندی بناتا ہے اور ساتھ ہی ایسی تدبیریں بھی کرتے ہیں کہ فاعلہ و منفعلہ قوتوں کی طاقت چند در چند ہو جاوے۔ تاکہ اعمال کیمیائی کے ذریعہ سے معدنیات جلد تر چاندی سونا بن سکیں۔

بخلاف اس کے طبیعیات میں ثابت ہو چکا ہے کہ سونا کان میں ایک ہزار اسی سال یعنی آفتاب کے ایک بڑے دورے کے بعد کامل طور پر تیار ہوتا ہے۔ پس اگر قوی موثرہ و منفعلہ کی قوت چند در چند ہو جائیگی تو سونا نسبتاً بہت کم زمانہ میں تیار ہو جائیگا۔

اگر اکسیر دم کے دم میں معدنیات میں استحالہ کر دیگی اور ظاہر ہے کہ جو چیز عناصر سے ملکر بنے اس میں چاروں عناصر کے ہونے کے علاوہ کسی ایک چیز کا غالب ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طبیعت قائم ہو سکے اور جو مرکب ہوگا اس میں حرارت غریزیہ کا ہونا بھی ضروریات سے ہے تاکہ حافظ صورت ہو سکے۔

اور پھر جو متکون ایک عرصہ میں تیار ہوتا ہے وہ زمانہ تکوین میں برابر حالت بدلتا رہتا ہے۔ یہانتک کہ غایت کمال کو پہنچ جائے۔

آدمی ہی کو دیکھ لو کہ نطفہ سے خون بستہ بنتا ہے پھر لوتھڑا ہونا ہی پھر تصویر بنتی ہے۔ ازاں بعد جنین ہوتا ہے اور پھر مولود اور رضیع وغیرہ

ہوتا ہوا اپنے کمال تک پہنچتا ہے اور ہر حالت میں آخری کی نسبت مقدار و کیفیت بدلتی رہتی ہے اگر یہ نسبت نہ بدلے تو نطفہ کی حالت میں بھی ہرگز تغیر نہ ہو سکے اسی طرح حرارتِ عزیزیہ سے بھی ہر حالت کی مختلف حیثیت ہوتی رہتی ہے۔ اب خیال کرنا چاہئے کہ ایک ہزار اسی سال میں سونے کی کتنی حالتیں بدلنی چاہئیں کیمیا گر بھی چونکہ ایک ناقص دھات کو کامل بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے ضرور ہے کہ وہ بھی طبعی اطوار تدریجی کے پیرو بنیں تاکہ چاندی سونا بنا سکیں۔ اب صنعت کی شان ہو کہ مقصود و غایت کا تصور صاحبِ صنعت کے ذہن میں موجود ہو۔ کیونکہ ابتدائے عمل آخر فکر ہوتا ہے اور آخر فکر اول عمل اس لئے ضرور ہے کہ کیمیا گر ان تمام حالات اطوار کو جانتا ہو جو ایک معدنی کو سونا ہونے تک پیش آتے ہیں۔ ان سب باتوں کا علم کیمیا گر کو ہونا چاہئے۔ مگر علوم بشریہ ناچیز اور محدود ہیں۔ پس اس حالت میں جو کوئی سونا چاندی بنا دینے کا دعویٰ کرے وہ ایسا ہی ہے جیسا کہ کوئی مدعی کہے کہ میں مٹی سے آدمی پیدا کر سکتا ہوں۔ مگر یہ نہیں ہوا اور نہ ہو سکتا ہے جبکہ ایک دھات کے چاندی سونا ہونے تک کان میں کیا کیا حالتیں ہوتی ہیں۔ ایسی حالت میں مدعیان کیمیا کے دعووں کو کیونکر تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

دوسری دلیل شیخ الرئیس کے بطلانِ کیمیا پر یہ ہے کہ طبیعت کبھی سہل طریقہ کو چھوڑ کر بعید و مشکل کو اختیار نہیں کرتی۔ اگر کیمیا کا صنعتی طریقہ صحیح ہوتا تو طبیعت اس طریقہ کو چھوڑ کر ہرگز اس کے خلاف طریقہ پر نہ چلتی۔ طغرائی نے اس کیمیائی تدبیر کو سانپ بچھو کی تخلیق سے تشبیہ دی ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہو لیکن سانپ اور بچھو کیچڑ اور بالوں سے پیدا ہوتے تو لوگوں نے دیکھے ہونگے۔ لیکن کسی اہلِ علم نے کیمیا نہ بنائی اور نہ اس کا طریقہ معلوم کیا جہوں نیا

کے اقوال کا اعتبار نہیں۔ انکی ایسی مثال ہو کہ جیسے اندھا بٹیر مارنے جائے۔ جھوٹی حکایتیں انکے پاس ہیں اور بس۔

مختصر یہ کہ محققین کیمیا۔ کیمیا کو صنائع وعلوم سے خارج سمجھتے ہیں۔ جیسے کہ لکڑی۔ کے مادہ سے لکڑی اور حیوان کے مادہ سے حیوان ایک دن یا ایک مہینہ میں نہیں بنایا جا سکتا۔

اسی طرح سونے کے مادہ سے ایک دن یا ایک مہینہ میں سونا نہیں بن سکتا۔ پس اب جو شخص علمی طور پر کیمیا کا طالب ہوتا ہے وُہ اپنے مال کو اور کام کو ضائع کرتا ہے۔ اسی لئے کیمیا کو تدبیر عظیم کہتے ہیں۔ کیمیا کا بنا لینا ایسی مثال ہے کہ جیسے کوئی آدمی پانی پر چلے۔ ہوا میں اُڑے۔ اجسام کثیف میں نفوذ کرے۔ یا کوئی جانور پیدا کرے اور یہ سب خرق عادت اور معجزات ہیں جو اکثر مرد صالح کو ملتے ہیں۔ اور وُہ دوسروں کو تبلا دیتا ہے۔ لیکن یہ قوت دُوسرے شخص کے پاس عاریت ہوتی ہے گر وہ تیسرے کو نہیں دیسکتا۔

اسلئے حکما کے اقوال اس کے متعلق معمہ و چیستاں ہیں بغیر علم تصرف کوئی اپر قادر نہیں ہو سکتا۔ عام لوگ جو اس صنعت کو اختیار کر لیتے ہیں وُہ اکثر معاش کے اسبابِ طبعی پر قدرت نہیں رکھتے اور چاہتے ہیں کہ اس تدبیر سے ایک ہی دفعہ مالا مال ہو جائیں۔

دیکھو لو فقیر اور مساکین کو اس کا زیادہ خبط ہوتا ہی بلکہ حکما بھی اس طلب سے خالی نہیں۔ ابن سینا اس کے محال ہونیکا قائل ہی جو وزیر و صاحب ثروت تھا۔ فارابی اسے ممکن بتاتا ہی جو بمشکل پیٹ بھر کر کھانا پاتا تھا۔　　الرزاق ذو القوۃ المتین

سید محمد علی افسوس وکیل

زیور

جسم انسان سے زیور کا تعلق اور ملک کی حیثیت پر اثر

(۱)۔ خوبصورت آدمی کی لوگوں میں تعریف ہوتی ہے اور بدصورت کی مذمت مگر چندروز۔ نیک سیرتی البتہ انسان کے لئے مستقل نام پیدا کرتی ہے جیسا کہ بدسیرتی دائمی رسوائی۔ ناممکن ہے کہ دنیا میں یوسف مصری جیسے خوبصورت شخص پیدا نہ ہوتے ہوں۔ ہوئے ہونگے اور اُن کی سیرت کمزوری کے سبب صورت کے ساتھ ہی محو ہو گئی ہوگی۔ کیا دنیا میں سب سے زیادہ بدوضع نمرود شداد اور فرعون ہی تھے؟ کیا یوسفؑ کا نام انکی موزونیِ اعضا کے سبب سے قائم ہے؟ ذرا غور کیجئے اور پھر جواب دیجئے۔ جاپان سے لیکر امریکہ تک گُلِ گلاب کو جو شہرت حاصل ہے کیا یہ اس کی بناوٹ اور رنگت کے سبب سے ہے؟ نہیں ہوا میں بلکہ فضا میں پھیل جانے والی چیز اس کی خوشبو ہے۔

(۲)۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ انسان کو صورت گری میں کہاں تک دخل ہے اور سیرت بنانے میں کہاں تک۔ ظاہر ہے کہ حقیقی مصوّر نے صورت گری میں تو انسان کو مطلق دخل نہیں دیا۔ سیرت البتہ یہ بنا بھی سکتا ہے اور بگاڑ بھی۔ خدا نے جس شخص کو جیسا بنا دیا بنا دیا۔ معدنیات کا ملمع چڑھا کر ہم اسکو ذرا بھی تو جلا نہیں دے سکتے۔ البتہ ایسی چیزوں کا ملمع کچھ اسی قسم کی چیزوں کے لئے موزوں ہو سکتا ہے (جیسے دیگچی پر قلعی) انسان کے ساتھ انکا جوڑ بے جوڑ ہے۔ ہاں انسان اگر جلا پا سکتا

ہے تو اپنے ہی گوہر آبدار سے یعنی اُس گوہر سے جس کا تعلق ایک طرف تو اس سے ہے اور دُوسری طرف براہِ راست خدا سے۔ اشرف ہو کر غیر اشرف چیزوں میں خوبصورتی ڈھونڈھنا نادانی ہے۔ اور اگر کلمہ احسن تقویم پر غور کیا جائے تو بدصورتی کا نام لینے سے بھی شاید گناہ لازم آئیگا۔ اور خداداد حسن میں انسانی دخل۔ دخل در معقولات ٹھہریگا۔

(۳) کسی بی بی کا زیور کیا ظاہر کرتا ہے؟ یہ کہ اس بی بی کا میاں مالدار ہے یا اُسکا والد امیر ہے۔ پہننے والی کی اپنی قابلیت تو اُس سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتی۔ گویا زیور کسی مرد کی امارت جتانے کا ایک ادنیٰ سا ذریعہ ہے وہ نہ اُس کی زمین۔ اُس کے مکانات۔ اُس کے مویشی وغیرہ بجائے خود امارت کا ایک اعلان ہے۔

زیور کیوں پہنا جاتا ہے؟ خوبصورتی بڑھانے کو۔ امارت جتانے کو۔ رواج نبھانے کو۔ امرِ اوّل یعنی خوبصورتی بڑھانا تو وُہی دخل در معقولات ہے۔ امرِ دوم یعنی اظہارِ امارت اس کے بغیر بھی ہوسکتا ہے۔ رہا رواج سو رواج کیا ہے؟ ایک ایسی رسم کی پابندی ہے جس سے عام خلقت کی پسندیدگی حاصل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ خواہ وُہ رواج منقولاً اور معقولاً درست ہو یا نہ۔ اور یہ بات کہ کوئی شخص رواج کی پابندی سے دنیا کے لوگوں کی پسندیدگی حاصل کرسکے ناممکن۔ طبیعتوں کا اختلاف اور زمانے کا انقلاب کسی رواج کو ٹھہرنے ہی نہیں دیتا۔ کوئی میاں بی بی سفر کر رہے تھے۔ بی بی گھوڑے پر سوار تھی اور میاں پیدل۔ دیکھکر ایک راہ رو بولا کیسا بُزدل مرد ہے۔ کہ بی بی کے خوف کے مارے خود تکلیف اُٹھا رہا ہے اس پر وُہ خود سوار ہو گیا اور بی بی پیدل چلنے لگی۔ جس پر ایک دوسرا بولا

کیا سنگدل آدمی ہے کہ آپ تو گھوڑے پر سوار ہے اور عورت بیچاری پیدل چل رہی ہے۔ تب وُہ دونوں ہی سوار ہو گئے اور لوگوں سے بے تہذیبی کے طعنے سُنے۔ پھر دونوں پیدل چلنے لگے اور گھوڑا خالی ہمیشہ ہاتھ میں تھام لیا۔ اس پر بھی وُہ بیوقوفی کے طعنوں سے نہ بچ سکے۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ لوگوں کی پسندیدگی حاصل کرنے کے لئے انکو کس رواج کی پابندی کرنی چاہیئے تھی۔ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ دُنیا میں کوئی رواج نہیں۔

زیور کو البتہ نقصان مال اور جان کا وبال کہو تو بجا ہے۔ استعمال سے گھس گھس کر اس کی قیمت دمبدم گھٹتی رہتی ہے۔

چور بارہا بالیاں کان سمیت۔ نتھ ناک سمیت۔ کنگنی ہاتھ سمیت اور ہار گلے سمیت لیجاتے ہیں۔

اور اس پر بھی کیا ہمارے ملک کی مستورات جب آپس میں ملتی ہیں تو انکا پہلا سوال زیور کی نسبت نہیں ہوتا۔ کیا انکی پہلی نگاہ تفتیش ایک دُوسری کے زیور پر نہیں ہوتی۔ بلکہ اکثر ملنے سے بچھڑنے کے وقت تک اسی ایک ہی مضمون پر طبع آزمائیاں نہیں ہوتی رہتیں۔ کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انکو زیور کے ساتھ مجنونانہ پیار ہے۔ کیا اُنہوں نے لازمی مضمونوں میں کامیابی حاصل کرلی ہے کہ اختیاری مضمون ہر وقت زیرِ مطالعہ رہتا ہے۔

۴۔ ظاہر ہے کہ زیور ضروریاتِ زندگی میں سے نہیں ہے۔ البتہ لوہے کی چیزوں کے بغیر انسان کا زندگی بسر کرنا محال ہے۔ جس کی کسان کے ہل سے لیکر بادشاہ کے محل تک کے لئے یکساں ضرورت ہے اور اب ذرا مقابلہ کرو کہ ہندوستان میں لوہار کتنے ہیں اور سُنار کتنے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں لوہار ۲۸۴۹۰۸ تھے اور سنار ۴۰۵۲۸ تھے (اب تو اس سے بھی کہیں زیادہ ہونگے) گویا انسانی

زندگی کے ضروری لوازمات مہیا کرنے والے غیر ضروری چیزیں بنانیوالوں سے پندرہ ہزار کے قریب کم ہیں اور فی کس بارہ روپیہ ماہوار آمدنی کے حساب سے سُناروں کی اس چار لاکھ نکمی فوج پر ملک کا چھ کروڑ روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے جو اگر مفید حرفوں میں لگایا جائے تو کیا اچھی ترقی ہو سکتی ہے۔ آئے دن کے قحط اور گرانی کی عالمگیر شکایات سے ملک کی حیثیت ظاہر ہے وُہ ایسا مالدار نہیں ہو کہ ضروری چیزیں چھوڑ کر کھلونوں پر اپنا روپیہ برباد کرے۔

۵۔ زیور انسان کی خودنمائی کے جذبہ کو اُبھارنے والا ہو پہننے والے کے دل میں بچوں کی سی خواہش پیدا ہو کر ویسی ہی عادت بنجاتی ہو۔ یہ پہننے کیلئے نہیں پہنا جاتا دکھانے کیلئے پہنا جاتا ہے۔ جسکا ثبوت ذیل کے لطیفے سے کیا اچھا ملتا ہو کہتے ہیں کہ کسی ڈومنی نے جوشن بنوائے پہنکر دن بھر شہر میں پھری۔ اتفاق کی بات اُس بیچاری کو کسی نے نہ پُوچھا کہ وہ جُوشن کب بنوائے اور کہاں سے بنوائے۔ واپس آکر گھر کو آگ لگا دی۔ جب لوگ جمع ہوئے تو ایک نے پُوچھا یہ آگ کہاں سے لگی؟ ڈومنی جوشن کی طرف اشارہ کرکے بولی یہیں سے تو لگی۔ تب اُس نے پُوچھا یہ جوشن کب بنوائے ہیں جھنجھلا کر جوابدیا۔ کمبخت اگر پہلے ہی یہ بات پُوچھی ہوتی تو آگ کیوں لگتی۔

آراستگی تو بُری چیز نہیں البتہ اس سے جو نتیجہ پیدا ہوتا ہے وُہ خطرناک ہے۔ کہ انسان جو کچھ تو پہلے ہی خودنما پیدا ہُوا ہو ہوتے ہوتے نمائش میں ایسا منہمک ہو جاتا ہے کہ اصل غرض ہی کو بھُول جاتا ہے۔ جس کے لئے یہ پیدا کیا گیا ہے ۔

ہوشیار

ابیلارڈ اور ہیلائیس

یہ ایک سچی محبت کا تاریخی واقعہ ہے جو سنہ ۱۱۴۲ء میں فرانس میں گذرا ہے۔ عاشق و معشوق پیرس کے ایک مقبرہ میں ہمیشہ کی نیند سوتے ہیں۔ ذیل کا خط زمانہ فراق میں لکھا گیا ہے:-

---

مجھے یہ دیکھنے سے کس قدر حیرت ہوئی کہ تمہارا پورا خط دلشکن بدبختی کے کوائف سے بھرا ہے۔ زمانہ دراز میرے زخموں کو بند کرنے کو چاہیے تھا لیکن تمہارے خط نے زخم تازے کر دیئے۔ دیکھو! میں منت کرتی ہوں تم نے کس قدر پریشان حال مجھے بنا دیا ہے۔ دنیا میں میرے لئے کسی قسم کی راحت نہیں ہے سوائے اس کے کہ تم ہی میرے لئے باعث شادمانی ہو۔ نامہربان نہ ہو۔ میں تھوڑی سی راحت تم سے بھیک مانگتی ہوں اور تم مجھے دے سکتے ہو۔ مجھے اپنے پورے حالات معلوم کراؤ۔ شاید میری آہ وزاری تمہاری تکالیف کو کم کرے۔ جب تم مجھے لکھو گے میں جانونگی کہ تمہارے دل میں میری یاد باقی ہے اور یہ بات میرے لئے باعث شادمانی ہوگی۔

میرے کمرے میں تمہاری تصویر ہے اور جب کبھی وہاں سے گذرتی ہوں تو اسکو ایک تمنا بھری نظر سے دیکھنے کے لئے کھڑی رہجاتی ہوں۔ دیکھو! ایک تصویر سے مجھے اسقدر راحت ہوتی ہے جو صرف تمہارا عکس ہے تو تمہارے خط سے کیوں نہ خوشی ہو۔ ہم کو آپس میں لکھنا چاہیئے۔ میں پڑھوں گی کہ تم میرے شوہر ہو اور تم دیکھوگے کہ میں اپنے آپ کو تمہاری بی بی لکھوں گی۔ میری قسمت میں

ابھی وہ خوشی نہیں ہے کہ مَیں تم کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں ۔اس لئے اس کے بدلے میں صرف تمہارے خطوط ہی میرے لئے باعث اطمینان ہونگے ۔ مَیں تمہارے پاک خیالات کو پڑھوں گی ۔ انکو ہمیشہ اپنے ساتھ جان کی طرح رکھونگی اور ہر لحظہ آنکھوں سے لگاؤں گی چُوموں گی ۔ اگر تم نہ لکھو کہ تم مجھے دل سے پیار کرتے ہو تو مَیں کسی صُورت سے زندہ نہیں رہ سکتی ۔

جب تم مجھے لکھو گے تو تم اپنی بی بی کو لکھو گے ۔عقد نے ایسی خط کتابت کو جائز بنا دیا ہے تو تم کیوں نہیں مجھے مطمئن کرتے ہو ۔ مَیں صرف اپنے تمام عہدوں ہی سے پابند نہیں ہوں ۔ بلکہ میرے لئے میرے چچا کا خوف ہی لیکن تمہیں تو کچھ وجہ نہیں کہ تم ڈرو ۔ تم ہی میری بدبختی کا باعث ہُوئے ہو ۔ اس لئے تم میری راحت کا سبب بنو ۔ تم بھُولے نہیں ہو (کیونکہ عاشق کبھی بھُولتے نہیں) کہ کبھی خوشی سے پُورا دن تمہارے ساتھ گذارتی تھی اور جب کبھی تم باہر ہوتے تو مَیں اپنے آپ کو ہر ایک سے جُدا کر کے تم کو خط لکھتی تھی ۔ جب تک میرا خط تمہیں نہیں پہنچتا تھا مَیں کس قدر بےچین و بیقرار رہتی تھی ۔ پیام بر کو پانے کے لئے کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ اس رام کہانی سے شاید تم گھبراؤ ۔ لیکن میرے جذبات کی کوئی انتہا نہیں ہے ۔ کیونکہ مَیں اس سے بھی زیادہ دُکھ اُٹھا چکی ہُوں مَیں نے اپنے سے نفرت کی ہے تاکہ صرف تم ہی سے محبت کروں ۔ مَیں خود کو برباد کرنے کے لئے اس قید خانہ (ننری)[۱] میں اس لئے آئی کہ تم کو آرام سے رہنے دوں ۔ یاد رکھو ! صرف اُس ہی دل میں یہ جذبات گھر کرتے ہیں جو پاک محبت کے شعلہ سے منوّر ہو ۔ ناپاک دل میں ایسے خیالات آتے ہُوئے بھی گھبراتے ہیں ۔ مَیں تم کو دُنیا کی ہر ایک چیز سے زیادہ چاہتی ہُوں اور اپنی زندگی کے آخری دم

[۱] رُہبان کا مسکن جو تارک عورتوں کے لئے مخصوص ہو ۔

تک اسی طرح چاہونگی - گو بی بی کا نام دُنیا کی نظر میں معزز ہے - لیکن معشوق کے لفظ میں زیادہ جادو ہے - یہ میری شومئی قسمت تھی کہ میں ایسے ظالم خاندان میں پیدا ہوئی جنکی دشمنی نے میری مطمئن زندگی کو خاک میں ملا دیا - اگر وہ نیک مزاج ہوتے تو میں کیوں نہ اپنے پیارے شوہر کے ساتھ خوش خوش رہتی - ہائے وہ کیسے بیرحم ہیں کہ تم کو قتل کرنے پر ایک بدمعاش کو اُبھارا - اُس وقت میں کہاں تھی - اپنے پیارے کو بچانے میں مجھے کس قدر فخر ہوتا - اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر میں تمہاری نگہبانی کرتی - آہ - یہ جذبات کی روانی مجھے کہاں کہاں لیجا رہی ہے - اب محبت گھبراتی ہے اور حیا زبان کو روکتی ہے -

میں ان عورتوں میں اپنی زندگی گذار رہی ہوں جو اپنے تئیں خدا سے بیاہی ہوئی سمجھتی ہیں - لیکن اُن میں صرف ایک میں ہی ہوں جو انسان سے بیاہی گئی ہوں میں ان لوگوں میں رہتی ہوں جو صلیب کے پُشتیبان ہیں - لیکن میں صرف ایک ہی ہوں جو انسانی جذبات کی بندی ہوں - میں ایک تن ہو کر اپنے ابیلارڈ پر فدا ہوں - اگر میں عشرت پسند ہوتی تو کیا مجھے اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں دیر تھی - میری عمر بائیس سال سے زیادہ نہ تھی - یہ صرف تمہارے ہی لئے تھا کہ میں نے اپنے حُسن و جوانی کو تم پر قربان کر دیا - اور اسکے بدلے میں بیچین گھنٹے اور فرقت کی کٹھن راتیں گذارتی ہوں - افسوس میرا خیال کرو - مجھے نہ بھولو - میری محبت اور وفا کو یاد کرو - اور مجھے اپنی معشوق سمجھکر یاد کرو - یاد رکھو میں تمہیں دل سے پیار کرتی ہوں اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کوشش کرتی ہوں کہ تمہارا خیال صفحۂ دل سے مٹا دوں - ہائے - یہ کسقدر خوفناک خیال ہے - میں مارے خوف کے کانپتی ہوں اور میرا دل مجھ سے نفرت کرتا ہے - اسوقت میرا دل بھر آیا ہے اور ہاتھ کانپ رہا ہے - معاف کرنا یہ میرے آنسو ہیں جو خط کو تر کر رہے ہیں - خدا حافظ +

محمد سعد الدین خاں (از لندن)

(ترجمہ از انگلش)

ایک ہندی گیت

شام کا وقت ہے۔ گرمی کا موسم ہے۔ پیاس کا زور ہے۔ گاؤں کے سرے پر بڑ کے شاندار درخت کے نیچے ڈگر سے بچا ہوا ایک پکا کنواں ہے۔ بہت سی گاؤں کی کمسن اور خوبصورت لڑکیاں اس کنوئیں پر پانی بھرنے کے شغل سے دل بہلا رہی ہیں اور اپنی الہڑپن کی بے خبری میں ایک دوسری سے چہل کر رہی ہیں۔ اتنے میں ایک مسافر ایک گھوڑی پر سوار پیاس کا مارا ہوا گرمی سے زار و نزار اس کنوئیں کی طرف بڑھتا ہے۔ اس واقعہ کو ہندی شاعر نے ایک گیت میں نظم کیا ہے اور وہ گیت اس طرح شروع ہوتا ہے:

نیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا ہے سوار

پھر یہ نیلی گھوڑی والا دبلا پتلا سوار پنہاریوں سے یوں مخاطب ہوتا ہے:۔

کنوئیں کی گوری تم پانی پلا دو تو راہ مسافر جاتے

پنہاریاں مسافر کی اس بے باکی پر چونک پڑتی ہیں اور اُن میں سے ایک جو سب سے زیادہ تیز و طرار اور شوخ ہے یوں جواب دیتی ہے:۔

اَے بھرپیو چھیلا بھرپیو میرا بالا ساجوبن دیکھ نہ بھول
جس کی مَیں بالی بوہڑیا اُس کے تمسے تو راج مزور

اس جواب میں کس قدر اپنے حسن اور اپنے سسرال والوں کی امارت کی ترنگ ہے پانی پلانے سے انکار ہے۔ مگر کس انداز کا انکار ہے۔ کس قدر خودداری کا اظہار ہے کہ میاں پانی پینا ہے تو خود بھر کر پی لو۔ کیا تمہارے ہاتھ نہیں ہیں۔ کہیں اسی وہم میں نہ رہنا کہ مَیں بالی بھولی ہوں تو تمہارا کام کر دونگی جس گھرانے

کی میں بہو ہوں اس میں۔ تجھ جیسے تو مزدور ہوتے ہیں پھر میں تیرا کام کیوں کرنے لگی۔ یہ جواب سنکر اگر کوئی کنارِ رود کا رہنے والا ہوتا تو یہ شعر پڑھتا :۔

غرورِ حسن اجازت مگر نہ داد اے گل کہ پرسشے بکنی عندلیب شیدا را

مگر یہ حضرت تو کوئی بڑے بگڑے دِل تھے۔ راجپوتی خون اُن کی رگوں میں گردش کر رہا تھا۔ ایسا فقرہ ایک عورت سے سنیں اور خاموش رہیں۔ دِل میں بھی اِن کے کوئی لگی لپٹی بات نہ تھی فوراً تلخ کر بولے :۔

"کاہیکا تیرا گڑوا اور کاہیکا تیرا ڈول۔ کاہیکی تیری اینڈوئی ری گوری تو کے ٹکے تیرا مول"

اِس پر جواب ملتا ہے :۔

سونے کا میرا گڑوا رُوپے کا میرا ڈول

رتن جڑاؤ میری اینڈوی رے چھیلا تو لاکھ ٹکے میرا مول

مسافر صاحب سنکر اَور بھی برافروختہ ہوتے ہیں۔ جل کر فرماتے ہیں :۔

پیتل کا تیرا گڑوا اور چمڑے کا تیرا ڈول

گھاس پھوس کی تیری اینڈوی ری گوری تو پھوٹی کوڑی تیرا مول

اس پر مسافر اور پنہاری دونوں بگڑ جاتے ہیں۔ مسافر اپنی راہ لیتا ہے اور پنہاری

بھر گڑوا لے چلی اور چڑھ گئی چندن چوبار

یہ لڑکی کچھ ایسی ویسی نہ تھی۔ اچھے کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ پانی گھڑے میں بھر کر چلی اور اپنے دو منزلے مکان پر جس میں چندن کے کٹہرے تھے چڑھ گئی وہاں جا کر اُس نے اپنی ساس سے شکایت کی۔

ساس جی نیلی سی گھوڑی پاتلی اور پاتلیا تھا سوار

کنوئیں کی گوری تم پانی پلا دو نو راہ مسافر جائے

بہو کی یہ شکایت اُس غصّے کو ظاہر کرتی تھی جو ہر صاحبِ عصمت اور شریف

لڑکی کے دل میں ایک اجنبی سے طعن آمیز فقرے سُنکر پیدا ہوتا ہے مگر بڑھیا ساس کو بھولی بہو کی نسبت اس واقعہ کا حال زیادہ معلوم ہے۔ نیلی گھوڑی والا سوار کنوئیں کی گوری کی تلاش میں اپنی ماں سے بلکر نکلا تھا۔ اس لئے ساس نے جواب دیا :-

اَے بہو وُہ تہارے شامیا تھوڑا سا پنیا دیتی پلا

نادان لڑکی جس کی شادی سات برس کی عمر میں ہو گئی تھی اور اُس دن سے آج بارہ برس ہونے آئے تھے کہ اُس نے اپنے میاں کی شکل نہیں دیکھی تھی حیرت سے کہتی ہے :-

مَیں کیا جانوں وُہ میرے شامیا تھوڑا پنیا دیتی پلا
سات برس کی مَیں بیاہی چھوڑی تو بارہ برس پیچھے آتے

خیر یہ بات تو ہو لی۔ اب میاں بیوی کا سامنا ہوتا ہے۔ میاں اٹھوا نٹی کھٹوانٹی لیکر پڑجاتے ہیں اور بیوی سے اتنے برس پیچھے تو ملے مگر بات تک نہیں کرتے تو بیوی کہتی ہے :-

کیا تمہیں کی نیندیا اور کیا تمہیں چڑھا ہے خمار
دل کی گھنڈی کھولو میرے پیارے مکھ سے اتارو رومال

میاں نے انداز سے کہا :-

نہ ہمیں کی نیندیا اور نہ چڑھا ہے خمار۔ وُہ بات یاد کر میری گوری تھوڑا سا پنیا دیتی پلا
بیچاری بیوی دل میں شرمندہ ہوتی ہے اور پشیمانی کے لہجے میں گڑگڑا کے کہتی ہے :-

ابھی میں کیا جانوں تم میرے شامیا تھوڑا سا پانی دیتی پلا
سات برس کی تم نے بیاہی چھوڑی تو بارہ برس پیچھے آئے۔

اس بیساختہ پن کی معافی سے میاں بھی خوش ہو گئے اور دونوں کا ملاپ ہو گیا۔

آزمائش

وُہ لاغر ہو کر انسان کا صرف سایہ رہ گیا تھا۔ کئی دن تک اُس نے اپنی زندگی کے چراغ کو روٹی کے ایک ٹکڑے اور دُودھ کے ایک پیالے پر جلتا رکھا۔ اور آج صبح جبکہ اُس نے اپنی جیبوں کو بے فائدہ اِدھر اُدھر اُلٹا۔ تو سوائے مفلسی کے کچھ نہ پایا۔ اگرچہ اسکو کھانے پینے کو کچھ نہ ملا تھا۔ لیکن پھر بھی اُس نے اپنی کھوئی ہُوئی طاقتوں کو کچھ عرصے کے لئے پھر جمع کیا۔ اور اخبار کے کالموں میں سے "کارکنوں کی ضرورت" دیکھنے لگا۔ جس میں سے اُس نے چند اشتہار چُنے۔ لیکن پے در پے تین جگہوں سے دریافت کرنے پر جواب ملا۔ کہ "جگہیں پُر ہو چکی ہیں"۔ اگرچہ یہ متواتر شکستیں اس کے ٹوٹے ہُوئے دِل کو پژمُردہ کر دینے کے لئے کافی تھیں۔ لیکن اس نے صبر اور ہمت کے تلخ عصا کو ہاتھ میں لیا۔ اور چوتھی جگہ قسمت آزمائی کے لئے روانہ ہُوا۔ اس وقت گرمی کی شدت اُن لوگوں کو بھی تنگ کر رہی تھی۔ جنہوں نے تمام رات عیش و عشرت اور آرام میں گذاری تھی۔ برخلاف اس کے ایک شخص کہ جس کا دماغ، جسم اور رُوح سب کچھ بیمار تھا۔ ایک اجنبی رستہ پر سخت دھوپ میں ننگے پاؤں بھوکا اور پیاسہ اپنے آپ کو گھسیٹتا ہُوا لئے جا رہا تھا۔

آخر جب وُہ اسی حالت میں تین میل کی مسافت طے کر کے منزلِ مقصود پر پہنچا تو اس کے پاؤں بالکل مجروح ہو چکے تھے۔

تھوڑی دیر کے لئے وہ اس مکان کی دہلیز پر سستانے اور اشتہار کو دوبارہ پڑھنے کے لئے بیٹھ گیا۔ اشتہار میں جب اُس نے یہ غیر معمولی عبارت پڑھی۔ کہ "دیانت دار آدمی جو پچیس سال کی عمر سے کم اور تندرست پرہیزگار اور محنتی ہو

اس کے سوا کسی کو درخواست کرنے کی ضرورت نہیں"۔ تو اس کی مایوسی تھوڑی دیر کے لئے حیرت آمیز تعجب سے بدل گئی۔ اسکو بھروسے اور حوصلہ نے اُٹھایا۔ اور وُہ دل میں یہ سوچتا ہُوا بڑھا کہ اگر صرف دیانتداری پرہیزگاری اور محنت ہی کی لیاقت چاہئیں۔ تو سب سے پہلے مجھے ہی اس جگہ کے حاصل کرنے کا بہت عمدہ موقع ملنا چاہئے۔

جب وہ اندر داخل ہُوا۔ تو وہاں بہت سے درخواست کنندے موجُود تھے جنہیں آئے ہُوئے ایک گھنٹہ گذر چکا تھا۔ یہ دیکھکر لڑکا دیر کرکے آنے پر بہت پچھتایا۔ مگر خلافِ اُمید وہ سب سے پہلے مشتہر صاحب کے دفتر کی طرف بلایا گیا۔

اندر جاکر اس نے ایک سفید بالوں والا بڈھا دیکھا۔ جو ایک کھڑکی کے نزدیک میز پر بیٹھا ہُوا تھا۔ اس بڈھے نے اس پر ایک تیز اور متجسّس نظر ڈالی اور کہا بیٹھ جاؤ۔ لڑکے نے چپ چاپ حکم کی تعمیل کی۔

بوڑھا۔ "تمہارا نام"۔

لڑکا۔ مجھے ہالفرڈ گرے کہتے ہیں۔

بوڑھا۔ پہلے تم کیا کرتے تھے۔

ہالفرڈ گرے۔ (ذرا جھجکتے ہوئے) میں سکاٹ لینڈ میں ایک کھیت پر نوکر تھا۔ لیکن مَیں نے اس کو اس خیال سے چھوڑدیا۔ کہ مَیں لندن میں اس سے زیادہ کما سکونگا۔ آج مجھے یہاں آئے ہوئے قریب دو ماہ کے گذرچکے ہیں اور ابھی تک کوئی کام حاصل نہیں کرسکا۔

بڈھا آدمی۔ "کیوں نہیں" اور پھر اپنی شُستہ نظر اپنی سُنہری چوکھٹے والی عینک کے اوپر سے لڑکے پر ڈال کر کہا "ایک نوجوان آدمی کو کام کے حاصل

کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہئے۔ یہ کیا معاملہ ہے۔ اچھا میں سچ سننا چاہتا ہوں"۔ لڑکے نے اپنی تھکی ہوئی مگر مشتعل آنکھیں بڈھے کی آنکھوں سے ملائیں اور بولا "آپ سچائی چاہتے ہیں۔ تو یہی جواب ہے کہ صرف اس لئے کہ میں بد قسمتی سے یہاں کوئی دوست نہ رکھتا تھا۔ ورنہ میں ہر ایک کام کرنے کے لئے تیار ہوں بشرطیکہ مجھے ملے"۔

بڈھا۔" زمانے کے بہت ستائے معلوم ہوتے ہو۔ تمہارے پاس کس قدر روپیہ باقی رہ گیا ہے"۔ لڑکے نے غمگین آواز میں جواب دیا۔ کہ ایک پائی تک نہیں۔ آہ! ایک پائی تک نہیں! بوڑھے نے یہ فقرہ ہونٹوں میں کہا۔ اور پھر لڑکے کی طرف گہری نظر ڈال کر بولا "تم میرے پاس اس لئے آئے ہو کہ تم دیانتدار ہو!

لڑکا۔ اگرچہ میں بالکل مفلس ہوں۔ مگر دیانتداری ابھی تک میرے پاس ہے۔ اگر میں دیانتدار نہ ہوتا۔ تو کیوں روپے کے بغیر ہوتا۔

بوڑھا آدمی (دل میں) اس میں کچھ صداقت پائی جاتی ہے (با آواز) "اچھا میں اُمید کرتا ہوں۔ کہ تم میرے کام آسکو گے۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم آپس میں کچھ سمجھوتہ کریں۔ میں مناسب سمجھتا ہوں۔ کہ جو کام میں تم سے کرانا چاہتا ہوں اس سے تمہیں آگاہ کردوں۔ اب پوری توجہ دو"۔ ......

اس کے بعد بڈھے نے ایک کاغذوں کا بڑا گٹھڑ اُٹھا لیا۔ اور دس منٹ یک بالفرد گرے کو اپنے کام کی اصلیت سمجھاتا رہا۔

لڑکا چپ چاپ اپنی نظر زمین کی طرف گاڑے ہوئے کچھ سوچتا رہا۔ اور آخر کار نظر اُٹھائی اور جیکب ایسٹرڈین (بوڑھے آدمی کا نام۔ (جو لڑکے کے دلی جذبات کو معلوم کرنے کے لئے پورے غور سے کوشش کر رہا تھا)

کی طرف مخاطب ہوا۔

لڑکا۔ "جناب معاف کیجئے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے۔ آپ کا اشتہار ایک دیانتدار آدمی کے لئے تھا۔ لیکن آپ کے کام میں ایک یا دو موقع مجھے ٹھیک یاد نہیں ایسے ہیں کہ جنکو میں دیانتداری نہیں سمجھتا۔"

جیکب ایسٹرڈین "ٹھیک درست مگر میرے لئے یہ ضروری ہے کہ میں ایک ایسا نوکر رکھوں۔ کہ جس پر مجھے پورا پورا اعتبار ہو۔ ورنہ میں بہت کچھ لوٹا جا سکتا ہوں"۔

لڑکا۔ (لاپرواہی سے) "یہ سارا کام ہی کچھ گڈمڈ سا ہے۔ اوّل تو جو شخص اس قسم کے کام کو اختیار کرلے۔ وہ اپنے آپ کو دیانتدار کہہ ہی نہیں سکتا۔ اور پھر آپ کا یہ مطلب ہے۔ کہ وہ اپنی جیبوں سے روک کر آپ کی اس قدر جیبیں بھرے۔ کہ اوپر اچھلنے لگیں۔ اس سے تو کمپنی کو دائیں بائیں ہر طرف سے لوٹنے کا مطلب ہے۔ لہذا یہ جگہ میرے واسطے نہیں"۔ یہ کہکر لڑکا اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس وقت اس کا چہرہ نہایت زرد ہو رہا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں غصہ سے چمک رہی تھیں۔ اور اس کی نازک نوجوان مورت سرو کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ جیکب ایسٹرڈین نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے سر ہلایا۔ اور مسکرا کر کہا۔ "نوجوان! تم تو کہتے تھے۔ کہ تم کو کوئی ملازمت نہیں ملسکتی لیکن اب تم خود دس پونڈ ماہوار کی ملازمت نہایت بے پروائی سے چھوڑے جاتے ہو"۔ لڑکے نے جواب دیا۔ کہ "ہاں یہ ٹھیک ہے۔ لیکن اگر میری دیانتداری کی سفید چادر پر بددیانتی کا بدنما دھبہ لگنے کی بجائے موت پیش کی جاوے تو میں بڑی خوشی سے دنیا کو چھوڑنا پسند کرونگا۔ جناب عالی! یہ ایک عمدہ ہے

جو مَیں نے اپنی ماں سے بستر مرگ پر کیا تھا۔ اور میرا ارادہ مرتے دم تک اس عہد پر قائم رہنے کا ہے۔ یہ کہہ کر وہ مایوسانہ مگر اپنی ثابت قدمی پر ناز کرتا ہوا اُٹھا اور دفتر سے باہر نکل گیا۔

جس وقت وُہ چلا گیا تو بُڈھے نے باہر کے دفتر سے ایک کلرک کو بلایا۔ اور اسکو لڑکے کے پیچھے جا کر اس کے مفصل حالات دریافت کرنے کے لئے حکم دیا۔ کلرک کو حکم دینے کے بعد بڈھا کئی منٹوں تک خیالات میں ڈوبا رہا۔ اور آخر اس کے مُنہ سے نکلا۔ "حیرانگی ہے۔ کہ پہلی ہی دفعہ اسے نوکری ملی۔ اور وُہ اس سے انکار کرتا ہے"۔ ابھی وُہ انہی سوچوں میں تھا۔ کہ کلرک واپس آ گیا۔

بڈھا۔ (شوق سے) تم نے کیا معلوم کیا۔

کلرک۔ وہ سکاٹلنڈ کا رہنے والا ہے۔ مَیں نے دو ایجنسیوں تک اس کا پیچھا کیا۔ لیکن ابھی تک اس کو جگہ نہیں ملی۔ ایجنسی والوں نے کہا ہے کہ وُہ اس کام کے کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ تب وُہ اپنے گھر بلومز بری کے ایک کمرے میں چلا گیا۔ جب وُہ اندر داخل ہُوا۔ تو اس کے چہرے سے یہ ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وُہ مایوس ہو چکا ہے۔

بُڈھا۔ مَیں بھی یہی چاہتا تھا۔ اچھا میری موٹر گاڑی منگواؤ۔ کلرک جھکا اور باہر چلا گیا۔

شام کا وقت ہے۔ اور سڑک پر ایک موٹر گاڑی جا رہی ہے۔ جس میں ایک کروڑپتی صاحب سوار ہیں۔ وُہ گاڑی چلتے چلتے یکایک ایک بہت پُرانے اور خستہ گھر کے آگے جا کھڑی ہُوئی (یہی بالفرڈ گرے کا گھر تھا)۔

کروڑپتی اُترا۔ اور اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک لڑکی نکلی اور کروڑپتی کو ایک ہال میں داخل کر کے اور ایک اَور دروازے پر دستک دیکر چلی گئی۔

فوراً دروازہ اندر سے کھُلا۔ جونہی لڑکے کی نظر بڈھے ایسٹروین پر پڑی۔ لڑکے نے حیرانگی سے اس کی طرف دیکھا پہلے وُہ بڑبڑایا۔ پھر ٹوٹے پھوٹے چند الفاظ کہے لڑکا" آپ مجھے ملنا چاہتے تھے"۔ ایسٹروین نے سر ہلایا۔ اور کہا کہ ہاں مَیں نے تمہارے گھر کا پتہ لگا لیا۔ سچ یہ ہے کہ مَیں تمہیں پسند کرتا ہُوں۔ اور تمہارے ساتھ اس مُلازمت کے متعلق پھر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ صرف تم ہی ایک ایسے ہو۔ کہ جس کو میں نے دیکھا اور نوکری کے لئے پسند کیا۔ لڑکے نے مختصراً کہا۔ کہ جناب عالی! میں بھُوکا مرجاؤنگا۔ لیکن اپنی ماں سے کبھی وعدہ خلافی نہیں کرونگا"۔

بڈھے نے کہا کہ دس پونڈ ماہوار کی طرف بھی تو دیکھو۔

لڑکا" لیکن بے عزتی کے۔ کبھی نہیں۔ ہرگز نہیں"۔

ایسٹروین کی آنکھیں لڑکے سے اُٹھ کر اس کے غریبانہ مگر آراستہ کمرے کی طرف پھریں۔ اور سب کمرہ کا چکر لگا کر ایک چھوٹی میز پر جس کے اوپر ایک چھوٹی سی نیلے رنگ کی شیشی سُرخ نشان والی پڑی ہوئی تھی۔ جا ٹھہری۔ اس نے گھبرا کر لڑکے کی طرف دیکھا۔ جس کی حالت بہت ہی مایوسانہ ہو چکی تھی۔

لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ دَوڑا۔ اور اس نے کہا کہ ہاں۔ لیکن میں خیال کرتا ہُوں کہ لمبی دَوڑ میں بھی مجھے اس کی (یعنی شیشی کی) ضرورت نہیں پڑے گی۔ بوڑھے ایسٹروین نے اپنا ہاتھ لڑکے کے کندھے پر رکھکر کہا کہ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ ایسی موت اور زندگی دونوں ہی بے عزتی ہے۔ اور ساتھ ہی دُوسرے ہاتھ سے شیشی کی طرف اشارہ کیا۔ اور کہا کہ پھر یہ کیا ہے؟ لڑکا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ مجھے اس کا خیال تک بھی نہیں۔

ایسٹرڈین - "اچھا تو پھر مجھے دیدو" - لڑکا چپ چاپ میز کی طرف بڑھا اور شیشی لا کر بڈھے کے ہاتھ میں دیدی - بڈھے نے شیشی اپنی جیب میں ڈال لی - اور کہا کہ تم اپنی ٹوپی لو - اور میرے ساتھ چلو۔

لڑکے نے کہا کہ میں آپ کے ساتھ آؤں تو لیکن میں نہیں سمجھتا ....

بڈھے نے بات کاٹ کر کہا "تم ہر ایک بات کو تھوڑی دیر میں سمجھ لوگے - اسوقت تم صرف میرے ساتھ چلے چلو - اگرچہ بڈھے آدمی کا لہجہ مجبور کر دینے والا تھا مگر پھر بھی بالفرڈ نے اس کے برخلاف کرنے کی کوشش کی - لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کوئی اور سوال کرے اس کا سر چکرایا - اور وہ فرش پر گر پڑا -

کروڑپتی جلدی سے اس کی طرف پھرا - اور جھک کر اس کا کالر بٹن کھولتے ہوئے بڑبڑایا "بھوک سے مر رہا ہے - اور نوکری سے انکار کرتا ہے - کیوں صرف اس لئے کہ وہ اس کو راستبازی نہیں سمجھتا - ہاں ہاں میں یقین کرتا ہوں کہ آخر کار میں نے ٹھیک آدمی حاصل کر لیا - قبل اس کے کہ لڑکا ہوش میں آنے کے آثار ظاہر کرے - ایسٹرڈین فوراً اٹھا اور اپنے منتظر شافر (موٹر چلانیوالا) کو حکم دینے کے لئے باہر نکل گیا -

اس کے پانچ منٹ کے بعد بالفرڈ گرے کی بیہوش مورت پارک لین میں جیکب ایسٹرڈین کے گھر کی طرف لیجائی جا رہی تھی -

اس واقعہ کو ایک ماہ کا عرصہ گذر گیا ہے - اور آج وکیلوں کی مشہور کمیٹی ایک لاوارث کروڑپتی کی (جو کہ وسٹ انڈیز کے بہت بڑے حصے کا مالک تھا) وصیت کو مرتب کرنے کے لئے بیٹھی - تو ایک کاغذ کے پیش ہوتے ہی جس پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی - کہ بالفرڈ گرے کون بالفرڈ گرے کون بالفرڈ گرے صرف دیانتدار جسکو میں جانتا ہوں - میرا متبنّٰی ہے" - ایک عجیب شور سا

پیدا ہو گیا۔

جب اس کے کئی سالوں کے بعد ہالفرڈ گرے جیکب ایسٹر ڈین کا وارث ہوا۔ تو وُہ بہت دفعہ اپنی والدہ کے لفظوں کو دُہرایا کرتا تھا۔ جو اس نے اپنے بستر مرگ پر کہے تھے۔ کہ بیٹا راستباز رہو۔ اس کی پرواہ نہ کرو کہ تمہیں کس قدر تکلیف اُٹھانی پڑے۔ کبھی سوائے راستبازی کے اور کسی چیز کے حریص ہو۔" اور وُہ خوش تھا۔ کہ شکر ہے۔ مَیں ویسا ہی نکلا +

(ترجمہ از انگریزی)

کاشتِ انگور

نواب عزیز جنگ بہادر کی طبع تنوع پسندی کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہ ایک طرف آصف اللغات جیسی خالص علمی خدمت میں مصروف ہیں تو دُوسری طرف فن زراعت میں معقول دخل رکھتے ہیں اور اس میں بھی صاحبِ تصنیف و تالیف ہیں۔ انکی دو کتابیں زراعت و باغبانی کے متعلق اسوقت ہمارے سامنے ہیں۔ ایک فلاحۃ النخل یعنی کھجور کی کاشت پر ہے۔ اور دُوسری کاشتِ انگور پر ہے۔ موخر الذکر میں درخت انگور کے جغرافی حالات خصوصیات۔ اقسام۔ طریقۂ کاشت۔ امراض اور انکے علاج کے طریقے بیان ہُوئے ہیں۔ اس تفصیل کے ساتھ کہ ساڑھے چار سو صفحہ کی ضخیم کتاب بنگئی ہے۔ اس طرح کھجور کی کاشت میں درخت خرما کا تاریخی و جغرافی احوال۔ اس کی خصوصیات۔ کیمیائی تحقیق۔ طریقہ کاشت امراض و علاج سب درج ہیں۔ یہ کتاب کوئی پونے تین سو صفحہ کی ہے۔ محکمہ زراعتِ آگرہ واودھ نے اس کتاب کو نہایت پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ ایک بڑی خوبی ان دونوں کتابوں میں یہ ہے کہ عربی کُتب سے بھی انکی تالیف میں مدد لی ہے اور انگریزی کتب سے بھی۔ اور اس اعتبار سے اُردو زبان میں بہت ہی مفید اور مغتنم مجموعۂ معلومات ہیں کتابیں مجلد ہیں اور قیمت حسب ذیل ہے۔ کاشتِ انگور قیمت ۱۲ مجلد ۔ کھجور کی کاشت قیمت ۴ مجلد

پتہ :۔ عزیز باغ۔ سُلطان پورہ۔ حیدر آباد دکن۔

معشوقۂ عرب

مندرجہ ذیل مضمون ایک عربی ناول کے ایک باب کا ترجمہ ہے۔ ہمارے مکرم جناب جواد علی خاں عالی نے یہ باب نمونتہً بھیجکر یہ لکھا ہے کہ اگر ناظرین اس کو دلچسپ پائینگے۔ تو اَور باب بھی جو ترجمہ ہو گئے ہیں پیش کئے جائینگے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انہیں عربی عبارت کو اُردو لباس پہنانے میں بہت کامیابی ہوئی ہے اور اُمید کرتے ہیں کہ وُہ اس کتاب کے اَور حصّے بھی عنایت کرینگے۔

سمیّہ !!! (دل میں) یہ خانہ خراب محبّت ہم تینوں کی (یعنی اس کی خود، اُس کے باپ اور اس کے عاشق حسنؔ) کی عذابِ جاں نکلی۔ اگر عشق کی راہ اختیار کرتی ہوں تو والد کے احکام سے سرتابی کرنی پڑتی ہے۔ دُنیا کی نگاہ میں بدلحاظ ٹھہرتی ہوں۔ اور والدین کے جو حقوق سعادتمند اولاد پر ہیں، اُن کے رُو سے ملزم قرار پاتی ہوں، اگر ان خیالات سے درگذر کرتی ہوں تو بھی نہیں بنتی، ذرا سے تغافل میں ایک قیمتی جان کے لالے پڑ جائینگے۔ محبّت والوں میں پاگلپن کے ہلکے نعرے سے یاد کیجاؤں گی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھ سے ایسا ہوگا کیسے؟

محبّت کو عذابِ جاں مَیں کہنے کو تو کہہ گئی۔ لیکن اَے دِل! تو ہی اِنصاف سے کہہ دے کہ دُنیا میں یہ لذّت تو نے کسی اَور بات میں پائی؟ جب سے اُلفت آشنا ہوا دُنیا کی کسی اَور بھی بُری بھلی شے کی تو نے تمنّا کی، اس میں شک نہیں کہ اس میں مُبتلا ہونے سے تیری تمام زندہ دلی، تیری ظاہری خوش مذاقی، کی جگہ غم والم، حسرت و تمنّا نے لے لی، لیکن اس دلاویز غم پر کیا تو اپنی تمام خوشیاں دل سے نثار کرنے کو تیار نہیں،

تیری آنکھوں سے بجائے مشتاقِ تماشا شوخ، اور للچاتے ہوئے تار نظر کے اشکوں کی جھڑی جاری ہے۔ لیکن کیا دنیا کے گوہر آفرین سمندروں نے آجتک جتنے آبدار موتی پیدا کئے، انکی قیمت ان اشکوں کی لڑی کے ایک دانہ کو بھی پہنچتی ہے۔

اگر آج تیرے زخمِ دل سے یہ خارِ غم نکل جائے، تیرے پہلو سے یہ میٹھا درد جاتا رہے، اور تیری صدفِ چشم اِن گوہر اشک کا رونا بند کر دے، تو زندگی بے مزہ، خیال تاریک، اور تو جسم بے جان ہو کر رہ جائے۔ حق تو یہ ہے، کہ جس کے دل میں داغِ اُلفت نہیں، وہ لطفِ زندگی سے بے بہرہ ہے، اور اس کی زندگی زندگی نہیں۔

بشکند دستے کہ خم در گردنِ یارے نشد
کور بہ چشمے کہ لذت گیر دیدارے نشد

تو جب تک اس لطف سے آگاہ نہ تھی، نہ تھی، اب آگاہ ہو کر بے اس کے چین نہیں پاسکتی، تیری وہ گھڑیاں کس بے چینی و اضطراب سے گذرتی ہیں، جب ذکرِ حبیب سے تیرا مرکزِ خیال ہٹ جاتا ہے۔ یہ اسی رُوحانی نسبت کا کرشمہ ہے، واہ کیا پیارا اور دلکش نام ہے، (حسن) جو لذت و شیرینی اس نام میں ہے وہ کسی دوسرے لفظ میں نہیں، نام لیتے ہی زبان میں ایک احساس پیدا ہوا جو جسم میں رُوح بنکر دوڑ گیا۔ فرطِ شوق میں کسی خیال کے آجانے سے دامنِ صبر ہاتھ سے جاتا رہا، اشک آنکھوں سے جاری ہی تھے، ایک آہِ سرد دلِ دردمند سے نکلتے ہی، جسم پر سکون طاری ہو گیا، اور خیالات کا سیلاب بھی کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔

دفعتہً کسی سخت خیال نے گویا اسے ہوشیار کیا، نیم باز آنکھیں کھولیں، اور ٹوٹے ٹوٹے ہوئے الفاظ میں (جو نیم ہوشیاری کی وجہ سے تھے) ہم نے یہ کہتے سُنا:۔

"تا کہ والد کے ..... کہنے کا میں پاس ..... کروں، اور اُلفت ..... سے"
"باز آؤں۔ لیکن ایک بے گناہ پر ..... جو بیجا حملہ کا ..... ارادہ ..... کیا"
"گیا ہے، ..... اگر میں اُس کی ..... روک نہ بن سکوں ..... تو کم از کم ....."
"اُس کی اطلاع تو اُسے ..... ضرور کر دوں"۔

"ادائے حق والدین کے یہ معنی ..... نہیں کہ خلافِ انصاف ..... امنِ عامہ"
"امور میں بھی اُنکی خاطر سے ..... دریغ کیا جائے، اور پھر یہ تو ایسے"
"شخص کے مقابلہ میں ہے، جو اِس عمومی حیثیت سے کہیں بلند پایہ"
"اور تیری ..... انسانی امداد کا سچا مستحق ہے۔ اور جبکہ اس کی کوئی خطا"
"بجز اس کے نہیں، کہ وہ ہمارا سچا محسن ہے، اور اسی استحقاق سے"
"وہ اپنا حق میری نسبت جتاتا ہے۔ جس کے شکریہ کا احسان اور ایفا"
"وعدہ یہ کیا جا رہا ہے۔ معاذ اللہ"۔ میرے والد کے خیالات سراسر"
"ظالمانہ ہیں، اور اللہ پاک کو ظلم ناپسند ہے پس مجھے بھی ناپسند"
"ہی کرنا چاہیئے۔"

اِتنا کہکر وہ سرو قد کھڑی ہو گئی۔ شام کا وقت گزر کر تاریکی کا پردہ پڑ چکا تھا، اور اس کی حسبِ مرضی وقت آ چکا تھا، لہٰذا جو لباس اُس کے نرم و نازک جسم پر تھا، وُہ معمولی اوتار چڑھاؤ سے۔ بدن پر اس طرح سج دیا گیا، جو تیز رفتاری میں ذرا بھی مانع نہ ہو سکے، پھر نُورانی چہرہ ایک خوبصورت نقاب سے چھپایا گیا، اور ان سب تیاریوں کے بعد حُور وش سمیّہ ایک محرم راز کنیز کے ساتھ بابُ المدینہ کی سمت روانہ ہو گئی۔

سمیّہ کے متعلق جہانتک ہمیں خود اس کے اضطراری خیالات نے دریافت حال کا موقعہ دیا وُہ یہ ہے کہ سمیّہ اور پاکباز سمیّہ کسی شخص مسمّی حسن سے عہدِ اُلفت

باندھ چکی ہے، جسکی استواری میں وہ دل سے کوشاں ہے۔ لیکن اس کا باپ اس کے خلاف ہے، اور اس قدر خلاف ہے، کہ حسن پر کسی مخالفانہ حملہ کی تاک میں ہے، اور موقع پا کر وہ اس وقت حسن کو اُن ارادوں سے آگاہ کرنے اور تدابیر حفظ ماتقدم کرنے کا مشورہ دینے کو گھر سے نکلی ہے۔

ایک کنواری نازنین کا بے محابا ایک غیر شخص سے ملاقات کرنے کے لئے جانا، موجودہ نیز قدیم الایام کے معیار تہذیب میں شرافت پر دھبہ لگانے والی بات ہے۔ لیکن ہمارے ناظرین سمیہ کی اخلاقی غرض وغایت سے لاعلم نہیں، نیز اس کے سچے جوش، اور عرفانی جذبات میں پاک نفسی، اور صاف باطنی کا جو رنگ ہے، وہ اس کے ان پچھلے الفاظ میں جھلکتا ہے۔

یاالٰہی ماھٰذالحُبُّ ؟..... اِذاکنت
ترٰی اَنْ اَخْطِی فی مَا اقول
فانزع..... حُبَّ ھٰذا الشّاب من
قلبی ..... لا ..... لاتنزعه....
اوانزعه یاالٰہی ..... اوکماتشآءُ
آہ ..... لا اریٰ ھذا کلہٗ الّا
ممّا یزید فی تعلقًا وھیامًا..
اللہ ..... ھوالذی اراد ان
نحب احدنا الاخریٰ ..... والحبّ
الّذی یکون خالیًا من الدنسٓ
وغایته شریفةٌ اِنّما ھومِن
عنداللہِ +

خداوندا! محبت کیا شے ہے؟ اگر میرے لیں کوئی زبانی ہے، تو ٹھنڈے دل سے میں یہ کہتی ہوں کہ حسن کی محبت مجھ سے چھین لے۔ نہیں۔ نہ چھین یا چھین لے۔ جیسے تو چاہے تیری مصلحت میں مصلحت ہے۔ اسکی محبت نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے، حقیقت تو یہ ہے، کہ اس محبت کا دلوں میں ڈالنے والا تو ہی ہے، ہماری محبت کو تو چاہتا ہے، محبت بھی وہ محبت جو رکیک حالات سے پاک ہے، اس کا منشا، خالص، اور وہ خدا پاک کی عطا کردہ ہے +

سمیہ کیا بحیثیت اپنے عادات و اخلاق کے اور کیا بحیثیت حسن و جمال کے زینتِ خواتینِ مدینہ کہلاتی ہے۔ اور ہم نے بھی اس کے ہر انداز میں جو بات پائی وُہ یہ تھی کہ اس کے تمام حرکات و سکنات تہذیب متانت اور دانشمندانہ جچے تلے سانچے میں ڈھلے ہوئے معلوم ہوتے تھے، تصنّع اور تکلّف تو اس نے نام کو چھو نہیں گیا ہے۔

حسن صورت کے متعلق یہ کہنا کافی ہے کہ دستِ قدرت نے اپنی کمال صناعی سے ایک بُت تراش کر، اس میں جان ڈالی تھی۔

اس کا مذاق بھی صورت کی طرح بولتا ہوا تھا۔ مدینہ بھر میں وُہ بزمِ مشاعرہ بے رنگ مانی جاتی تھی جس میں سمیہ کسی خوش فہم داد وتحسین سے گرمیٔ کلام، اور شعراء کا حوصلہ بڑھانے کے لئے رونق افزاء بزم نہ ہو۔

الغرض سمیہ کو چونکہ حسن کی روانگی کی اطلاع باب المدینہ کے راستہ سے ہو کر ملی تھی، اس لئے وُہ باب المدینہ پر پہنچ کر نشیبی جانب ٹھہر گئی اور انتظار کے مزے لوٹنے لگی، حسن جوں ہی باب المدینہ سے نکلا، شاہراہ کے نشیبی درختوں سے کسی آدمی کے نکلنے کی آہٹ معلوم ہوئی۔ اور کچھ آواز کی بھنک بھی کان میں پڑی، حسن اس آہٹ سے ٹھٹک گیا۔ لیکن آواز پر کان لگائے رہا۔ درختوں سے جو چیز نکل رہی تھی وُہ برابر بڑھتی رہی اور راستہ سے قریب ہو کر اس کی زبان سے ایک آواز نکلی، جس سے حسن کو ایک آرزومندانہ تحریک ہوئی۔ اور بجائے اپنے وجود کو چھپانے کے اس نے جلد تر اپنے کو اس نو وارد انسان تک پہنچایا، اور اس کے پہلے لفظ کا جواب جو غالبًا اس کا نام تھا اور اُسے متنبہ کرنے کے لئے ادا کیا گیا تھا۔ آگاہی کی شان سے استعجاب کے لہجہ میں جس لفظ سے دیا گیا وُہ سمیہ کا پیارا نام تھا،

اور اب اس متناطیسی طریق تعارف کے بعد وُہ دونوں پُرارمان، اور دل از دست دادہ عاشق و معشوق آمنے سامنے آ گئے۔

حسن (حیرت سے) کیا فی الحقیقت مَیں اپنی دلربا اور پری پیکر سمیّہ کو ان آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، یا مزید برآں حیرت خیز خواب کا نظارہ میرے پیشِ نظر ہے۔ اگر ماہ طلعت سمیّہ واقعی اس ظلمتکدہ دل کو منور کرنے آئی ہے، تو کیا پُوچھ سکتا ہُوں۔ کہ وُہ کیا چیز تھی؟ جس نے میری حور شمائل محبوبہ کو اس تشنہ کام محبت تک پہنچایا۔ اگر مَیں اُسے اپنی بیداری بخت کہوں تو دل نہیں قبول کرتا، اب تک کبھی مَیں ایسا خوش قسمت تو نہ تھا، نہیں! نہیں! یہ جذبِ اُلفت کا معجزہ ہے۔ جو میرے نزدیک اب عین الیقین کا درجہ رکھتا ہے۔ میری تمام عمر میں یہ مُبارک گھڑی ہے، جس کی قدر و قیمت کو عیشِ جاوداں بھی نہیں پہنچ سکتی۔"

حسن یہ کہ رہا تھا۔ اور سمیّہ (جو شجاعت اور فریفتگی کے انداز سے) ایک خرمے کے درخت کے تنہ سے ٹیک لگائے دم بخود کھڑی تھی۔ اور باوجود اس کے کہ رات کی گھٹا ٹوپ اندھیری عالم پر محیط تھی۔ عفت کوش سمیّہ کا رُخِ زیبا اب بھی نقاب سے چھپا ہُوا تھا، ہوا کا دستِ گستاخ اگر نقاب کے ساتھ کچھ اٹکھیلیاں کرتا ہُوا دکھائی دیتا تو بڑی پھرتی سے ہاتھ کے اشارہ سے وُہ اس گستاخی سے روک دیا جاتا۔

حسن دل ہی دل میں اسوقت اس خیال سے نہال ہُوا جاتا تھا کہ اسکی معشوقہ کے دل میں اس کی طرف سے بڑی جگہ ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے اس نے سمیّہ سے تنہائی میں ملاقات کی کوشش کی تھی، لیکن اس کی کوشش لاحاصل رہی تھی، بخلاف اس کے آج سمیّہ نے باوجود سخت جکڑبندیوں کے بھی نخلِ آرزو کے ملاقات سرسبز کر دکھایا تھا۔

کی جس اولوالعزمی کے صلہ میں سمیتہ نے دربار محبت سے تمغہ کا استحقاق قائم کیا ہے، اُس سے اس کے منصفانہ دل میں حسن کی تصویر عشق کی گلکاریوں سے نہایت دلفریب نظر آرہی ہے جس کے دیکھنے کو چشم وجدان ورکار ہے۔ عشاق کی اس رُوحانی مسرت کا کہ اُن کا منظورِ نظر بھی ان کے عشق کی کیفیت ولذت اپنے دل میں رکھتا ہے۔ کوئی چیز مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اور جب یہ کانٹا بھی نکلجاتا ہے کہ اُن کی خلوت محبت کی تاک جھانک سے رقیب کی چشم بدبین بھی قاصر ہے، تو امیدوں کا سبز باغ آنکھوں کے سامنے لہلہانے لگتا ہے۔ گلہائے آرزو کی خوشبودار چادر اُن کے بستر عیش پر بچھ جاتی ہے۔ ذوق وشوق پیر پھیلاتا ہے، اور کاشانۂ دل نئے اور خوشنما ساز وسامان سے معمور کیا جاتا ہے۔

ہمارا عربی نژاد حسن اسوقت انہیں جذبات کے اثر سے باغ باغ ہو رہا ہے۔ جس کی حالت دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے ؎

اضطراب دلِ بلبل کوئی دیکھے اُسوقت
کھل کے جب بوئے محبت گُل تر دیتا ہے

لیکن حسن کے خیالات میں کسی فوری انقلاب کے اثر سے اُس کے چہرے کی تازگی اور انبساطی کیفیت میں گونہ فرق آگیا۔ جو کامیابی کی سُرخی ابھی ابھی چہرہ پر جھلک رہی تھی وُہ جاتی رہی اور بظاہر حال کسی منقبض خیال کے پیدا ہوجانے کا پتہ دینے لگا۔ وُہ خیال یہ تھا کہ:۔

جب گلشن امید کی گلگشت میں وہ مصروف تھا۔ دفعتہً ایک طرف سے سمیتہ کے والد (معوقجہ) کی خیالی تصویر نظر آئی۔ جو سمیتہ کو اس کے عزائمِ الفت پر تہدیدی تیور دکھا کر بولی:۔

"تجھے ان خام خیالیوں سے باز آنا چاہیئے۔ میں نے بارہا تجھے"
"سمجھایا لیکن تو کسی طرح راہ پر نہیں آتی۔ لے! اب سُن۔ آج سے"
"تجھے میری خاص نگرانی میں رہنے کے لئے تیار ہو جانا چاہیئے"
"جس کے بعد تو کبھی حسن کی پرچھائیں بھی نہ دیکھ سکیگی"۔
چونکہ حسن کو مدینہ میں معتبر ذرائع سے اس کی محبت کی وجہ سے سمیہ پر اسکی والد کی طرف سے سخت گیری کی خبر مل چکی تھی، اس لئے یہ دل دوز خیال اس مبارک گھڑی میں بھی آموجود ہوا۔
اس خیال کے آتے ہی حسن نے پھر اپنا کہا :-
حسن "میں نہیں کہہ سکتا کہ ایسا مبارک موقع بھی دنیا میں آج تک کسی کو"
"نصیب ہوا ہوگا۔ سچ تو یہ ہے کہ میرا یہ خیال بھی اس موقع"
"پر رشک کرتا تھا۔ متواتر کوششوں کے بعد ناکامی کا خیال اسکا"
"حوصلہ پست کر دیتا تھا، لہٰذا اس کی مسرت جو کچھ میرے دل میں"
"ہے اُس کے اظہار سے زبان قاصر ہے لیکن اس کے ساتھ یہ"
"کھٹک بھی دل میں پیدا ہو گئی ہے کہ اس ملاقات کا کوئی بُرا اثر"
"میری جان سے زیادہ عزیز دلربا پر نہ پڑے"۔
سمیہ نے اس آخری جملہ کو حیرت سے سُنا، کیونکہ اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ جس ارادہ سے سمیہ حسن کو مطلع کرنے آئی ہے۔ اُس سے نہیں تو اس معاملہ کے کسی نہ کسی پہلو سے حسن ضرور واقف ہے، اب سمیہ سے مارے شرم کے کچھ جواب دیتے نہ بنتی تھی، کیونکہ وُہ کسی غیر کا ارادہ نہ تھا، بلکہ اس کے والد کا، وہ مبُت بنی کھڑی تھی، حسن سے اس کا انداز خموشی نہ دیکھا گیا۔ اس نے کہا :-

"کچھ تو کہو، آخر یہ حیرانی و پریشانی کس بات کی ہے، کیا تمہیں میرے مکہ"
"کے سفر سے کچھ اندیشہ ہے؟"

اس فقرہ کا ختم ہونا تھا کہ سمیہ اپنی دلی کاوشوں کو نہ روک سکی، اور جو دلخراش خیال اس کے جگر میں چٹکیاں لیتا تھا، اس میں واقعیت کی جھلک پاکر اس کا دل قابو سے باہر ہو گیا۔ غم کی گھٹا دل پر چھا گئی اور آنکھوں سے اشکوں کی جھڑی لگ گئی۔ کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن فرطِ بکا سے یارائے سخن نہ تھا، دیر کے بعد تھرتھراتی ہوئی آواز سے غمناک لہجہ میں ٹھہر ٹھہر کے اس نے یہ الفاظ ادا کئے۔

سمیہ۔ بے شک مجھے ہر وقت تمہاری جان کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ نہ صرف اس تمہارے سفر سے، بلکہ:۔

ابھی کچھ کہنا چاہتی تھی، لیکن پھر اس کا دل بھر آیا، اور محبت بھری آنکھیں پُرنم ہو گئیں، سمیہ پر تاثیر کا یہ رنگ دیکھ کر حسن کا دل بھی بیقرار ہو گیا۔ بے ساختہ اس نے سمیہ کا نرم و نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیلیا، چونکہ حسن کو یہ پہلا اتفاق تھا کہ اس نے نازک اندام سمیہ کی نرم نرم انگلیوں کو مس کیا تھا، اس لئے اس کی روح میں ایک عجیب مقناطیسی احساس ہوا۔ اس غیر معمولی تاثیر سے سنبھل کر کہنے لگا:۔

حسن۔ کیا کہتے کہتے رک گئیں۔ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں۔ بلا تکلف کہو۔ کیا خاص مدینہ میں بھی کوئی میرا دشمن پیدا ہو گیا ہے۔ مگر تم کچھ خیال نہ کرو۔ مجھے کسی کی دشمنی کی مطلق پروا نہیں، جب تک کہ تم مجھے چاہتی ہو، تمہارا اقرارِ محبت اور اس بات کا جان بخش اطمینان کہ تم میرے سوا کسی کو نہیں چاہتیں، میری زندگی میں ہزار نعمتوں کی ایک نعمت ہے، اور اس کی قوت پر میں تمام دنیا کی مخالفت کی تاب لا سکتا ہوں۔

سمیہ (دیگر آواز میں) اور جب میں ہی تمہاری دشمن ہو جاؤں۔

حسن۔ جب تم دشمن ہو جاؤ۔ تو نے مجھے خود ہی زندگی وبال ہو جائیگی۔ اور اس وقت جو میری جان لیگا اُسے مَیں اپنا سب سے بڑا محسن اور رفیق سمجھونگا۔ لیکن مَیں نہ مانوں گا۔ جو تمہارے دل میں ہے صاف صاف کہ ڈالو جسے میرا دشمن سمجھتی ہو، اُس کا نام اگر بتلا دو تو تم کو دکھا دُوں، کہ کیونکر اس کا قصہ پاک کرتا ہُوں۔

حَسَن کے چہرہ کی معمولی متانت میں اس گفتگو سے فرق آگیا تھا۔ اُس نے پھر یہ الفاظ کہے۔

حسن۔ میری پیاری! کیا تم نہ مجھے اُس شخص کا نام بتلا سکتی ہو۔

سمیہ۔ (جسے اب جوشش گریہ سے یارائے ضبط نہ رہا تھا، اور پھُوٹ پھُوٹ کر رو رہی تھی) مَیں نہیں چاہتی، کہ اُسے مَیں خاک و خون میں غلطاں دیکھوں۔

وُہ اس وقت عجیب کشمکش میں تھی، باپ کا نام لینے پر عاشق کے مَیل خاطر آجانے کا خیال مجبور کرتا تھا، لیکن حمیت و غیرت بار بار زبان پکڑ لیتی تھی۔ حَسَن دشمن کا نام بتلانے میں سمیہ کی طرف سے اتنا تامل دیکھکر حیرت زدہ ہو رہا تھا، کہ اس میں کیا راز ہے،

حسن۔ اب زیادہ انتظار نہ کراؤ، کیا میرے اصرار کا تمہیں بالکل خیال نہیں۔ مدینہ سے نکلے ہُوئے مجھے بہت عرصہ ہوگیا۔ اور میرا ایک دوست یہیں قریب میرا انتظار کرتا ہوگا،

سمیہ۔ لیکن قبل اس کے کہ مَیں اُس کا نام لوں، میرا فرض ہے کہ مَیں اُسکی طرف سے عذر خواہی بھی کر لوں۔ گو مَیں جانتی ہوں کہ یہ عُذر خواہی مجھے ذمہ داریوں کی عام اخلاقی گرفت سے سبکدوش نہ کر سکیگی۔ لیکن مجھ اسیر دامِ محبت کو وُہ بات جو تمہارے خلاف ہو بھلا کس طرح گوارا ہو سکتی ہے۔ جبکہ ایک تمہاری رضامندی

ہی میرے اطمینانِ قلب کا باعث ہے۔

حسن (بات کاٹ کر) تمہارا منشا میں پا گیا - ضرور تم اپنے والد سے مجھ پہ خوف کھاتی ہو۔

سمیہ اس جملہ پر دل ہی دل میں سخت پشیمان ہوئی - اور دیر تک گم سم کھڑی رہی دیر تک انتظار کے بعد حسن کے اس جملہ نے طلسمِ خاموشی توڑا۔

حسن - میں تو کہہ چکا کہ ایسی مخالفتوں کا مجھ پر خاک اثر نہیں پڑ سکتا۔ جب تک تمہاری نظر مجھ سے سیدھی ہے، میں سمجھتا ہوں کہ ساری دُنیا میرے موافق ہے - کیا! تم اپنی محبت کا مجھے قول دے سکتی ہو"۔

سمیہ کی طرف سے اس کا کچھ جواب نہ ملا - تو اس خاموشی کو عین ایجاب سمجھ کر حسن نے کہا۔

حسن - جب ہم دونوں کا عہدِ اُلفت مضبوط ہو چکا تو کسی کے ظالمانہ ارادے اُسے توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے - ہاں یہ بتا دو کہ تمہارے والد آخر میرے دشمن کیوں ہو گئے ہیں؟ میرا کوئی قصور!

سمیہ - قصور یہی کیا کم ہے کہ تم نے ان کے ساتھ احسان کیا ہے، لیکن میں کہتی ہوں کہ اب آئندہ اُن کی چرب زبانی پر نہ جانا،

حسن - مجھے ڈر ہے کہ میری طرفداری کی وجہ سے تمہیں کوئی صدمہ اُن کے ہاتھ سے نہ پہنچے۔

سمیہ - نہیں - تم خاطر جمع رکھو - میں نے مصلحت کے خیال سے اپنی طرز سے انہیں یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ میں اپنے عشق و محبت کے ارادوں سے باز آگئی - اور میرے جذباتِ محبت کو فرزندانہ اطاعت کے جوش نے مغلوب کر دیا - اور ان کے حسب خواہش نہ مجھے اُن کے ارادہ ہائے طمع و

وحرص کا شکار بنتے میں عذر نہیں۔ لیکن یہ سب تدابیر میں نے اُس وقت تک کے لئے کرلی تھیں جب تک نہ مجھے تمہارے مشورہ سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ ملے۔ اب میرے بارہ میں جو تمہاری رائے ہو اس کی پابندی کے لئے میں ہمہ تن تیار ہوں۔

حسن۔ افسوس میری ایک اہم ذمہ واری نے ابھی نہ مجھے اس قابل نہیں رکھا ہے کہ میں تم کو خاطرخواہ مشورہ جو بجز اس کے کچھ نہیں ہوسکتا۔ کہ تم اس ظالم پنجہ سے نکلکر امن و آسائش کی دنیا میں چلی آؤ۔ نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ جہاں میں جارہا ہوں۔ وُہ آجکل ایک ایسا پُرآشوب مقام بنگیا ہے۔ کہ تمہارا جانا وہاں کسی طرح مصلحت نہیں۔

سمیّہ۔ پھر ایسے مقام پر تم خود کیوں جارہے ہو۔ سُنتی ہوں کہ حرمِ کعبہ کا بھی دشمنوں نے محاصرہ کرلیا ہے۔ مکّہ والے عجیب مصیبت میں گرفتار ہیں۔ ایسے سفر سے تو حتی الامکان احتیاط ہی چاہیئے۔

حسن۔ کچھ ایسی ہی مجبوری آپڑی ہے جس سے میں فسخ عزیمت نہیں کرسکتا تم میری واپسی تک اپنے موجودہ طرزِ عمل پر قائم رہو۔

اِتنے میں اُس نے اُونٹ کی آواز سُنی۔ جو یہاں سے تھوڑے فاصلہ پر اس کا ملازم لئے انتظار میں کھڑا تھا، سمجھگیا، وقت زیادہ ہوچکا ہے۔ اس لئے اُس نے سمیّہ کیطرف مخاطب ہوکر کہا۔

حسن۔ گو دل نہیں گوارا کرتا کہ اس مسرت بخش ملاقات کو ختم کروں لیکن ابھی ضروریات نے جن پر نخلِ اُمید کی آئندہ سرسبزی منحصر ہے' پابہ زنجیر کردیا ہے لہٰذا پیاری سمیّہ! اب اجازت کا طلبگار ہوں۔

سمیّہ۔ میں اپنی زبان سے جانے کا لفظ تو نہیں کہہ سکتی۔ ہائے میرا اضطراب تو مجھے اب اور بھی مار ڈالیگا۔ اِتنا کہا' اور زار وقطار رونے لگی۔

یہ الوداعی حسرت ناک سین حسن کے خرمن صبر کے ساتھ بھی برق بلا کا کام کر جاتا لیکن عاشقانہ ضبط و استقلال سے کام لیا۔ اور "فی امان اللہ" کہکر رخصت کیا۔ دل میں جذبات کا دریا اُمڈا، مگر ؎

دم رخصت زباں تو کھل نہ سکی
دل کی باتیں ہوئیں نگاہوں میں

اس وقت حسن کی حالت بھی جو تھی وہ تھی، لیکن اُس نے وہی کیا جو کرنا چاہیے تھا۔ اور اس طریقہ سے اپنے پہلو میں پاک و محبت کیش دل رکھنے والے عاشق و معشوق کی یکجائی کی وہ گھڑیاں تمام ہوئیں +

جواد علیخاں عالی (از دکن)

گلستان کا عربی ترجمہ گلستان سعدی تعریف سے مستغنی ہے۔ اور ہر شخص اسکی خوبیوں کا معترف ہے۔ اسکا ترجمہ عربی میں ۱۲۵۵ھ ہجری مصر میں شایع ہوا تھا۔ اور یہ ترجمہ ایک مستند فاضل جبرئیل آفندی بن یوسف مخلع رومی نے کیا تھا۔ یہ ترجمہ نہایت سلیس عربی عبارت میں ہے۔ صاحب مترجم نے اسکا نام جلستان رکھا تھا۔ گویا نعنا گلستان کی تعریب ہے۔ مگر اہل مصر ج کو تلفظ میں گاف یعنی کافِ فارسی کیطرح ہی ادا کرتے ہیں۔ پس یہ کہنا پڑیگا کہ صاحب مترجم نے اصلی نام کو بحال رکھا تھا۔ اب اس ترجمہ عربی کو جناب مولوی محمد عبد العلی صاحب آسی مدراسی نے عربی زبان کے سیکھنے والوں کے فائدے کے لئے مع لفظی ترجمہ اُردو شایع کیا ہے۔ اور بڑی تقطیع پر کتاب جلستان مع اردو ترجمہ موسوم بہ سنبلستان چھپی ہے۔ مولوی صاحب موصوف سے دفتر البیان لکھنؤ کے پتہ پر مل سکتی ہے۔ قیمت دو روپیہ ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ مولوی صاحب نے اس عربی ترجمہ کو چھاپ کر ہندوستان کے عربی دانوں پر احسان کیا ہے اور اُردو ترجمہ نے اس کتاب کو اور بھی کارآمد بنا دیا ہے۔ مگر ہم انہیں یہ مشورہ دینگے کہ جب کتاب کے دوبارہ طبع ہونے کی نوبت آئے تو موجودہ تقطیع کی بجائے کوئی اور موزوں تر تقطیع پسند فرمائیں +

میکس میولر

ہندوستان میں سنسکرت کے مشہور علامہ میکس میولر کے نام سے ہر تعلیم یافتہ واقف ہے۔ اور رگ وید کا ترجمہ جس سے اس جرمنی کے فاضل نے علمی دنیا میں نام پیدا کیا۔ یہاں بھی ایسا ہی مستند سمجھا جاتا ہے جیسا یورپ میں۔ اس لئے ہر علم دوست شخص کو علامہ موصوف کے حالات زندگی سے دلچسپی ہوگی اور امید ہے کہ ذیل کے حالات شوق سے پڑھے جاوینگے۔

فرڈرک میکس میولر ۶ دسمبر ۱۸۲۳ء کو بمقام دیسو واقع صوبہ پرشیہ ملک جرمنی میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ اس کے بچپن ہی میں مرگیا۔ اور اس کی ماں اپنے دو چھوٹے بچوں کو لیکر اپنے باپ کے گھر چلی گئی۔ جب یہ واقعہ پیش آیا تو بیچارے میکس کی عمر صرف چار برس کی تھی اور باپ بے وقت کی یتیمی نے اس کی ابتدائی زندگی کو بہت غمناک بنا دیا۔ مگر قدرت نے اسے طبیعت ایسی عطا کی تھی کہ حالات کی مخالفت اس پر کم اثر کرتی تھی اس لئے وہ بچپن میں بظاہر خوش اور چلبلا نظر آتا تھا۔ چھ برس کا ہوا تو وہ مدرسہ میں داخل ہوا اور بارہ برس کی عمر تک وہیں دیسو کے مدرسہ میں پڑھتا رہا۔ ان دنوں اسکی زندگی بڑی سختی کی زندگی تھی۔ اس کے کپڑے غیر کافی ہوتے تھے اور اسے غذا قلیل ملتی تھی۔ مصیبت پر مصیبت یہ پڑی کہ تیرہ برس کی عمر میں دادا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ ماں کی ہمت تھی کہ اس حالت میں بھی بیٹے کو ہونہار دیکھ کر اس کی تعلیم کو جاری رکھا۔ اور ۱۸۳۶ء میں اسے تعلیم پانے کے لئے لائپزگ بھیجدیا۔ جہاں وہ پانچ برس رہا اس عرصہ میں اس نے لاطینی زبان میں اتنی مہارت پیدا کرلی کہ وہ آسانی سے لاطینی بول سکتا تھا۔ اس سے پہلے سفر

کے وقت سے لیکر تمام عمر جب تک اُس کی ماں زندہ رہی میکس اسے محبت بھرے خط لکھتا رہا۔ اپنی تعلیم کی بابت مفصّل حالات اپنی پیاری ماں کو لکھتا تھا اور اکثر ان کتابوں کی بابت جو اُس کے مطالع میں آتیں۔ ماں سے مشورہ لیا کرتا تھا۔ ان ابتدائی خطوط میں سے ایک خط میں اپنا روزمرہ کا پروگرام یُوں بیان کرتا ہے:۔

"میں صبح پانچ بجے یا کبھی اس سے بھی پہلے اُٹھتا ہوں۔ اور سات بجے تک کام کرتا ہوں۔ پھر مدرسے جاتا ہوں۔ وہاں سے آکر گیارہ بجے وایولین بجاتا ہوں اور بارہ بجے پیانو۔ اس کے بعد کھاتا ہوں اور دوبارہ سکول جاتا ہوں وہاں سے آکر قہوہ پیتا ہوں اور جمناسٹک کی ورزش کے لئے جاتا ہوں۔ اس کے بعد شام تک پھر کام کرتا ہوں۔ شام کو تازہ ہُوا کھانے باہر نکلتا ہوں۔ کیونکہ آج کل گرمی میں سُورج ڈوبنے سے پہلے ٹھنڈی ہُوا نہیں ملتی۔ میں صبح پانچ بجے سے دوپہر کے ایک بجے تک صرف ایک روٹی پر گذارہ کرتا ہُوں اور سویرے چائے یا قہوہ نہیں پیتا۔ اسی لئے بعض اوقات میں ضُعف محسُوس کرتا ہوں"۔ یہ باقاعدگی اور استقلال عمر بھر اس کا شیوہ رہا۔

جب لائیپزگ کے سکول سے نکلنے کا وقت قریب آیا تو میکس اس سے مہینوں پہلے اس پریشانی میں رہتا تھا کہ آئندہ اُسے کیا کام کرنا چاہیئے۔ وُہ یہ خوب جانتا تھا کہ یونیورسٹی میں جاکر اُسے کوئی ایسا علم سیکھنا چاہیئے۔ جس سے وُہ یونیورسٹی کا نصاب ختم کرتے ہی روزی کمانے لگ جائے۔ کبھی سوچتا تھا کہ فیلالوجی یعنی علم اللسان میں نام پیدا کرے اور یونیورسٹی میں ہی روزگار حاصل کرے۔ کبھی ڈرتا تھا کہ اگر امتیاز پیدا نہ ہوسکا تو اس نصاب کی تعلیم سے روزگار کی اُمید نہیں ہوسکتی۔ آخر توکّل پر اُس نے یونیورسٹی میں داخل ہوتے ہی سنسکرت پڑھنی شروع کردی۔ زیادہ تر اس خیال سے کہ اس کی جدت پسند

طبیعت نے یہ تقاضا کیا کہ کوئی ایسی چیز لکھے جو اس کے دوستوں اور ہم مکتبوں کو نہ آتی ہو ۔ ۱۸۴۳ء میں جب اس کی عمر ابھی بیس برس سے بھی کم تھی میکس میولر نے ڈاکٹر آف فیلا لوجی کی ڈگری حاصل کر لی ۔ اس کے پاس اتنی وسعت نہ تھی کہ وہ ڈگری کے دن کے لئے لباس بنواتا ۔ اس لئے اسے مانگ کر کام چلانا پڑا ۔ اس زمانہ میں پرنس ولیم نے جس کی شادی میکس میولر کی والدہ کی ایک رشتہ دار بہن سے ہوئی تھی یہ چاہا کہ اُسے اسٹریا کے محکمہ سفارت میں کوئی جگہ دلا دے مگر میکس میولر غریبی کے باوجود اپنے اصولوں کا اس قدر پابند تھا کہ اس نے اس ملازمت سے انکار کر دیا اور یہ لکھا کہ یہ تجویز چونکہ میری آزادی میں خلل ڈالیگی ۔ مجھے شوق مطالعہ جاری رکھنے کا موقع نہ دیگی اور جو منزل مقصود میں نے اپنی زندگی کے لئے اپنے ذہن میں ٹھہرائی ہے اس سے پرے لیجائیگی ۔ اس واسطے میں معافی چاہتا ہوں۔

۱۸۴۴ء میں میکس میولر ایک سال کے واسطے برلن گیا اور وہاں سنسکرت اور فلسفہ پڑھتا رہا اور وہاں کے کتب خانہ میں سنسکرت کے قلمی نسخے دیکھتا رہا جو شاہ پرشیا انگلستان سے خرید کر لائے تھے ۔ تعجب ہے کہ اس سال میں میکس میولر کا گذارا کس طرح ہوتا رہا ۔ صرف چھ پونڈ اُسے وظیفہ ملتا تھا جو بمشکل ضروریاتِ زندگی کے لئے کفتی تھا ۔ خوش قسمتی سے اسے بعض دوست ایسے مل گئے جو اسے کبھی کبھی دعوتیں کھلاتے تھے ان دعوتوں کا ذکر اپنی ماں کو لکھتے ہوئے میکس ایک خط میں لکھتا ہے کہ "گھر پر تو میں صرف روٹی اور مکھن کھاتا ہوں اور قہوہ بغیر دودھ اور شکر کے پیتا ہوں" ایک اور خط میں یہ لکھتا ہے "آج کھانا نہیں میسر آیا اور کام رات کے تین بجے تک کرتا رہا" ان تمام تکالیف میں اس کا یہ عقیدہ اس کو سہارا دیتا تھا کہ خدائے دانا و بینا کے حکم سے سب کام ہو رہے ہیں اور اس کے خطوں میں اکثر یہ الفاظ ملتے ہیں کہ وہ ہو جو خدا کی مرضی ہو۔

دُوسرے سال میکس میولر پیرس چلا گیا۔ وہاں ایک ہندو دوست اسے ملا جس کے ساتھ وُہ انگریزی اور بنگالی بولنے کی مشق کیا کرتا تھا اور وہیں اس نے بنگالی زبان کی ایک گرامر فرانسیسی میں لکھی مگر اس کو چھپوا نہ سکا۔ ان دنوں میں معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تھوڑی سی فارسی بھی سیکھی مگر اُسے بڑھا نہیں سکا۔ پیرس میں وُہ اپنا گذارہ سنسکرت کے قلمی نسخے نقل کر کے کرتا تھا اور اوقاتِ فرصت میں رگ وید کا مطالعہ جاری رکھتا تھا۔ اس کو اس قدر سخت محنت کرنی پڑتی تھی کہ ایک رات وُہ شب بھر جاگتا تھا اور دُوسری رات صرف دو گھنٹے سوتا تھا اور وُہ بھی اس طرح کہ کپڑے اتارے بغیر بستر پر لیٹ جاتا تھا اور تیسری رات بالکل آرام کرتا تھا اور پھر یہی سلسلہ از سرِ نو شروع کر دیتا تھا۔ غذا کی کمی کام کی زیادتی صحت پر مضر اثر ڈالے بغیر نہ رہی۔ مگر ہمت پر آفرین ہے کہ کمزوری یا فاقے میکس مولر کے عزم و استقلال میں فرق نہ ڈال سکے اپنی کامیابی کے زمانہ میں اس وقت کی جدوجہد کا ذکر ایک خط میں میکس مولر اس طرح کرتا ہے:-

"جسمانی طور پر تو بیشک اس زمانہ میں مجھے بہت نقصان پہنچا ہوگا۔ مگر مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔ کیونکہ اس سخت جدوجہد کے بغیر کامیابی کیسے نصیب ہوتی"۔

(باقی دارد)

مسز عبدالقادر



حکمتِ عملی

ریویو از جناب شمس العلما خواجہ الطاف حسین صاحب حالی

یہ مفید اور قابلِ قدر کتاب میرے عزیز اور لائق دوست مولوی محمد سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی نے علمِ اخلاق پر لکھ کر کچھ عرصہ ہوا شائع کی ہے۔ لائق مصنف نے اس کتاب کے لکھنے سے اُردو زبان کی ایک ایسی ضرورت پوری کی ہے جو بہت مدت سے مُلک میں محسوس ہو رہی تھی۔ اگرچہ گزشتہ تیس برس کے زمانہ میں بہت سے رسالے اور کتابیں اس فن میں لکھی اور شائع کی گئی ہیں لیکن جہاں تک مجھ کو معلوم ہے اُن میں سے ایک بھی ہماری ضرورت رفع کرنے والی نہ تھی۔ ہم کو اس بات کی ضرورت تھی کہ اس فن میں جو کتاب لکھی جائے اس کی زبان فصیح اور نہایت صاف ہو۔ جو مطالبِ علمیہ اُس میں بیان کئے جائیں وہ علمِ اخلاق کی مقررہ اصطلاحات کے دائرہ سے خارج نہ ہوں۔ اور کتاب فلسفۂ قدیم و جدید دونوں کے ضروری مسائل پر مشتمل ہو۔ جہاں تک میں نے اس کتاب کو دیکھا ہے یہ سب خصوصیتیں اس میں بوجہ احسن پائی جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ لائق مصنف نے زبان اور بیان کی صفائی۔ اصطلاحاتِ علمی کی تلاش اور فلسفۂ قدیم و جدید کے مطالعہ اور اُن میں مہمات مسائل کے انتخاب کرنے میں کوئی دقیقہ سعی و کوشش کا فروگذاشت نہیں کیا۔ اس کتاب میں وہ تمام مسائل بیان کئے گئے ہیں جو انسان کی ذات میں جوہرِ شرافت پیدا کرنے والے ہیں اور جن سے سعادتِ تامہ حاصل ہوتی ہے۔

اس کتاب کے تین مقالہ ہیں۔ پہلے مقالہ میں تہذیبِ اخلاق کا بیان ہے اور

حکمت علم۔ عمل کے معنے و تعریفات بیان کرنے کے بعد انسان کے حرکات طبعی و وضعی۔ ملکہ و عادت عقل عملی کا ذکر کیا ہے اس کے بعد قوائے نفسانی یعنی نفس ناطقہ و قوائے غضبی و شہوی کی حقیقت اور امراض نفسانی کی کیفیت مفصل بیان کرکے بتایا ہے کہ سعادت تامہ کیا چیز ہے۔

مقالہ دوئم میں تدبیر منزل کا بیان ہے اور اس میں منزل کے مختلف ممبروں مثلاً والدین اولاد زن و شوہر کے فرائض اور حقوق پر عالمانہ بحث کی ہے۔ اور ایسی تدابیر بیان کی ہیں جو حسن معاشرت کے لئے اعلیٰ درجہ کی سبق آموز ہیں۔

تیسرے مقالہ میں سیاست مدن کی تعریف انسان کو تمدن کی ضرورت سلطنت و قانون و عدالت کی حقیقت۔ غلامی اور آزادی کی حالت مفصل بیان کی ہے اور اس کے بعد معاملات رسم و رواج کا فلسفہ بیان کیا ہے اور ایسے مضامین درج ہیں جو قوم و ملک کی سچی محبت پیدا کرتے اور قومی عزت کے حصول کے ذرائع بتاتے ہیں۔ اس لئے اس کا مطالعہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ کے مرد و عورت پر واجب ہے۔ عورتوں کی تعلیم اور حقوق کا ذکر جا بجا آیا ہے اور کتاب دونوں فرقوں کے لئے یکساں مفید ہے۔

مجھے قوی امید ہے کہ یہ عمدہ تصنیف ملک میں عام قبولیت کا درجہ حاصل کریگی۔ اور میری دلی آرزو ہے کہ میرے ہموطن اس سے فائدہ اٹھائیں۔

الطاف حسین حالی

نوٹ۔ یہ کتاب ذیل کے پتہ سے دستیاب ہو سکتی ہے۔ ضخامت ۵۰۴ صفحہ
قیمت تین روپے (عہ) مع محصولڈاک
مولوی سجاد مرزا بیگ صاحب دہلوی۔ بازار عیسیٰ میاں حیدرآباد دکن)

مولوی ذکاء اللہ مرحوم

(از منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔ اے
ایف۔ آر۔ اے۔ ایس)

چراغ بزم ذکا مولوی ذکاء اللہ / ہماری آنکھوں میں پھرتی ہے آپکی تصویر
مبارک آپ کو گلگشتِ جنتِ فردوس / مبارک آپ کو کوثر کی دائمی جاگیر
مبارک آپ کو ہو کشورِ عدم کا سفر / کہ ہم رکاب ہے شہرت تو پیش رو توقیر
تمہاری موت پہ صدقے کروں حیاتِ خضر / کہ سوگوار ہے عالم جہاں ہے دلگیر
جئے تو مردمِ چشمِ وقار کی صورت / مرے تو چھوڑ گئے یادگارِ عالمگیر
جئے ہزار برس کوئی پھر بھی مرنا ہے / مٹے نہیں کبھی ممکن نوشتۂ تقدیر
مرے خیال میں وہ رشکِ صد سکندر ہے / جسے جہاں میں میسر ہو دولتِ توقیر
وگرنہ پوچھئے مجھ سے کہ زندگی کیا ہے؟ / گلے میں طوق ہے پاؤں میں صد منی زنجیر
مرے خیال میں یہ خار دار جھاڑی ہے / کہ جس کا خار ہے ہر یک بجائے خود اک تیر
گلیمِ بخت کسی سے نہ ہو سکی اُجلی / ہزار ماتھے بھی رگڑے کروڑ کی تدبیر
ذرا سا چیر کے دیکھے کوئی مرا سینہ / دکھائی دینگے بجائے جگر ہزاروں تیر
مَیں وُہ مریض ہوں جسکی ہیں نارسا آہیں / مَیں وُہ اسیر ہوں نالے ہیں جسکے بے تاثیر
کمندِ یاس سے تارِ نفس خدا کی قسم / مَیں اس کے دام میں ہوں مثلِ بے زباں نخچیر
ہمیشہ نوچتی رہتی ہے بال و پر میرے / کہ ہے ارادۂ پرواز بھی بڑی تقصیر

نصیب غیر ہے کمخواب راحت و آرام — ہمارا حصہ ہے اک غم سو وہ بھی کل حصیر
کہاں ہیں آیتِ لَا تَقْنَطُوا کی امیدیں — جگا دے آج انہیں تو ہی نازِ دستگیر
مرے خیال میں القصہ خوش نصیب تھے آپ — کہ اس جہاں میں رہے بنکے صاحبِ توقیر
وہ خوش نصیب تھے ہشتاد سال تک جی کر — دیارِ شہرت و حرمت کو کر لیا تسخیر
میں اس حیات کی ناکامیاں بھلا دونگا — ملے جو آپ کی شہرت سے مجھ کو عشرِ عشیر
تمہاری طبعِ رسا کو مثال دوں کس سے — بجا ہے گر کہوں پارس اگر کہوں اکسیر
مدلہ ہے گر کہوں اس کو میں چشمۂ خورشید — ضیائے مہر سے جسکے خجل ہو بدرِ منیر
تمہاری طبعِ رسا کان تھی جواہر کی — کہ جس کے ہیرے ہیں دنیا میں اپنی آپ نظیر
بجا ہے اسکو کہوں تو نہالِ فضل و کمال — کہ جس کے پتوں پہ قرباں ہو خطۂ کشمیر
تمہاری طبعِ رسا جوئے آبِ زمزم تھی — کہ جس کے آبِ مصفا میں ہے حلاوتِ شیر
مورخ آپ تھے اور بے بدل مہندس بھی — سمجھتا میں تو تبرک ہوں آپ کی تحریر
سُنا دو مژدہ یہ تم ساکنانِ جنت کو — لقب تمہارا ہے روشن ضمیر داتا پیر

تمہارے باغ کا جب تک بہار اردو ہو
نہیں مجال کہ دستِ خزاں ہو دامنگیر



مرثیہ شہنشاہ

آنجہانی قیصر ہند اڈورڈ ہفتم کے انتقال پر ہمارے دیرینہ کرمفرما جناب چوہدری خوشی محمد صاحب بی۔ اے المتخلص بہ ناظر گورنر ریاست کشمیر نے حضور مہاراجہ صاحب بہادر والئی جموں و کشمیر کے خاص فرمان سے یہ پُردرد مرثیہ لکھا ہے۔ جس میں انگریزی طرز مرثیہ گوئی کا تتبع کیا گیا ہے۔ چوہدری صاحب بسبب اپنے عالیشان عہدہ کے اہم فرائض کے اب شعر و سخن سے بہت کم سروکار رکھتے ہیں۔ انکے کلام کے مشتاق مدت کے بعد اُن کی نظم کو دیکھکر ضرور مطمئن ہونگے۔

ہائے یہ کیا سانحہ اے چرخ گرداں ہو گیا — جس سے نیلی پوش شرق و غرب یکساں ہو گیا
تھی رُخ روشن سے جسکے باغ عالم کی بہار — آج وہ شمع منیر بزم رضواں ہو گیا
آفتاب سلطنت جس کا نہیں ہوتا غروب — آج وہ خورشید عالمتاب پنہاں ہو گیا
یعنی شہ ایڈورڈ ہفتم قیصر ہندوستاں — اس تماشاگاہ عالم سے خراماں ہو گیا
وہ لحد پر ملکۂ عالم کی پُرحسرت نگاہ — آخری نظارہ دیدار جاناں ہو گیا
کہدیا اہل عزیٰ نے بر سر بالین گور — جد و جہد زندگی کا آج پایاں ہو گیا
جب سوار دوش نکلا وہ شہ یوسف جمال — دیدۂ یعقوب قصر و کاخ و ایواں ہو گیا
خوبیوں میں بے بدل محبوبوں میں بے نظیر — شاہ خوباں ہو گیا محبوب یزداں ہو گیا
کشت زار سلطنت کی آبیاری کے لئے — ہو گیا گاہے صبا اور گاہ نیساں ہو گیا
پڑگئی محفل میں جس پر وہ نگاہ دلنواز — خویش و بیگانہ غلام شاہ دوراں ہو گیا
کالے گورے پیلے بھورے اسکے تھے حلقہ بگوش — اس کی یکرنگی کا سب رنگوں پہ احساں ہو گیا
مندروں میں اسکی الفت مسجدوں میں اسکا پیار — گاہ ہندو بنگیا گاہے مسلماں ہو گیا

جھونپڑی سے ہند میں نکلی جو دکھیا کی صدا — وہ دلِ پردرد ونڈسر میں پریشاں ہو گیا
ہائے تیرے غم سے اے شیرازہ بندِ صلحِ کل — ناگہاں مجموعۂ ہستی پریشاں ہو گیا

اس نگاہِ لطف سے بزمِ جہاں پُرنور تھی
بند کیں آنکھیں تو دنیا اک شبِ دیجور تھی

ہے غمِ ایڈورڈِ اعظم میں دلِ محزوں فگار — ہائے یہ کیا ہو گیا اے گردشِ لیل و نہار
جو قدومِ شاہ نے بخشا تھا جموں کو شرف — خطۂ کشمیر کو بھی تھا اسی کا انتظار
آج تیرے ہجر میں بریاں ہوا مثلِ کباب — کر چکی تھی وہ نگاہِ ناز جس دل کو شکار
ہائے وہ صورت تری تشبیہِ حسنِ روئے دوست — ہائے وہ سیرت تری تفسیرِ لطفِ کردگار
مادرِ اہلِ جہاں اے ملکۂ اسکندرہ — خالقِ کون و مکاں بخشے ترے دل کو قرار
جل گیا برقِ فنا سے خرمنِ عیش و سرور — آ گئی بن کر خزاں گلشن میں تیرے نو بہار
تیرے بارِ غم کو ہم اک ذرہ گر کم کر سکیں — مال و زر جان و جگر کر دیں ترے سر پر نثار
شاہِ والا باغِ رضواں میں نہ ہو پژمردہ دل — ملکۂ گیتی نہ کر ہجراں میں آہِ شعلہ بار
دیکھتا ہے غم کو تیرے جامع المتفرقین — دیدِ جاناں کے لیے ہے وعدۂ یوم القرار
زندۂ جاوید ہے وہ صلح آموزِ امم — شاہ کا ماتم نہ کر اے بانوئے فرخ تبار
صورت و سیرت پدر کی ہے پسر میں جلوہ گر — ہے جبینِ جارج سے سب سترِ ایڈورڈ آشکار
ہے غمِ شاہِ جواں ہمت سے دل کو بیکلی — جس نے کھویا رہبر، سرور، پدر اور یارِ غار
تختِ شاہی کی طرف ہے کھینچتا آفاق کو — جذبِ مقناطیس سے یہ وہ فرخ تبار
اے شہنشاہِ بلند اختر محبت میں تری — دست و بازو جان و دل لیکر ہیں حاضر جاں نثار

کوکبِ دولت کی تیرے جگ میں آب و تاب ہو
قاف سے تا قاف عالم میں ترا پرتاب ہو

دارِ فانی

سفر درپیش ہے غافل تجھے اس دارِ فانی سے لگا دل کو نہ دنیا سے نہ عیش و کامرانی سے
چلیگا کام کب تک دوست سے۔ زر سے جوانی سے کنارہ ایک دن کرنا پڑے گا زندگانی سے
سرائے دہر ہے یہ مہماں فقط تو رات بھر کا ہے
کمر باندھے ہوئے تیار رہ عالم سفر کا ہے
یہ مانا ہم نے تجھ کو عیشِ دنیا کا میسر ہے فراغِ دل ہے۔ ترقی سامنے ہے۔ بخت یاور ہے
شرابِ بیخودیٔ شوق سے لبریز ساغر ہے نہ شرم آنکھوں میں دنیا کی نہ دل میں خوفِ محشر ہے
مگر واضح رہے۔ یہ تیری بربادی کے ساماں ہیں
نظر آتے ہیں جو جلوے تجھے خوابِ پریشاں ہیں
چلیگا بزم میں جامِ شرابِ مشکبو کب تک رہینگے زینتِ محفل بتانِ شعلہ رو کب تک
بڑھیگی دولتِ دنیا تیرے دل کی آرزو کب تک یہ تیری کرّ و فر کب تک رہیگی اور تو کب تک
کفن بردوش صیادِ اجل پھرتا ہے گلشن میں
نہ شاخِ گل پہ چوکیگا نہ چھوڑیگا نشیمن میں
کہاں ہیں وہ کہ جنکی ربعِ مسکوں پر حکومت تھی کہاں ہیں وہ خدائی کا جنہیں دعویٰ تھا نخوت تھی
کہاں ہیں وہ کہ جنکے پاس لاتعداد دولت تھی کہاں ہیں وہ زیادہ آہرمن سے جنمیں طاقت تھی
کہاں نمرود ہے۔ شداد ہے۔ فرعونِ خودسر ہے
کہاں سہراب ہے۔ رستم ہے۔ دارا و سکندر ہے
کہاں ہیں قمِ باذنی کہکے جو مردے جلاتے تھے کہاں ہیں جو مریضِ جاں بلب کا دم بچاتے تھے
ہوئے کیا وہ جو کہدیتے تھے منہ سے۔ کر دکھاتے تھے ہیں منہ میں تربت کے سب منہ جو مرنے سے چھپاتے تھے

نہ اب وہ شمس ہیں، منصور و عیسیٰ و سلیماں ہیں
دھری ہی رہ گئی حکمت فلاطوں ہے نہ لقماں ہیں

حقیقت میں جگہ دنیا نہیں ہے دل لگانے کی — وفا کرتی نہیں یہ بے وفا سارے زمانے کی
نہیں ٹلتی مقرر ہے جو ساعت موت آنے کی — جگہ اس میں نہیں ہے دم مارنے کی لب ہلانے کی
نہیں خوفِ خزاں کب تک بہارِ زندگانی میں
کہاں تک شمعِ ہستی کی جلے گی بزمِ فانی میں

سمجھ سکتا ہے کون اس کو - فنا کیا ہے بقا کیا ہے — کریں رد و قدح اس پر ہمارا حوصلہ کیا ہے
نہیں کچھ اختیار اپنا تو پھر چون و چرا کیا ہے — ہمیں اسباب سے کیا بحث ہے۔ یہ ماجرا کیا ہے
گل تر ہیں۔ نہ بلبل ہیں۔ نہ گلچیں ہیں گلستاں کے
فقط ہم تو تماشائی ہیں اس بازارِ امکاں کے

کھلی راہِ عدم ہے۔ ایک آتا۔ ایک جاتا ہے — کہیں ہے نغمۂ شادی کہیں کہرام مچتا ہے
نیا ہر روز اس دارِ فنا کا رنگ ہوتا ہے — دو رنگی اس کو کہتے ہیں اسی کا نام دنیا ہے
زمیں گردش میں ہے۔ یا گنبدِ گردوں کا چکر ہے
نیا جس وقت دیکھو سامنے آنکھوں کے منظر ہے

زن و فرزند ہیں اپنے۔ نہ بھائی اپنا بھائی ہے — جو سچ پوچھو تو یہ جھنڈے تلے کی آشنائی ہے
یہ جیتے جی کی الفت ہے محبت ہے صفائی ہے — پسِ مُردن کسی کی دوستی کب کام آئی ہے
پرائی گور میں پیر اپنے پھیلاتا نہیں کوئی
کسی کے ساتھ اس سنسار سے جاتا نہیں کوئی

غلط ہے دعویٰ الفت سراسر عاشقی جھوٹی — ثبوتِ یک دلی جھوٹا۔ دلیلِ دوستی جھوٹی
عزیزوں کی ہے تقریرِ خلوصِ باطنی جھوٹی — غرض جھوٹی ہے دنیا اور جھوٹی بھی بڑی جھوٹی
بھروسا اپنے دم کا ہی نہیں ہے غیر کا کیا ہو

بچا جاتا ہے گولی وقت پر کیسا ہی اپنا ہو

وفا و مہر و اُلفت سب کہانی ہے فسانہ ہے
برائے نام اپنایت ہے۔ کہنے کو یگانہ ہے

ذرا دیکھو تو کچھ اس نفسی نفسی کا ٹھکانا ہے
پڑی ہے اپنی اپنی سب کو۔ خود مطلب زمانہ ہے

اُمید دستگیری بے نتیجہ بے خیالی ہے
کسی کا اس جہاں میں کوئی وارث ہے نہ والی ہے

عید کا چاند

لو وہ تو نے مژدہ پھر عید کا سُنایا
پھر دن خوشی کا ہم کو اللہ نے دکھایا

کیسا سحر سے عالم پُر نور ہو رہا ہے
ہر شخص اِس خوشی سے مسرور ہو رہا ہے

بچوں نے ہر گلی میں یہ شور ہے مچایا
پھر روزِ عید آیا پھر روزِ عید آیا

اُنکا لباس رنگیں ہر دل کو بھا رہا ہے
اُن پیاری صورتوں کی رونق بڑھا رہا ہے

کیسی خوشی خوشی سے بازار جا رہے ہیں
بچپن کی شوخیوں سے اودھم مچا رہے ہیں

کچھ دام جیب میں ہیں ہم عمر ساتھ میں ہیں
باتیں ہیں پیاری پیاری اور ہاتھ ہاتھ میں ہیں

پابندیاں نہیں ہیں کچھ آزاد ہو رہے ہیں
گلیوں میں دوڑتے ہیں اور شاد ہو رہے ہیں

پیر و جواں سبھی تو خوشیاں منا رہے ہیں
کپڑے نئے بدل کر مسجد کو جا رہے ہیں

سجدہ میں اُس کے آگے سر کو جھکا دیا ہے
اور شکر اُس خدا کا دل سے ادا کیا ہے

جس نے کرم سے اپنے یہ دن ہمیں دکھایا
سب کو خوشی عطا کی سب کو گلے ملایا

پھر اے شرر تمہیں بھی یہ عید ہو مبارک۔
اُس ماہوش کی تم کو پھر دید ہو مبارک

عید اور انتظارِ یار

آ تجھ بغیر دل کا دیا ہی بجھا ہوا
ظلمت سرا بنی ہے، سراپا بنا ہوا

یہ کیا غضب کہ مائلِ عجز و نیاز ہم
اور تو غرور و کبر کی جانب جھکا ہوا

ہے بس حدیثِ عشق و محبت سے ہم کو کام
اور تو جفا جوئی کا صحیفہ پڑھا ہوا

بوئے وفا و رنگِ محبت سے اجنبی!
کس خاک سے بنا! ترا بت ہی بنا ہوا

پھرتے ہیں لوگ عید کو مسرور و شادماں
پر کنجِ فکر و یاس میں میں ہوں پڑا ہوا

سو عید مجھ کو جانِ جہاں! تیری دید ہے
آ چشمِ انتظار کا در ہے کھلا ہوا

میں تیری رہ میں شوق کی آنکھیں بچھاؤنگا
دل کے چبوترے پہ تجھے لا بٹھاؤنگا

تمکین سرمست

عیدِ قرباں

عیدِ قرباں آئی یا آئی گلستاں میں بہار
کھل رہے ہیں اک کے غنچے اور چہکتے ہیں ہزار

وقت ہی کیسا سہانا ہے ہوا کیا خوشگوار
لہلہاتا ہے چمن۔ پھولوں پہ ہے کیسی نکھار

تن رہے ہیں گل چمن میں جیسے اکڑیں نوجواں
عیدگہ میں زیب بر کرکے لباسِ زرنگار

گردِ کعبہ پھر رہے ہیں دیکھنا حجاج یوں
جیسے گلشن پر نسیمِ صبح ہو خوش خوش نثار

ساعت اچھی ہے۔ مہیا ہیں کل اسبابِ نشاط
ہاں تو بسم اللہ ساقی۔ اب یہ کیسا انتظار!

ہاں ادھر بھی اک نظر او ساقیٔ غفلت شعار!
مطلع ایک میں بھی ہوں نگاہِ لطف کا امیدوار

موسمِ گل کی قسم تجھ کو۔ عطا کر ایک جام — ایسی گھڑیاں ساقیا آتی نہیں ہیں بار بار
سالِ نو آیا۔ ہے لازم عہدِ نو ساغر سے ہو — پھر بندھے پیمان پیمانے سے ساقی ایک بار
چل رہا ہے دورِ مے۔ بادہ نوشی ہے گرم — لب پہ ساقی کے "بگیر" اور لب پہ رندوں کے "بیار"
قطعہ
تو ہے محوِ شغلِ مے مسلم۔ تجھے معلوم کیا — تیرے ہم جنسوں کے کیسے کٹتے ہیں لیل و نہار
گو بظاہر اُنکے بشرے سے نہیں ہے رنج عیاں — گو بظاہر اُنکے چہروں پر نہیں گرد و غبار
گو بظاہر اُنکی صورت پر نہیں غم کا نشاں — گو بظاہر اُنکی صورت سے نہیں رنج آشکار
اُنکے مطبخ دیکھ جا کر سرد ہیں اے بیخبر — بی بی اور بچوں کے کپڑے ہو رہے ہیں تار تار
اُن کی نظروں میں ہے یکساں۔ ہو محرم یا کہ عید — حسبِ معمول آج بھی ہیں یک بیک وہ بیقرار
اشکِ خوں اُنکی شراب اور لختِ دل اُنکا کباب — یوں منائی عید۔ اور دل کا نکالا یوں بخار

زہر کے گھونٹ اپنی مے! قطعاً حرام اپنا کباب
ہم ہوں بدمستِ تعیش! قوم یوں زار و نزار!

سرسیّد مرحوم

اہلِ عالم پر تری ہستی نے روشن کر دیا — مادۂ ایثار ہے ذاتِ بشر میں تا کجا
کس طرح دوشِ دلِ نازک پہ بارِ سنگِ غم — ہیں اُٹھاتے دوسروں کے واسطے اہلِ ہمم
اپنی راحت اپنی آسائش کو دیتے ہیں بھلا — فکر مندی ہے یہی ہو جائے اوروں کا بھلا
جسکو عُرفِ عام میں آرام کہتے ہیں بشر — اُس سے بیگانہ ہیں یہ خدامِ نسلِ بو البشر
فرشِ خوابِ استراحت پر خدا کی شب کو ہے — اُنکی پلکوں میں مگر کب نیند آئی شب کو ہے
کود جانا آگ میں اوروں کی اُنکا کام ہے — شاہدِ احوال چشمِ گردشِ ایام ہے

لوٹنا، تپنا، تڑپنا کام انکے دل کا ہے
برقِ مضطر ایک ادنیٰ کام انکے دل کا ہے

انکے سینہ میں ہے آتشخانۂ آذر کی آگ
سینۂ سینا کی ہے یا مجمرِ خاور کی آگ

پردۂ گل کی طرح اِن کا جگر صد چاک ہے
انکے طفلِ دل کے تن پر خون کی پوشاک ہے

دیدۂ نمناک انکا ہے ہمیشہ اشکبار
راتدن، شام وسحر، جوں ناگرا کی آبشار

یہ وہ مجنوں ہیں جو لیلیٰ کیلئے مرتے نہیں
سرد آہیں وصلِ لیلیٰ کے لئے بھرتے نہیں

یہ وہ مجنوں ہیں جو ہیں دیوانۂ لیلائے قوم
کاسۂ سر میں نہیں کچھ جنکے جز سودائے قوم

مرحبا صد مرحبا!! اے سید عالیمقام!!
ایک شخصیت پہ تیری تھی خود آسائی حرام

خشت تھی تعمیر تیری میں لگی ایثار کی
آشکارا شان تو نے جگ پہ کی ایثار کی

منزلِ دل تھی تری کاشانۂ سوز و گداز
دل نہیں وہ، دل نہیں جو خانۂ سوز و گداز

راہ پیما سے حرارت گارۂ الفت تو ہوا
از سرِ نو نکتہ آموزِ اخوت تو ہوا

بہرِ امت گھومتا پھرتا تھا جوں موجِ ہوا
جذبۂ بے اختیارِ شوق تھا رہبر ترا

تا دمِ آخر خدمت پر کمربستہ رہا
قوم کے جینے کی خاطر عمر بھر مرتا رہا

سلہ سینہ کوبی میں رہا جب تک کہ دم میں دم رہا
تو رہا اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

قوم تھی خوابِ قیامت کی بغل میں سو رہی
چشمِ عبرت تھی سرِ بالیں اکیلی رو رہی

حیف اغربت میں خلف بیدار باش اسلاف کے
بے حس و بے حرکت و جنبش تھے غفلت میں پڑے

صورِ اسرافیل پھونکا تو نے یہ جب زور سے
چونک اُٹھے مُردے یکایک فرشِ خوابِ گور سے

قوم کو پھر جان تیری شورشِ قُم سے ملی
زندگانی تیرے اعجازِ تکلم سے ملی

در حقِ ما مُردگاں الحق مسیحا بودہ

سلہ مولانا حالی مدظلہ کے ایک مشہور شعر کا کسی قدر تبدیلی کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ ط۔ر

چاند و تنہاے بیجان و مجزا بُوَدہ

تھا لبِ سرورِ پہ وقتِ نزع لفظِ "اُمّتی" "قوم" تھا، کہتے ہیں سیّد کا بھی حرفِ آخری
گر نبیؐ اُمّت کی خاطر غرقِ اندیشہ رہے مارتے سیّد بھی بحرِ فکر میں غوطہ رہے
لالہ وار داغِ غم سرور کا گر سینہ رہا سینۂ سیّد بھی درد و غم کا گنجینہ رہا
شمعِ اُمّت کے سدا سرور جو پروانہ رہے شاہد اُمّت کے سیّد بھی تو دیوانہ رہے

ایسے نانا کے لئے ایسا نواسا چاہئے
کانِ الٰہی سے نکلنا ایسا ہیرا چاہئے

نام جو جو ہو گئے مثبوتِ لوحِ روزگار تا بقائے نسلِ آدم وہ رہینگے برقرار
امتدادِ وقت کے ہاتھوں سے ملنے کے نہیں کاردِ ایّام کے کاٹے سے کٹنے کے نہیں
ہے اسی زمرہ میں تیرا نام اے والاتبار! اے حیاتِ جاوداں کی مملکت کے تاجدار!

آج تو گلگشت کرتا خلد کے بُستان میں ہے
نام تیرا گونجتا ہر سمت ہندوستان میں ہے

عبدالمجید سالک بٹالوی

راستی

ہے باغبانِ گلشنِ تقریر راستی آئینہ بیاں کی ہے تصویر راستی
صیقل ہے بہرِ خنجرِ توقیر راستی ہے کحلِ چشمِ چہرۂ تحریر راستی

لازم ہے غازۂ رخِ ایماں اسے کہوں
واجب ہے وجہِ عزّتِ انساں اسے کہوں

ہادی و رہبر و خضرِ راہِ دیں ہے یہ آفت میں دستگیر، الم میں مُعیں ہے یہ

مشاطۂ عروسِ سخن بالیقیں ہے یہ بزمِ صفاتِ نیک میں بالا نشیں ہے یہ
دشمن سمجھئے اسکو خیالاتِ خام کا
ہر رعفت ہے کہئے شاہدِ حُسنِ کلام کا

ہے رو نمائے صدق و صفا خوئے راستی ہے کیمیائے علم و عطا خوئے راستی
ہے فضلِ حق کو باد نما خوئے راستی ہے موجبِ رضائے خدا خوئے راستی
کچھ دخل راستی میں نہیں تین پانچ کو
سچی ہے یہ مثل کہ نہیں آنچ سانچ کو

تقریر اسی سے دلکش و عالم پسند ہو تحریر میں اسی سے نفاست بلند ہو
دلچسپ اسی سے ہر سخن و وعظ و پند ہو شیریں اسی سے لفظِ بیاں مثلِ قند ہو
سُولی سے جو بشر کو اُتارے یہ خو ہے وہ
جو گیسوئے کلام سنوارے یہ خو ہے وہ

سچّے جو ہیں سمجھتے ہیں سب انکو ذی شعور غیبت سے فتنہ سازی سے رہتے ہیں وہ نفور
اہلِ جہاں کی ہجو سے وہ بھاگتے ہیں دُور لب پر وہ آنے دیتے نہیں کلمۂ غرور
ممکن نہیں غلط جو ہو بات اسکی پیچ کریں
سچ کو نہ جھوٹ جھوٹ کو ہرگز نہ سچ کریں

عزت جہاں میں پاتا ہے جھوٹا بشر کہاں قابلِ یقین کے ہوتی ہے جھوٹی خبر کہاں
صادق کا نور پاتی ہے کاذب سحر کہاں سچّے کی قدر پاتا ہے جھوٹا مگر کہاں
بھایا جو کذب کشتِ صداقت اُجڑ گئی
پڑتا جو کوئی جھوٹا ہوا کُل بگڑ گئی

دوارکا پرشاد اُفق لکھنوی

~~~~
~~~~

عورت

(خطاب بہ جناب منشی احمد حسین خاں صاحب بی۔اے)

جو فرماتے ہیں آپ سچ ہے سراسر　　نہیں اس میں گنجائش شبہ تل بھر
نظامی کا ارشاد بھی سب بجا ہے　　صداقت میں ہیں دونوں رائیں برابر
بظاہر یہ رائیں مخالف ہیں لیکن　　یہ تطبیق ہے ان کی اے بندہ پرور

جو دے رائے کوئی کسی شے کی نسبت　　کرے غور اُس شے کے سب پہلوؤں پر
ہر اک شے میں ہیں حسن و قبح دونوں　　کہ بے عیب ہے ذاتِ خلاقِ اکبر
ہیں ہر ایک تصویر کے دو جدا رخ　　جو ہے ایک تاریک تو اک منور
بہم باغ عالم میں ہیں رنج و راحت　　کہ ہے خار بھی ہمنشینِ گلِ تر
سمندر میں ہیں دُرِّ شہوار جس جا　　پڑے ہیں وہیں لاکھوں بیکار پتھر
جہاں ماہ میں اسقدر روشنی ہے　　وہیں ایک دھبہ بھی ہے اُسکے اندر
اگر نفع پہنچاتی ہے جل کے آتش　　تو کر دیتی ہے خاک بھی یہ جلا کر
جو دیتا ہے ہیرا بہت مال و دولت　　تو ہے جان لینے میں بھی تیغ و خنجر
اگر زہر ہیں سنکھیا اور افیون　　تو اکثر دواؤں کی ہیں جزوِ اکبر
بہت فائدے اس سے ہوتے ہیں لیکن　　ڈبوتا جہازوں کو بھی ہے سمندر
بڑے کام کی چیز ہے ریل لیکن　　تصادم بھی ہوتا ہی رہتا ہے اکثر
نکلتے ہیں بجلی سے مقصد ہزاروں　　گرے ہے قیامت کہیں گر پڑے گر
بہت اس سے جانیں بھی ضائع ہوئی ہیں　　شک اس میں نہیں کچھ کہ اچھی ہے موٹر

بہت بدنما پاؤں ہیں اس کے بیشک — بڑے خوشنما گو ہیں طاؤس کے پر

بھلا جس کو سمجھے ہوئے ہے زمانہ — بُرائی بھی ہے کچھ نہ کچھ اُس میں مضمر
بُرا جانتا ہے جسے سارا عالم — بھلائی کے بھی اُس میں کچھ ہیں جوہر
نہ دُنیا میں ہر چیز بالکل بُری ہے — نہ کہہ سکتے ہیں اس کو اچھا سراسر

غرض ہے یہی حال سارے جہاں کا — یہی حال عورت کا ہے بندہ پرور
محاسن کا مخزن اگر اس کو کہیے — تو ہے یہ قبائح کا بھی ایک دفتر
اگر پھول ہے یہ تو کانٹا بھی ہے یہ — یہ پتھر بھی ہے۔ ہے اگر لعل و گوہر
پلائے گی گر جامِ کوثر۔ تو یہ ہی — پلاتی ہے زہرِ ہلاہل کا ساغر
اگر جان ہے آفتِ جاں بھی ہے یہ — اگر آب ہے تو یہی شے ہے آذر
جو عورت سے آبادیٔ خانماں ہے — تو عورت ہی ویراں بھی کردیتی ہے گھر
بُرائی اگر اس کی مخفی نہیں ہے — تو ظاہر بھلائی بھی ہے بلکہ اظہر
اگر آفتیں اس کی لائی ہوئی ہیں — تو آتی ہے یہ راحتوں کو بھی لے کر
اگر سنگ مرمر ہے تو موم بھی ہے — یہ دلدار بھی ہے اگر ہے یہ دلبر
اگر زخم ہے یہ تو مرہم بھی ہے یہ — ہے آبِ بقا بھی جو ہے آبِ خنجر
جہاں پہ ہے عورت کی نیکی بھی روشن — جو معلوم ہیں سب کو تریا چرتر

جو فرمائی ہے آپ نے مدح اس کی — یہ ایسی ہی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر
نظامیؔ نے جو کچھ مذمت بیاں کی — بُرائی ہیں اس سے بھی ہے یہ فزوں تر

کئی قسم کی عورتیں ہیں جہاں میں — نہ کیجے قیاس ایک کو دوسری پر
بُرائی میں حیوانِ مطلق سے ادنیٰ — بھلائی میں اعلیٰ ملائک سے بہتر

یہی واقعی رائے حامد کی بھی ہے
نہیں اُنگلیاں ہوتیں پانچوں برابر

حامد حسن قادری ۔ بی ۔ اے

قِسمت

اک روز کسی دوست نے یہ شوق سے پُوچھا — کچھ آپ کو معلوم ہے تقدیر کی نسبت
قسمت کا جو سنتے ہیں مُسلمانوں میں جھگڑا — کیا آپنے سمجھی ہے بھلا اسکی حقیقت
ہر قوم میں گو قائل تقدیر ہیں لیکن — کیا وجہ اِ مُسلماں ہیں بہت شاکی قسمت
ہر وقت ہی کیوں قوم میں تقدیر کا رونا — ہر فردِ بشر کیوں ہے گرفتارِ مصیبت
کیوں آتی ہیں ادبار کی کانوں میں صدائیں — کیوں قوم بنی جاتی ہے تصویرِ ذلت
سُنکر یہ کہا مَیں نے کہ اے صاحبِ دانش — یہ بات تو ہے صاف نہیں غور کی حاجت
اِسلام ابھی خوابِ حکومت سے نہ جاگا — گو سر میں ابھی باقی تھا سودائے حکومت
اور بادۂ عشرت سے سبھی مست ہُوئے تھے — اس حال میں جب آکے پڑی سر پہ مصیبت
جو ہاتھ کہ بیکار رہے کارِ جہاں سے — جو دل کہ رہے غرقِ خیالِ مَے عشرت
کس طرح سے بگڑے ہُوئے وہ کام بناتے — کب اُن سے تھا ہو سکتا علاجِ غمِ عسرت
جس دم اُنہیں ناکامی نے ہر سمت سے گھیرا — باقی نہ رہی بازوئے ہمت میں بھی طاقت
جو خون کبھی گرم تھا اب سرد ہُوا تھا — ادبار و مصیبت سے نہ تھی لڑنیکی عادت
کوشش جو کہ معراجِ ترقی کا ہے زینہ — تھی اسکی بھی صورت سے مسلمانوں کو نفرت

جب دہر میں تنگ آ گئے افکارِ جہاں سے
اور آئی رہائی کی نظر کوئی نہ صورت

ہر سمت سے ادبار نے اس طرح جو گھیرا
ناچار ہر اک شخص ہوا شاکیٔ قسمت

پائی جو دلِ زار نے اس طرح سے تسکیں
اور فکر و تردد سے ہوئی ان کو فراغت

ہر بات میں ہر کام میں پھر سمجھا انہوں نے
ناکامیٔ ہمت کو بھی ناکامیٔ قسمت

افسوس رہے یہ تو مقدر ہی کو روتے
اور صاحبِ ہمت ہوئے سب صاحبِ قسمت

مانا کہ ہے تقدیر بھی عالم میں کوئی چیز
پر فتحِ مقدر کے لئے چاہیئے ہمت

ہے قاف سے قسمت کے عیاں قوتِ بازو
اور سین سے ظاہر ہے سمجھ لینے کی طاقت

اور میم کا ایما ہے کہ محنت کئے جاؤ
تیار ہو ہر کام کو ہے تے کی اشارت

مفہوم کو قسمت کے مسلماں جو سمجھتے
ممکن نہ تھا ہوتے یہ گرفتارِ ہلاکت

وہ شاہدِ قسمت کے ہیں دیدار سے محروم
جو کارِ جہاں میں کبھی کرتے نہیں ہمت

عبد العزیز شوق
(از دینانگر)

عیدِ قرباں

ماہ مبیں نے کر کے اعلانِ عیدِ قرباں
فردِ فلک پہ لکھا فرمانِ عیدِ قرباں

شامِ شبِ جلالت احیانِ عیدِ قرباں
جامِ مےَ مسرت فیضانِ عیدِ قرباں

نکلا ہے چاند جب سے روشن ہیں سب کے چہرے
ہے دورہ تجلی دورانِ عیدِ قرباں

ڈوبا ستارہ غم کا - مہرِ سرور چمکا
برجِ قمر بنا ہے ایوانِ عیدِ قرباں

ہر لمحہ عبادت ہے ساعتِ سعادت
ہر ساعتِ تجلی - ہر آن عیدِ قرباں

اندازِ عیش لائی - آئی طرب سے آئی
قرباں اس ادا کے اے شانِ عیدِ قرباں

کرنے ہیں راہِ حق میں صدقے وہ جان اپنی — جن مومنوں کا دیں ہے ایمانِ عیدِ قرباں
عالم کے واسطے ہے یہ خیر کا زمانہ — ہے آشنائے عالم الطافِ عیدِ قرباں
ترشح سے جامِ دل میں ہے بادہ بشارت — ہے انتہائے فرحت عنوانِ عیدِ قرباں
قربان راہِ حق میں مثلِ خلیل ہو کر — لازم ہے عارفوں کو عرفانِ عیدِ قرباں
اسلام کے چمن میں رنگِ بہار آیا — ہے گلشن شگفتہ بستانِ عیدِ قرباں
کعبے میں قبلہ رو ہیں حجاج صرفِ طاعت — ہے سر بسر زائروں کے احسانِ عیدِ قرباں
باہم مصافحوں میں گذر گئی دوستوں کی — باہم گلے ملیں گے یارانِ عیدِ قرباں
ہے جیب ہیں جہاں کی نقدِ سرورِ شادی — پُر ہے دُرِ خوشی سے دامانِ عیدِ قرباں
مذبوح مثلِ حیواں ہر بدسگال بزدل — ہر نیک ہو شہیدِ پیکانِ عیدِ قرباں
قربانیاں نفاق و افسانۂ جہل کی ہوں — خونِ وفا سے تر ہو میدانِ عیدِ قرباں
ہو اتفاق و علم و دولت سے استفادہ — ہوں قلب جاں نثارانِ شایانِ عیدِ قرباں

ہے آرزوئے طالب ہو بختِ ہند غالب
ہو جشنِ جم سے افزوں سامانِ عیدِ قرباں

طالب بنارسی (از بمبئی)

تازہ غزلیں

(از جناب توفیق)

اینقدر جوشِ ہوسہا جلوہ سامان است و بس — دل بہ بزمِ خویش چوں آئینہ حیران است و بس
عالمِ بیخوابی شوقم مپرس از من کہ چیست — اینقدر دانم کہ یک خواب پریشان است و بس
جز بحسرت سوختن در بزمِ دل چیزے نماند — داغ ناکامی زیارتگاہِ ارمان است و بس

شادیِ عیدِ جنوں از خویشتن گم می کند / خندۂ صبحِ عدم چاکِ گریباں است و بس
مایۂ دلبستگی آمد در رنگِ بیدلی / غنچۂ دل چوں بساطِ گل پریشاں است و بس
دل کہ میدارد ازاں صد ماتمِ ناز آرزو / باہجومِ آرزو آشفتہ داماں است و بس
بے خلشہا نیست سیرِ گلشنِ ایجادِ ما / چشم را نظارۂ ہر غنچہ پیکاں است و بس

نیست بعدِ مرگ ہم توفیقِ پروائے کسے
شعلۂ شمعِ مزارِ ما گل افشاں است و بس

(از جناب آغا شاعر صاحب قزلباش دہلوی)

نظر کے سامنے نیلا سا آسماں کیوں ہو / جو دل جلے نہ کسی کا تو یہ دھواں کیوں ہو؟
مجال ہی نہیں جھوٹی تری زباں کیوں ہو / نہیں جو منہ سے نکلنی ہوئی تو ہاں کیوں ہو!
چلے بھی آؤ اکیلے ہی بدگماں کیوں ہو / جہاں خدا ہے وہاں غیر درمیاں کیوں ہو!
یہ ہاتھ چاند سے رخسار پر۔ یہ نیچی نظر / سنو تو۔ ہائے میں قرباں سرگراں کیوں ہو!
کوئی ٹھکانہ بتاؤ تو دل ٹھہرے اپنا / تم ایک جا نہیں رہتے جہاں تہاں کیوں ہو؟
ابھی کلی تھی ابھی پھول کھل کے مرجھایا / ہمیشگی ہو تو یہ رنگِ بوستاں کیوں ہو؟
مزہ تو جب ہے مسیں بھیگتے ہی موت آجائے / جو نامراد ہیں۔ کوئی پھر جواں کیوں ہو؟
شباب شیب کو بھی ساتھ لیکے چلتا ہے / نہیں تو اسکو غرض گردِ کارواں کیوں ہو؟
نہیں یہ ضد کہ پلک پر سے اشک گر جائیں / مجھے یہ دھیان کہ محنت ہی رائگاں کیوں ہو؟
ہماری خاک اڑا کر صبا بھی ہے بے چین / جو بے خطا ہو تو ایسی رواں دواں کیوں ہو؟
وہ مہ جمال جنھیں فرشِ گل پہ نیند آئے / لحد میں اُن سے یہ پوچھے کہ تم یہاں کیوں ہو
یہ اس کی شانِ کریمی کے سب شگفتے ہیں / نہیں تو باغ میں گل کیوں ہو گلستاں کیوں ہو
یہ سچ ہے ناظمِ ملکِ سخن ہوں میں شاعر / نہیں تو کچھ زبانوں پہ داستاں کیوں ہو؟

(از جناب حفیظ جونپوری)

دُنیا مری نگاہ میں صحرائے یاس ہے جس دن سے جی اُداس ہے عالم اُداس ہے
نالوں کو بھی کسی کی نزاکت کا پاس ہے اے صبر المدد فقط اب تیری آس ہے
گھیرے ہے مجھ کو نزع میں اک دوسرا خیال وہ جانتے ہیں موت سے اسکو ہراس ہے
شکووں کا یہ جواب ہے اچھا یونہی سہی ہم کو قسم کا پاس نہ وعدے کا پاس ہے
چھایا ہے بزم میں مری افسردگی کا رنگ کہتے ہیں لوگ آج کی صحبت اُداس ہے
دُنیا میں جس کے درد کی کوئی دوا نہ ہو ایسے مریض کے لئے مرنا ہی راس ہے
کیونکر ہو ختم لذتِ بیداد کا بیاں آخر مرے دہن میں زبانِ سپاس ہے
فرقت ہی اک سزا ہے محبت کے جرم کی انصاف چاہتا ہوں کہ تو حق شناس ہے
بڑھتا ہے اور کے یہاں اختلاجِ قلب کیونکر کہیں ہوا ترے کوچے کی راس ہے
اس بزم میں ہزار اداؤں کا سامنا لے دیکے ایک دل ہی یہاں اپنے پاس ہے
اک مشغلہ ہے ہجر میں آہوں کا کھینچنا قسمت کو رو رہا ہوں اثر سے تو یاس ہے
آیا جو میں تو بیٹھو نہ منہ پھیر کر اُدھر دیکھو اِدھر تمہیں سے مری التماس ہے
بس مختصر یہ ہے مری حسرت کی داستاں جب تک یہ سانس ہے ترے ملنے کی آس ہے

اس نظم کو حفیظ تغزل سے بحث کیا
تیرے کلام میں تو فقط درد و یاس ہے

(از میر ولایت علی صاحب فردوس)

چھوڑ کر تیرے آستانے کو اب کہاں جاؤں سر جھکانے کو
زندگی تھی جو ہجر میں آتی یوں تو آئے گی موت آنے کو
بیوفاؤں سے روٹھ کر پچھتائے کوئی آتا نہیں منانے کو

ڈر جل جائے غش ہو طالب دید عشق اتنا تو ہو دکھانے کو
رو دی انجام گل پہ شبنم تر آئی جس دم صبا ہنسانے کو

(از پنڈت پربھو دیال صاحب متخلص بہ عاشق لکھنوی)

ڈنکا کبھی جہاں میں بجتا رہا تمہارا تعظیم کو تمہاری قومیں ہیں صف آرا
علم و ہنر تمہیں سے سارے جہاں میں پھیلے حصہ میں تھا تمہارے کسب کمال سارا
علامۂ زمانہ سارے جہاں نے مانا تھیں صنعتیں تمہاری عالم میں آشکارا
چمکا کیے زمیں پر تم آفتاب بنکر ہر دم بلندیوں پر چمکا کیا ستارا
تہذیب کس بلا کی پہلے بھری ہوئی تھی اب ہے مہذبوں میں وحشی لقب تمہارا
غفلت شعاری چھوڑو برباد ہو چکے ہو عشرت پسندیوں نے کھویا ہے کھوج سارا
بگذشت موسم گل بشر نالہائے بلبل
تا کے شراب مستی یا ایہا السکارا

(از جناب سید تلمیذ حضرت ظہیر دہلوی)

وفا تو عہد میں کیوں ہے تامل سوچتے کیا ہو کوئی دشوار ہے یہ کام تم دل سے اگر چاہو
نکالو آرزو کے بدلے دل کو میرے سینہ سے ہے دل ہی نہ پہلو میں نہ پھر دل میں تمنا ہو
وفا کی ہم رکھیں امید کس برتے پہ اب اس سے بھروسا جب نہیں دل کا تو کیا انکا بھروسا ہو
نہ اپنوں میں محبت ہے نہ یاروں میں مروت ہے یہ کہئے کوئی کس برتے پہ دنیا میں کسی کا ہو
ملے جو خود سے ملجائیے کھینچے تو اس سے کھنچ جائیے جو ٹیڑھا ہو تو ٹیڑھا ہو جو سیدھا ہو تو سیدھا ہو
بھلائی چاہتا ہوں میں تو ہوتا ہے برا میرا برا چاہوں اگر اپنا عجب کیا ہے کہ اچھا ہو
کسی صورت وہ قابو میں نہیں آتے نہیں آتے

تمہیں سوچو کوئی تدبیر اے سید کہ اب کیا ہو

(از سید کاظم حسین صاحب ہدف لکھنوی)

ہیں منفعل وہ حشر کے دن دادخواہ سے	ملتی نہیں نگاہ ہماری نگاہ سے
آئینہ کی بھی آنکھ ہے مدت سے منتظر	اپنی بہار دیکھ لو اپنی نگاہ سے
دل کو شکست غمزہ و ناز و ادا سے ہے	تنہا کوئی بھی لڑ نہیں سکتا سپاہ سے
کچھ اس میں شک نہیں ہے کہ گردش نصیب ہوں	چکر میں ہوں میں الفتِ چشم سیاہ سے

دردِ دل و جگر کا کرو کچھ ہدف علاج
کیا فائدہ ملیگا تمہیں۔ آہ آہ سے

(از جناب ابوالاعجاز صاحب عرشی)

شبِ فراق کے صدمے اُٹھائیگا پھر کیا	کسی پہ اے دلِ ناداں تو آئیگا پھر کیا
کیا زباں سے پھر انکار بوسہ لب لعل	لہو کے اشک ستمگر رلائے گا پھر کیا
یہی جو روز کا اے دل ترا اُلجھنا ہے	کسی کی زلف میں مجھ کو پھنسائیگا پھر کیا
بٹھا کے پاس رقیبوں کو اب وہ شعلہ حسن	برنگِ شمع مرا دل جلائیگا پھر کیا
دلا یہ ہستی موہوم بھی غنیمت ہے	گیا جو یاں سے عدم کو وہ آئیگا پھر کیا
حصول کیا تجھے گردوں مرے مٹانے سے	بگاڑ کر مجھے ظالم بنائے گا پھر کیا
ابھی سے اے دلِ ناداں جو ہے یہ بیتابی	شبِ وصال کی لذت اُٹھائیگا پھر کیا

دکھائی نزع میں جس نے نہ شکل اے عرشی
وہ بے وفا مری تربت پہ آئے گا پھر کیا

حیدرآباد دکن

اردو علم و ادب کی دلچسپیوں کا ایک ... ماہوار رسالہ

... گفتگو - عبدالقادر ... ۱۰

... - پنڈت شو نرائن صاحب شمیم ... ۹

... - محمد خلیل الرحمن صاحب ۱۸

... - جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسہ عالیہ رامپور ۲۳

... کی مسلمان عورتیں - سید خورشید علی صاحب (حیدرآباد دکن) ۳۲

... کا شاہی زمانہ - خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب عشرت ۴۱

... - محمد ... صاحب ... ۴۸

... (مکالمہ) زمزم ۵۳

نظم

... - جناب حفیظ جونپوری ... ۶۱

... - محمد فاروق صاحب ...

تصویر - سید ...

یار کا خط - مرزا ... صاحب محسن ۶۳

شادی کی مبارکباد - پنڈت نرائن پرشاد صاحب بیتاب ۶۵

محنت - سید امیر حیدر صاحب ... ۶۶

اپنی قسمت - سید ابوالحسن صاحب ناطق ۶۸

سالگرہ کی مبارکباد - سردار عبدالمجید صاحب ... ۶۹

غزلیات:

مرزا محمد ہادی عزیز ... ۷۰

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی ...

پنڈت جواہر ناتھ کول ساقی دہلوی ۷۱

میر مہدی علی صاحب شہید ...

جناب ... ۷۲

سید رضی حیدر رضی ...

شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے دو اعلےٰ افسر صاحبان "مخزنِ حکمت" کی نسبت کیا فرماتے ہیں :-

شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے ایک اعلےٰ افسر یعنے جناب میجر سید حسن بلگرامی ایم۔ ڈی۔ ڈی پی۔ ایچ (کیمبرج) آئی۔ ایم۔ ایس (ریٹائرڈ) مقیم لندن فرماتے ہیں کہ:-

"مخزنِ حکمت"

کو دیکھ کر نہایت خوش ہوا ہوں۔ یہ نہایت قابلیت سے لکھی ہوئی طب خانگی پر ایک عام فہم اور عمدہ کتاب ہے جو اردو خواں پبلک کے لئے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوگی۔ جہانتک مجھے معلوم ہے۔ اردو زبان میں یہ اپنی طرز کی پہلی کتاب ہے جس کی تصنیف کے لئے میں قابل مصنف کو تہ دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔ میں خیال کرتا ہوں کہ اس کتاب میں جو حفظ ماتقدم اور صحت کی ہدایات درج ہیں وہ عام الناس کیلئے خاص طور پر مفید ثابت ہونگی لیکن اسکے دیگر ابواب بھی وقت ضرورت نہایت کارآمد ثابت ہونگے۔

شہنشاہ ہند کے محکمہ طبی کے ایک اعلےٰ افسر یعنے جناب کرنل ذوالنور احمد ایم۔ ڈی۔ آئی۔ ایم۔ ایس۔ (ریٹائرڈ) مقیم دہلی فرماتے ہیں کہ:-

"مخزنِ حکمت"

(یا)

گھر کا ڈاکٹر و حکیم

(مصنفہ شمس الاطباء)

نہایت قابلیت سے لکھی ہوئی ایک جامع کتاب ہے جو طب خانگی پر اردو زبان میں ڈاکٹری و یونانی کی صرف واحد تصنیف اپنی نظیر آپ ہی ہے۔ میرے خیال میں ہر ایک اردو خواں شخص کو نیز ہر ایک ڈاکٹر و حکیم کو اس کتاب کی ایک ایک جلد ضرور اپنے پاس رکھنی چاہیئے۔

یہ نامور ڈاکٹر بھی مخزنِ حکمت کی قدر دانی کی بڑے زور سے سفارش کرتے ہیں :-

(۱) جناب ڈاکٹر سید محمد اشرف ایم۔ ڈی (ہائیڈلبرگ)، لکھنؤ۔
(۲) جناب ڈاکٹر بی۔ ایل۔ ٹومیکا۔ ایم۔ ڈی ریاست جیند۔
(۳) جناب ڈاکٹر محمد اسداللہ خاں صاحب ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (لندن)
(۴) جناب ڈاکٹر پرتھوی بہار دولچ ایف۔ آر۔ سی۔ ایس (ایڈنبرگ)
(۵) جناب ڈاکٹر جی۔ آر۔ رائے ایم۔ آر۔ سی۔ پی۔ (لندن)
(۶) جناب ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا صاحب افسر اعلیٰ محکمہ طبی (پنجاب)
(۷) جناب رائے بہادر ڈاکٹر بیلی رام صاحب سابق سول سرجن [illegible]
(۸) جناب خان بہادر ڈاکٹر امیر شاہ صاحب آنریری سرجن (لاہور)
(۹) جناب ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ صاحب [illegible]
(۱۰) جناب ڈاکٹر [illegible] سول سرجن (ناسک)

حجم کتاب ایک ہزار تین سو چوبیس صفحات لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت کل بلا جلد چار روپے مجلد چار روپے [illegible] ملنے کا پتہ کتب خانہ جناب شمس الاطباء (ڈگی بازار) لاہور

مخزن

آنکھ کھلنا

سنہ ۱۹۱۰ء کا آخری دن تھا اور سنہ ۱۹۱۱ء کی آمد آمد تھی۔ میں شام کے قریب الہ آباد کی نمائش کے اُس حصّہ میں جہاں نمائش کا وسیع میدان دریائے جمن کے کنارے سے آملا ہے ٹہل رہا تھا۔ غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی کرنیں دریا کے پانی کو چمکیلے سرخ رنگ میں رنگتی تھیں۔ تماشائیوں کا ہجوم ہوائی جہاز یا زمانہ جدید کے اُڑن کھٹولے کا حیرت انگیز منظر دیکھنے کے بعد منتشر ہو رہا تھا۔ اور بہت سے تماشائی زن و مرد شفق کے نظّارہ کے شوق میں دریا کی طرف کھنچے آتے تھے۔ اور دو دو چار چار مل کر کنارِ دریا پر کھڑے ہوتے جاتے تھے۔ میں بھی ایک گروپ میں جا مِلا۔ وہاں دو صاحبوں میں ایک عجیب بحث چھڑ گئی۔ اُن میں سے ایک اپنی وضع سے انگریزی پڑھے ہوئے معلوم ہوتے تھے اور دوسرے کوئی پرانی وضع کے بزرگوار۔ مجھے یہ گفتگو ایسی دلچسپ تھی کہ میں دیر تک اسے سنتا رہا۔ اور اس میں مجھے بہت سے مضامین غور طلب نظر آئے۔ اس گفتگو کا خلاصہ حافظہ کی مدد سے ذیل میں درج کیا جاتا ہے تاکہ ابنائے وطن اس کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کریں۔

ممالک متحدہ کی عالیشان نمائش جو دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء میں شروع ہوئی اور فروری سنہ ۱۹۱۱ء تک جاری رہیگی دیکھنے کے قابل ہے۔ اسکا حال بہت سے اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا ہے اور نمائش کی کمیٹی کی طرف سے ایک کتاب شائع کی گئی ہے جسکی قیمت صرف ایک آنہ ہے۔ اس میں سب ضروری حالات نمائش درج ہیں۔

بحث کرنے والے دونوں صاحبوں کے نام چونکہ معلوم نہیں ہو سکے۔ اس لئے انہیں باعتبار اس تمدن کے جس کے وہ اپنی اپنی جگہ قائم مقام تھے۔ اس مضمون میں جدید و قدیم کے نام سے تعبیر کیا جائیگا۔

مسٹر جدید (میاں قدیم سے) فرمایئے۔ آپ اس نمائش کو کیسا پاتے ہیں؟ مفید چیز ہے نا؟

میاں قدیم (کسی قدر تامل کے ساتھ) آپ کس اعتبار سے پوچھتے ہیں؟ اس میں شک نہیں کہ تماشا تو بہت اچھا ہے۔ ایک اچھا مہذب میلا ہے۔ اور یہ میلا تفریح کے بہت سے اور سامانوں سے جو ہمارے ہاں مروج ہیں بہتر ہے۔ لیکن جو محنت اور صرف اس پر ہوا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے مجھے تو ایسی زیادہ کار آمد چیز معلوم نہیں ہوتی۔

جدید۔ مجھے یہ سُنکر حیرت ہوئی ہو کہ آپ جس نمائش کو کار آمد نہیں سمجھتے۔ یورپ میں ایسی نمائشیں صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی کا ایک مجرب نسخہ ہیں اور ہماری گورنمنٹ نے اس نمائش میں نہ صرف ظاہری حیثیت میں یورپ کی نمائشوں کا ایک نمونہ ہمیں دکھا دیا ہے۔ بلکہ ہماری ترقی کے لئے وہی مجرب نسخہ جو یورپ میں مفید ثابت ہو چکا ہے۔ مہیا کیا ہے۔

قدیم۔ وہاں کی باتیں تو آپ جانیں جو وہاں ہو آئے ہیں۔ شاید وہاں نمائشیں مفید ثابت ہوتی ہوں یا مناسب حال ہوں۔ مگر یہاں کیا باعتبار ملک کے عام افلاس کے اور کیا باعتبار ہماری موجودہ کاروباری حالت کے کچھ غیر موزون سی نظر آتی ہیں۔ آخر بتایئے تو سہی۔ انکا مقصد کیا ہے اور فائدہ کیا؟

جدید۔ نمائش کا سب سے بڑا مقصد یہ ہو کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں کھولدے ہندوستان کے آدھے امراض کا باعث یہی ہے کہ اہلِ ملک کی آنکھیں

بند ہیں۔ یعنی یا تو وُہ ایسے خوابِ غفلت میں ہیں کہ "جاگن حشر تک قسم ہے"۔ اور یا اگر کسی قدر بیدار بھی ہو چکے ہیں تو بہت سی چیزوں سے جو اُن کے لئے مفید ہیں بے خبر ہیں اور اس معنی میں کہا جا سکتا ہے کہ اُنکی آنکھ ابتک نہیں کھلی۔

قدیم۔ ہمارے مُلک کی غفلت کی نیند کی اگر پوچھئے تو اس کے کئی سبب ہیں اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ نمائش یا ایسی اور بہت سی نمائشیں ہماری اس غفلت کا کیونکر علاج ہو سکتی ہیں۔ رہا دُوسرے معنی میں آنکھ کھلنا۔ سو اسکے فوائد کا میں چنداں معترف نہیں۔ میں تو دس پندرہ دن سے ہر روز شام کو یہاں کا ہجوم دیکھ جاتا ہوں۔ میری آنکھ اگر اب تک بند تھی تو اب بھی بند ہے۔ مجھے تو کوئی ترقی محسوس نہیں ہوئی۔

جدید۔ مجھے یہ سُنکر بہت تعجب ہُوا۔ کہ آپ نے اتنے دِنوں میں اس مجموعہ عجائبات میں کوئی ایسی چیز نہیں دیکھی۔ جو آپ کے لئے نئی ہو۔ یا جسے دیکھکر آپ کے خیالات میں پہلے سے زیادہ وسعت یا معلومات میں ترقی ہوئی ہو۔ اگر یہ سچ ہے تو معاف کیجئیگا۔ آپ چشمِ بینا سے محروم ہیں۔ یہاں تو قدم قدم پر "کرشمہ دامنِ دل میکشد" کا مضمون ہے۔ ہندوستان کے مشہور اور بے بدل شاعر مرزا غالب مرحوم نے کیا خوب کہا ہے ؎

نشئے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

قدیم۔ میں یہ دیکھکر تو خوش ہُوا کہ آپ کو ہماری شاعری سے کچھ تعلق باقی ہے۔ مگر میں اشعار کی سند نہیں مانتا۔ شعر و سخن کے شوق میں تو تُم کسی سے کم نہیں۔ لیکن اس قسم کے مباحثے اس سے نہیں طے ہوتے۔ یا کم از کم اس طرح طے

نہیں ہونے چاہئیں۔ کہ ایک شعر پڑھ دینا گویا ایک برہانِ قاطع پیش کر دینا ہے؟ میں آپ سے یہ پوچھتا ہوں کہ نمایش بھر میں کوئی ایک چیز بھی ایسی بتائیے جسکو ہم اپنے ملک کی بیداری یا آنکھ کھلنے کا ذریعہ قرار دے سکیں۔

جدید۔ ایک چیز ہو تو کہوں۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یہاں ایک ایک چیز عجیب اور مفید ہونے میں لاجواب ہے۔ مثال کے طور پر آپ سب سے پہلے اس ہوائی جہاز کو ہی لیجئے۔ جسکی حیرت انگیز اڑان ہم آپ ابھی دیکھکر آئے ہیں۔ انسان ہزاروں برس سے اس فکر میں تھا کہ ہوا میں اڑنے کی کوئی ترکیب پیدا ہو۔ صدیوں کی محنت کا آج ثمر ملا ہے۔ کہ اڑان ممکن ہو گئی ہے۔ آپنے دیکھا۔ اس جہاز ہوائی کا وہ فرانسیسی جہاز ران کس طرح بیدھڑک زمین سے ابھرتا ہے۔ کس وثوق کے ساتھ آسمان کی طرف بڑھتا ہے اور کتنی بلندی پر پہنچکر چکر پر چکر لگاتا ہے۔ سائنس کے عجائبات میں اس سے بڑھکر اچنبھا موقت نہیں ہے۔ اور ہماری خوش قسمتی ہے کہ اس نمائش کی بدولت ہزارہا ہندوستانیوں نے اس ایجاد کو بچشم خود دیکھ لیا۔

قدیم۔ ہوائی جہاز کے عجیب ہونے میں کلام نہیں۔ بیشک اچنبھا ہے۔ اور میں پھر اپنی پہلی رائے کا اعادہ کرنا چاہتا ہوں کہ اور تماشوں سے بہتر تماشا ہے۔ کیونکہ بجائے فریب نظر کے سائنس کا کرشمہ اور ترقی علم کا نتیجہ ہے۔ مگر میرا اعتراض ابتک قائم ہے کہ ہمیں کوئی فائدہ اس کے دیکھنے سے نہیں ہو سکتا۔

جدید۔ کیا جانیں آپ فائدہ سے کیا مراد لیتے ہیں۔ ان چیزوں کا یہی فائدہ ہوتا ہے کہ انسان کے خیالات وسیع ہوں۔ اسے معلوم ہو کہ انسان محنت اور ہمت سے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ سائنس کے پڑھنے اور سیکھنے کا شوق پیدا ہو اور اہل ہند اہل یورپ کی ترقی دیکھکر خود بھی ترقی کی طرف مائل ہوں۔ اور یہ سب اس ہوائی جہاز کے مشاہدہ سے اور دیگر مشاہدات سے ممکن ہے۔

قدیم۔ ممکن تو بہت سی چیزیں ہیں جو بسا اوقات واقعی طور پر ظہور میں نہیں آتیں اہلِ علم کے نزدیک محض امکانات کی بحث بالکل غیر معتبر اور ناکافی ہے۔ وقعات پر بحث ہونی چاہئے۔ کیا آپ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں جو لوگ اس اُڑان کی سیر دیکھتے ہیں۔ اُن کے یہ خیال ہوتے ہیں جن کے امکان آپ بتا رہے ہیں؟ میرا تو مشاہدہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں تو روز دیکھتا ہوں کہ تماشائیوں کی ایک کثیر تعداد تو اس حیرت سے اس نظارہ کو دیکھتی ہے۔ جیسے وہ کسی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں اور اس ایجاد کے موجد اور اس ہنر کے جاننے والے کسی اور مٹی کے۔ اُن کی آنکھیں صرف کھلتی ہی نہیں۔ بلکہ حیرانی سے کھلی رہ جاتی ہیں۔ اسکا اثر بجائے ترقی کا حوصلہ دلانے کے اور سائنس سیکھنے کا شوق بڑھانے کے جہانتک میرا اندازہ ہے ہم ہندوستانیوں کے حوصلوں کو پست کرنے والا ہے۔ ہم ابھی سائنس میں مبتدی بھی نہیں اور اہل یورپ منتہی کے درجہ کو پہنچتے جاتے ہیں اور انکی رفتار ترقی اس قدر تیز ہے۔ کہ ہم اگر پر لگا کر بھی اُڑیں تو انکے برابر نہیں چل سکتے۔ اور لوگ اس فرق کو تو ملاحظہ کیجئے۔ میں نے اِن کانوں سے ایک دفعہ نہیں بلکہ دفعہ پچھلے چند دنوں میں ہی اچھے اچھے ثقہ اور معقول لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے۔ بھئی انہی لوگوں کا حوصلہ ہے۔ مجھے تو اگر کوئی ہزار روپیہ ساتھ دے اور کہے کہ جاؤ اس کے ساتھ سوار ہو جاؤ۔ تو میں تو کبھی نہ جاؤں کہ موت کے منہ میں کودنا ہے۔ ہم تو ابھی اتنے سستے ہوئے نہیں۔ کہ یُونہی مُفت میں اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں"۔

جدید۔ میں مانتا یہ تسلیم کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ابھی کمیٔ تعلیم کے باعث بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کی ایجادات سے مرعوب ہوتے ہیں اور

اہل یورپ کو ایک مافوق الفطرت قوت سمجھنے لگتے ہیں۔ لیکن سب تو ایک سے نہیں بہت
ایسے بھی تو ہیں کہ یورپ کی ترقی سے مستفید ہو کر اپنے ملک کی ترقی کی فکر میں ہیں۔
اُن کے لئے تو یہ تجربے جو یہاں دکھائے جا رہے ہیں۔ فائدہ سے خالی نہیں۔
آپ نے دیکھا ہے بجلی کو علوم جدیدہ نے کس طرح دست بستہ باندی بنایا ہے۔ اور
اس نمائش میں کیا کیا کام اس سے لیا جا رہا ہے۔ شام ہوتے ہی نمائش کے
وسط کے قریب جو گھنٹہ گھر بنا ہے کس طرح خود بخود منور ہو جاتا ہے سیکڑوں
برقی لمپ جو اس پر لگے ہیں۔ یکبارگی روشن ہو کر اسے بقعۂ نور بنا دیتے
ہیں۔ فوارے اسی بجلی کی بدولت طرح طرح کے رنگ بدلتے ہیں۔ اور رات
روشنی میں رشکِ نیمروز بن جاتی ہے۔

قدیم۔ جی ہاں میں نے یہ سب دیکھا ہے۔ اور بارہا اس کی خوبصورتی سے میرا
دل خوش ہوا ہے۔ لیکن ملکی پہلو سے میرے دل پر تو ہمیشہ مایوسی چھائی
ہے۔ اور میں نے آہ سرد بھر کر کہا ہے۔ کہ یہ چراغان ہمارے لئے باعثِ
مسرت نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم بڑی محنت
سے مٹی کے چراغوں میں سرسوں کا تیل اور روئی کے فتیلے ڈال ڈال کر
چراغاں کیا کرتے تھے اور جتنی دیر روشنی درکار ہوتی اتنی دیر دعائیں
مانگتے رہتے تھے۔ کہ کوئی جھونکا تیز ہوا کا آکر ہمارے دیئے نہ بجھا دے
اور اب برقی چراغوں کی قطاریں ہیں۔ جو شیشے کے چھوٹے چھوٹے فانوسوں
کے نیچے نہایت محفوظ حالت میں روشن ہیں۔ نہ انہیں ہوا کا ڈر نہ آندھی
کا خطرہ۔ مگر فرق کیا تھا۔ وہ روشنی ہماری اپنی ہوتی تھی اور یہ روشنی دوسروں
سے مانگی ہوئی۔ نمائش کے میدان میں یہ منور مینار کھڑا ہے۔ مگر اس
روشنی میں ہمارا کیا ہے۔ برقی روشنی ایجاد اہل یورپ کی۔ لمپ ساخت

یورپ کے۔ اُن کی ترتیب لیاقت کسی یورپین صناع کی۔ کونسی بات ہے
جس پر ہم فخر کر سکیں۔ کہ یہ ہماری کرامات ہے۔ ہاں ایک چیز ہم بھی
اس مجموعہ میں پیش کرتے ہیں اور وہ چشم حیراں ہے۔ اُستاد کا شعر
بے اختیار زبان پر آتا ہے۔ کس بیساختہ پن سے کہا ہے ؎

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے
چشم نرگس کی دہن غنچہ کا حیرت میری

جدید۔ مَیں آپ کی اس منطق کا قائل نہیں کہ ہم ان چیزوں کو دیکھکر ہمیشہ
محوِ حیرت ہی رہینگے۔ اس میں شک نہیں کہ فوری اثر حیرانی کا ہوتا ہے
اور اپنی ناقابلیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ احساس ہی قابلیت
کا آغاز ہے اور اس سے ہر ترقی کی ابتدا ہے۔ اور اس کا نام مَیں نے
"آنکھ کھلنا" رکھا ہے۔ آپ مجھ پر اعتراض کرتے ہوئے درحقیقت میری
تائید کر رہے ہیں۔ اگر آپ یہ مانتے ہیں کہ بہت سے سوچنے والے
دل اور دماغ ان ایجادات اور ترقیوں کو دیکھکر حیران ہوتے ہیں اور
اپنی کمی کو محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کاموں کے سیکھنے کی تدبیر اس
احساس سے فقط ایک قدم آگے ہے۔ دُور کیوں جاتے ہو۔ اسی
نمائش کے اندر اس کے ثبوت موجود ہیں۔ بہت سی چیزیں جو
پہلے ہمارے ہاں نہیں بنتی تھیں۔ اور باہر سے بن کر آتی تھیں۔
اب ہمارے ہاں بننے لگی ہیں اور ہمارے ہی ہم وطن کاریگروں نے
بنائی ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی چیزیں جو ابھی ہماری صنعت
سے بالاتر نظر آتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد بننے لگیں گی۔ مَیں کل ہی
اتفاق سے فرنیچر کے کمرے میں گیا۔ تو یہ دیکھکر نہایت

شمار کی کوشش ہوئی لیکن مکمل فہرست ہنوز تیار نہیں ہوئی۔ بقول اجہ ہیرزل کے جتنے بکری کے کھال پر بال ہیں۔ اتنے ہی ستارے اور سیارے ہیں۔ ہندوؤں کے راہو اور کیتو کا پتہ نہیں چلا۔ یا تو یہ سیارے فرضی تھے یا ہنوز دوربین کافی طاقت کی ایجاد نہیں ہوئی ہے۔ یا ممکن ہے کہ نئے دریافت ہوئے ہوئے سیارے یورینس (Uranus.) اور نپچون (Neptune.) راہو اور کیتو ہوں۔

یونانین اور عربی علم ہیئت میں صرف سات ستارے مانے جاتے ہیں۔ یعنی:۔

زحل	سنیچر	سیٹرن
عطارد	بُدھ	مرکیوری
زہرہ	شکر	وینس
مشتری	برہسپت	جوپیٹر
مریخ	منگل	مارس
شمس	سورج	سن
قمر	چندرمان	مُون

یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ جو صفتیں ان سیاروں کے متعلق بیان کی جاتی ہیں وہ وہی ہیں جو ہندیوں میں مشہور ہیں۔ ہم سوال کرتے ہیں:۔

اوّل۔ کیا یہ ممکن ہے کہ چند اشخاص مختلف ملکوں میں ستاروں اور سیاروں کے مجموعوں کو دیکھنے اور شناخت کے لئے بجنسہ وہی اشکال اپنے ذہنوں میں تجویز کریں جو انکے خیال میں مشابہ بعض متخیلہ اشکال فرضی کے ہوں۔

دوم۔ کیا یہ غالب ہے کہ اگر جوتش محض تجربہ پر بنیاد رکھتا ہے تو ہر ایک ستارے کے متعلق وہی تاثیریں مختلف ملکوں کے مشاہدہ کرنے والے بیان کریں۔

ہمارے خیال میں اس درجہ کا توارد ہونا تقریبًا ناممکن ہے۔ یہ تسلیم کیا جاتا ہے

کو علم ہندسہ دنیا کے مختلف حصوں میں ابتداً ہند سے گیا ہے - چنانچہ یہ نام بھی اس امر پر دال ہے - لیکن اس امر میں شبہ ظاہر کیا گیا ہے کہ آیا مصریوں اور یونانیوں نے ہند سے جوتش کا علم حاصل کیا - بہت سے علمائے اسلام جوتش کو لغو اور فرضی سمجھتے رہے لیکن ان میں سے بعض بعض اس کی تحصیل اور مشق میں مصروف رہے نصاریٰ کے ممالک میں بھی اس کی مخالفت ہوتی رہی - تاہم بعض ان میں سے بھی اس کے مشتاق رہے -

یہ امر مانا جاتا ہے کہ چینی - ہندو - مصری - کلدانی زمانہ قدیم میں جوتش کے قائل تھے - رفتہ رفتہ خواہ کچھ ہی وجوہات ہوں لوگوں کے عقیدے میں فرق آ گیا باوجود اس زوال کے خلیفہ منصور کے عہد میں منجم دربار میں رہتے تھے اور آیندہ کا حال بیان کیا کرتے تھے - علیٰ ہذا کیتھلک عیسائیوں میں اسکا شغل رہا چنانچہ ایک شخص کارڈینل ڈالی نے حضرت مسیح کا زائچہ بنایا تھا - فرانس کے بادشاہ لوئی یازدھم نے ایک نجومی گیلی اوتی ملازم رکھا ہوا تھا - انگلستان میں بعضے پروٹسٹنٹ عیسائی اسکے قائل رہے - ولیم للی ایک بڑا مشہور نجومی انگلینڈ میں ہو چکا ہے اس کی پیشینگوئی دربارہ وبا کے صحیح نکلی - وبا کے بعد کی آتشزدگی کے بارہ میں بھی اس کی پیشینگوئی صحیح ثابت ہوئی - علیٰ ہذا چارلس اول کے متعلق بھی اس کی پیشینگوئی صحیح نکلی حتیٰ کہ اسکو پارلیمنٹ سے کچھ عرصہ ایسی خدمات کے صلہ میں پنشن بھی عطا ہوتی رہی - شاعروں میں سے ڈرائیڈن نے اپنے بچوں کے زائچے بنوائے - علم ہیئت کی تحقیقات نے اس فن کو بہت ضعف پہنچایا اور رفتہ رفتہ یہ فن ابلہ فریبوں کے ہاتھ منتقل ہو گیا -

اب ہم کو یہ دکھلانا ہے کہ ہندی جوتش کی مشابہت مصری جوتش سے حیرت انگیز ہے - زمانوں پھر کچھ کچھ یورپ میں اس طرف توجہ ہوئی ہے - یوروپین جوتشیوں کی سالانہ جنتریوں کو شوقیہ طلاعہ کیا جاتا ہے - خواہ یہ علم خبطی - لغو -

بابل یا مصر ہو۔ یورپ کے منجم مصری جوتش پر عمل کرتے ہیں۔ جو اتفاق سے ترجمہ ہو کر باقی رہگیا ہے۔

او کلٹ ریویو میں ہمارے شہنشاہ معظم کا زائچہ درج ہوا ہے۔ بار منرودہ تو انسائکلوپیڈیا میں جرمن کے مشہور شاعر گیٹے کا زائچہ درج ہے جو صحیح ثابت ہوا۔ ۱۸۷۰ء میں ایک کتاب جسکا نام (انفلوئنس آف دی سٹارز) ہے روزا واگن نے شائع کی۔ اس میں مذکور ہے کہ ابتدا یہ علم سینہ بسینہ مصر میں جاری رہا اور حضرت مسیح کے ایک ہزار سال قبل سے ستاروں کا مشاہدہ مصری کرتے رہے۔ سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں کلاڈیس بطلیموس نے ۴ جلدوں میں اس علم کے قواعد قلمبند کئے۔ اس کے ترجمے انگریزی زبان اور ہسپانیہ کی زبان میں ہو گئے۔ ۱۶۳۶ء میں جان ویلی نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مفصل ذکر تو اس فن کا اس محدود تحریر کے احاطہ مجوزہ سے باہر ہے تاہم شائقین جوتش کی دلچسپی کے لئے زائچہ کے بارہ خانوں کا ذکر کافی ہوگا۔ جو ہر ایک زائچہ میں ہوتے ہیں۔

خانہ اوّل - یہ گھر مذکر ہے۔ اس کا تعلق سر۔ زبان اور حافظہ سے ہے۔ یہ جسم کا گھر ہے اور سب سے ضروری خانہ ہے۔ اگر اس میں منگل واقعہ ہو تو مولود کے چہرہ پر تل یا داغ ہونا ضروری ہے۔ مختلف ستاروں کے اس گھر میں واقعہ ہونے سے مختلف اثر بیان کئے جاتے ہیں۔ اس گھر کا رنگ سفید ہے۔

خانہ ۲ - مؤنث ہے۔ دولت دنیوی سے اور مولود کی گردن سے متعلق ہے۔ رنگ سفید ہے۔

خانہ ۳ - رنگ سُرخ زردی لئے ہوئے۔ مذکر ہے۔ ہاتھ بازو شانہ مولود سے تعلق رکھتا ہے۔ سفر۔ ہمسائگان۔ تصنیفات۔ برادر ہمشیرہ کے

تعلقات بھی اسی گھر سے ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۴۔ مؤنث رنگ سُرخ۔ معدہ۔ سینہ، شش سے متعلق ہے۔ اِس گھر سے میراثِ پدر۔ زندگی کے آخری حصّہ کی بابت احوال ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۵۔ رنگ سیاہ وسفید۔ مذکر۔ دِل، پُشت، جگر سے تعلّق ہے۔ اولاد۔ ثروتِ دُنیوی۔ لذّاتِ دنیوی۔ کامیابی کاروبار سے متعلق ہے۔

خانہ ۶۔ سیاہ رنگ۔ مؤنّث۔ مولود کے ملازم۔ مویشی۔ جدیان کے متعلق۔ معدہ امعا پر اثر ہوتا ہے۔

خانہ ۷۔ سیاہ مذکر۔ ازدواج وعشق کے متعلق ہے۔

خانہ ۸۔ سبز وسیاہ۔ مُونث۔ جسم کے نچلے حصّہ سے تعلق ہے۔ مَوت کس طرح سے ہوگی۔ کیا کیا مال بذریعہ وصیت ملیگا۔

خانہ ۹۔ سبز وسفید۔ ران اور سُرین سے تعلق رکھتا ہے۔ دریائی سفر اور سفرِ دُور و دراز سے متعلق ہے۔ بیوی اور اس کے عزیزوں سے تعلقات اس گھر سے ظاہر ہوتا ہے۔

خانہ ۱۰۔ مُونث۔ سُرخ سفید۔ زانو کے متعلق۔ کاروبار منصبی پیشہ۔ مادر کے تعلقات ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۱۔ مذکر۔ لات کے متعلق۔ دوست اور آشناؤں کے حالات ظاہر ہوتے ہیں۔

خانہ ۱۲۔ مُونث سبز رنگ۔ رنج والم کا گھر ہے۔ دشمن۔ خرابی دُنیوی سے تعلق ہے۔ پاؤں اور انگوٹھے سے تعلق ہے۔

نقشہ بالا سے ظاہر ہے کہ ۷ گرہ باراں گھر میں کیونکر واقع ہوسکتے ہیں۔ بوقتِ ولادت یہ دیکھا جاتا ہے کہ کون سیارہ کس بُرج میں ہے۔ سیاروں کی گردش کے حساب سے اگر بُرجِ اوّل میں جو پیدایش کا خانہ ہے کوئی سیارہ موجود ہے تو اُس کے

پھل دریافت کئے جاتے ہیں۔ بعض اوقات دو دو تین تین ستیارے ایک ہی برج میں جمع ہوتے ہیں اور دیگر گھر خالی رہتے ہیں۔ خالی گھر کے اثر مقابلہ کے گھر کے گرد سے دریافت ہو جاتے ہیں۔ طریق دریافت کی ماہیت نہ معلوم کس بنیاد پر رکھی گئی ہے۔ یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ علم کس طرح سے حاصل ہوا۔ غالباً تجربات کا مجموعہ ایسا تیار ہوتا گیا ہوگا کہ اُس سے کوئی کلیہ قاعدے موضوع کئے گئے ہیں۔ چنانچہ

(۱)۔ زحل (یعنی سنیچر) ہے۔ اگر وہ خانہ پیدائش میں بوقتِ ولادت موجود ہے تو مولود تُنفہ منین۔ صابر۔ مطالعہ پسند ہوگا۔ مستورات سے تعشق نہ رکھیگا لیکن جس کے ساتھ اُس کا عشق ہوگا ثابت قدم ہوگا۔ رُوحانی معاملات کا شغل رکھیگا۔ قد دراز۔ دست و پا لمبے ہونگے۔ بال سیاہ ابرو آپس میں ملے ہُوئے ہونگے۔ لیکن اگر یہ ستیارہ نچلی منزلت کا واقعہ ہوا ہے (جو ایک اصطلاحی لفظ ہے) تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مولود حاسد۔ حریص۔ کینہ ور۔ دروغ گو۔ اور بے صبر شخص ہوگا۔ جملہ سیاروں کا اثر موجودات حیوانات اور نباتات پر بھی ہوتا ہے جو جوتش میں نامزد کئے گئے ہیں جنکا ذکر طوالت کی وجہ سے متروک کیا جاتا ہے۔

(۲)۔ مشتری (برہسپت) اگر خانۂ ولادت میں واقعہ ہے تو وہ اُونچا واقعہ ہوا ہے تو قد دراز۔ بیضوی شکل۔ موٹی آنکھیں۔ بال گنجان۔ دانت اچھے ہونگے۔ مولود فیاض۔ مہمان نواز۔ لذاتِ دنیوی کا شائق ہوگا۔ بیوی سے محبت رکھیگا۔ کمینہ باتوں سے اجتناب کرے گا۔ آواز بلند اور صاف ہوگی۔ اگر یہ ستیارہ نیچ واقعہ ہوگی تو مولود بوالہوس۔ مغرور۔ عیاش فضول خرچ اور ظالم و جابر ہوگا گویا اثر [illegible] ہوگا۔

(۳)۔ مریخ (منگل) کے اثر یُوں بیان کئے جاتے ہیں۔ اگر اونچا واقعہ ہوا ہے تو

مولود بہادر۔ شائقِ جنگ۔ تیز طبیعت۔ رنگ سُرخ۔ دراز سینہ متوسط قد۔ جسم کی ہڈیاں بڑی ہونگی۔ بال گھنگر ودار۔ آنکھیں باز کی آنکھوں کے مشابہ۔ اگر یہ سیارہ نیچے واقعہ ہوا ہے تو مولود شریر۔ فتنہ پرداز۔ نہ خوفِ خدا نہ خوفِ انسان۔ عادات میں بے تمیز اور بے اصُول ہوگا۔

(۴)۔ شمس (سورج) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود حکمرانی کا شائق۔ نمود کا شائق لیکن مزاج محبت آمیز ہوگا۔ عادات احسن اور گفتگو میں متین ہوگا۔ اگر نچلے درجہ پر واقع ہے تو مولود مُدمغ۔ شیخی باز۔ فضول خرچ۔ زبان دراز۔ دوسروں کی دولت پر زندگی بسر کرنے والا ہوگا۔

(۵)۔ زہرہ (شکر) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود عاشق مزاج۔ محبت سے جی چرانیوالا۔ خوبصورت۔ ہر قسم کے تعیش کا شائق۔ موسیقی اور فنونِ لطیفہ ونفیسہ کا مشتاق ہوگا۔ رنگین مزاج ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوا تو جسم فربہ۔ موٹے لب۔ چہرہ پر زردی۔ عادات میں شورہ پُشت۔ بد اخلاق۔ بد وضع۔ بدمعاش ہوگا۔

(۶)۔ عطارد (بُدھ) اگر اونچا واقعہ ہے تو مولود کا دماغ باریک بین۔ ذہن تیز اور طبیعت فصیح وبلیغ۔ صاحبِ حافظہ۔ رُوحانی معاملات میں مشتاق۔ پیشگو ہوگا۔ اگر تجارت کی جانب توجہ کرے گا تو اس سے بڑھکر ہونا مشکل ہے۔ نئے نئے رستے دولت پیدا کرنے کے اختراع کریگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود دروغ گو۔ لاف زن۔ زبان دراز۔ متلوّن مزاج۔ ابن الوقت ہوگا۔

(۷)۔ قمر (چندرماں) اگر اونچا واقعہ ہوا تو مولود۔ نرم مزاج۔ بزدل۔ خیالی پلاؤ پکانے والا۔ شاعر۔ سفر کا شائق۔ متلوّن مزاج ہوگا۔ میانہ قد۔ گول چہرہ ہوگا۔ اگر نیچے واقعہ ہوگا تو مولود سست۔ کاہل الوجود۔ شرابی۔ آوارہ گرد۔ دروغگو ہوگا۔ اِس نقشہ میں راہو اور کیتُ دونوں کا ذکر نہیں ہے جو ہندی جوتش میں نحس گرہ

سمجھے جاتے ہیں۔
اب یا یہ امر کہ یہ گرہ اگر خانۂ ولادت میں واقع نہ ہوں تو پھر برجوں پر جہاں جہاں وُہ ستارے واقعہ ہوں۔ اپنے اپنے اثروں کے عکس ڈالتے ہیں۔ ان میں سے بعض گرہ بعض خانوں کے مالک سمجھے جاتے ہیں۔ وُہ جہاں واقعہ ہوں اپنے اپنے خانہ پر حکمرانی کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی گرہ ایسے خانہ میں واقع ہے جو اُسکا گھر نہیں تو مالکِ خانہ اس کے ساتھ ملکر اثر پیدا کرتا ہے۔ یعنی بعض ستیارے بعض دیگر ستیاروں کے دوست اور بعض دشمن سمجھے جاتے ہیں۔ اگر دوست واقعہ ہے تو فبہا ورنہ دشمن گرہ سے اسکا مقابلہ ہوتا ہے۔ جس گرہ کا زور زیادہ ہوتا ہے وُہ اپنا اثر زیادہ دکھاتا ہے اور اکثر اوقات اوسط نکل آتی ہے۔ اس قاعدہ پر جس کے قواعد بشرح و بسط بیان کئے گئے ہیں۔ ہر ایک گرہ کے ایک بُرج میں واقعہ ہونے یا اس بُرج کے خالی رہنے سے جو اثر ہوتے ہیں جُداگانہ بیان کئے گئے ہیں۔ جنکا ذکر مفصل باعثِ طوالت ہے۔ ہم نے صرف اُسی قدر تذکرہ کیا ہے جس سے مشابہت دکھلانی مقصود ہے۔
جو لوگ ہندی جوتش سے واقف ہیں وُہ مندرجہ بالا تحریر سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ کہ کہاں تک ہندی جوتش مصری جوتش سے مشابہ ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ:۔

یا تو یونانی ہندیوں سے جوتش لے گئے اور انہوں نے مصر میں رائج کیا یا کلدانیوں اور چینیوں نے ہندیوں سے حاصل کیا۔

یا ہندی ان ملکوں میں جاتے رہے اور وہاں سے سیکھ کر ہندوستان میں لے آئے۔ یا مصریوں نے ہند سے سیدھا حاصل کیا۔

خواہ ان میں سے کوئی صورت صحیح ہو۔ جہانتک راقم سطور کو ہندی جوتش سے

واقفیت ہے وہ اتنا کہہ سکتا ہے کہ یہ تو نہیں ایک دوسرے سے اکتساب ہوا ہے۔ جس کتاب کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے اُس کے مطالعہ سے ہم کو معلوم ہوا کہ مصری جوتش کی کتابوں میں مبتدی اصول بیان ہوئے ہیں۔ جو نکات اور تفصیل ہندی کتابوں میں درج ہے وہ بے انتہا ہے اور سینکڑوں جوتشیوں کے ذاتی تجربے ہیں۔ لیکن دعویٰ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ تتبع و تقلید کس نے کی۔ کیونکہ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ ابتدائی اصول ایک قوم نے وضع کئے اور ترقی دوسری قوم نے کی۔ البتہ اس قدر ظاہر ہے کہ ہندی جوتش میں شرح و بسط بدرجہا زیادہ ہے۔ اس قدر بھی انصافاً ہم کو لکھنا واجب ہے۔ کہ ہندی جوتش کی بعض کتابوں میں عربی الفاظ استعمال ہوئے ہیں اور عربوں کا ایک خاص طریقہ شمار اختیار کیا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس فن میں مہارت رکھتے تھے اور ہندی اور عرب ماہرینِ علم آپس میں تبادلۂ معلومات کرتے رہے ہیں +

شمیم

تاریخ ابو البشر یہ کتاب حال میں شائع ہوئی ہے مفتی محمد انوار الحق صاحب ایم۔ اے نے پروفیسر رڈ پاتھ کی کتاب کے حصۂ اول کا اردو میں ترجمہ کیا ہے اور اس میں جدید تحقیقات کے مطابق آغاز نوع انسان سے بحث کی گئی ہے۔ مفتی صاحب مستحق داد ہیں کہ انہوں نے ایسی دلچسپ علمی کتاب ترجمہ کے لئے انتخاب کی اور اس کا نہایت عمدگی سے ترجمہ کر کے اردو علم ادب میں ایک مفید اضافہ کیا۔ اس کتاب کی قیمت فی جلد مجلد ۶ اور غیر مجلد ۸ ہے اور صاحب مترجم سے تاج محل بھوپال کے پتہ پر مل سکتی ہے +

حکیم انخرسیس

(سلسلہ تاریخ الحکما)

حکیم شہر اثینہ میں سینتالیسویں اولمپیاد میں آیا۔ اور اپنے شہر میں پہنچنے سے چند روز بعد مار ڈالا گیا۔ کہتے ہیں کہ جس زمانہ میں یہ ظاہر ہوا ہے۔ اُس زمانہ میں بہت سے بڑے بڑے حکیم موجود تھے۔ یہ حکیم تاتاری الاصل تھا۔ اور تمام حکما میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا بھائی فدویدا اس ملک تاتار کا بادشاہ تھا۔ اس کے باپ کا نام غنوروس تھا۔ اور اس کی ماں یونان کی رہنے والی تھی۔ اسی وجہ سے وہ دونوں زبانیں جانتا تھا۔ نہایت فصیح اور خوش بیان شخص تھا۔ اکثر بیش قیمت لمبے جوڑے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ دُودھ اور دہی کے سوا کچھ نہ کھاتا تھا۔ وعظ و نصیحت کے وقت بہت جلدی اور بہت مختصر بولتا تھا۔ اور الفاظ و عبارات دقیق کا استعمال کرتا تھا۔ کیونکہ اس کی تقریر کے مضامین ہی ایسے باریک ہوتے تھے۔ بلاغت و ثروت کلام میں یہ کیفیت تھی کہ اُس کے جُملے ضرب المثل بن گئے تھے۔ جو شخص کلام میں اُس کا تتبع کرتا تھا تو لوگ اس کی نسبت کہا کرتے تھے۔ کہ یہ شخص تاتاری عبارت بولتا ہے۔

حکیم انخرسیس نے بلادِ تاتار کا رہنا چھوڑ کر شہر اثینہ میں رہنا پسند کیا تھا۔ اس شہر میں آتے ہی سیدھا حکیم سولون کے مکان پر پہنچا۔ اور اس کے دروازے کو جا کھٹکھٹایا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا اُس سے کہا کہ حکیم سولون سے کہدو کہ ایک شخص دروازے پر کھڑا ہے جو آپ سے ملنے اور آپ کے یہاں بہت مدت کے لئے رہنے کے قصد سے آیا ہے۔ سولون نے جواب میں کہلا بھیجا کہ انسان

صرف اس صورت میں مہمان کو اپنے یہاں رکھ سکتا ہے کہ وہ اپنے شہر میں ہو اور جہاں وہ مقیم ہو اُس میں اُسکو تصرف حاصل ہو"۔

انخرسیس یہ سنتے ہی بے تکلف اندر چلا گیا اور حکیم سولون سے کہنے لگا کہ آپ اس وقت اپنے شہر میں ہیں اور اپنے ہی مکان میں مقیم ہیں۔ لہٰذا آپ مجھکو بطور مہمان کے قبول کیجئے اور میری مصاحبت کا سامان مہیا کرائیے" حکیم سولون اس حاضر جوابی سے بہت ہی خوش ہوا۔ اور حکیم انخرسیس کو اپنے یہاں رکھکر بہت ہی خوش ہوا۔ دونوں کی آپس میں ایسی محبت ہوگئی کہ آخر عمر تک برابر قائم رہی۔

حکیم انخرسیس کو نظم کا بڑا شوق تھا۔ اسی لئے اس نے بلاد تاتار کے تمام قوانین کو نظم میں مرتب کیا تھا۔ اس کے علاوہ ایک نظم میں قوانین حرب بھی لکھے تھے۔

حکیم انخرسیس اکثر کہا کرتا تھا کہ درخت انگور سے تین چیزیں پیدا ہوتی ہیں۔ نشہ۔ لطف۔ ندامت۔ شہر اثینیہ کی مجالس سے اس کو اکثر تعجب ہوا کرتا تھا کیونکہ وہ دیکھتا تھا کہ حکما احکام مفیدہ جاری کرتے ہیں اور حمقا اس کی تعمیل کرتے ہیں۔ وہ اس پر بھی تعجب کیا کرتا تھا کہ یہاں کوئی شخص اگر کسی کو برا کہے خواہ وہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو تو وہ سزا پاتا ہے۔ اور بعض صورتوں میں گالیاں کہ معاف ہیں۔ چنانچہ کھیل کود میں۔ خواہ مخاطب کوئی بڑا ہی آدمی کیوں نہ ہو۔ اُسے اس پر بھی تعجب ہوا کرتا تھا کہ اہل یونان اپنے دسترخوانوں پر پہلے متوسط درجہ کے پیمانوں میں شراب پیتے ہیں۔ اور پھر بڑے پیمانوں میں۔ حالانکہ اُنکو علم ہوتا ہے کہ نشہ ہو چلا ہے۔

یہ حکیم مذاق کا کبھی متحمل نہ ہوتا تھا۔ اور خصوصاً انکا جو خوشی کی تقریب میں کئے جاتے ہیں۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ آدمی کو شراب پینے سے کس طرح روکا جائے۔ حکیم انخرسیس نے جواب دیا کہ مجھے تو اس ترکیب سے بہتر کوئی نہیں معلوم ہوتی کہ اسکے پاس کوئی بدمست آدمی چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اس کی حرکات کو دیکھکر اس فعل سے نفور ہوجائے۔

کسی نے پوچھا کہ "آپ کے ملک میں آلاتِ موسیقی ہوتے ہیں یا نہیں"؟ حکیم انخرسیس نے بطور سرزنش جواب دیا کہ ہاں آلاتِ موسیقی تو ہوتے ہیں مگر شرابیں نہیں ہوتی۔

جب کوئی شخص کھیل میں شریک ہونے کے لئے اپنے بدن پر تیل ملتا تھا تو حکیم انخرسیس کہا کرتا تھا کہ یہ شخص ایک بڑے جنون کی تیاری کر رہا ہے۔

ایک روز کشتی کے تختوں کی موٹائی ناپ کر کہنے لگا کہ ان میں سفر کرنیوالوں اور موت کے درمیان صرف چار انگل کا فاصلہ ہے۔

حکیم انخرسیس ہمیشہ یہ کہا کرتا تھا کہ ہر انسان پر واجب ہے کہ وہ اپنی زبان اور پیٹ پر قابو رکھے۔ یہ حکیم ہمیشہ سوتے ہوئے اپنا داہنا ہاتھ اپنے منہ پر رکھکر سوتا تھا۔ جس کے یہ معنی تھے کہ انسان کو چاہئیے کہ حفظِ زبان کا اہتمام کلی رکھے۔

ایک شخص تاتار کا رہنے والا ایتھنز سے اس کے پاس آیا تو حکیم انخرسیس نے اس سے کہا کہ میرے ملک نے مجھے بدنام کیا۔ اور تو نے اپنے ملک کو۔

کسی نے اس سے پوچھا کہ "کیا آدمیوں میں اچھے اور برے ہوتے ہیں"؟ حکیم نے جواب دیا کہ "کیوں نہیں؟ کیا ان کے زبان نہیں ہوتی؟"

اس حکیم کا قول تھا کہ صرف ایک دوست جو حقِ دوستی و صحبت ادا کرے ان بہت سے دوستوں سے بہتر ہے کہ جو حالتِ ثروت میں لوگوں کے پاس جمع ہوکر دوستی کا دم بھرا کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ لوگوں نے اس واسطے بازار میں بیٹھنا شروع کردیا ہے کہ ان میں

سے بعض اس صحبت میں بیٹھ کر خائن ہو گئے ہیں۔

ایک روز یہ حکیم کسی راستے سے گذر رہا تھا کہ ایک مدہوش نے اس سے از راہ مذاق کہا کہ یہ شخص اپنے آپ کو بڑا حکیم سمجھتا ہے۔ حکیم انخرسیس نے اس کو دھکا دیکر کہا کہ کمبخت تو آج عالم جوانی میں دو چلو شراب کا متحمل نہیں ہوتا تو کل کو بڑھاپے میں پانی کا بوجھ کیونکر اٹھا سکیگا۔

حکیم انخرسیس اکثر قانون کو مکڑی کے جالے سے مثال دیا کرتا تھا۔ اور حکیم سولن پر ہنسا کرتا تھا کہ اس کے نزدیک وضع قانون سے انسان کی خواہشیں رُک جاتی ہیں۔ کہتے ہیں کہ برتن بنانے کے لئے کُمہار کا چاک اسی حکیم کا نکالا ہوا ہے۔

اس حکیم نے ایک روز بتخانہ آفتاب کے کاہنہ سے جا کر پوچھا کہ آیا دُنیا میں مجھ سے بھی کوئی بڑا حکیم ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں میزون شانیسی تم سے بھی بڑا حکیم ہے۔ اسکو سخت تعجب ہوا کہ میں نے اُس کا کبھی نام بھی نہیں سُنا۔ اور فوراً اس کی تلاش میں اس گانوں میں پہنچا کہ جہاں یہ شخص بھاگ کر جا رہا تھا۔ دیکھا کہ میزون اپنی کھیتی باڑی کے کام میں مصروف ہے۔ حکیم انخرسیس نے اُس سے کہا کہ اب کھیتی کرنے کا وقت نہیں رہا۔ میزون نے کہا کہ بلکہ برعکس اس کے اب بھی تو کھیتی کرنے کا وقت ہے"۔ اسی میزون کو افلاطون نے منجملہ حکما رشمار کیا ہے۔ یہ ہمیشہ آدمیوں کی صحبت سے علحدہ رہتا تھا۔ کیونکہ اس کو انسانوں سے بالطبع نفرت تھی۔ ایک دفعہ میزون ایک ویرانہ میں کھڑا ہوا دل کھول کر ہنس رہا تھا۔ ایک شخص اتفاق سے وہاں سے گذرا اور پوچھنے لگا کہ تمہارے ہنسنے کا کیا باعث ہے۔ نہ یہاں کوئی آدمی ہے نہ آدم زاد۔ کہا کہ یہی تو میری ہنسی کا سبب ہے۔

شاہ اکریسوس نے حکیم انخرسیس کا شہرہ سُنکر بہت سا زر و مال اس کے پاس بھیجکر بُلا بھیجا۔ انخرسیس نے یہ سب واپس بھیجدیا اور کہلا بھیجا کہ میں اس مُلک میں

حصولِ اخلاق و زبان کے لئے آیا ہوں۔ سونے یا چاندی کا محتاج نہیں ہوں۔ جب میں علم پیری میں اپنے وطن کو جاؤنگا تو مجھے نہایت لطف و سرور حاصل ہوگا۔ چلتے ہوئے میں تم سے بھی ملتا جاؤنگا۔ کیونکہ مجھے بھی تم جیسے شخص کی دوستی کی بڑی تمنا ہے۔

واپسی کے وقت حکیم انخرسیس کا گذر شہر قیر بیک پر ہوا۔ اس وقت اتفاقاً ایک بُت کی ماں کا عُرس تھا۔ حکیم نے بھی یہ دیکھکر اپنے دل میں عہد کیا کہ اگر میں اپنے وطن بخیریت واپس پہنچ جاؤں تو ایسا ہی عُرس کیا کرونگا۔ وطن پہنچکر اُس نے ارادہ کیا کہ وہاں کے لوگوں کے عادات و اطوار کی اصلاح کرے اور یونان کے قانون کو رواج دے۔ مگر کسی نے ایک نہ مانی۔ ایک روز خفیہ طور پر اُس نے اپنی نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ چنانچہ وُہ عُرس کی رسوم ادا کر رہا تھا۔ کہ کسی شخص نے بادشاہ کو اطلاع دیدی۔ بادشاہ خود دوڑا آیا اور اس کو اس حال میں دیکھکر دُور سے تیر مار دیا جو کاری پڑا۔ جب رُوح نکلنے کے قریب ہُوئی تو اُس نے بآوازِ بلند کہا کہ مُلکِ یُونان نے جہاں میں لُغت و اخلاق کی تعلیم حاصل کرنے گیا تھا میری قدر کی۔ مگر میرے وطن نے مجھ کو ذلیل کر دیا۔

انخرسیس کے مرنے کے بعد اس کی قدر ہُوئی اور لوگوں نے اسکی یادگار قائم رکھنے کے لئے اس کا بُت بنایا *

(ترجمہ از عربی)

محمد خلیل الرحمٰن



بلینک ورس

ذیل کا مضمون جناب سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی پروفیسر مدرسہ عالیہ رامپور مؤلف تاریخ "ذرۂ نادرہ" نے ارسال فرمایا ہے۔ پروفیسر صاحب کی تحقیق اور وسعت نظر قابل داد ہے:۔

"فصیح الملک" میں ایک مضمون مولوی نجم الغنی صاحب کا میں نے دیکھا۔ جس کا عنوان "انشا پردازان اردو سے ایک اہم سوال" ہے۔ اس مضمون پر جناب احسن مارہروی نے ایک ایڈیٹوریل نوٹ بھی تحریر فرمایا ہے۔ پہلے ہم اس نوٹ کو کسیقدر مختصر کر کے درج کرتے ہیں۔ اور اس پر اپنی رائے ناقص کا اظہار کرینگے۔ بعدہٗ اصل مضمون کی نسبت جو کہنا ہوگا عرض کرینگے۔

(عبارت مختصر نوٹ)

جناب احسن تحریر فرماتے ہیں کہ "ایک ہمارے دوست نے "ہماری شاعری کے لئے نیا میدان" کے عنوان سے اپریل سنہ ۱۹۰۹ء کے فصیح الملک میں۔ بلینک ورس کو نظم سمجھکر پیش کیا تھا۔ اور اپنی رائے ظاہر کی تھی کہ اگر توسیع خیالات کے لئے اردو میں اس قسم کی نظمیں کہی جانے لگیں تو بہت فائدہ پہنچے"۔

جناب احسن نے اس مضمون پر جو رائے ظاہر کی تھی اُس میں ثابت کیا تھا کہ بلینک ورس انگریزی زبان کا نام ضرور ہے۔ مگر اس کا رواج انگریزی سے پہلے فارسی میں موجود ہے جسکو نثر مرجز کہتے ہیں۔

یہ بھی فرماتے ہیں:۔ "پہلے ہمارا خیال تھا کہ ایشیائی علوم کی ناواقفیت کے

سبب سے اکثر انگریزی دان حضرات ایشیائی اصنافِ سخن کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہیں۔ مگر اس مضمون کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ شمس العلما مولانا حالی بھی یہی خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ نثر مرجز جسکو انگریزی میں بلینک ورس کہتے ہیں از قسم نظم ہے۔

عام اس سے کہ بلینک ورس کا ترجمہ یا مقابل نثر مرجز ہو یا نہ ہو مگر انگریزی میں ضرور ایک قسم نظم کی ہے جس میں قافیہ نہیں ہوتا ہے۔ زبانِ انگریزی میں بلینک کے معنے سادہ (یعنی معرّیٰ از قافیہ) اور ورس کے معنے نظم کے ہیں۔ چونکہ نظم انگریزی میں ایک چوتھی قسم گریمر کی ہے۔ اس لئے نحاۃِ انگریزی تحت بیان پراسوڈی یعنی علم العروض گریمر میں قواعد نظم لکھا کرتے ہیں۔ چنانچہ جے۔ سی۔ نسفیلڈ صاحب بہادر نے بھی جو سر رشتہ تعلیم ممالک متحدہ کے ڈائرکٹر تھے۔ اپنی گریمر نمبر ۴ میں بلینک ورس کو تحت اقسام نظم لکھا ہے۔ اور ملٹن صاحب کی پیرا ڈائز لاسٹ سے اس کی مثال لکھی ہے۔ انگریزی میں بلینک ورس کے منجملہ اقسامِ نظم ہونے میں کلام نہیں۔ لہٰذا بلینک ورس کو انکا نظم سمجھنا بہت درست ہے۔ نوٹ کے بقیہ امور کی تحقیق کی نسبت آگے لکھونگا۔ طول و تکرار سے بچنے کے لئے یہاں ترک کرتا ہوں۔

مولوی نجم الغنی صاحب کا یہ فرمانا بہت درست ہے کہ نئی روشنی والے بموجب اَلنَّاسُ عَلٰی دِیْنِ مُلُوْکِھِمْ اندھا دھند تقلید انگریزی پر مٹے ہوئے ہیں اور خُذْ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدَرَ پر عمل بالکل نہیں۔

اسمیں بھی شک نہیں کہ فی زمانا جذبات اور نیچرل شاعری کی طرف طبیعتیں زیادہ مائل ہیں۔ مگر ہمارے اسلاف نے اس کام کو بھی باحسن وجوہ کر دکھایا ہے۔ چنانچہ جناب میر انیس صاحب نے اپنے مراثی میں صبح۔ شب۔ گرمی۔ بہار۔ صحرا اور بھائی بہن ماں بیٹے۔ دولہا دلہن کی گفتگوؤں میں۔ اور منشی اسمٰعیل حسین صاحب منیر نے اپنی مثنوی معراج المضامین میں تعریف صبح بنارس میں اور جناب میر نے اپنے گھر کی مذمت میں

کیا کیا نیچرل سینریاں کھینچی ہیں۔ اور غزل گوئی میں میر۔ غالب (صرف ایک رنگ کے اشعار میں) اور داغ نے کیا کیا جذباتِ عاشقی کو نظم فرمایا ہے۔ اُن کی کس مُنہ سے تعریف کیجائے۔ یہ کہنا انصاف کا خون کرنا ہے کہ ایشیائی شاعری پیشتر ان امُور سے خالی تھی۔ ہاں البتہ مغربی خیالات جو اب اُردو کے سانچے میں ڈھالے جاتے ہیں۔ یہ پیشتر نہ تھے۔ کیونکہ اسوقت تک ہمارے اور اہلِ مغرب کے درمیان تبادلۂ خیالات کا اچھی طرح ذریعہ ہی حاصل نہ تھا۔ اور پھر لُطف یہ ہے کہ تقلیدِ فارسی ہزاروں قیوُد کے پابند رہکر اس وادیِ دشوار گذار کو بھی طے کیا ہے۔

"بلینک ورس کی خواہش اُردو میں بیجا ہے"

اوّل تو ایک بات جو ایک مُلک کے لوگ پسند کرتے ہوں۔ اُس کے پسند کرنے پر دُوسرے لوگ کیوں مجبُور کئے جائیں۔ ہمارے طبائع اُن سے ازرُوئے فطرت مختلف ہیں۔ جن چیزوں کو وہ حُسن سمجھتے ہیں ہمارے نزدیک قبیح ہیں اور اُسی طرح بالعکس اِن کے۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ حُسن و قبحِ اشیا عقلی نہیں۔ سوائے حسنِ صدق و قبحِ کذب کے بلکہ انتظامِ عالم اختلافِ طبائع ہی سے مربُوط ہے۔ اگر اختلافِ طبائع نہ ہوتا تو تمام عالم کے انسان کچھ چیزیں اور پیشے پسند کرتے اور دُوسری چیزیں بوجہ ناپسند ہونے کے ترک کر دیتے۔ جس سے وُہ صنایع معطل رہتے اور ضروریاتِ عالم میں خلل واقع ہوتا۔ اِس اختلاف میں عجیب مصلحتِ باری ہے۔ اور ارتفاعِ اختلاف ممکن نہیں۔

جن اصُول اور خصُوصیاتِ مُلکی کے ساتھ یورپ والوں کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اُنہیں سے اکثر اصُول بوجہ اختلافِ طبائع ہماری طبیعتوں پر سخت گراں ہیں۔ چنانچہ اوزانِ انگریزی پر کیا منحصر ہے۔ بعض بحورِ عربیہ بھی ہماری طبیعتوں کو موزون نہیں معلوم ہوتے۔ ایسے خواہشاتِ بیجا سے معلوم ہوتا ہے کہ آیندہ ہم سے کہا جائیگا کہ وزنِ انگریزی پر اُردو

میں نظمیں کہی جایا کریں۔ جب خود فطرت نے ہر مُلک کے امزجہ وطبائع وآب وہوا و اشیا واشکال وغیرہ مختلف پیدا کئے ہیں۔ پھر ایک کی مرغوب چیزیں دوسروں کے پسند کیونکر ہو سکتی ہیں۔ ایسے اُمور کا ہم کو پابند کرنا گویا اصُولِ نیچر کے خلاف ہم کو چلانا ہے۔

دُوسرے یہ کہ زبانِ انگریزی کا قافیہ تنگ ہے۔ چنانچہ انگریزی میں سَن (آفتاب) بفتحِ اوّل کا قافیہ۔ گوان (گیا) بروزن خوان۔ اور فیئر (اچھا) کا قافیہ۔ اِر (ہَوا) اور پُٹ بضم (رکھنا) کا قافیہ نَٹ بفتح (اخروٹ) اور لارڈ کا قافیہ ورڈ (لفظ) لاتے ہیں۔ ورڈس ورتھ اور لارڈ ٹینیسن اور ایمرسن اور لانگ فیلو کی نظمیں ملاحظہ ہوں۔ بوجہ ضرورتِ قافیہ۔ اِن میں سے بعض الفاظ کے تلفظ میں تغیر کیا جاتا ہے مگر نثر اور بول چال میں یہی تلفظ بتایا جاتا ہے۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے۔ مَیں بہت سی مثالیں لکھتا مگر بخیالِ انقباضِ طبائع اردو دانان زیادہ مثالوں سے احتراز کیا۔ جو لوگ انگریزی پڑھتے ہیں وُہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اس طرح کے قوافی انگریزی میں کثیر الوقوع ہیں۔ پھر ایک اَغیَر نے میں نہ تعداد مصاریع کا اِنتظام نہ قوافی کا کوئی بندوبست۔ انہیں وقتوں نے انگریزوں کو نظمِ غیر مقفّیٰ کہنے پر مجبور کیا۔ برخلاف ہماری زبان کے کہ ایک لفظ کے بکثرت قافیے موجود ہیں۔ ہم کو کیا ضرورت ہے کہ ہم نظمِ غیر مقفّیٰ کہیں کسی بڑے سے بڑے۔ مضمون واقعہ۔ اور تاریخ کو ہم بہت آسانی کے ساتھ نظم کرسکتے ہیں اور ایسے طولانی مضامین کے لئے مثنوی اور مسدس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

تیسرے یہ کہ ہم ایشیائی لوگوں کی طبیعتوں کو بوجہ اُنس وعادت قدیم جو حظ کہ نظم مقفّیٰ سے ہوتا ہے وُہ نظم غیر مقفّیٰ سے نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم کو بلینک ورس کی طرف میلان نہیں ہے۔ کچھ نظمیں غیر مقفّیٰ جو اُردو میں اب تک کہی گئیں۔ مرغوبِ طبع نہ ہونے سے اُنکو مقبولیت نہ حاصل ہوئی اور اُن کا کوئی نام بھی نہیں لیتا ہے۔

سب سے زیادہ فائدہ نظمِ غیر مقفےٰ کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ نظم میں وسعت اور سہولت ہوگی۔ جب قیدِ قافیہ ہم کو دقت میں نہیں ڈالتی ہے تو وسعت و سہولت ہی کیا ہوئی۔ بڑی بڑی ضخیم نظمیں ہونا دلیل عدمِ دشواری ہے؟ فارسی میں شاہنامہ۔ حملہ حیدری مرزا رفیع باذل۔ اور اردو میں جلدہائے مراثی انیس و دبیر موجود ہیں۔ اگر سہولت بلینک ورس میں ہم تسلیم کرلیں تو سب سے زیادہ سہولت نثر میں ہے۔ اور یہ بلینک ورس سے بھی آسان ہے۔ کیونکہ نظمِ غیر مقفےٰ میں قیدِ وزن پھر بھی ہوتی ہے پس معلوم ہوا کہ محض سہولت کوئی چیز نہیں بلکہ مرغوبِ طبع ہونا بھی ضروری ہے۔

باوجود قیود و پابندی جناب میر انیس نے وسیع میدانِ مرثیہ میں نیچرل شاعری کو ٹھیک موافق بول چال کے نظم کرکے دکھا دیا۔ چنانچہ مولوی حالی فرماتے ہیں۔ اگر فردوسی لکھنؤ میں ہوتا تو اُن کی تقلید کرتا۔ اور جناب اشہری فرماتے ہیں کہ مرثیہ اُن کی طرح کسی نے عربی و فارسی میں بھی نہیں کہا۔ پھر بتلایئے قیدِ قافیہ کیا خرابی لاتی ہے۔

بہرطور پہلے بلینک ورس کی ضرورت اُردو میں ثابت کیجائے اور اُس کی ناگواری کو ہماری طبیعتوں سے دُور کرکے ہمیں اس سے مانوس بنایا جائے۔ تو پھر ہم کو نظمِ غیر مقفےٰ کہنے میں کیا عذر ہوسکتا ہے۔ نظم بلا قافیہ ہماری چیز نہیں ہے اگر اسوقت سے نام برآوردہ اشخاص نظم بلا قافیہ کہتے رہیں۔ بلا اس کے کہ اسی وقت سب کو متفق کرنے کی فکر کریں۔ تو آیندہ جب ہماری طبیعتیں اس سے مانوس ہوگئیں اور ہمارا توحش دُور ہوگیا اور اُس کی خوبی ہماری سمجھ میں آگئی۔ اور مقبولیتِ عام کا خلعت اُسکو ملگیا۔ اپنے آپ نظمِ غیر مقفےٰ کا رواج ہوجائیگا۔ اس وقت متفق بنانے کی کیوں فکر ہے۔ وقتِ ایجاد سب اُس سے موافق نہیں ہوا کرتے ہیں۔ آیندہ نسلوں کے مرغوبِ طبع اگر وہ ایجاد ہوتی ہو تو شائع

ہو جاتی ہے ورنہ نہیں۔

دیکھئے پیشتر عبارت مُقفّیٰ و پُرشوکت الفاظ کو لوگ بہت پسند کیا کرتے تھے مگر اُنہی زمانہ میں جناب غالب مرحوم نے خطوط روزمرّہ اُردو میں لکھنا شروع کئے وُہ بھی نہ بوجہ رغبتِ طبع بلکہ بمجبوری۔ چنانچہ خود اس رنگ کی عبارت کو بوجہ ضُعفِ قوائے جسمانی لکھنا ارشاد فرماتے ہیں۔ مگر اب وُہی رنگ عام پسند ہو گیا اور اس طرح کی عبارت کو حسن سمجھا جاتا ہے۔

بلینک ورس و نثر مرجز

بلینک ورس کا مترادف نثر مرجز کو جناب شمس العلماء مولانا حالی و جناب احسن و مولوی نجم الغنی صاحب تینوں اصحاب سمجھتے ہیں۔ اور وزنِ بحور کا ہونا بھی نثر مرجز میں تینوں بزرگوار تجویز فرماتے ہیں۔ مگر مولانا حالی صاحب اس کو از قسم نظم شمار کرتے ہیں اور باقی دونوں صاحب منجملہ اقسام نثر۔

اِن تینوں بزرگوں نے جو تعریف کہ نثر مرجز کی تسلیم کی ہے مجھے اُس سے اختلاف ہے۔ اِس وجہ سے بلینک ورس اور نثر مرجز میرے نزدیک ہم معنیٰ الفاظ نہیں۔ کیونکہ بلینک ورس کا انگریزی میں از قسم نظم ہونا میں ثابت کر چکا ہوں اور نثر مرجز از قسم نثر ہے۔ پس اُس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئے۔ کیونکہ کلام کی دو ہی قسمیں ہیں۔ ایک نظم اور دُوسرے نثر۔ جو کلام نظم ہے وہ نثر نہیں ہو سکتا اور جو کلام کہ نثر ہے وُہ نظم نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ دونوں دو متقابل چیزیں ہیں۔ نظم میں وزنِ بحور معتبر ہے اور نثر میں نہیں۔ لہٰذا جس کلام میں بحور ہو گا عام اس سے کہ اُس میں قافیہ ہو یا نہ ہو وُہ نثر نہیں کہا جا سکتا۔ مرجز کو نثر کہنا اور اُسکو از قسم نثر گننا خود دلیل اس امر کی ہے کہ اس میں وزنِ بحور نہ ہونا چاہئے ورنہ نثر کہنے کے کیا معنے ہونگے۔ اگر نظم و نثر میں فرق وزن بحور نہیں ہے تو ان دونوں میں

ما بہ الامتیاز پھر کونسی شئے ہے۔ کیونکہ قافیہ تو نثر میں بھی ہوتا ہے۔

میرے نزدیک جو لوگ کہ تعریف نثر مرجز میں وزن سے مراد وزن بحور لیتے ہیں غلطی کرتے ہیں۔ بلکہ یہاں وزن عروضی مراد ہے۔ چنانچہ عبد الرزاق یمینی مقدمات ظہوری میں تعریف نثر مرجز یوں تحریر فرماتے ہیں:۔

"در اصطلاحِ اہلِ انشا، مرجز کلامیست منثور کہ وزن دارد و سجع ندارد۔
ہمچوں۔ عزیزا! صرفِ اوقات بے فکر واہب کارساز۔ و خرچ
انفاس بجز ذکر قادر کردگار مضرتِ تمام و خسر کمال دارد"۔

اور فرہنگ اندراج میں لکھا ہے:۔

"مرجز بزائے معجمہ کمعظّم نوعے از شعر۔ و با صطلاح اہلِ انشا قسمے از سہ
اقسامِ نثر کہ مرجز و مسجّع و عاری است۔ پس مرجز نثرے باشد کہ
کلمات فقرتین اکثر جا ہا ہمہ ہموزنِ باشند متقابل یکدیگر بدونِ رعایت
سجع۔ مثال "خیالِ ناظم بے تعلق قامت دلربائے ناموزونست و
قیاسِ ناثر بے تمسک کاکل مومیائی نامربوط"۔

اور یہی مسلک مصنفین غیاث و انشا فیض رسان و احسن القواعد کا ہے۔ دیکھئے صرف و خرچ اوقات و انفاس۔ بے و بجز۔ فکر و ذکر۔ واہب و قادر۔ و کارساز و کردگار اور اسی طرح دوسری مثال میں الفاظ متقابلہ فقرتین میں وزنِ عروضی ہے اور قافیہ نہیں ہے اور فقرات اسلئے موزون بھی نہیں ہیں۔

تعریف فرہنگ اندراج میں نوعے از شعر سے مراد یہ نہیں ہے کہ نثر مرجز میں وزن بحور ہوتا ہے بلکہ لفظ مرجز بلا قید لفظ نثر کی نسبت کہتے ہیں کہ جو شعر بحر رجز میں ہو اُسکو مرجز کہتے ہیں۔ اور یہ معنی لغوی و وضعی بتلاتے ہیں۔ بعدہٗ معنی اصطلاحی نثر مرجز کو منجملہ سہ اقسام بتاکر اور لفظ فقرتین لاکر اور مثال کلام منثور سے دیکر واضح

کر دیا کہ نثر مرجز نثر ہے اور اس میں وزنِ بحور نہیں ہوتا ہے۔ نثر و نظم دونوں کا وجود ایک ہی عبارت میں ممکن نہیں۔ کیونکہ وزن ہی شعر کو نثر سے جدا کرتا ہے۔

شعر کی تعریف میں قید مقفّٰی اور نثر مرجز کی تعریف میں قید وزن نے بہتوں کو دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ جسکی وجہ سے تجویز وزن بحور بھی کرتے ہیں اور نثر بھی سمجھتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے انشاپردازانِ اُردو نے نظم بلا قافیہ کہی یہانتک کوئی مضائقہ نہیں لیکن اسکو نثر مرجز سمجھنا سخت غلطی ہے۔ اُس پر طرّہ یہ کیا کہ تقابل میں الفاظ فقرتین کے ہموزن بوزن عروضی لانے کو بھی ترک کر دیا جس کے بغیر نثر مرجز ہو ہی نہیں سکتی ہو۔

کوئی اُن سے پُوچھے کہ تعریفِ نثر مرجز میں کلمات فقرتین کے بتقابل ہموزن ہونے کے معنے کیا ہیں۔ اوّل تو لفظِ کلمات لانے کی کیا ضرورت تھی دُوسرے اگر وزن سے مراد وزنِ بحور ہے تو تقابل میں ہموزن کیوں کہا۔ اِس لئے کہ شعر کا دُوسرا مصرع متقابل پہلے مصرع کے ہموزن ہی ہوتا ہے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ پہلے مصرع سے دُوسرے مصرع کا وزن مختلف ہو۔

تینوں صاحبوں کی تعریفِ مسلّمہ نثر مرجز سے علاوہ مطالع کے (کیونکہ مطالع کے دونوں مصرعوں میں قافیہ ہوتا ہے) ہر شعر غزل۔ قصیدہ اور قطعہ کا نثر مرجز ہے اور کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ اور غزل و قصیدہ و قطعہ منجملہ اقسامِ نظم ہیں پس ایک ہی وقت میں نظم بھی ہوئے اور نثر بھی۔ اور یہ محال ہے۔

جناب مولوی نجم الغنی صاحب تو نثر مرجز میں وزنِ بحور مانتے ہیں اور فقرتین میں تقابل کا ہونا بھی ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ ان کی تعریف سے جب تقابل بھی نہ رہا تو پھر ہم ہر صنف نظم کو بلحاظ ہر مصرعِ نثر مرجز کہنے کے مستحق ہیں اور انہوں نے خود بھی آیات کے ایک ایک مصرعے لکھے ہیں اور انکو نثر مرجز فرمایا ہے۔

جب تعریف نثر مرجز میں آپ نے فرمایا کہ ہر فقرہ وزن رکھتا ہو اور قافیہ نہو اور

متقابلہ غیر ضروری ٹھہرا تو قافیہ ہونے یا نہ ہونے کا لحاظ کس چیز سے کیا جائیگا۔ اور تعریف نثر مرجز میں قید قافیہ نہ ہونے کی بیکار ہو جائیگی۔

تعریف شعر

اب سوال یہ امر کہ قید قافیہ حدِ شعر میں جیسا کہ بعض اساتذہ عروض نے تعریف شعر لکھی ہے۔ آیا تحقق نفس شعر میں قافیہ شرط ہے یا نہیں۔ اسبارہ میں محققین فنِ عروض کی یہی رائے ہے کہ تحقق نفس شعر قافیہ پر مبنی نہیں۔ بلکہ وہ ایک امر عارضی ہے۔ ورنہ تعریف شعر ناقص ہوگی۔ کیونکہ فرد یہ جو منجملہ اقسام شعر ہے صادق نہ آئیگی اور تعریف کو جامع و مانع ہونا چاہیے۔

محقق طوسی علیہ الرحمۃ نے معیار الاشعار میں شعر کی تعریف کلام موزون مخیل فرمائی ہے اور قافیہ کو داخل حدِ شعر نہیں مانا ہے۔ اور سکاکی نے بھی اسی قول کو مفتاح العلوم میں ترجیح دی ہے۔ ان محققین کے قول سے ہر وہ کلام کہ جس میں وزن بحور پایا جاتا ہو اور قافیہ چاہے ہو یا نہ ہو نظم ہی ہے۔ اس تعریف سے بلینک ورس یا نظم غیر مقفی داخل نظم ہے۔ مگر نثر مرجز کہ جس میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے داخل نظم نہیں ہو سکتی پس یہ ارشاد جناب حالی کا کہ بلینک ورس یا نظم غیر مقفی داخل نظم ہے بہت درست ہے مگر تعبیر بلینک ورس کی نثر مرجز کے ساتھ صحیح نہیں۔

"سجع موازنہ"

اگر الفاظ متقابلہ ہموزن بروزن عروضی ہیں وزن بحور بھی پایا جائے تو اُسے سجع موازنہ کہتے ہیں۔ چنانچہ سکاکی تلخیص المفتاح میں اور میر شمس الدین فقیر دہلوی حدائق البلاغت میں یوں ارشاد فرماتے ہیں۔ کہ کل الفاظ دو فقرہ نثر یا دو مصرع نظم کے برسبیل تقابل وزن میں متحد اور ردی میں مختلف لانے کو سجع موازنہ کہتے ہیں اور یہ بمنزلہ ترصیع ہے۔ سجع متوازی میں (یہاں بھی اتحاد وزن سے مراد وزن عروضی ہے۔ ورنہ ایک شعر کے دو مصرعوں میں متحد الوزن کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کیونکہ

ایک شعر کے دونوں مصرعے ہموزن ہی ہوا کرتے ہیں) جیسا کہ اللہ تعالیٰ قرآن مجید و فرقانِ حمید میں ارشاد فرماتا ہے وَآتَيْنَاهُمَا الْكِتَابَ الْمُسْتَبِينَ وَهَدَيْنَاهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ اور نظم میں یہ شعر حسان العجم خاقانی کا ہے

رشکِ نظمِ من خورد حسان ثابت را جگر   دستِ نثرِ من زند سحبان وائل را قفا

رشک کے مقابل میں دست اور نظم و نثر۔ خورد و زند۔ حسان و سحبان۔ ثابت و وائل۔ جگر و قفا باہم گر وزنِ عروضی رکھتے ہیں مگر ہم قافیہ نہیں ہیں اور آیت میں بھی یہی صورت ہے۔ پس نثر مرجز اور سجع موازنہ میں نسبت عموم خصوص من وجہ ہے۔ کیونکہ سجع موازنہ نثر اور نظم دونوں میں پائی جاتی ہے اور مرجز صرف نثر میں۔ میرے نزدیک مرجز کو نثر کہنا اور پھر اُسے نظم سمجھنا بڑی غلط فہمی ہے۔ نثر کا نظم نہ ہونا روزِ روشن کی طرح واضح ہے۔ کیونکہ مَیں نے اوپر ثابت کر دیا ہے کہ نثر مرجز بایں حیثیت کہ قسم نثر ہے اُس میں وزنِ بحور نہیں ہو سکتا اور یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ قافیہ کے بغیر بھی وجودِ شعر پایا جاتا ہے۔ اور قافیہ شعر کے لئے ایک امرِ عارضی ہے۔ نظم و نثر میں شے مابہ الامتیاز سوائے وزن بحور کوئی دوسری چیز نہیں۔

میرا خیال یہ ہے کہ بہ ادلّہ و براہین مَیں نے اِس امر کو ثابت کر دیا کہ کلامِ موزون غیر مقفّٰی داخلِ نظم ہے اور نثر مرجز سے خارج ہے۔

بیشک ورس اور نظم غیر مقفّٰی ہم معنی الفاظ ہیں۔ مگر بلینک ورس کا مترادف نہ سجع موازنہ ہے اور نہ نثر مرجز۔ سجع موازنہ میں کلماتِ متقابلہ کا ہموزن بروزنِ عروضی ہونا شرط ہے اور وزنِ بحور بھی پایا جاتا ہے اور بلینک ورس میں صرف وزن بحور ہوتا ہے اور نثر مرجز میں تقابل اور وزن شرط ہے اور وزن بحور ندارد۔ پس نثر مرجز اور بلینک ورس میں بڑا فرق ہے۔ اِس سے تو سجع موازنہ ہی قریب ہے۔

جب مَیں یہانتک لکھ چکا تو جہار شربت مرزا قتیل کی ملگئی اُنہوں نے یہ تعریف

اور مثال لکھی ہے۔

مرجز نثرے باشد کہ از قافیہ پاک بود۔ اما فقرہ اولے با فقرہ ثانی مساوی الوزن
باشد۔ مثال چشم کوکب مشتاق فیض از جمالِ پاک آں اختر شکرست۔
دست دولت محتاج خیر از عطائے عام آں دارا حشمت است۔

یہ بھی وزن سے مراد وزنِ عروضی لیتے ہیں۔ اور مثال نثر ہی لکھی ہے۔ امثلہ نثر مرجز کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وزن سے مراد۔ وزنِ حرفی مگر سجع موازنہ کی مثال میں جو شعر کہ خاقانی کا لایا گیا ہے۔ اس میں جگر کے مقابل وہموزن قفا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وزن عروضی معتبر ہے۔ خواہ وہ وزن عروضی ہوتا ہو۔ یا وزنِ حرفی۔ نثر مرجز میں وزن بحور نہیں ہوتا ہے۔

(باقی دارد)

شرح تعزیراتِ ہند۔ مرزا محبوب بیگ صاحب بی۔ اے۔ ایل۔ بی وکیل لاہور نے ایک بڑے کام کا تہیہ کیا ہے۔ جس میں امید ہے کہ وہ خاطر خواہ کامیابی حاصل کرینگے۔ تعزیرات ہند کی ایک ضخیم شرح اُردو میں وہ لکھ رہے ہیں۔ جو بارہ حصوں میں شایع ہوگی اور جس کا ہر حصہ ایک سو بیس صفحے سے کم نہ ہوگا۔ پہلا حصہ دسمبر ۱۹۱۱ء میں چھپا ہے اور اس میں اعلان کیا گیا ہے کہ باقی حصص یکے بعد دیگرے جلد جلد شائع ہوتے رہینگے۔ یہ کتاب باعتبار لکھائی چھپائی کے بہت اچھی چھپی ہے۔ اس کی قیمت فی حصہ ایک روپیہ رکھی گئی ہے۔ اور یہ وہی تدبیر ہے جس سے انگریزی میں لکھی ہوئی قانونی کتابیں عموماً بیچی جاتی ہیں۔ تاکہ یکمشت قیمت کا بوجھ خریداروں پر نہ پڑے۔ جہانتک حصہ اول سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ شرح باعتبار مطالب کے مفید ہے اور اس میں تمام ضروری فیصلے عدالہائے عالیہ کے دیئے گئے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ قانون پیشہ لوگوں کے لئے بہت کارآمد ہے اور دیگر شائقین بھی اس سے معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔ توقع ہے کہ قانون پیشہ اصحاب مرزا صاحب کی اس کوشش کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور ان کی حوصلہ افزائی کرینگے۔

ٹرکی کی مُسلمان عورتیں

ریورنڈ کینین سیل صاحب ڈی۔ ڈی کا یہ مضمون ایک سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے کہ انڈین ریویو میں پہلی دفعہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اکثر انگریزی پرچوں مثلاً دی انڈین سوشل ریفارمر وغیرہ نے اسکو نقل کیا۔ مَیں نے اسی زمانہ میں ان حضرات کی دلچسپی کے لئے جو انگریزی سے ناواقف ہیں اس کا ترجمہ کیا تھا مگر اس وقت تک اس کے شائع کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ اب ناظرینِ مخزن کی خدمت میں حاضر ہے۔

جن لوگوں نے ٹرکی اور ہندوستان دونوں ممالک کی سیاحت کی ہے۔ وُہ ہندوستان کے مقابلہ میں ترکی مسلمان عورتوں کی آزادی دیکھکر سخت متحیر ہوتے ہیں۔ وہاں کی عورتیں ہندوستان کی طرح مدت العمر زنانہ کی چار دیواری میں محدود نہیں ہوتیں اور نہ دُنیاوی زندگی اور مناظرِ قدرت کے دیکھنے سے محروم۔ ٹرکی میں مُسلمان عورتیں سب مُسلمان عورتوں کی طرح بڑے بڑے شخصی اور قانونی حقوق رکھتی ہیں۔ بحیثیت بیوی کے مُسلمان عورت اپنی جائداد پر بلا شرکتِ غیرے قابض رہتی ہے اور اپنی املاک پر آزادانہ اختیارات رکھتی ہے۔ بلا شوہر کی شراکت و امداد کے وُہ مدعی یا مدعی علیہ بن سکتی ہے۔ وُہ جائداد کی وارث ہوسکتی ہے اور اپنی پرورش اور نان و نفقہ کے مناسب انتظام کے مطالبہ کا اپنے شوہر پر پورا حق رکھتی ہے۔ اسی طرح اور بہت سی باتوں میں بلحاظ قانونی حقوق کے وُہ دُوسری اقوام کی عورتوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔ لیکن باوجود ان آسانیوں کے اِن عورتوں کی مجموعی حالت نظامِ تمدن پر ایک بدنما داغ ہے۔ اس کے اسباب کوئی ناقابلِ علاج نہیں ہیں۔ حرم کی پابندیاں اور زنانہ کی سختیاں کسی شرعی تعلیم کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم و رواج اور تعصب و بدگمانیوں کی بدولت ہیں۔ لہٰذا ضرورت

ہو کہ سمجھدار اور باخبر ترک بہت جلد اس کی اصلاح پر کمر باندھیں اور ترقی کے دلدادہ مسلمان دوسرے مقامات پر بھی اس ضروری تغیر و تبدل سے غافل نہ رہیں۔

ترکوں میں مانوگیمی یعنی وحدت الازدواج کا عام قاعدہ ہے۔ اُمرا میں صرف چند ہی ایسے ہیں جنھوں نے اپنی پہلی بیوی پر دوسری اور تیسری یا چوتھی بیوی کا اضافہ کیا ہو۔ طلاق اگرچہ چنداں ناممکن الحصول نہیں تاہم بہت ہی کم رائج ہے۔

متمول لوگوں کے مکانات دو حصوں میں منقسم ہیں۔ یعنی (۱) سلاملق مردانہ اور (۲) حرم یا زنانہ۔ حرم عموماً عمارت کا نہایت پاکیزہ اور بہت آرام دہ حصہ ہوتا ہے۔ وہاں صرف وہ مرد جا سکتے ہیں جو عورتوں سے کوئی رشتہ رکھتے ہوں جیسے باپ بیٹے۔ بھائی۔ خسر وغیرہ۔ اس قاعدہ کی کوئی بہت سختی کے ساتھ پابندی نہیں کیجاتی اور خصوصاً نوجوان ترک جماعت (ینگ ٹرکش پارٹی) کے اراکین میں جو ٹرکی کے اعلیٰ تعلیم و ترقی یافتہ مسلمان ہیں۔ بہت دور کے عزیزوں اور بلکہ شوہر کے ذاتی دوستوں کو بھی گھر کی خواتین کی سوسائٹی میں شریک ہونے کا موقع دیا جاتا ہے۔

ٹرکی کی عورتیں بڑی مہربان مائیں ہوتی ہیں۔ محبت و اُلفتِ مادری ان میں بہت ہوتی ہے۔ لیکن یہ اکثر اپنے بچوں کے ساتھ بیجا نازبرداریوں اور لاڈ اور پیار کی بھی عادی ہوتی ہیں۔ اسی طرح لڑکے اپنی ماں کے ساتھ بیحد محبت کرتے ہیں اور اپنی ماؤں کے بڑے ہی دلدادہ ہوتے ہیں۔ انکے اس طرزِ عمل کی اصلی محرک پیغمبر اسلام کی مشہور حدیث ہے اَلْجَنَّةُ تَحْتَ اَقْدَامِ اُمَّھَاتِکُمْ یعنی بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے۔

جب کوئی ماں اپنے شادی شدہ فرزند کے ساتھ رہتی ہے تو گھر پر اسی کی حکومت ہوتی ہے۔ بہو کا درجہ بالکل ماتحتانہ ہوتا ہے اور اس کے رسم و رواج کے سانچے میں

ڈھلی ہوئی پابندیاں بڑی ہی تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ ان مصائب کو وُہ بیچاری صرف اس دلخوش کن خیال میں برداشت کرجاتی ہے کہ آخر ایک روز اُسے بھی اپنی بہو پر یہی فرمانروایانہ اقتدار حاصل ہونگے۔ آئے دن کے دُکھ اور تکلیفوں میں محض آیندہ کی خوشگوار اُمیدیں اسکے لئے بہت کچھ تسلی و دلاسا کا باعث ہوتی ہیں۔

تُرکوں کی خانگی زندگی میں لونڈیوں کی کثرت ایک بہت بڑا نقص ہے۔ شرعی لحاظ سے غلامی کے لئے اسیرانِ جنگ کا ہونا شرط ہے۔ قسطنطنیہ میں بردہ فروشی کی دُکانیں بند کردی گئی ہیں۔ اور عام طور پر اس کی قطعی ممانعت ہوگئی ہے۔ لیکن خفیہ طور پر ابھی اس کا رواج باقی ہے۔ چھ سے دس سال تک کی عُمر کے بچے خریدے جاتے ہیں۔ جن میں کچھ بھی استعداد و قابلیت کے آثار معلوم ہوتے ہیں۔ اُنکی بڑی ہی پرداخت ہوتی ہے۔ اعلیٰ درجہ کی تربیت سے ان کو بہت باکمال اور شائستہ بنانے کی کوشش کیجاتی ہے۔ ان کے طرز و انداز میں دلکشی اور دلفریبی پیدا کرائی جاتی ہے۔ غرض انہیں ہر طرح اعلیٰ درجہ کی زندگی بسر کرنے کے قابل بنایا جاتا ہے۔ اس قسم کی لڑکیاں بڑی بڑی قیمت پر فروخت ہوتی ہیں۔ اگر کوئی بہت غیر معمُولی خوبصُورت اور نہایت حسین لڑکی ہو تو سلطان کے حضور میں پیش کی جاتی ہے۔ سُلطان بھی اگر اپنے افسرانِ اعلیٰ میں سے کسی کو اس عزت افزائی سے مفتخر فرمانا چاہیں تو حرم سرا میں سے کوئی کنیز مرحمت فرماتے ہیں۔ اگر کوئی باپ اپنے لڑکے کی شادی کسی ایسی لڑکی سے جو اس کی ہمپایہ ہو کرنے کے کثیر اخراجات نہ برداشت کرسکتا ہو تو وُہ اپنے فرزند کے لئے ایک کنیزک جو کسی متموّل خاندان کے زیرِ تربیت رہی ہو خریدتا ہے۔ اس کی اولاد جائز تصوّر کیجاتی ہے اور اولاد ہوجانے کے بعد وُہ بیچی نہیں جاسکتی۔ اکثر اوقات وُہ آزاد کردی جاتی ہے اور اس سے شادی کرلی جاتی ہے۔ وُہ اسوقت آزاد ترکی عورتوں کی ہم رُتبہ بنجاتی ہے اور اس کے تمام شخصی حقوق قائم ہوجاتے

ہیں۔ اکثر وفعہ انکی قسمت زوردار ثابت ہوتی ہے ۔لیکن اس طرح کی خانگی غلامی کا معاشرت پر بہت بڑا اثر ہوتا ہے اور عورت ذات کو اس کے حقیقی درجہ اور اصلی منزلت سے گھٹا دیتا ہے۔

حرم کی چپ چاپ زندگی میں سب سے بڑی ہلچل اس وقت واقع ہوتی ہے جب کسی لڑکے کی شادی کا وقت قریب آتا ہے اور اُس کے لئے ایک پسندیدہ لڑکی کی فکر ہوتی ہے ۔اگر ماں کی نظر میں رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کے زمرہ میں کوئی موزوں دلہن نہ نکلے تو آخر کار دوسری جگہ اس کی تلاش کی ضرورت ہوتی ہے مختلف طریقوں سے اس کے پاس ایسی ناکتخدا لڑکیوں کے نام پیش ہوتے ہیں جو اس کے لڑکے کی بیوی بننے کے لائق ہوں ۔ پھر وُہ کسی پیشہ ور مشاطہ کو ہمراہ لیکر ان لڑکیوں کے مکانات پر جاتی ہے ۔ہر جگہ صاحب خانہ بڑے ہی آؤ بھگت کے ساتھ حرم کے خاص ملاقاتی کمرہ میں اس سے ملتی ہے ۔ اس کے بعد لڑکی بہت عمدہ پوشاک زیب بدن کرکے اور خوب بناؤ سنگار کرکے وہاں آتی ہے ۔ ان نئے مہمانوں سے بادب ملتی ہے اور قہوہ سے ان سب کی تواضع کرتی ہے ۔ اپنے آپ کو ایک پسندیدہ ۔خوش اسلوب اور دلکش انداز میں بتلانے کے بعد وُہ چلی جاتی ہے ۔نئے ملاقاتی ماں سے اس کی لڑکی کی بڑے ہی مبالغہ کے ساتھ تعریف کرکے رخصت ہوتے ہیں۔ اسی طرح تمام لڑکیوں کے مکانات کو جانے اور ان سبھوں کو دیکھ چکنے کے بعد ان کے حُسن و قبح ۔ ان کے صفات اور انکی دلفریبیوں کا مقابلہ کیا جاتا ہے ۔اس پر بحث ہوتی ہے اور آخر کار باتفاق رائے ایک لڑکی کی نسبت رائے قائم کی جاتی ہے ۔ ضروری بات چیت اور قول و قرار کے بعد کسی مناسب وقت پر شادی ہو جاتی ہے ۔

روزانہ زندگی کی یکسانیت میں دوسرا تغیر حمام کو جانا ہے۔ حمام فی الاصل ایک طرح

کا عورتوں کا کلب ہے جہاں نئی نئی ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ دُنیا کی خبریں معلوم ہوتی ہیں اور ادھر اُدھر کی گپ شپ میں بہت خوش گوار طریقہ سے وقت گذارا جاتا ہے۔ بعض خانگی مراسم سے وابستہ چند مذہبی غسل ہیں جو عموماً حمام میں کیے جاتے ہیں وہاں کی خواتین کا عام قاعدہ ہے کہ دوستوں کے زمرہ میں بڑی ہی مسرت و شادمانی کے ساتھ اکثر دن دن بھر حمام میں گذارتی ہیں۔ شوہر کی اجازت سے عورتیں ہوا خوری یا خرید فروخت کے لئے باہر جا سکتی ہیں۔ نواحِ قسطنطنیہ میں باسفورس کے کنارے۔ بعض مقامات ایسے دلکش۔ خوشنما۔ پُرلطف اور دلاویز ہیں۔ اور شہر کے قریب بعض ایسے خاموش پُرفضا سبزہ زار اور زندگی بخش تفرج گاہ ہیں۔ جنکو عورتیں بہت پسند کرتی ہیں۔ ان جگہوں پر ایک روز بسر کرنا بڑے ہی لطف و شادمانی کا باعث ہوتا ہے۔ سودا مول لینا بھی ایک طرح کی تفریح ہے۔ امیروں میں یہ عام قاعدہ ہے۔ کہ حبشی خواجہ سرا ہمیشہ بحیثیت ملازم خاص اور محافظ کے بیگمات کے ہمراہ رہتے ہیں۔ سلطانی حرم کی بیگمات کے ہمراہ رکاب اسی طرح کے خواجہ سرا بہت زرق برق وردیوں میں ہمیشہ ہوتے ہیں۔ جو خواتین اس طرح باہر نکلتی ہیں وہ ایک ریشمی اوڑھنی اور ایک باریک گاج کا نقاب استعمال کرتی ہیں[1] یا جیسا کہ آجکل بہت زیادہ رواج ہے۔ ایک "چارشف" ہوتا ہے۔ اس کے دو ریشمی دامن ہوتے ہیں۔ ان میں سے چھوٹے کو سر پر ڈال کر ٹھوڑی کے نیچے باندھ لیا جاتا ہے۔ ریشم یا ململ کا ایک مربع ٹکڑا چہرہ پر آویزاں رہتا ہے۔ جس سے صورت چھپ جاتی ہے۔ بعض اوقات اسے پیچھے کی طرف بھی ڈال لیا جاتا ہے۔

حرمِ سلطانی میں کئی سو عورتیں ہیں۔ خاص قوانین و قواعد کے مطابق

---

[1] دستوری حکومت کے بعد سے یہ رسم بھی اٹھا دی گئی۔ ترکی مسلمان خواتین اب بلا کسی نقاب کے باہر نکلتی ہیں۔ (مترجم)

وہاں کاروبار چلتے ہیں۔ فرمانروا سُلطان کی والدہ جو والدہ سُلطانہ کہلاتی ہے حرم کی سردار ہوتی ہے۔ حرم کے اندر رہنے والوں پر یہ پُوری حکومت کرتی ہے۔ اس کے بعد ولیعہد کی بیوی کا درجہ ہے۔ ہر خاص خاتون کے لیے اس کے علیحدہ ملازم اور اس کا علیحدہ حصّہ مکان ہوتا ہے۔ والدہ سُلطانہ کو نئے حکمران کے تخت نشین ہونے پر اس کی والدہ کو اپنی خدمت سپرد کردینی پڑتی ہے۔ اِسی طرح پچھلے فرمانروا کی تمام خواتین نئے حکمران کی خاتونوں کو اپنی جگہ دیتی ہیں۔

والدہ سُلطانہ کو اس کی بھاری خدمتوں میں بارہ خواتین سے مدد ملتی ہے ان کے فرائض میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ حرم سرا کے چھوٹے چھوٹے کاموں میں اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے دُوسروں کی تربیت کریں۔ یہ اکثر کنیزیں ہوتی ہیں جو بالکل کمسنی میں خرید لی جاتی ہیں۔ خود مددگار عورتیں بھی عموماً وُہ کنیزیں ہوتی ہیں جو سُلطان کی توجّہ اپنی طرف معطوف نہ کرا سکی ہوں۔ اور جنہیں اب باہر شادی کرنے کی قطعی امید نہیں۔ مناسب پاسبانوں کی محافظت میں یہ عورتیں سیر و تفریح کے لیے باہر نکلتی ہیں۔ درگاہوں وغیرہ کی زیارت کرتی ہیں۔ بہر کیف ان کی زندگی بہت یکساں طریقہ سے بسر ہوتی ہے۔ اور اس میں ان کی دماغی ترقی کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔ جو وقت باہر جانے یا خانگی کاروبار میں صرف نہیں ہوتا۔ وُہ بالکل اپنے لباس و زیورات کی دیکھ بھال اور اسی طرح کی دُوسری ادنیٰ اور فضول باتوں میں گذرتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر درجہ کی عورتوں میں تعلیم کی بہت کمی ہے۔ پچھلے دِنوں اگرچہ لڑکیوں کے مدارس کی تعداد میں بہت کچھ اضافہ کیا گیا لیکن اس سے چنداں فائدہ نہ ہو سکا۔ کیونکہ لڑکیوں کو جلد مدرسے اُٹھا لینے کے باعث اُنکی تعلیم بہت ناقص رہ جاتی ہے۔

ٹرکی کی خانہ بدوش اقوام کی مُسلمان عورتیں جیسے کُرد میں زیادہ آزاد زندگی گذارتی ہیں۔ وُہ بڑی شہسوار ہوتی ہیں اور بڑی بڑی مہموں میں اپنے شوہروں کے ہمراہ رہتی ہیں۔ وُہ نہایت محنتی۔ مستعد اور چالاک ہوتی ہیں۔ اپنے خاندان اور اپنے قبیلہ کے معاشرتی اور سیاسی امور میں بہت کچھ حصّہ لیتی ہیں۔ وُہ کسی طرح کا نقاب وغیرہ نہیں استعمال کرتیں لیکن سفر کے وقت اپنے چہرہ کے کچھ ضروری حصّہ پر کپڑا ڈال لیتی ہیں۔ وُہ دُوسری مسلمان عورتوں کی نسبت بہت زیادہ آزادی سے متمتع ہوتی ہیں اور بیرونی دُنیا کو بہت کچھ دیکھتی بھالتی ہیں۔ لیکن اِس سے کوئی بُرا اثر ان میں نہیں پیدا ہُوا۔ بلکہ بخلاف اس کے اُن کی کھُلی ہُوئی کاروباری زندگی نے ان میں خود داری کا بہت بڑا مادّہ پیدا کر دیا ہے اور ان میں اخلاق کا ایک بہت اعلیٰ معیار قائم ہو گیا ہے۔ انہیں جو کچھ آزادی حاصل ہے اسے وہ نہایت عقلمندی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں اور اُنکے اطوار وخصائل اور اُنکی چال چلن میں بہ نسبت دُوسروں کے بہت کچھ درستگی۔ دانشمندی اور شائستگی ہے۔ بزرگترین اسلامی مُلک کی مُسلمان عورتوں کے متذکرہ بالا کیفیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کی حالت میں ابھی بہت کچھ اصلاح کی ضرورت باقی ہے۔ تاہم وُہ ہندوستان کی مُسلمان عورتوں سے بدرجہا اچھّی حالت میں ہیں۔ اس بارے میں بہت ہوشیاری اور خبرداری کے ساتھ اصلاح کی ضرورت ہے۔ اگر بہشت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے" تو پھر کس قدر ضروری اور اہم بات ہے کہ ماں جسمانی لحاظ سے مضبوط و قوی۔ دماغی لحاظ سے ذی ہوش۔ سنجیدہ اور فہیم۔ اپنے گھر اور خاندان کے انتظام میں ہوشیار اور کافی دستگاہ رکھنے والی ہو۔ اس کے دماغی حدود بہت وسیع کئے جانے چاہئیں۔

سیّد خورشید علی (حیدرآباد۔ دکن)

لکھنؤ کا شاہی زمانہ

شاہی زمانہ کچھ اسی لحاظ سے قابلِ قدر نہ تھا کہ اس کے دور میں غلّے کی انتہائی برکت کی فراوانی پیداوار کی کثرت اور شاہی فیاضیوں سے لوگ خوشحال اور فارغ البال تھے کیونکہ ایک لحاظ سے اگر خیال کیجئے تو روزمرہ کی فوجداریاں اور بانکوں کی تیغ زنی شہزوروں کی ڈاکہ زنی، مارپیٹ دھینگا مشتی نوچ کھسوٹ ذرا ذرا سی بات پہ خون کی ندیاں بہانا چوریاں ڈاکہ زنی چھاپے مارنا گرہ کاٹ لینا گھر لوٹ لینا دن دہاڑے لٹیا ڈوگی یہ سب خرابیاں ایسی تھیں جنکا ذکر سنکر رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔

پھر محکمۂ عدالت کی بدعنوانیاں مقدمے کی سماعت نہ ہونا سفارشوں کا لحاظ کرنا پولیس کی بے وقعتی اور سونے میں سہاگہ تھی۔

گلباز خاں شاہی چور جو ہمیشہ اپنی بدکرداریوں سے جیل خانے میں رہا کرتا تھا۔ اور آخر کو اس کی شناخت کے لئے شاہی حکم سے اس کے دونوں گال پیلال کرکے داغ دیئے گئے تھے مگر اللہ رے چوری اور سینہ زوری ایسی دھاک بندھی ہوئی تھی کہ جب مہاجن سے کہلا بھیجا کہ ہم کو دس ہزار روپیہ کی ضرورت ہے۔ اُس نے ہاتھ باندھکر روپیہ حاضر کر دیا اور جو کچھ چین چپڑ کی پہلو بدلے ناک بھوں چڑھائی دون کی لی روپیہ تو اسوقت تیار نہیں ہے کل منیب جی آئیں تو لے لینا آج جنم اشٹمی ہے۔ دو چار ہنڈیاں سکارنا ہیں ابھی اننت چودس تک تو ہم روپیہ نہیں دے سکتے۔ بڑے لالہ تیرتھ گئے ہیں۔ تو سمجھ لیجئے کہ شاہ جی کی شامت آگئی۔ بیٹھے بٹھائے عذاب مول لیا۔ رات کو دندناتے ہوئے آدھمکے۔ نہ کہیں پولیس ہے نہ روندہے۔ شاہ جی کے ہاتھ پاؤں کھٹیا سے باندھ دیئے اور توڑی چھاتی پر رکھدیا اور گڑی ہوئی دھن دولت پوچھ پوچھ کر کھود کھدوا کر باندھ لی اور

چمپت ہوئے۔ مزے ہونے لگے۔ کچھ یار دوستوں میں بانٹی کچھ محلے کے غریب غربا کو دی کنباری کی شادی کرادی۔ اگرچہ حرام کی کمائی تھی لیکن اس کا مصرف نیک کاموں میں ہوا۔

گلباز کو لوگ میر صاحب میر صاحب کہتے تھے محلے بھر کے لوگ اُن سے خوش تھے محلے میں یہ سب ہے۔ کبھی کسی پسنہاری کے یہاں بھی ایک جھاڑو کی چوری نہ ہوئی تھی۔

اپنے کمال میں ایسے فرد تھے کہ چو منزلے پر چشم زدن میں چڑھ جانا انکے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ میر صاحب سے انکے دوست نے پوچھا کہ آجتک تمہارا کسی بہادر سے بھی سامنا ہوا ہے۔ کہنے لگے جان ایسی بُری ہے کہ تلوار کی آنچ کے سامنے لوگ آتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بڑے بڑے سورما وقت پر دبک جاتے ہیں لیکن اس بارے میں ہم ایک عورت ذات کی بہادری کا ذکر نہ کرنا حق پوشی سمجھتے ہیں جس نے ہم ایسے دس بہادروں کو زیر کرلیا تھا۔

محمد علی شاہ کا زمانہ تھا ہمارا آغازِ شباب اور ہمارے ساتھ دس شاگرد پیشہ جیسا سورما سپہگری کے فن میں ہوشیار سوقت ہماری نگر میں آدمی کی وقعت ایک مچھر سے زیادہ نہ تھی

ایک روز خبر ملی کہ ندگاہ کے قریب حکیم شیدعلی کے مکان میں دہلی کی ایک بیگم بہت مالدار آئی ہوئی ہیں۔ ہم نے اپنے دستور کے موافق اپنے ایک شاگرد سے کہلا بھیجا اگر لکھنؤ میں رہنا ہے تو ہمارا حق پہلے دیدو۔ بیگم صاحب نے کہا کہ میر صاحب کی شہرت میں سُن چکی ہوں اور دو ہزار روپیہ انکی نذر کرنے کو رکھا ہے مگر تم کو نہ دونگی تم انہیں کو بھیجدو۔

بیگم صاحب نے تو درحقیقت یہ بات سچے دل سے کہی تھی مگر چھد کا دل کتنا ہوتا ہے۔ ہمارے شاگرد کو اس ملال میں کچھ کالا معلوم ہوا۔

آٹھ روز ٹال کر ہم دسوں آدمی مسلح ہو کر بیگم صاحب کے مکان پر پہنچے ایک

شاگرد نے کہا آپ لوگوں کے اندر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔
میں جاکر جو کچھ پونجی ہے سب سمیٹ لاتا ہوں۔ رات کے دو بجے ہونگے
کہ یہ مکان کی دیوار پر چڑھ کر دھڑدانہ کود پڑا۔
اتفاق سے بیگم صاحب اس وقت پیشاب کی ضرورت سے اُٹھی تھیں دردا
لونڈی ایک ہاتھ میں شمع اور دوسرے ہاتھ میں لوٹا لئے ہوئے ساتھ تھی۔ دھماکے
کی آواز سنکر جو لونڈی نے آدمی کو دیکھا تو دُہ دُہائی کہکر بیہوش ہوگئی۔ بیگم صاحب
نے لوٹا پکڑ لیا۔ بیگم صاحب کے گھر بھر میں مرد کا نام نہ تھا۔ مامائیں اصیلیں اپنے اپنے
کونے میں دبکے ہیں لیکن بیگم صاحب نے نہایت استقلال سے کہا کون؟ ہمارے
شاگرد نے جواب دیا ہم ہیں۔ کہا کیوں قضا نے گھیرا ہے جا سیدھا پلٹ جا۔
اس نے کہا سیدھی طرح سے اپنا زیور اُتار کر رکھدو اور روپیہ کا صندوقچہ حوالے کرو
نہیں تو تمہاری قضا پھر پھرا رہی ہے۔
بیگم صاحب نے کہا اچھا تو اپنا وار کر۔ ہمارے دم میں جب تک دم ہے
ایک پیسہ نہ دینگے۔ شاگرد نے پہلے تو دھمکایا۔ تلوار میان سے کھینچکر اُٹھائی مگر
یہ بھی پھکیت نکلی اور پینترا بدل کر ڈٹ گئی اور کہا ہاں دیکھوں تو سہی تو کیسا تلوا
ہے۔ اُس نے ایک ہاتھ بھرپور مارا بیگم نے لوٹے پر روک لیا۔ اسی طرح اُس نے
کئی ہاتھ مارے بیگم سب خالی دیگئی۔ اتنی دیر میں پھرتی سے بیگم نے اپنا ریشمی رومال
جو گلے میں بندھا تھا کھولا۔ ایک موٹا پیسا ازار بند سے کھول کر اُس کے کونے میں
باندھ خوب بل دیئے اور ہنکٹی بچا کر وہی رومال گردن پر کھینچ مارا جس کی چوٹ
سے یہ غش کھا کر گر پڑا۔ جب اسکو بہت دیر ہوگئی تو ہم میں سے دوسرا آدمی کود
گیا اور اُس نے جو اپنے ساتھی کو مرا ہوا پایا تو نہایت غصے میں بیگم پر تلوار کے
ہاتھ لگائے مگر وہ بھی ایسی ماہر فن تھی کہ سب ہاتھ لوٹے پر روکے اور جب اپنی باری آئی

تو گھما کر وہی رومال مارا کہ وہ بھی غش کھا کر گر پڑا۔ یکے بعد دیگرے ہمارے سب آدمی کام آ گئے تو گھبرا کر ہم خود کود پڑے۔ مکان کو گنج شہیداں دیکھ کر ہماری آنکھوں میں خون اتر آیا اور بیگم پر بہت خشمناک حالت میں ہم نے حملہ کرنا چاہا لیکن اُنکے کہا میر صاحب! تم ایک نامی اُستاد ہو۔ میں تم سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتی اور نہ اس میں میرا رتی بھر قصور تھا۔ میں نے تمہارے لئے دو ہزار روپیہ الگ رکھا تھا لیکن تمہارے شاگرد کی حماقت سے یہ نوبت پہنچی۔ ہم نے کہا اب تو جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میرے قوت بازو تو بہادر سپاہی تو نے مار ڈالے اب اس کے بعد زندگی کا کچھ مزا نہیں اور بہادر کے ہاتھ سے مرنا میں اپنے لئے بہتر سمجھتا ہوں۔ میں عورت پر کیا ہاتھ اُٹھاؤں تو ہی پہل کر۔ بیگم نے کہا میر صاحب! تم خاطر جمع رکھو یہ سب زندہ ہیں مرے نہیں ہیں۔ انکو ابھی اچھا کئے دیتی ہوں۔ لیکن اس شرط سے کہ یہ سب ننگے سر اور ننگے پاؤں میرے گھر سے جائیں اور صبح کو اپنا جوتا اور ٹوپی لینے آئیں۔ میں نے طوعاً و کرہاً اس شرط کو منظور کر لیا۔ اُس نے ہر ایک کی گردن آہستہ سے ہلائی وہ ہوشیار ہو کر اُٹھ بیٹھا۔ جب اس طریق عمل سے سب اچھے ہو گئے تو میں نے کہا جس طرح تم نے ان سب کو بیہوش کیا۔ ایسا ہی ایک ہاتھ مجھ پر بھی مارو اس نے میرے لحاظ کی وجہ سے بہت پس و پیش کیا۔ جب میرا اصرار بڑھ گیا تو وہ رومال مجھ کو بھی رسید کیا۔ میں بھی بیہوش ہو کر گر پڑا۔ اُسی وقت میری گردن بیگم نے ہلائی۔ میں اچھا ہو گیا۔ جب ہم سب جانے لگے تو اُس نے دو ہزار روپیہ ہماری نذر کیا۔ ہم نے کہا اب ہم روپیہ نہیں لے سکتے اور نہ تمہارے یہاں آج سے کوئی آئیگا۔ تم چین سے پاؤں پھیلا کر سویا کرو۔ جہاں پر اُس نے پیسہ مارا تھا اُس دن سے آجتک وہاں درد ہوتا ہے۔ ہم نے تو اس عورت کے مقابلے میں کسی مرد کو بھی نہیں پایا۔

یہ حال تو چوری اور سینہ زوری کا تھا۔ چوک میں روزہ دو ایک سے بات بات پر تلوار چل جاتی تھی۔ ہر ایک بانکے کے پاس دو تلواریں ہوتی تھیں۔ ایک ہاتھ میں ایک پرتلے میں ذرا سی چشمک پر چخاچخ اور شپاشپ چلنے لگی۔

اِن سب باتوں پر بھی لوگ شاہی زمانے کے معترف نظر آتے ہیں تو آخر وُہ کون سی بات تھی جس سے اس زمانے کی اسقدر عزّت ہے۔ بات یہ ہے کہ شاذونادر واقع تو ہر زمانے میں ہوا کرتے ہیں لیکن عام طور پر شاہی زمانے کی سوسائٹی پر نظر دوڑائی جائے اور اگلے لوگوں کے طرز معاشرت پر غور کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ اُس زمانے اور اس زمانے کے لوگوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اس وقت کے لوگ اپنی تن پروری اور عُمدہ اچھی پوشاک اور دولتمندی کو انتہائی امارت سمجھتے ہیں اور اُس زمانے کے لوگ اپنی دولت کو کُنبہ پروری اور نیکنامی کی غرض سے صرف کرنے کو ریاست سمجھتے تھے۔ وضعداری کو اپنا جوہر سمجھتے تھے۔

یہ بات طے شدہ ہے کہ سلطنت کیسی ہی عادل اور منصف مزاج نیکدل رحیم کیوں نہ ہو۔ لیکن اگر رعیّت کا طرز معاشرت خراب ہے تو سلطنت کو قانون کی کل اسی رُخ پر پھیرنا پڑتی ہے۔ اور اگر سلطنت کے افعال ناشائستہ قانون ناقابل عمل ہیں مگر رعیت کی طرز معاشرت عُمدہ اور شریفانہ ہے تو سلطنت کو وُہی رنگ اختیار کرنا ہوگا۔

یہ قانونِ قدرت ہی کہ جیسا طرز معاشرت مجموعتہً لوگوں کا ہوتا ہے اُسی کے مناسب حال گورنمنٹ کو قانون بنانا پڑتا ہے تمام دُنیا کی مخلوقات پر ایک قانون نافذ نہیں ہوسکتا۔

شاہی قانون کا سبک اور برائے نام نفاذ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ لوگ

عام طریق پر شریف نیک چلن ایماندار اور خوش اخلاق تھے غلہ ارزاں تھا شہر میں امن برستا تھا۔ روپے پیسے کی طرف سے لوگوں کو بیفکری تھی لباس پوشاک اور کھانے پینے میں بہت تکلفات نہ تھے۔ چور اُچکے بدمعاش بھی اپنی کمائی نیک کام میں صرف کرتے تھے۔ بنی جان طوائف نے پچاس ہزار روپیہ خرچ کرکے چوک میں امام باڑہ بنوا دیا جو آجتک موجود ہے۔ عباسی جان گوہر جان کے امام باڑے دیکھ کر لوگوں کو یہ گمان ہوتا ہے کہ اُنکی ساری کمائیاں شہر کی آبادی برقرار رکھنے کے لئے صرف ہوتی تھیں۔

دہلی کے ایک بزرگ عمدۃ الملک اسلام خان مشہدی وزیر شاہجہان کے پڑوتے سید حیدر حسین صاحب بھی اسوقت لکھنؤ میں موجود ہیں۔ تخمیناً اسّی برس کا سن شریف ہے۔ آپ بُرہان علی خاں جلاوت جنگ کے نواسے ہیں۔ قدیم مکان نیل کے کٹرے میں تھا۔ واجد علی شاہ آخری شاہ اودھ کے آغاز حکومت میں بیس روپیہ کی کرائے کی بہل کرکے پندرہ روز میں لکھنؤ آئے۔ فرماتے ہیں کہ اسوقت کے لکھنؤ کا کیا پوچھنا۔ شہر رشک جنت بنا ہوا تھا۔ لکھنؤ بھر میں کہیں سڑک کا نام نہیں۔ دو طرفہ سر بفلک عمارتیں۔ عالی شان مکانات۔ تپلی تپلی گلیوں میں دو طرفہ دوکانیں مینا بازار سے چینی بازار تک دوکانوں میں ہر طرح کے تاجر پیشہ جا بجا ناچ رنگ کے جلسے ہو رہے تھے۔ قیصر باغ کی برجیوں پر سنہری کلس چڑھائے جاتے لوگ عموماً متواضع با اخلاق تھے اسی طرح اور لکھنؤ کے شاہی زمانہ دیکھنے والے بڈھے قدیم طرز معاشرت کا ذکر کرکے آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شاہی زمانہ ایک خواب تھا جسکا سماں آنکھوں میں اب تک بندھا ہوا ہے۔ آہ کیا کیا لوگ تھے۔ شاہی عملے میں شرفا اہلکار تھے۔ کسی نیچ قوم کو سرکاری ملازمت کا مُنھ نہیں ملتا تھا۔ ایک کماتا تھا دس کھاتے تھے۔ اناج سستا تھا۔ غریب سے

غریب آدمی کے یہاں دو چار مہمان بنے رہتے تھے ذرا ذرا سی بات پر نالش نالشی نہ ہوتی۔ سرکار دربار میں جاتے ہوئے لوگ ہچکچاتے تھے۔ بڑے بڑے معاملے آپس میں فیصلہ ہو جاتے تھے۔ اس قدر خود غرضی کا بازار گرم نہ تھا۔ اگلے وضعداروں میں پنڈت دولارام کشمیری شاہی میں بانگرمو کے چکلہ دار تھے۔ مزاج میں خیر تھی ایک بارہ دری اپنے نام سے بنوائی۔ وسعت اور خوبصورتی میں اسکے ساتھ کی ایک تھی۔ اسکو تمام شہر کی حاجت روائی کیواسطے وقف کر دیا تھا۔ بیاہ شادی یا اور کسی تقریب یا غمی کی مجلس کیلئے جسکو ضرورت ہوئی اطلاع کر دی اور صاحب خانہ نے دری چاندنی تگیری قنات جھاڑ کنول۔ مردنگیں دیوارگیریاں دنگل قالین سے آراستہ کر دیا۔ زیادہ ضرورت ہوئی دیگیں اور خوان پوش وغیرہ بھی موجود۔ یہ سب سامان بارہ دری کے کوٹھے پر مستعد رہتا تھا۔

اسی طرح تمام عمال سرکاری کی فیاضی اور سخاوت کا حال تھا۔ بادشاہ سے لیکر فقیر تک خوش نیت مخیر اور نیکی کیطرف راغب تھا۔

مشہدے سال بھر بھیک مانگ کر جو روپیہ جمع کرتے وہ یوم عاشورہ سید الشہدا کی مجلس میں لٹا دیتے۔

مہاراجہ ٹکیت رائے نے جس قدر دولت کمائی معہ تنخواہ کے سب تالاب کنوئیں اور مسجدیں اور مندروں کی تعمیر میں صرف کر دی۔ آپ ہمیشہ سادہ لباس اور سادہ وضع سے بسر کی۔ شاہی زمانے کو جو لوگ ابتک یاد کر رہے ہیں وہ محض اگلے لوگوں کے اخلاق تواضع بردباری نیک چلنی وضعداری اور ملک کی مجموعی حالت اور شریفانہ برتاؤ کا ماتم کرتے ہیں اور یہ تو اسوقت تک رونا رہیگا جب تک ہم اپنی حالت کو نہ بدلینگے درحقیقت یہ ہماری بداخلاقیوں کا رونا ہے ❖

خواجہ محمد عبدالرؤف عشرت لکھنوی

وقت

سینکا (Seneca) کا قول ہے کہ ہم سب کمی وقت کی شکایت کرتے ہیں اور باوجود اس امر کے ہم کو اس سے جس قدر کہ ہم کو معلوم ہے بہت کچھ زیادہ انجام دینا ہو وہ بیان کرتا ہے کہ ہماری زندگیاں یا تو بالکل کچھ کام نہ کرنے۔ یا کسی کام کی بات نہ کرنے یا ایسے کام کے کرنے میں جو ہم کو نہیں کرنا چاہئے صرف ہوتی ہیں۔ ہم ہمیشہ اس امر کے شاکی رہتے ہیں کہ ہماری مدتِ عمر بہت کم ہے۔ مگر ہم عمل اس طرح پر کرتے ہیں گویا کہ اس کا کوئی اختتام نہیں۔

اس معزز فلسفی نے بلحاظ اس امر کے۔ ہمارے اُس اختلاف کو جو خود ہم کو اپنی ذات سے ہے۔ اپنی مختلف طرزِ تحریر اور خیالات میں جن سے کہ اُس کی تحریرات مختص ہیں بیان کیا ہے۔ میں نے اس امر پر اکثر غور کیا ہے کہ بنی نوع انسان ایک امر میں جو پہلے امر کے مثل ہے کلیتاً خود اپنی ذات سے اختلاف کرتا ہے۔ اگرچہ عام طور پر ہم اپنی کمی مدتِ عمر پر متاسف معلوم ہوتے ہیں۔ تاہم ہم اس کے ہر ایک زمانہ کے ختم ہو جانے کے متمنی ہیں۔

خورد سال لڑکا اس امر کا متمنی ہے کہ وہ جوان ہو جائے اور پھر کاروباری آدمی بنجائے۔ بعد ازاں جائداد حاصل کرے اور پھر خطابات حاصل کرے اور پھر کنارہ کش ہو جائے۔ اس طرح اگرچہ ہر شخص زندگی کے زمانہ کا تھوڑا ہونا چاہتا ہے مگر اس کے جتنے حصے دراز اور دشوار گذار معلوم ہوتے ہیں۔ ہم عام طور پر اپنے وقت کے دراز ہونے کے خواہشمند ہیں لیکن اگر ہم سے ممکن ہو تو اُسکے حصوں کو جن سے کہ وہ بنا ہوا ہے خوشی سے چھوٹا کردیں۔ ایک دبا خوار بہت اچھی طرح اس امر پر مطمئن ہو جائیگا۔

اگر تمام وقت جو موجودہ لمحہ اور اگلے چوتھائی سال کے آخری دن کے درمیان اس کے سُود ادا ہونے کا دن واقع ہے ۔ نیست و نابود ہو جائے ۔ ایک مدبّر اس امر پر کہ اُس کی زندگی کے تین سال ضائع کر دیئے جائیں قانع ہو جائیگا اگر وُہ معاملات کو زمانہ کے ایسے انقلاب کے بعد اُس طرح جس طرح کہ اس کے دماغ میں ہے ترتیب دیکھیگا ۔ ایک عاشق بخوشی اپنی زندگی کے اُن تمام لمحوں پر خطِ بطلان کھینچنے کے لئے تیار ہے جو اُس کے معشوق کی خوش آیند مُلاقات کے اور اس وقت کے درمیان گذرنیوالے ہیں ۔ پس اس تیزی سے جس تیزی سے کہ ہمارا وقت گذرتا ہے ۔ ہم اپنی زندگی کے اکثر حصّوں میں بہت خوش ہوں اگر وُہ اس سے زیادہ تیزی سے گذرے ۔ دِن کے بہت سے گھنٹے جو ہم پر گراں گذرتے ہیں ۔ صرف وُہی نہیں بلکہ ہم سال کے سال اُڑا دینا چاہتے ہیں اور وقت کو بالکل اس طرح گذارتے ہیں جس طرح کہ کوئی ایک ایسے مُلک میں ہو کر گذرے جو بہت سے جنگلوں اور چٹیل میدانوں سے پُر ہو ۔ جس سے کہ وُہ اُن چند چھوٹی بستیوں یا خیالی آرام کے مقاموں تک جو اس کے بعد واقع ہیں پہنچنے کے واسطے خوشی خوشی جلد گذرنا چاہتا ہو ۔

اگر ہم اکثر آدمیوں کی زندگی کو بیس حصّوں میں تقسیم کریں تو ہم کو یہ امر معلوم ہوگا کہ اُن بیس حصّوں میں سے کم سے کم اُنیس خالی ہیں جو نہ تو خوشی ہی میں صرف ہوئے ہیں اور نہ کسی کام کے کرنے میں مگر اس حساب میں مَیں اُن لوگوں کی زندگی کو شامل نہیں کرتا جو ہمیشہ کاروبار کی وجہ سے عجلت میں رہتے ہیں ۔ بلکہ صرف اُن لوگوں کی زندگی کو شامل کرتا ہوں جو ہمیشہ کاروباری دُنیا میں مشغول نہیں رہتے اور مَیں اُمید کرتا ہوں کہ میری یہ خدمت اُن لوگوں کو ناپسند نہ ہوگی اگر مَیں انکی زندگی کے خالی اوقات کے باکار بنانے کے لئے چند طریقے تجویز کروں ۔ طریقے جو مَیں اُنکے سامنے پیش کرونگا مفصلہ ذیل ہیں :۔

اتوار نیکی کرنا اُس کے نہایت عام معنوں میں۔ وُہ خاص تجویز جس میں کہ معاشرتی نیکیاں شامل ہیں ایک نہایت محنت پسند دل کو کام میں لگا سکتی ہے اور ایک آدمی کو اُس شخص سے جس کی زندگی حد درجہ کی مشغولیت میں گذرتی ہو زیادہ مشغول رکھتی ہے۔ جاہل کو صلاح دینا حاجت مند کی ضرورت رفع کرنا اور ستم رسیدہ کو تسلی دینا وُہ فرائض ہیں جو قریب قریب ہماری روزانہ زندگی میں پائے جاتے ہیں ایک آدمی کو اکثر ایک جماعت کی برافروختگی کے دُور کرنے کے ایک مستحق آدمی کی بابت انصاف کرنے کے۔ حاسدوں کے حسد کی آگ بجھانے کے۔ غصہ وروں کے غصّہ کو فرو کرنے کے اور متعصب لوگوں کو راہ راست پر لانے کے اتفاقات ہوتے ہیں اور ان میں سے سب مشاغل ایک سمجھدار انسان کے لئے مناسب و موزوں ہیں۔ اور اُس شخص کے لئے جو اپنی خوشی سے اُن میں اپنے آپکو مشغول کرسکے اطمینان بخش ہیں۔

ایک قسم کی اَور نیکی ہے جو اُن تنہا گھنٹوں کے لئے جن میں ہم کلیتاً جلسوں اور باہم گفتگو کرنے سے علیحدہ خود اپنی ذات پر چھوڑ دیئے جاتے ہیں مشغلہ ہوسکتی ہے۔ میرا مطلب اُس تعلّق خاص ہی جو ہر ایک عقلمند مخلوق کو اپنے بزرگ و برتر پیدا کرنے والے کے ساتھ رکھنا چاہیئے۔ وُہ آدمی جسکی عادت خدا کی حضوری میں رہنے کی ہے ہمیشہ خوش دل رہتا ہے اور اپنے آپ کو اپنے سب سے زیادہ عزیز اور اچھے دوست کی صحبت میں خیال کرکے ہر لمحہ اطمینان حاصل کرسکتا ہے۔ وقت اُس پر کبھی گراں نہیں گذرتا اور یہ ناممکن ہے کہ وُہ اکیلا رہے (کیونکہ اس کا خدا سب اس کے ساتھ) اُسکے خیالات و جذبات اُن گھنٹوں میں جنہیں کہ اَور لوگوں کے نہایت بیکار رہتے ہیں۔ اُس بہ مشغولیت رہتے ہیں۔ وُہ جب ہی کہ معاملات دُنیا سے دُوسری طرف متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا دل رُوحانی آگ سے مشتعل ہوجاتا ہے اور

اُمیدوں سے پُر ہو جاتا ہو اور اُس کی حضوری کے خیال سے جو ہر جگہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ مسرور ہوتا ہے۔ یا برخلاف اس کے اپنے خوف۔ غم اور تصورات کو اُس پروردگار حقیقی کے سامنے پیش کرتا ہے۔

مَیں نے اس موقعہ پر انسان کے صرف نیک ہونے کی ضرورت کو اس لئے مدِ نظر رکھا ہے۔ تاکہ وُہ کچھ کر سکے اور بیگانہ نہ رہے۔ لیکن اگر ہم آگے غور کریں کہ نیکی کرنا اُسوقت تک کے لئے جس وقت تک کہ وُہ ختم ہو۔ صرف ایک مشغلہ ہی نہیں بلکہ اُس کا اثر ہماری بقا کے اُن حصّوں پر پڑتا ہے جو ہماری قبر کے بعد ہیں اور یہ کہ ہماری تمام آئندہ بقا کی جزا یا سزا اُنہی گھنٹوں پر منحصر ہے جنکو ہم اس دُنیا میں نیکی یا بدی میں صرف کرتے ہیں۔ پس اس طریقہ سے اپنے وقت کو گذارنے کے لئے ہمارے پاس دو دلیلیں ہیں۔

جبکہ ایک آدمی صرف تھوڑا سا ذخیرہ اپنی حالت درست کرنے کے لئے رکھتا ہے۔ اور اُسکو اچھی طرح عمل میں لانے کے مواقع بھی رکھتا ہے۔ اُس کی بابت ہم کیا خیال کرینگے۔ اگر وُہ اُنیس حصّہ برباد کردے اور شاید بیسواں حصّہ اپنی بربادی اور ضرر میں صرف کرے لیکن بریں وجہ کہ دماغ میں ہمیشہ جذبات نہیں ہو سکتے اور نہ نیکی کرنے کے درجہ تک کا اُس میں جوش ہوتا ہے۔ یہ امر ضروری ہے کہ ایسے فرصت کے اوقات کے لئے مناسب مشاغل بتائے جائیں۔

مجھے یہ امر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ میرے خیال میں ایسے مشاغل سے جو صرف بے ضرر ہوں اور جنکے اختیار کرنے کی سوائے انکی بے ضرری کے اور کوئی وجہ نہ ہو ہمہ تن مانوس ہو جانا عقل رکھنے والی مخلوقات کے درجہ سے گھٹا ہوا ہے اس امر کا فیصلہ مَیں نہیں کرونگا کہ آیا کسی قسم کے کھیل کے متعلق اس سے کچھ اور زیادہ بھی ظاہر ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے یہ امر ہے کہ میرے

خیال میں نہایت سمجھدار لوگوں کو گھنٹوں پتوں کا ایک سیٹ تقسیم کرتے ہوئے اور پھانٹتے ہوئے دیکھنا اور کوئی گفتگو سوائے بازی کے اصطلاحات کے نہ کرتے ہوئے اور کوئی دوسرا خیال سوائے سُرخ یا سیاہ دھبوں کے جو مختلف رنگوں میں باہم ترتیب دیئے گئے ہوں آتے ہوئے نہ دیکھنا۔ نہایت تعجب خیز ہے۔ کیا کوئی آدمی اس قسم کے لوگوں کو یہ شکایت کرتے ہوئے کہ زندگی کا زمانہ بہت کم ہے سُنکر نہ ہنسیگا۔ دوستی کو اگر باقاعدہ ہو تو نہایت اعلیٰ اور مفید دلچسپیوں کا مخزن سمجھنا چاہیئے لیکن دل کبھی کسی چیز پر اسقدر رغبت سے متوجہ نہیں ہوتا جس قدر کہ ایک نہایت خاص دوست کی باتوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ درحقیقت زندگی میں دور اندیش اور نیک دوست کی صحبت سے حظ اُٹھانے سے بہتر کوئی برکت نہیں۔ وہ دل کو تسلی دیتا اور ہلکا کرتا ہے سمجھ کو ترقی دیتا اور صاف کرتا ہے۔ تخیل اور علم کو بڑھاتا ہے۔ نیکی اور اچھی تجاویز کو پیدا کرتا ہے۔ خواہشات کو قابو میں رکھتا اور ٹھنڈا کرتا ہے اور زندگی کے اکثر خالی اوقات میں باعث دلچسپی ہے۔ ایسے خاص دوست کے علاوہ ایک شخص کو ایک ایسے شخص سے عام گفتگو کرنیکی کوشش ہونی چاہیئے جو ان لوگوں کو جن سے کہ وہ گفتگو کرتا ہے محظوظ کر سکے اور اپنا اچھا اثر ڈال سکے اور ان دونوں صفات کا ہمیشہ چولی دامن کا ساتھ ہے۔

اور بہت سے مشاغل زندگی ہیں جنکے شامل کرنیکی ہر ایک فرد بشر کوشش کرے۔ تاکہ تمام موقعوں کیلئے کچھ نہ کچھ مشغلہ ہو۔ بنسبت اسکے کہ سُست پڑا رہکر دماغ پریشان کیا جائے یا کسی ایسے جذبہ سے جو اتفاق سے سُستی کی دلدل میں پھنسانا چاہے سُستی میں پڑ جائے۔

ایک آدمی کا جو علم موسیقی، نقاشی یا نقشہ کشی کا مذاق رکھتا ہو۔ ایک ایسے شخص سے مقابلہ کیا جائے جو ان ہنروں سے مذاق نہیں رکھتا تو مقابلۃً مذکورہ بالا شخص ایک دوسری سمجھ کا آدمی کہا جاسکتا ہے لیکن زندگی کے تمام مشاغل میں سے اپنے خالی اوقات کے پُر کرنے کے لئے اس سے بہتر کوئی امر نہیں کہ مفید اور دلچسپ مصنفوں کی کتابیں پڑھی جائیں +

محمد بدر الدین ۔ سوار ، و ، ی

تعلقاتِ زن و شُو

مکالمہ

میاں۔ تم نے مخزن میں بنت الوقت کا مضمون دیکھا۔ یہ بتاؤ کہ وہ تمکو کچھ پسند آیا؟

بیوی۔ کس لحاظ سے؟

میاں۔ آیا اُس میں جو کیرکٹر دکھائے گئے ہیں اُنکو تم پسند کرتی ہو۔

بیوی۔ مجھے تو وہ اصلی کیرکٹر نہیں معلوم ہوتے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ہندوستانی گڑیاں۔ کہ چار کالے ڈورے سے ٹانکے مار دیئے آنکھیں ہو گئیں۔ دو اور لگا دیئے بریاں بن گئیں۔ ایک کپڑے کو گول مروڑ کے متوازی سی دیا ہاتھ ہو گئے

میاں۔ بہت زور کی کہی۔ واقعی اگر بنت الوقت کوئی اصلی جیتی جاگتی بیوی ہوں تو بڑی کہہ کرنی بیوی ہیں۔ یہ بھی مانتی جانتی ہیں کہ "میری تو دونوں جہان کی فلاح اسی شخص (خاوند) کی ذات پر منحصر ہے" اور اگر وہ کہیں تو اپنا کلیجہ تک نکال کے رکھ دوں"۔ اور خاوند سے ذرا ذرا سی باتوں پر لڑتی بھی جاتی ہیں۔ سارے قصے میں شروع سے اخیر تک ایک جگہ یہ نہیں دکھایا کہ اُنہوں نے خاوند کی کونسی بات مانی یا خاوند کے لئے کیا تکلیف گوارا فرمائی۔ اُلٹا اُسکو خواہ مخواہ ستایا ہے۔

بیوی۔ جی ہاں۔ وہ تو بچارا کام میں مصروف ہے اور آپ ایک شعر کے معنی پر بحث کرنے کے لئے اور امیر اور داغ کا مقابلہ کرنے کو جس طرح صاحب بہرے کو پکارتا ہے اِس طرح اپنے خاوند کو آواز دیتی ہیں اور اپنی بات کی پچ کی یہ حالت ہے کہ خود ہی فخریہ لہجہ میں فرماتی ہیں"۔ گر میں بھی

کہے گئی کہ تم ایک بھی نہیں دکھا سکتے" اور اس پر طرّہ یہ کہ خفا بھی ہو گئیں لیکن انکا خاوند بھی کوئی بیچارا بڑا ہی غریب مزاج آدمی ہوگا جو اپنا کام چھوڑ کر بیگم صاحبہ کے حکم پہ دوڑا دوڑا چلا آیا۔ تم تو اوّل آتے ہی نہیں اور جو آتے تو میری جان کھا جاتے کہ ایسی فضول بات کے لئے مجھے کام پہ سے بلایا۔

میاں۔ شاید ان میاں بیوی کی نئی نئی شادی ہُوئی ہوگی جو کام کی پروا نہ کی۔

بیوی۔ نئی شادی کہاں سے ہُوتی ہوگی۔ بچّہ تو اتنا بڑا موجود ہے کہ باوا کی انگلی پکڑ کر اُنکے ساتھ کچہری جانے کو مستعد ہے۔

میاں۔ جی ہاں یہ حماقت مزید برآں۔ جس طرح جہلا بچّوں کو عید کی نماز میں بیوی کے کہنے سے لیجاتے ہیں اور نمازی نماز پڑھتے ہیں اور بچّے روتے رہتے ہیں۔

بیوی۔ لے کیسے نہ جاتے۔ بیگم صاحب کا حکم بھی تھا۔ دیکھو تابعدار میاں ایسے ہوتے ہیں۔ تم جیسے تھوڑا ہی۔ کہ بچّے کو میرے ساتھ بھی نہیں سونے دیتے۔

میاں۔ تم تو دوسری بحث چھیڑتی ہو۔ مگر یہ دیکھا کہ بیوی صاحبہ نے بچّے کو ضد کرنے کا سبق کس صفائی سے دیا ہے اور میاں نے کس طعن سے بات کی ہے کہ اگر قیصر کی جان تم کو ایسی دوبھر ہے"۔ گویا بے کچہری گئے قیصر مری جاتا۔

بیوی۔ شاید دوبھر کا محاورہ کھپانا ہو اس لئے یہ فقرہ لکھدیا ہو۔

میاں۔ ممکن ہے۔ اور دیکھو میاں جب کچہری سے واپس آتے ہیں تو باوجود اماں جان کی نصیحت کے میاں سے بحث کرنے کا ارادہ نہیں چھوڑا۔ اور اُدھر قیصر صاحبزادے کو دُوسرے دن کے لئے پھر میاں کے کندھے پر سوار کرا دیا کہ قیصر ہمارے کل پھر چلے جانا خفا نہ ہو"۔ کچہری کیا ہُوئی۔ نانی جی کا گھر ہو گیا۔

بیوی۔ تم نے ایک بات کا خیال نہیں کیا مزاج میں شیخی بھی ہے۔ چنانچہ نرس کا ذکر

بھی ازبس ضروری تھا۔ نرس کیا ہوگی۔ کوئی ایسی ویسی ہوگی جو بچہ ایسا ضدی ہے کہ باوا کے سر پر چڑھا جاتا ہے۔

میاں۔ آجکل کے مضامین میں عورتوں نے چھری کانٹے سے میز پر کھانے نرس۔ سائے وغیرہ کا تذکرہ کرنا فیشن کر رکھا ہے۔ اس کے بغیر انکی انگریزیت میں فرق آتا ہے۔

بیوی۔ انگریزیت یا میمیت ؟

میاں۔ (جواب ٹال کر) اچھا اس مضمون میں جو نکات بحث طلب ہیں اُن پر بھی تم نے غور کیا۔

بیوی۔ مثلاً ؟

میاں۔ مثلاً یہ کہ میاں بیوی کی محبت خط مستقیم کی سی رہنی چاہیے۔ ایک۔ بیوی کو ہر وقت میاں سے طنزاً گفتگو کرنی چاہیئے۔ دو۔ بیویوں کو اپنا دماغ شعراء کے کلام کے مباحثے میں صرف کرنا چاہیئے۔ تین۔ بیوی کو میاں کا نام لینا چاہیئے۔ یہ چار مسئلے ہیں۔

بیوی۔ بی بنت الوقت صاحبہ کا یہ خیال کہ "شادی کے یہ تین سال مجھ کو پہاڑ معلوم ہوتے۔ اگر میری اُنکی ہفتے میں دو ایک دفعہ لڑائی نہ ہوتی رہتی"۔ نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اگر ایسا خیال ظاہر کرنے والی اپنا نام بنت عنب رکھ لے تو زیادہ مناسب ہو۔ کیونکہ عربدہ جوئی اُسی کا کام ہے۔ شکر رنجی کے گھاؤ بھی زیادتی سے دل و بدن گہرے ہوتے جاتے ہیں! ور رفتہ رفتہ آپس میں کھٹنی ہو جاتی ہے۔ گھڑی گھڑی لڑنے جھگڑنے سے اور پھر ملنے سے چھچھوراپن اور بچپن معلوم ہوتا ہے۔ اس مضمون میں جو ایک جگہ بنت الوقت نے اقرار فرمایا ہے کہ میری خفگی کوئی سچ مچ کی تھوڑا ہی ہے اور اس جھوٹی

خفگی پر بعض بعض جگہ اپنے خاوند کو ڈانٹا ہے تو اس سے مجھے چڑے چڑیا کی کہانی کا وُہ فقرہ یاد آتا ہے کہ "ڈر موئے میری آنکھیں دُکھتی ہیں"۔ اور طلاپ یہی کہ "ماری کوئی تو نے لاگی مَیں کیا تجھ سے روٹھی تھی"۔
بیگم صاحبہ کا رُوٹھنا۔ میاں کا خوشامد کرنا۔ اور انکے سوال جواب میں نخیبڑا اور گلزارِ نسیم کا مزا آتا ہے۔ میاں بیوی سے ایک تصویر دکھاکر اسکی تعریفوں پر تعریفیں کرتے ہیں اور آخرکار بیوی صاحبہ جل بھُن کر اٹھوانٹی کھٹوانٹی لیکر جا پڑتی ہیں اور میاں مناتے ہیں تو فرماتی ہیں "مجھ سے کیا کام اپنی پسند والی سے جاکر ایسی خوشامد کی باتیں کرو"۔ یہ اندرسبھا کا سین نہیں تو اور کیا ہے۔
میری رائے میں تو بنت الوقت کی ساس کی نصیحت بہت درست ہے۔ کہ میاں کے آرام کا خیال رکھنا چاہیئے اور اس سے خواہ مخواہ نہ الجھنا چاہیئے۔ خاصکر جب وُہ تھکا ماندہ ہو۔
میاں۔ مَیں تمکو اتنا عقلمند اور نکتہ سنج نہ سمجھتا تھا۔ اچھا یہ تو پہلے سوال کا جواب ہوا۔ دُوسرے سوال کا کیا جواب ہے۔
بیوی۔ اسی میں وُہ بھی آگیا۔ ہر وقت میاں سے چھیڑ چھاڑ بنت الہوا کو کرنی جائز ہے۔ میاں بیوی کے رشتے میں عشق کا چٹخارہ متانت لیا ہوا ہونا چاہیئے ہر وقت طنزاً گفتگو کرنا بدمزاجی پر دلالت کرتا ہے۔ اور ہر ایک خاوند بنت الوقت کے میاں کی طرح سہار کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ اگر جاہل ہے تو وُہ بھی اپنی بدمزاجی دکھائیگا اور ممکن ہے ہاتا پائی کی نوبت پہنچے۔ اگر پڑھا لکھا ہے تو وُہ گھر میں آنا چھوڑ دیگا۔ تم نے ایک دن مجھے شیکسپیر کا ایک قصہ سُنایا تھا جس میں ایک بدمزاج بیوی کی اوّل مرمت اور آخر

میں درستی ہوئی ہے۔ بنت الوقت کو وُہ قصّہ ضرور پڑھنا چاہئے۔

میاں۔ نہیں مگر وُہ تو بہت محبت والی بیوی ہیں۔

بیوی۔ لفظی اظہار میں تو کم سے کم ضرور۔ تیسرے اور چوتھے مسئلے کا حل اب تم کرو۔

میاں۔ شاعری اگرچہ زمانہ جاہلیت کی نشانی ہے لیکن اس کا لُطف اُٹھانے کے لئے بڑی لیاقت اور علم درکار ہے اور ہماری اُردو اور فارسی کی شاعری کی ظاہری صُورت ایسی ہے کہ جو شخص صرف لکھ پڑھ ہی سکتا ہو اور اچھا تعلیم یافتہ نہ ہو اسکے لئے شاعری میں کسی قسم کا حصّہ لینا قطعی مخرب اخلاق ہے۔ اور چونکہ ہماری مستورات کو اور بہت سے مفید مشاغل موجود ہیں۔ اِس لئے انکو اس سے پرہیز ہی لازم ہے۔ علیٰ ہٰذا القیاس اُردو کے ناول بھی مضر ہیں۔ میرے خیال میں تاریخی قصص مثل قصص ہند و مذہبی کتب مثل الکلام اور بزرگان اسلام کی سوانح عمری اور سفرنامے انکے لئے زیادہ فائدہ مند اور دلچسپ ہونگے۔ تاریخ میں مولوی ذکاء اللہ صاحب کی تاریخ ہند کے بہت سے حصّے نہایت دلچسپ ہیں۔

اب رہا بیوی کو میاں کے نام لیکر پکارنے کا مسئلہ۔ میری رائے میں نام لینا تو ہرگز مناسب نہیں۔ اِس لئے کہ ہماری سوسائٹی میں صرف اپنے سے چھوٹے کا نام لیتے ہیں۔

بیوی۔ تم نے ناصر دلہن کی نسبت کیا رائے قائم کی؟

میاں۔ اچھی خاصی بھولی بھالی پیاری دلہن ہے۔ اگرچہ بنت الوقت صاحبہ اسکو روشن خیال لڑکیوں میں شمار کرتی ہیں لیکن میرے ذہن میں تو انکی تصویر یوں آئی ہے کہ ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہے۔ پور پور چھلّے پہنے ہیں۔ رنگ سانولا ہے۔ گول چہرہ ہے۔ جھکی ہوئی ہیر یاں ہیں۔ ڈھیلے

پائچوں کا پاجامہ ہے۔ گہنا ہاتھوں میں سونے کا بے ترتیبی کے ساتھ کہنیوں تک پہنچتا ہے۔ کان ڈہرے ہوگئے ہیں۔ گلے میں سونے کے ساتھ پوتوں اور شیشے کے جوے بھی پہن لئے ہیں۔ قد چھوٹا۔ بدن دوہرا۔

بیوی۔ (قہقہہ لگاکر) یہ تم نے کیونکر جانا۔

میاں۔ اس قسم کے خیالات کی عورت ٹھیٹ دیسی ہوگی اور ایسا ہی لباس پہنیگی۔

بیوی۔ اس کا کیرکیٹر بتاؤ۔

میاں۔ کیرکیٹر کی سُنیئے۔ وُہ فرماتی ہیں "اتنا بڑا گھر اماں جان کے نہ ہونے سے سُونا سُونا معلوم ہونے لگا"۔ بچّوں کے نہ ہونے سے تو گھر سُونا سُونا معلوم ہوتا ہے۔ کہ وُہ جب ہوتے ہیں تو غل غپاڑہ رہتا ہے۔ لیکن اماں جان کے نہ ہونے سے انکا گھر جو انکو سُونا سُونا معلوم ہونے لگا تو غالباً انکی اماں جان ہر وقت چلّاتی رہتی ہونگی اور اگر ایسی اماں جان کی وہ تعریف کرتی ہیں تو قطعی ظاہرداری برتتی ہیں۔ اور یہ ٹھیٹ دیسی لوگوں کا قاعدہ کلیہ ہے پھر ارشاد کرتی ہیں "اصل یہ ہے کہ کسی بزرگ کے گھر میں ہونے سے کچھ دل کو اطمینان سا رہتا ہے"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بی ناصر دلہن نری دلہن ہی ہیں۔ اگر وُہ گڑیا ہوتیں تو اور بھی اچھا تھا۔ یعنی خود کچھ بھی نہ کرنا پڑتا۔ ہر وقت طاق میں سجی رہتیں۔ اس فقرے سے صاف ظاہر ہے کہ ناصر دُلہن کو اپنے اوپر بالکل بھروسہ نہیں ہے۔ نہ انکی اپنی کوئی رائے ہے۔ نہ اپنی رائے پر اطمینان ہے۔ اس لئے اماں جان کے سہارے جیتی ہیں۔ لیکن کہیں خدانخواستہ اماں جان جنّت آشیان ہوگئیں۔ تو کیا ہوگا۔ یہ ہمارے ہندوستانیوں کی طرز زندگی کا بہت کمزور پہلو ہے۔ بڑوں کے آگے چھوٹے کوئی چیز ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دبتے دبتے غلامی کی خصلتیں

پیدا ہو جاتی ہیں اور نہ اپنے اوپر بھروسا رہتا ہے۔ نہ بے سہارے کے کچھ کر سکتے ہیں۔ اور ہمیشہ اپنی لگام دوسرے کے ہاتھ میں دینے سے خوش رہتے ہیں۔

بیوی۔ ناصر خود جب امّاں جان سے اتنا دبتے ہیں تو کیا اُنکی بیوی کو نہ دبنا چاہیئے۔

میاں۔ ناصر صاحب بھی تو اسی طرزِ زندگی میں پرورش پا چکے ہیں جس کی ہم نے اوپر ہجو کی۔ ولایت کے درزیوں نے اگر اُنکی پوشش بدل دی تو کیا ہوا۔ اب دیکھئے عورت تو عورت ناصر مرد ہو کر اتنی جرأت نہیں رکھتا کہ جس بات کو بُرا نہیں سمجھتا۔ اُس پر کھلم کھلا عمل کر سکے۔ برخلاف اس کے چوری چھپے ان کاموں کرنے کو معیوب نہیں سمجھتا۔ گویا امّاں جان کے ڈر نے صاحبزادے کو اس قدر چوٹا بنا دیا ہے کہ اُن کی چوری کا لپکا ولایت کی رہائش میں بھی نہ گیا۔ ”ڈبر کنیزہ“ اور ”کنسرویٹو“ کہنا تو سیکھ لیا۔ مگر تمہیں میرا مُردہ ہی دیکھنا نصیب ہو جواب کے چلنے سے انکار کرو“ کی قسم کے فقرے نہ بھولے۔ یعنی اُنکے دماغ میں سے وہ اوہامی کثافت ابھی تک نہیں نکلی جو گھٹی کے ساتھ ہمیں پلائی جاتی ہے۔ جب میاں ایسے ہیں تو بیوی تو ان سے کچھ درجہ بڑھی ہوئی ہی ہونی چاہیئے۔ وُہ یہ فقرہ سُن ہی نہیں سکتیں مُنہ بھینچے جا رہی ہیں۔ کہ گویا ادھر یہ لفظ مُنہ سے نکلے اور اُدھر ناصر کے مُرغِ رُوح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔ بیچاری مجبور ہے کیا کرے آخر میاں کا کہنا ماننے کے لئے مجبور ہوتی ہے۔ اور یا تو کس شد و مد سے تھیٹر جانے سے انکار تھا اور یا ایک ہی قسم پر جھٹ سے تیار ہو گئیں مطلب یہ کہ نہ کوئی اصُول ہے نہ کسی کام کی بُرائی بھلائی دریافت کرنے کی قابلیت امّاں جان تھیٹر میں جانے کو بُرا سمجھتی ہیں۔ دُلہن جان بھی بُرا سمجھتی ہیں

میاں نے قسم دی - بیوی اسکو اچھا سمجھنے لگیں - گھر میں یہ سنتی ہیں کہ اماں جان بڑی بوڑھی ہیں - میاں اُنکے بیٹے ہیں اُنکے خورد ہیں - اِسلئے شرافت کا تقاضا اسی امر کو سمجھتی ہیں کہ اماں جان کی بات رد نہ کریں اور اُنکے مقابلے میں میاں کو بالکل کچھ نہ گردانیں - کس قدر جہالت کا خیال ہے - میاں اور بیوی کا رشتہ ایسا رشتہ ہے کہ اس میں تیسرا آہی نہیں سکتا - خواہ وُہ ماں ہو یا اپنا بچہ ہی کیوں نہ ہو - میاں کو مقدم بیوی ہے اور بیوی کو مقدم میاں ہے - جب یہ ہوتا ہے تو میاں اور بیوی یکجان اور دو قالب ہوتے ہیں - اور جب تک ایسا نہ ہو تب تک میاں بیوی کے تعلقات میں ضرور رخنہ باقی رہتا ہے -

بیوی - آپ مجھے لکچر پلانے لگے - بہت خوب -

میاں - آپ یُوں سمجھیں -

بیوی - بس اب سو ئے سنسار اور جاگے پاک پروردگار " آپ بھی سو جائیں اور اس لکچر کو پھر کے لئے اُٹھا رکھیں -

"ترمزم"

اولڈ بوائے - علیگڈھ کالج کے ہواخواہ بالعموم اور پرانے طلبہ بالخصوص اِس نئے ماہوار رسالہ کا جو چند ماہ سے مقام بنارس سے جاری ہوا ہے نہایت خوشی سے خیر مقدم کرینگے - اسکے اڈیٹر عترت حسین صاحب بی - اے اور اسسٹنٹ اڈیٹر سید منظر علی صاحب ہیں - دونوں صاحبان اپنے رسالہ کو پُرانے طالبعلموں کے لئے دلچسپ بنانے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے - امید ہو کہ علیگڈھ کے سب پُرانے طلبہ جو عمُوماً خوشحال اور کامیاب اصحاب ہیں - اس نئے علمی پودے کی آبیاری کرینگے ●

شاعری

شاعر کا اوج طبلِ سدرہ سے کم نہ تھا — رکھتی تھی جن دنوں پر پرواز شاعری
خدمت گذارِ شاعرِ خوش گو تھا ہر امیر — تھی ہر وزیر و شاہ کی دمساز شاعری
گرویدہ اک جہان تھا اس کے جمال کا — کرتی تھی اپنے حُسن پہ خود ناز شاعری
ہوتی تھی ہر رئیس کی مجلس میں اس کی قدر — رہتی تھی بزم و رزم میں ممتاز شاعری
بھرتے تھے موتیوں سے سب اہلِ سخن کے مُنہ — کرتی تھی شاعروں کو سرفراز شاعری
تسخیرِ قلب ہوتے تھے تاثیرِ شعر سے — حُسنِ بیاں میں رکھتی تھی اعجاز شاعری

شاعر کی قدر فخرِ دو عالم نے کی حفیظ
رکھتی ہے یہ سند پہ اعزاز شاعری

(حفیظ جالندھری)

ہمارا ترانہ

اغیار سے یہ کہدو ہے یہ مکاں ہمارا — یہ سرزمیں ہماری یہ آسماں ہمارا
یہ باغ و راغ سارے جتنے ہیں سب ہمارے — یہ آبجو ہماری یہ گلستاں ہمارا
ہوتے ہیں کون اس میں صیاد اور گلچیں — مدّت سے اس چمن میں ہے آشیاں ہمارا
اپنے لہو سے ہم نے ہر نخل کو ہے سینچا — ہم باغباں ہیں اس کے یہ گلستاں ہمارا

گلگشت ایسی بھائی کچھ ہم کو اس چمن کی
جس سے نہ یاد آئی پھر بھول کر وطن کی

اے اجنبی گر تو واقف نہیں عرب سے — جو پوچھتا ہے ہم سے نام و نشاں ہمارا

مسکن قدیم اپنا ہے سرزمین بطحا　　　پہلے ہوا جہاں سے چشمہ رواں ہمارا
جو چاہے دیکھ آئے بیت الحرام مکہ　　　قائم ہے اُس زمیں پر اب تک نشاں ہمارا
مرجع ہمارا اب تک ہے خاک پاک یثرب　　　جس خاک میں ہے سوتا وہ گلّہ باں ہمارا

ہم اہل بادیہ ہیں اسلام کے فدائی
اس دین کے فدائی اس نام کے فدائی

ضرب المثل ہماری مہماں نوازیاں ہیں　　　ہم کو عزیز جاں سے ہے میہماں ہمارا
حاتم سے نام روشن ہمت کا ہے ہمارے　　　جود و سخا میں عالم ہے مدح خواں ہمارا
ہم نے کبھی کسی سے آنکھیں نہیں چرائیں　　　مانگا ہے ہم سے اُس نے گو نقدِ جاں ہمارا
دب کر کسی کے آگے گردن نہیں جھکائی　　　اسواسطے لقب ہے شیرِ ژیاں ہمارا

ابنائے بادیہ ہم ڈرتے نہیں کسی سے
البتہ چھیڑ پہلے کرتے نہیں کسی سے

وہ ابنائے مغرب یعنی کہ جبلِ طارق　　　صدیوں اُڑا کیا ہے اُس پر نشاں ہمارا
یہ سرزمینِ مشرق کہتے ہیں ہند جسکو　　　قرنوں رہا ہے اسپر سکّہ رواں ہمارا
ہرقل کا تاج اب بھی ہے زیبِ سر ہمارے　　　ہے پائے بوس اب تک تختِ کیاں ہمارا
دشمن جو ہم سے آکر میدان میں لڑے ہیں　　　بھولے نہیں وہ اب تک زخمِ سناں ہمارا
پہنچے ہیں ہم یہاں تک خیبر کو پار کرکے　　　کیا روکتا ہمالہ بحرِ رواں ہمارا
قومیں یہاں کی ہم سے پسپا ہوئی ہیں اک اک　　　ہر جنگ میں رہا ہے پلّہ گراں ہمارا
مدت تک اس زمیں پر کی ہم نے حکمرانی　　　صدیوں رہا ہے تابع ہندوستاں ہمارا
گھربار ہم نے اپنا چھوڑا اسی کی خاطر　　　اس درجہ مہرباں تھا کچھ میزباں ہمارا

آب و ہوا یہاں کی ایسی ہمیں خوش آئی
ہم نے عرب سے آکر بستی یہاں بسائی

ہندوستان میں رہتے گذری ہیں آٹھ صدیاں ہر ذرہ اس زمیں کا ہے راز داں ہمارا
ماں باپ ہیں ہمارے مدفون خاک اس میں اس خاک سے بنا ہے ہر نوجواں ہمارا
بیجا نہیں جو اسکو سمجھیں وطن ہم اپنا زیبا ہے گر کہیں ہم ہندوستاں ہمارا
بھارت ہماری ماں ہے ہم اسکے بالکا ہیں ہے اب تو برج باشی کل خانداں ہمارا
بیوپار ہے ہمارا حبِّ وطن کا سودا اس جنس کا ہے جویا یہ کارواں ہمارا

اس دھن میں چار سو ہم پھرتے ہیں مارے مارے
گو تھک گئے ہیں لیکن ہمت نہیں ہیں ہارے

[illegible]

تصوّر

اے تصور تیری خوبی کیا کسی سے ہو بیاں تیری جدت آفرینی کا ہے قائل اک جہاں
تو کرے دم بھر میں رنگا رنگ بزم آرائیاں تو اگر چاہے بنا دے ایک گل سے گلستاں
تو مٹائے آکے دل سے رنج کے داغ و نشاں تو دکھائے سیرِ باغِ رشکِ گلزارِ جناں
تو بڑھائے حسبِ منشا شانِ اشیائے جہاں شئے ہر اک معلوم و مجہول آگے تیرے عیاں
دور کی دیکھی ہوئی شئے دم میں تجھ سے ہو عیاں دور اندیشی میں اک تو ہی ہے یکتائے زماں
کھینچتا ہے اس طرح تصویرِ یارِ دلستاں دیکھ کر صنعت تری ہوتے ہیں گم تاب و تواں
خواہشوں کے پیش کرتا ہے تو نادر ارمغاں تو بناتا ہے عجب دلچسپ قصے داستاں
جمع کر دیتا ہے تو اک دم میں گنجِ شائگاں صرف کر دیتا ہے اک لمحے میں دولت بیکراں
تجھ سے بنتا ہے سکندر دم کے دم میں سرگراں تجھ سے بنتا ہے تونگر دم میں مفلوکِ زماں
کیسی ہے خود اختیاری ذات میں تیری نہاں کوئی مجبوری نہیں جو روک لے تیری عناں
کیوں نہ شاعر تجھ کو چاہیں شاعروں کی تو ہے جاں کیوں نہ عارف تجھ کو مانیں تو ہی اسرار داں

مونس خلوت کوئی تجھ سا زمانے میں کہاں — وقتِ بد میں تو ہی دائم غمگسار و مہرباں
تیری آمد ہی مبارک دل مصفا ہو جہاں — تو ہی بد باطن کے حق میں اک بلائے ناگہاں
عیب کو معیوب کے تو صاف کرتا ہی بیاں — جذبۂ باطن کا ہو جب فعلِ ظاہر ترجماں
مول لیتا ہی مصیبت تجھ سے نادانِ جہاں — راحتیں پاتا ہے تجھ سے مردِ عاقل بیگماں
تیری خیر اندیشیاں کرتی ہیں دل کو شادماں — تیری خیر آگاہیاں ہوتی ہیں تسکیں بخشِ جاں
ہوتی ہی سچی خوشی اس شخص ہی کو بیگماں — تو لباسِ صدق میں ہوتا ہی جسکا میہماں

تیری خوبی پر ہی دلدادہ ذہینِ تفتہ جاں
کر رہا ہی تو ہی اُس کی غمگساری ہر زماں

سید غلام مصطفیٰ ذہین

یار کا خط

مرحبا! کاغذ کے ٹکڑے مَیں ترے قرباں ہوں — خود ہوں گو محسن ترا گرویدۂ احساں ہوں
پارۂ کاغذ نہیں حرزِ دلِ غمگیں ہے تُو — قلبِ مضطر کے لئے سرمایۂ تسکیں ہی تو
معدنِ الطاف ہے تو مخزنِ اسرار ہی — جامعِ اوصاف ہے عکسِ دلِ دلدار ہی
کم نہیں تیرے شکن چینِ جبینِ یار سے — شان میں نقطے فزوں خالِ رُخِ دلدار سے
تو اگر دو چار دن بھی غم رُبا آتا نہیں — حق تو یُوں ہی پھر مجھے دُنیا کا کچھ بھاتا نہیں
وصل تیرا کم نہیں کچھ مجھ کو وصلِ یار سے — کیُوں نہ ہو تو بھی تو آخر ہے اسی سرکار سے
ہو نہ ہو قایل کوئی اس مختصر تحریر کا — مَیں سمجھتا ہُوں نوشتہ ہے مری تقدیر کا
جب کبھی مجبُور ہونگا دادخواہی کے لئے — پیش ہوگا چار یاروں میں گواہی کے لئے
حالِ دل تجھ سے کہونگا پھر کبھی دل تھام کر — منزلوں آیا ہی چل کر اب ذرا آرام کر

امرناتھ محسن

شادی کی مبارکباد

یہ نظم دیر میں شائع ہوتی ہے۔ مگر شعر کی تازگی میں فرق نہیں آتا۔ ہمارے کرمفرما پنڈت نرائن پرشاد صاحب بیتاب نے اپنے دوست مسٹر کنہیا لال بیتن کی ”منشی“ بی۔ اے کی شادی میں (جو ماہ اپریل میں ہوئی تھی) یہ اشعار بطور تہنیت نظم کئے تھے۔ قافیہ و ردیف کی دقت اور بندش کی آسانی بالخصوص قابل تحسین ہے۔

تری شادی سے دنیا میں بڑھی توقیر شادی کی
نہ ہے طالع نہ ہے قسمت نہ ہے تقدیر شادی کی

جہاں میں بج رہے ہیں شادیانے تیری شادی کے
خوشی عالم میں ہے اور دھوم عالمگیر شادی کی

ادھر شادی کی دھن میں تیرے سر پر بندھا سہرا
ادھر سہرے کے بندھنے سے کھلی تقدیر شادی کی

شباب[۱] اپریل کا ہے چیت فصلی کا بڑھاپا ہے
مناتے ہیں خوشی مل کر جوان و پیر شادی کی

تو شادی کیلئے دنیا میں اور تیرے لئے شادی
تری جاگیر شادی اور تو جاگیر شادی کی

ترے گھر کے در و دیوار سے شادی برستی ہے
برنگِ ابرِ باراں چھا گئی تاثیر شادی کی

تری شادی نے اپنا کر لیا پابند شادی کو
منڈھے یہ بیل چڑھ کر بن گئی زنجیر شادی کی

نگاہوں کو تری مدِ نظر تھی خانہ آبادی
نشانہ جا لگا تاکا ہوا یہ تیر شادی کی

ملی تقدیر۔ پہلے صرف آنکھیں مگر اب ملگیا دل بھی
وہ تھی تدبیر منگنی کی۔ یہ ہے تقدیر شادی کی

ترا سہرا یہ جھک جھک کر بلائیں تیری لیتا ہے؟
کہ ہوتی ہے خوشی خوش ہو کے دامنگیر شادی کی!

بہن میری دلہن ہے اور بھائی جان ہیں دولہا
برادر جسم شادی۔ جان ہے ہمشیر شادی کی

دلِ بیتاب سمجھیگا ٹھکانے لگ گئی محنت

---

[۱] اپریل کی ۱۶ تاریخ اور چیت فصلی کی ۲۹ ۔

ہوئی مقبول اگر یہ نذر پرتحریر شادی کی

ایضاً بقیہ قافیہ تصویر

پکارے خامشی میں بھی خوشی تحریر شادی کی | مزہ جب ہے کہ منہ سے بول اُٹھے تصویر شادی کی
شفق رنگ خوشی تارے ہیں پھول اور کہکشاں سہرا | فلک بھی تیری شادی سے بنا تصویر شادی کا
چمن لائے اِدھر سہرے جھنک لائی اُدھر گنگنا | زمیں خاکہ ہے شادی کا۔ فلک تصویر شادی کی
دلہن کی آنکھ میں دولہا دلہن دولہا کی آنکھوں میں | جدھر دیکھو نظر آتی ہے اک تصویر شادی کی
ابھی خاموش تھا نوشہ ابھی کرنے لگا باتیں | خدا کی شان منہ سے بول اُٹھی تصویر شادی کی
نظر آتی ہے ہر صورت سے صورت شادمانی کی | بنا ہے ہر براتی ہو بہو تصویر شادی کی
دلہن شرمیلی۔ دولہا طلعت خاموش ہیں دونوں | کوئی ہے صبر کا پتلا۔ کوئی تصویر شادی کی
تصور میں جب آئے ساتھ ہی نور شاد و نوشابہ[1] | وہیں میری نظر میں کھنچ گئی تصویر شادی کی

دیا ہے کام اُس نے تیری شادی میں مصور کا
کھچی ہے خامۂ بیتاب سے تصویر شادی کی

[1] دلہن کا نام

محنت

کام سے ہے آدمیت کام سے آرام ہے | آدمی کی زندگانی کا سبب بس کام ہے
آدمی وہ ہے جسے مطلب ہو کم آرام سے | اسکو ہونا چاہئے دن رات رغبت کام سے
آدمی آفاق میں جو کام کے لائق نہیں | یاد رکھو اپنے ہمچشموں میں وہ فائق نہیں
آدمی گر محنتی ہے اور دیانتدار ہے | کام اُسے فکر معیشت کے لئے درکار ہے
کام فخر نوجواں ہے کام فخر پیر ہے | کام سے سوسائٹی میں عزت و توقیر ہے

کام کو تعلیم قدرت کا طریقہ یاد ہے
سارے استادوں سے بہتر کام اک استاد ہے

مردم اعلیٰ کے دیکھو گر اٹھا کر واقعات
تم پہ کھل جائے کہ تھے کیا محنتی وہ باصفات

چاہیے ہر کام میں ہم کو انہی کی پیروی
کی جنہوں نے صرف تحقیقات اپنی زندگی

جو کئے تجویز انہوں نے کام پائے اپنے لئے
پائی داد مردمی ایسی دلیری سے کئے

آج کل تعلیم کا ڈنکا بجا ہے خلق میں
دھیان اب تہذیب کا کیا جا بجا ہے خلق میں

خلق میں پیدا کیا ہے اب یہ شہرا کام نے
کارخانہ ہے ترقی کا نظر کے سامنے

درجہ اعلیٰ کچھ نہ کچھ ہے تو ریاضت دوستو
قیمتی ہر چیز کی قیمت ہے محنت دوستو

گلشن راحت نہیں پھلتا ریاضت کے بغیر
کام کچھ بھی ہو نہیں سکتا ہے محنت کے بغیر

بوستان خلق میں جو مرد گذرے ہیں بڑے
کام تھے انکے زبردست اور ریاضیں انکی کڑے

رنج اٹھائے کام میں محنت سے بیزاری نہ تھی
صبر سے محنت انہوں نے رات دن جاری رکھی

ہاں طبیعت بھی نہایت تیز انہوں نے پائی تھی
انکے حصہ میں ذہانت بھی خدا داد آئی تھی

پر اٹھاتے تھے وہ تکلیف اور زحمت رات دن
جان و دل سے وہ کیا کرتے تھے محنت رات دن

بلکہ محنت ہی نہیں در اصل راحت بھی کوئی
کام کچھ امید سے کیجے تو ہے عین خوشی۔

تھا یہ قول سینٹ اوگسٹائن اہل یقیں
کچھ نہ کرنے کے برابر کوئی بھی محنت نہیں۔

برکتیں نازل ہوں اس پر حق تعالیٰ کی سدا
صرف جس نے عمر کو کار خلائق میں کیا۔

برکتیں اس پر بلائیں فکر کی سہتا ہے جو
اور کار نیک ہر دم سوچتا رہتا ہے جو

الغرض ہر کام میں مشکل روا محنت سے ہے
کام جو دنیا میں ہے وہ کام کا محنت سے ہے

جان ہو قربان خوبی بیان سنسکرت
اک مثل کیا خوب کہتی ہے زبان سنسکرت

شیر وہ ہوتا ہے میدان جہاں میں کامیاب
اپنے جو گل سے بدن کو کام میں کردے گلاب

ضعف ہے انکا قوی ہیں وہ نہایت بزدلے
اپنی ناکامی میں کرتے ہیں جو قسمت کے گلے

(ماخوذ از انگریزی)

اپنی تمنّا

گھر سے لایا ہے اُٹھا کر ہمیں شوقِ دیدار دیکھنے آئے ہیں گلشن میں گلِ تر کی بہار
توڑ لیجائیں یہ ہرگز ہمیں منظور نہیں اپنا دل بھی اسے دیجائیں تو کچھ دور نہیں
بیٹھ کر پاس بہت غور سے دیکھینگے اسے ایسے بیٹھینگے کہ پہلو میں بٹھا لینگے اسے

یہ مجھے کون اُٹھاتا ہے یہ قصہ کیا ہے کیا کوئی عاشقِ شیدا ابھی یہاں بیٹھا ہے
کس لئے مارا مجھے میں دیکھ تو لوں کیا مارا بوٹی بوٹی کی ہے فریاد کہ تیرا مارا
پھول کے ساتھ تو موجود اک آفت بھی ہے اس کی قربت میں تو کانٹوں کی عنایت بھی ہے

شاہدِ گل کو حفاظت کی ضرورت نکلی دولتِ حسن کو بھی سانپ کی حاجت نکلی
اسکو زیبا ہے یہی جو گلِ خوشبو پالے شاخِ گل خوب کیا تو نے کہ بچھو پالے
مانتا ہوں تجھے کی تو نے یہ اچھی تدبیر چاہیے اپنی سی تدبیر پھر آگے تقدیر

پھول بھی تو کہ آرام نہیں پاتا ہے دامن اسکا بھی تو کانٹوں میں اُلجھ جاتا ہے
کبھی تھپیڑے سے ہوا کے جو یہ بچتا ہے ادھر تو ذرا بھی نہیں آتا ہے انہیں رحم ادھر
اور بھی دکھے ہوئے دل کو دکھا دیتے ہیں زخم یہ پھول سی پتی میں لگا دیتے ہیں

نازکی پر ہی یہ ساتھ آہ یہ حالت کیسی ہے لکھی پھول کی قسمت میں مصیبت کیسی
جسمِ نازک تو مصیبت کا سزاوار نہ تھا گل کسی طرح سے بھی قابلِ آزار نہ تھا

پیاری صورت کے لئے تو نہ برائی ہوتی کاش ایسوں کے تو حصے میں بھلائی ہوتی

درد ہر اک کے لئے یوں تو برا ہوتا ہے لیکن اچھوں میں یہ اندوہ بڑا ہوتا ہے
نہ دکھائے کہیں اللہ مصیبت آتی اب تو تکلیف کسی کی نہیں دیکھی جاتی
اے خدا چھین لے آلام زمانے بھر کے اور سب دیدے مجھے درد محبت کر کے
یہ وفا جان جو جائے تو وفا کر جائے
تیرا بندا تیرے بندوں کے لئے مر جائے

سال نو کی مبارکباد

مبارک زمانہ کو دورِ گلستاں مبارک ہو عالم کو عشرت کا ساماں
مبارک ہو دستِ جنوں کو گریباں مبارک ہو عشاق کو چاکِ داماں
عروسِ چمن کو یہ جوبن مبارک ہو گلچیں کو گلگشتِ گلشن مبارک
مبارک دلِ خستہ کو زخم پنہاں مبارک تمنائے شورِ نمکداں
صبوحی کشو جام و مینا مبارک یہ سرمست دلکش مہینا مبارک
مبارک مڈل والوں کو فاقہ مستی مبارک شریفوں کو یہ دورِ پستی
مبارک ہو دربار والوں کو دہلی مبارک ہمیں اپنی چھوٹی حویلی
مبارک ہو انگلینڈ کو جشن شاہی مبارک ہو دشمن کو دورِ تباہی
مبارک ہو مخزن تمہیں سال نو کی
مبارک تمہیں روز افزوں ترقی

سردار عبدالحمید خاں یوسفزئی

تازہ غزلیں

(از جناب مرزا محمد ہادی صاحب عزیز لکھنوی)

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے / نہ بن پڑتی ہی ہنستے اور نہ روتے
شب فرقت اسی حسرت میں گذری / ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے
کہیں یہ راز کیا اے ہنسنے والے / اگر جیتے تو کچھ دن اور روتے
بہت جھگڑے رہے فرقت کی شب تک / نہ دُنیا تھی نہ ہم تھے صبح ہوتے
یہ کس نے خواب میں جلوہ دکھایا / یونہیں ہم رہ گئے سوتے کے سوتے

عزیز اب ضبط سے بھی کام لو کچھ
ارے مر جاؤ گے کیا روتے روتے

(از جناب خواجہ محمد عبدالرؤف صاحب لکھنوی)

روح نکلے گی جو ساقی ترے ترسانے سے / سیدھی کوثر کو چلی جائیگی میخانے سے
حکما کہتے ہیں ہوتی ہے غذا جزو بدن / ہم تو تحلیل ہوئے جاتے ہیں غم کھانے سے
آپ بھی جلتے ہیں اوروں کے جلانے والے / ہم کو روشن یہ ہوا شمع کے جل جانے سے
محفل آباد رہے خیر سے خم کی ساقی / ایک دو گھونٹ چھلکتے ہوئے پیمانے سے
قطع کر رشتۂ تسبیح اگر دانا ہے / کشتِ اُمید ہری ہوگی نہ اس دانے سے

دیکھ لو چل کے ذرا سیر یہاں کی عشرت
دو قدم خانۂ اللہ ہے بت خانے سے

(از پنڈت جواہر ناتھ صاحب کول ساقی دہلوی)

کیا شرمسارِ شوق ہیں رنگِ وفا سے ہم
تقریب کوئی ہو تو ملیں دلربا سے ہم

آئینہ دِل کا صاف ہوا ذکرِ قلب سے
ہر رنگِ جلوہ ہو گئے ذوقِ صفا سے ہم

ایمن کیا ہے شیوۂ تسلیم نے مجھے
بےخوف ہو گئے ہیں ہجومِ بلا سے ہم

تم کو نہیں خیال کسی دردمند کا
شاداں ہیں یا حزیں ہیں تمہاری بلا سے ہم

تسکین ہے کوئی رنگِ تمنا نہیں رہا
فارغ ہوئے ہیں کشمکشِ مدعا سے ہم

بیرخ وُہ ہم سے گر رُخِ نازک مزاج ہے
کیونکر ملینگے شاہدِ گلگوں قبا سے ہم

بیگانہ آپ ہو گئے خلوت گزیں جو ہیں
اب کیا یگانہ ہونگے کسی آشنا سے ہم

ہے شوقِ دید حضرتِ اقبال کا ہمیں
کس دن ملینگے دیکھئے جادو نوا سے ہم

(از میر مہدی علی صاحب شہید)

دینے والے آپ ہیں الزام کے
چھیڑنے والے دلِ ناکام کے

گر اثر ہے نالۂ بیتاب میں
وُہ چلے آئینگے دلکو تھام کے

کعبۂ ابرو سے پھرنے کے نہیں
ہم بہت پابند ہیں اسلام کے

سب کو ہی معلوم تم سے عشق ہے
کیوں نہ صدقے ہوں تمہارے نام کے

جس طرف لیجائیگا جائینگے ہم
ساتھ ہیں اب تو دلِ ناکام کے

ہم وفا کے واسطے پیدا ہوئے
یہ تو کہئے آپ ہیں کس کام کے

مضطرب بےخانماں وحشت زدہ
نام ہیں یہ عاشقِ ناکام کے

کون رکھے دوستوں سے اب اُمید
سب ہیں اے دل اپنے اپنے کام کے

مر کے اُٹھے اُسکے در سے اے شہید
ایک ہی ہو تم بھی اپنے نام کے

(از جناب مظہر تھانوی)

جفا کی انتہا ہے اور میں ہوں — غم راحت فزا ہے اور میں ہوں
ستم سے بھی اب اُس نے ہاتھ کھینچا — تمنائے جفا ہے اور میں ہوں
تصوّر ہے کسی کا مونسِ غم — خیالِ دلربا ہے اور میں ہوں
رُخِ رنگیں کا اُنکے ہے تصوّر — خیالِ خوشنما ہے اور میں ہوں
نشاں ملتا نہیں کچھ قافلہ کا — بس اک بانگِ درا ہے اور میں ہوں
الٰہی کعبۂ دل کو بچانا — کہ وہ کافر ادا ہے اور میں ہوں
نگاہِ سحر آگیں پڑ رہی ہے — وہ چشمِ فتنہ زا ہے اور میں ہوں
زمانہ بر سر بیداد ہے اب — خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں
شریکِ غم نہیں فرقت میں کوئی — فقط دستِ دعا ہے اور میں ہوں
معاصی میں ملے کیا خاک لذّت — غمِ روزِ جزا ہے اور میں ہوں

رسائی یار تک مشکل ہے مظہر
کہ آہِ نارسا ہے اور میں ہوں

(از سید رضی حیدر صاحب رضیؔ)

زیبا ہے روئے یار پہ دامن نقاب کا — گویا ہے آفتاب پہ دامن سحاب کا
مستانہ چشم جوشِ جوانی دکھا گئی — نشہ چھپا نہ بادۂ حسنِ شباب کا
رہنے نہ دینگی شوخیاں اُنکی نگاہ کی — آنکھوں میں اب گذر نہیں ممکن حجاب کا
کہتی ہے مُنہ پہ چاپلی چتون یہ صاف صاف — آنکھوں کے پاس تک نہ گذر ہو حجاب کا

حیراں ہُوں مجھ سے کیوں وہ خفا ہو گئے رضیؔ
غصہ کی کوئی وجہ نہ باعث عتاب کا

بہترین کتاب

صبحِ زندگی

[illegible] کی کتاب جس کا [illegible] رسالہ [illegible] میں چھپنے سے بہت شہرت
حاصل کر چکی ہے، اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط، عمدہ قسم کے کاغذ پر چھپی ہے [illegible]
[illegible] کی کتابیں جو مہنگائی [illegible] ہیں۔ یہ کتاب [illegible] (۱۲۰) صفحہ کی
ہے [illegible] برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے تمام حالات جو [illegible]
کے پیرایہ میں [illegible] گئے ہیں اور [illegible] جس جس عمر میں جن جن باتوں کے معلوم ہونے کی
ضرورت [illegible] خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی عظمت۔ گفتار۔ کردار
[illegible] کے متعلق [illegible] بیان ایسا موثر ہے کہ ضرور دلنشین ہوتا ہے! خانہ داری کی تفصیل
[illegible] صفائی ستھرائی کے علاوہ سینے پرونے۔ چھاپنے۔ کاڑھنے کی بہت سی باتیں
[illegible] گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دیئے گئے ہیں! [illegible]
[illegible] کا [illegible] اس کتاب کی روح رواں ہے! وداع کا سماں۔ پھوپھی کا بھتیجی کو رخصت
[illegible] اور آخری [illegible] سے تعلق رکھتی ہیں! زبان کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ
[illegible] اہل زبان یعنی [illegible] اساتذہ کے مشہور مصنف مولوی محمد عبدالراشد الخیری
[illegible] تصنیف ہے۔ [illegible] واقعات یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر اتالیقی کتاب [illegible]
[illegible] قیمت [illegible] (علاوہ محصول ڈاک)

درخواستیں بنام منیجر مخزن لاہور آنی چاہئیں

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت۔ مصنفہ شیخ عبد القادر صاحب بیرسٹرایٹ لا، پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبعِ ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک [illegible]

رسومِ دہلی۔ مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ۔ قیمت مع محصولڈاک ۱۲۔

منازل السائرہ۔ مولوی عبد الراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن [illegible]

خوابِ ہستی۔ مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن [illegible]

ابو مسلم خراسانی۔ رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت [illegible]

مکتوباتِ آزاد۔ اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ با تصویر۔ [illegible]

کلامِ نیرنگ۔ سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت [illegible]

انتخابِ مخزن۔ مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک [illegible]

دردِ جاناں۔ مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ۔ ۸

دربار نمبر۔ دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ [illegible]

مثنویاتِ میر حسن۔ مثنوی بے نظیر و مہ منیر کے ساتھ مثنوی گلزارِ ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کرکے شامل کی گئی ہے [illegible]

سیرِ تبت۔ انگریزی کتاب فیئر ایز ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ۔ تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ [illegible]

مرقعِ خوشخطی۔ فنِ خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب عجب رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں، کاتبوں اور شائقینِ خط کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسنِ ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے اہتمام میں ملحوظ رکھا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کی اسوقت تک کہیں موجود نہیں [illegible]

درخواستیں بنام مینیجر مخزن۔ لاہور آنی چاہئیں

عرق ماء اللحم انگوری دو آتشہ

جس میں انگور سیب - بہی اور بیتر - بٹیر مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں و دیسی مشک و عنبر ڈال کر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک بھر میں فروخت ہو چکی ہیں - کیا دوا ہیں خالص ڈاکٹری طبیب فی بوتل میں فروخت کر سکتا ہے ہرگز نہیں

عرق ماء اللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی نازک ساخت کو مضبوط کر کے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے - بلغم پیدا ہونی بند ہو جاتی ہے - ضیق النفس (دمہ) کو نادمی - کھانسی جلد دور ہو جاتی ہے - اور جن بچوں میں سل کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق - سل - بخار - کھانسی سے مرا ہو تو بطور حفظ ماتقدم اسکے پینے سے فائدہ سکتا ہے - جن طالبعلموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو - ذہین - ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہئے - تاکہ وہ کثرت محنت سر لاغری کی وجہ سے بے وقت موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں -

دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کا ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے - سر میں درد رہتا ہے سر گھومتا ہے سر میں بوجھ رہتا ہے - آنکھیں کمزور - تکان پٹھوں میں اکڑاؤ اور بے چینی دور ہو جاتی ہے - تریاق مضرات شراب ہے -

تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی حرکت کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن تپش دل غشی اور سلسل نبض کا بند ہو جاتا ہے -

چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اخلاط ردیہ مادہ سوداویہ کی پیدائش غیر معمولی کو روک دیتا ہے اور اس کے افعال باقاعدہ بناتا ہے

پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے - ہاضمہ کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم -

چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کی باعث کثرت ادرار و رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ بھی حالت پر آ جاتے ہیں

ساتواں اثر اعضائے تناسل پر اور زنانہ پر یہ ہوتا ہے کہ تولد شدہ دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی خوشگوار زندگی گزرتی ہے - گھر کے لوگ خوش - کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے - اعضاء مسلوبہ رئیسہ نابینہ

آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ زہریلے اجزاء کو تحلیل کر کے خون صالح بکثرت پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون کر کے جسم میں تازہ جان پھونک دیتا ہے جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے -

الغرض عرق ماء اللحم اعضائے بیکار کو بکار اور خفتہ کو بیدار - غافل کو ہوشیار اور ہوشیار کو بار قرار بنا دیتا ہے

قیمت — ایک بوتل دو روپے (عہ) چھ بوتل گیارہ روپے (لعہ) درجن بوتل (ععہ)

نوٹ - (۱) بذریعہ نجات میں تین بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا - (۲) نئے خریدار قیمت پیشگی معہ فیس بذریعہ منی آرڈر داخل فرماویں (۳) بذریعہ ریلوے پارسل بھیجنے پر محصول کم لگیگا - ریلوے اسٹیشن و لائن کا پتہ صاف لکھیں - کتاب حل المشکلات پتہ لکھنے والوں کو مفت دیجائیگی

پتہ: دواخانہ ... ندوۃ الحکماء لاہور

نتیجہ تجربہ

کیا واقعی سچائی نہیں ہے؟

از خود تصدیق

تازہ شہادت جناب [illegible] تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات اسکی جس قدر تعریف کیجائے کم ہے

خضاب عالمگیر اسکی تعریف استقدر کافی ہے کہ یہ بالوں کو سیاہ کر دیتا ہے جلد پر دھبہ یا داغ نہیں دیتا۔ بالوں کو ریشم کی طرح ملائم اور چکدار بناتا ہے قیمت فی شیشی عہ

مرقد افیون اس عرق کے چند روز استعمال سے افیون بلا تکلف چھوٹ جاتی ہے مروڑ اور دست نہیں آنے پاتے

دافع بواسیر خونی ہو یا بادی تین دن میں خون بند ہو کر مسے بلا خرخشہ نابود ہو جاتے ہیں۔ ہفتہ بھر میں صحت کامل قیمت عہ

اکسیر نگاہ سرمہ دھند۔ غبار جالا۔ پھولا۔ سرخی پڑوال۔ ککرے رونکا [illegible] علاج موتیا بند کے لئے تیر بہدف۔ آنکھوں کے جملہ امراض کے لئے اکسیر ہے فی تولہ [illegible] ممیرہ فی تولہ عہ

اکسیر الحیات

حلق سے اترتے ہی فوراً کر معدہ اعضا پر اثر کرتی ہے

اکسیر الحیات

دل و جگر و دماغ و معدہ کے امراض کو دور کر کے ایک اعلیٰ طاقت بخشتی ہے۔

اکسیر الحیات

طاقت کے لئے تیر بہدف اور گئی گذری طاقت کو دوبارہ واپس لانے میں بے نظیر ہے۔

اکسیر الحیات

ضعف مثانہ کے لئے تریاق کامل اور قوت دہ ہے

اکسیر الحیات

کی ایک شیشی استعمال کرنے سے تین سیر خون صالح پیدا ہوتا ہے اور چہرے کی بے رونقی اڑ جاتی ہے۔ چہرہ چمکیلا ہو جاتا ہے۔

اکسیر الحیات

کا استعمال تھوڑے عرصہ میں کایا پلٹ کر دیتا ہے ایک کمزور دبلے پتلے آدمی کو پرزور بنا دیتا ہے۔

اکسیر الحیات

کی ان گنت خوبیاں ہیں جو لکھنے میں نہیں آسکتیں غرضکہ تمام امراض جسمانی کا حکمی علاج فی شیشی عہ

تازہ شہادت۔ جناب شیخ [illegible] ساکن [illegible] تحریر فرماتے ہیں کہ آپکی ایجاد کردہ اکسیر الحیات بہت [illegible] مجھکو ثابت ہوئی ہے [illegible]

گلگونہ ترکی اگر آپ حسن اور حسن میں دلفریبی کی شان پیدا کرنی چاہتے ہیں تو مزید گلگونہ ترکی منگائیں چہرہ کے تمام قسم کے داغ کیل چھائیاں دور کرنے کے بعد مثل گلاب بنا دیتا ہے جس بیت احباب [illegible] فرمائیں۔ قیمت عہ

ہیرا تیل خوشبودار روغنی دل دوستو! ہم نے آپکی خاطر کیا اعلیٰ اور خوشبودار تیل ہیرا تیل بنایا جس کی خوشبو مشک و عنبر کو مات کرتی ہے۔ بالوں کو نرم اور ملائم اور چکدار رکھنے بنانے کے علاوہ درد سر کو مفید ہے۔ دماغ کی کمزوری اور خشکی دور کرتا ہے اور بار بار لگانے سے پہاڑی [illegible] ہو جاتا ہے

صاف [illegible]

ڈاکٹر محمد علی سنیاسی فیح ایل ایم ایس شفاخانہ مشیر صحت شہر فیروز پور پنجاب

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپے کس طرح ہو گئے

موجودہ حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شراکت غیرے مالک ہو گیا ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک اس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۸۸۳ روپیہ تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سنیئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر بی باتن صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر پایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک دیکر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی آگ سے چاق اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تمام عمر بھی ان پر [illegible] ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچرر دیں معزز عہدہ داروں سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ امتیازانہ قدرت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۸۸۳ روپے روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اس وقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لیے لاثانی دوا ہے۔ ہر بچپن کے زمانہ یا جوانی کے بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت عمل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کا اثر رکھنے والی دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت انشاء اللہ ایسی ہو [illegible] میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ جیسے ہی ابتداء میں حاصل ہوتی ہے استعمال کر کے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی [illegible] روپے آنہ (۶)

[illegible] ڈاکٹر کیمیا گر پروپرائٹر شفا خانہ عام لاہور سے طلب کرو

چھپکر تیار ہے

خیالستان

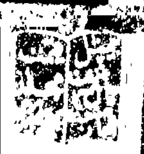
یعنی

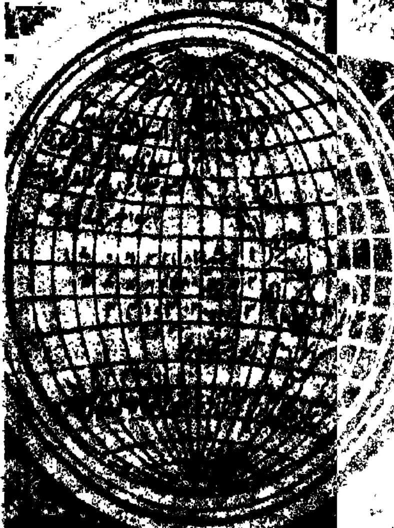
سید سجاد حیدر صاحب بی۔اے کے مصنفہ قصوں اور مضامین کا مجموعہ

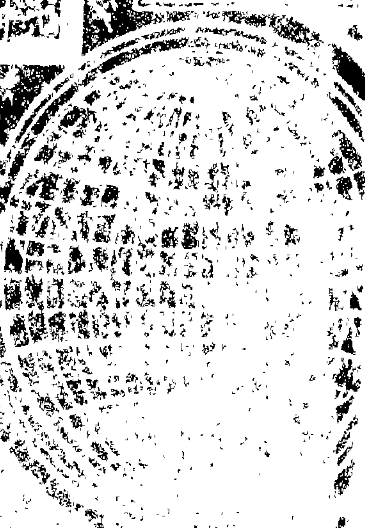
یہ کتاب پونے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت خوشقلم چھپی ہے۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ سرورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں۔ ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔اے نے لکھکر اس دلچسپ مجموعہ کے کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔

سید سجاد حیدر صاحب کے اچھوتے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں۔ محتاج بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات ایسی فرمائشیں آئی ہیں کہ مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون تھا۔ تلاش کر کے ایک روپیہ کا وی۔پی کر دیجئے۔ اب انکے وہ سب مضامین جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یکجا نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں۔ **قیمت** علاوہ محصولڈاک دو روپے (۲) شائقین جلد منگوائیں۔

مینجر رسالہ مخزن میکلگن روڈ لاہور







طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی نے جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے اطراف ہند میں اس کار اہم کیلئے سب کی نظریں ان ہی کی طرف اٹھتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو ان ہی کی ذات سے ہیں اور ان ہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک احساس فرض کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس اہم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساس فرض کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمر ہے گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی کاروبار کی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اسلئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں ہے۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز ساخت میں تہذیب و ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کیلئے عام طور پر اطبا برتتے ہیں بلکہ حکما کے وہ اعلیٰ نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصل اصول اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور مناسب قیمت پر تیار ہوتے ہیں۔ اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے۔ نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک بیش بہا جوہر ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس جوہر کا گنجینہ ہے اسلئے تمام ابنائے وطن کو ان اعلیٰ و منتخب یونانی ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام سے تیار ہوتی ہیں فائدہ اٹھانا اور اسکی ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقع ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام و حسن معاملہ کے سبب تھوڑے عرصہ میں اس دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی

خط و کتابت کا پتہ {منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی} تار کا فی پتہ: میڈیسنز



ہندو مسلمانوں کے تعلقات - مولوی محمود علی صاحب - ۱
پلیگ مینس - ۱۷
فیثا غورس - مولوی محمد خلیل الرحمن صاحب - ۲۷
میر انیس اور ہم - سید مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی - ۳۷
بیہم فراقش - مس نرندر ناتھ صاحبہ - ۴۴
تصویر کے دو رخ - ۴۹

نظم

کلام اکبر - سید اکبر حسین صاحب پنشنر (الہ آباد) ۵۹
نظر حسرت - مسٹر وہاج الدین حمید صاحب بیرسٹر لکھنؤ ۶۰
دل بیقرار - منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی - ۶۱
... - جناب حفیظ جونپوری - ۶۲

سید الشہداء - غلام محمد ...
قدیم ... ۹۳
بھوپال - مولوی سید احمد علی صاحب ... ۹۴
قطعہ عزیز - مرزا محمد ہادی صاحب عزیز ۹۷
کابلی - سید امیر حیدر صاحب بخت - ۹۹

از حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف الصدق حضرت جلال لکھنوی ۱۰۱
از جناب احمد علی صاحب شوق قدوائی لکھنوی - ۶۲
از جناب محشر بھوپالی - ۶۲

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے۔

... مطبع ... میں چھپا اور منشی فضل الٰہی مرغوب رقم نے شائع کیا

قیمت ... مع محصول ڈاک قسم دوم ... ایک پرچہ ۴ر

مخزن

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

"ہندو مسلمانوں کے تعلقات" ایک ایسا مبحث ہے جو اول تو ہمیشہ ہی اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ ہندوستان کی فلاح و بہبود کا مدار اس مسئلہ کے حل ہونے پر موقوف ہے۔ لیکن اندنوں میں خصوصیت سے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حال میں ہندو مسلمانوں کے سرآوردگان قوم نے الٰہ آباد میں ایک جلسہ کر کے یہ قرار دیا ہے کہ رفع تنازعات کی تدبیریں ہونی چاہئیں مولوی محمود علی صاحب پروفیسر رندھیر کالج کپورتھلہ نے بہت عمدگی سے اس مضمون کے مختلف پہلوؤں پر نظر ڈالی ہے:۔

تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کے تعلقات کشیدہ ہیں۔ بلکہ کشیدگی عداوت تک پہنچ گئی ہے اور یہ بھی سب کو مسلّم ہے کہ اس اختلاف سے اخلاقی۔ اقتصادی۔ سیاسی اور مذہبی غرض بہت سے نقصان ہیں جو فریقین برداشت کر رہے ہیں۔ نیز یہ خواہش بھی اکثر فہمیدہ افراد کو ہے کہ یہ اختلاف دور ہو جائے لیکن کوشش کی جانب آجتک ایک قدم بھی نہیں اٹھا اور کوشش تو ایک جانب اخباروں میں جو قدر مضامین اس اختلاف کو بڑھانے اور ایک فریق کو دوسرے کے مظالم سنانے اور کینہ

وعداوت کو بھڑکانے کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ اتفاق پیدا کرنے کے تذکرے اُنکے مقابل میں کچھ بھی نہیں۔ اور اخباروں کو تو اس ملک میں ابھی ملکی مصلحت اندیشی اور خیرخواہی کا حامی تسلیم کرنے میں تامل بھی ہے اور وہ باستثنائے اندک قوم کے بگڑے ہوئے مذاق سے فائدہ اُٹھاکر اپنی گرمی بازار سے مطلب رکھتے ہیں تعجب اُن قومی مجمعوں پر ہے جن میں عموماً قوم کے روشن خیال بزرگوار اور قومی اور ملکی مصلحتوں کو بخوبی سمجھنے اور سمجھانے والے جمع ہوتے ہیں وہ بھی اکثر اپنی قومی حقوق کی حفاظت کرتے ہوئے دوسروں پر حملہ کرتے اور عداوت بھڑکاتے تو دیکھے جاتے ہیں لیکن باستثنا بعض تقریروں کے کسی کانفرنس کسی کانگریس۔ کسی انجمن اور کسی سبھا میں کبھی یہ ریزولیوشن پیش نہیں ہوا کہ "ہمارے نزدیک ہندو مسلمانوں کا اختلاف ملک کے لئے اور دونوں قوموں کے لئے مضر ہے اور ضرورت ہی کہ ہر فریق عداوت کے خیال کو مٹا کر اپنی قوم کے ساتھ دوسری قوم کے فوائد کو بھی ملحوظ رکھے اور حتی الوسع دوستانہ امداد دے"۔ تعلیمی ضرورت مسلّم ہے۔ پولٹیکل اغراض مقدم ہیں۔ اُنکے لئے تو اکثر سنا گیا ہے کہ عمدہ مضامین لکھنے کا اہتمام ہوا ہے اور اچھی تجویز پیش کرنے پر توجہ کیجائیگی۔ مگر ملک میں اتفاق کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے اور ابتک کوئی ایسی تحریک سُننے میں نہیں آئی تھی کہ عداوت ونفاق کے اسباب اور اُن کو دُور کرنے کے ذرائع دریافت کرنے کے لئے غور کیا جائے۔ البتہ اب اب کچھ آواز پیدا ہوئی ہے اور کہیں کہیں یہ چرچے ہونے لگے ہیں اور چند ایک مضامین بھی دیکھنے میں آئے ہیں لیکن مسئلہ مہتم بالشان ہے ایک دو تحریروں سے حل ہونے والا نہیں۔ ضرورت ہے کہ ملک کے سب بہی خواہ غور کریں اور اسباب عداوت کو تشخیص اور دفعیہ کی تدابیر کو معین فرمائیں۔ اور اس مرحلے کو ٹھنڈے دل سے اور قومی طرفداری سے الگ ہو کر طے کرنے کے بعد وہ وقت آسکیگا کہ

اتفاق اور اس کے نتائج سے بہرہ اندوز ہونے کا موقع ملے۔

اگرچہ اس مضمون کی جانب توجہ نسبتاً عدم کے برابر ہے مگر پھر بھی اسباب عداوت بہت سے سُننے میں آتے ہیں ہر شخص نے کسی نہ کسی واقعہ کے باعث عداوت ہونے پر یقین کر چھوڑا ہے اِس لئے متخیلہ کا رستہ صاف ہے اور تسلیم شدہ اسباب کو دیکھنے کے بعد عداوت کی حقیقی وجہ تک پہنچ جانا ممکن ہے۔

گاؤکشی - اکثر کہنے والے اور بالخصوص ہندو خیال کرتے ہیں کہ ان کے مذہب میں گائے کی تعظیم فرض ہے اور مُسلمان گاؤکشی کے عادی ہیں اس لئے ہندو اس ظلم کو دیکھ نہیں سکتے اور مُسلمانوں سے عداوت رکھنے پر مجبور ہیں۔ اِس بارے میں اسقدر تسلیم کرنے میں تو مجھ کو تامل نہیں کہ اگر گائے کو ذبح کرنے کی ضرورت نہ ہو اور صرف اس خیال سے ذبح کیجائے کہ ہندو ہمسائے جلیں اور پیچ کھائیں تو ایسا فعل سخت مذموم ہے اور ہمارے مذہب نے ہمسایوں کی رعایت بلاقید مذہب فرض قرار دی ہے۔ قرآن پاک میں جَارِ الْجُنُبِ یعنی اجنبی ہمسائے پر احسان کرنے کا حکم ہے اور ہمارے ہادی (رُوحی فداہ) کا ارشاد ہے کہ مجھے ہمسائے کے ساتھ رعایت کرنے کی یہانتک تاکید کی گئی ہے کہ مَیں خیال کرتا تھا کہ شاید اسکو ورثہ میں شریک کیا جائیگا۔ اور ایک موقع پر ارشاد ہے کہ وُہ ہرگز مُسلمان نہیں جسکے ہمسائے کو اس سے تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اور نیز اگر کسی کام میں کچھ فائدہ نہ ہو تو اسلام میں اسکو لغو کہتے ہیں اور قرآن نے لغو کو ناجائز قرار دیا ہے۔ چہ جائیکہ اس کے ساتھ ہمسایوں کے ناراض ہونے کی مضرت بھی ہو۔ لیکن مسلمانوں کے اس فعل کو باعثِ عداوت قرار دینے سے پہلے یہی سوچنا چاہئے کہ گاؤکشی کی رسم ہندوستان میں مُسلمانوں کے ساتھ آئی ہے اور اس زمانے میں ہندوؤں کے اندر گائے کے دیوتا اور اوتار ہونے کا خیال بھی لفظی معنوں میں موجود

تھا لیکن اختلاف ایک طرف ملک گیری کی لڑائیاں ختم ہو جانے اور ملک میں امن قائم ہونے کے بعد ہمیشہ ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جاتے رہے ہیں اور ایک دوسرے کے لئے جان تک قربان کرنے میں دریغ نہیں کرتے رہے۔ اور اب جبکہ گائے یا دیگر حیوانات کو دیوتا سمجھنے کا خیال معدوم ہوتا جاتا ہے۔ عداوت کی آگ بھڑکتی جاتی ہے اب بھی ہندو پارٹی کا جو حصہ قدیم مذہب پر قائم ہے اور گائے کی پرستش کرتا ہے۔ دیکھا جائے تو اس پارٹی میں عداوت کے خیالات بہت کم ہیں۔ اور ان میں سے اکثر مسلمان بزرگوں کو مانتے۔ اُنکے مزاروں پر منتیں چڑھاتے اور مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتے ہیں اور اختلاف جسقدر ہے اُسی جدید پارٹی کو ہے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے بہت قریب آگئے ہیں اور خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے اور اپنے اصول کے رو سے گائے کو بھیڑ بکری کی طرح صرف ایک مفید جانور مان سکتے ہیں پس جب گائے کو مذہبی عظمت دینے والے اختلاف نہیں رکھتے یا کم رکھتے ہیں اور اسکو جانور سمجھنے والوں کا دل صاف نہیں تو معلوم ہوا کہ گاؤکشی عداوت کا باعث نہیں بلکہ عداوت کسی اور وجہ سے ہے اور اس کو بھڑکانے کے لئے گاؤکشی بطور ایک موثر حیلہ کے پیش کیجاتی ہے۔

دُوسرے گائے کی مذہبی عظمت بیشک ہندوؤں کے تمام قدیم فرقوں میں ہے۔ لیکن گائے کے علاوہ اَور جانور بھی ہیں جنکو بعض فرقے واجب التعظیم سمجھتے ہیں۔ بلکہ بعض یا یُوں کہنا چاہیئے کہ ہندوؤں کا اکثر حصہ جیو ہتیا کو ناجائز اور ظلم جانتا ہے اور ان میں سے بعض مُنہ پر پٹی باندھتے ہیں اور پاؤں میں جوتی نہیں پہنتے کہ فضا کے کیڑے تلف ہوں۔ ان سب کے خلاف خود بعض ہندو گوشت کو علانیہ استعمال کرنے والے موجود ہیں۔ پس اگر گائے پر ظلم کرنے سے

مسلمان قابلِ عداوت ہیں تو دیگر جانوروں کی ہتیا کرنے والے ہندوؤں سے سانپوں تک کو دُودھ پلانے والے ہندو ضرور مخالف ہونے چاہئیں لیکن ایسا نہیں ہوا اور واقع میں جو بات ایک شخص کے مذہب میں جائز مان لیجائے ناجائز کہنے والے اُسکو مجبور کرنے کا حق نہیں رکھتے - اِس لئے جو لوگ ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے اور دُوسرے کے افعال اور اختیارات میں دخل نہیں دیتے وُہ عقلمند ہیں۔ اور جو اِس لئے عداوت رکھتے ہوں کہ دُوسرے لوگ ہمارے مذہبی حکموں کی تعمیل کیوں نہیں کرتے اور جس فعل کو ہم ناجائز سمجھتے ہیں اُس کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں۔ قوم کے عقلمندوں پر فرض ہے کہ ایسے نادانوں کو سمجھائیں نہ یہ کہ اُنکے لئے غیر مذہب والوں سے عداوت پیدا کریں -

تیسرے اگر مسلمان گائے کو اِس لئے ذبح کرتے ہوں کہ ان کو اس کی ضرورت ہے یا وُہ صحیح طور پر یا نادانستہ اسکو مذہبی فرض سمجھتے ہیں تو خواہ ہندوؤں کے نزدیک مسلمان ضرورت سمجھنے یا مذہبی حکم ماننے میں غلطی پر ہوں وُہ اپنے نقطہ خیال سے مجبور ہیں اور ان کو ایسے فعل پر اگر وُہ غلط ہے انصاف کے رُو سے سمجھانا فرض ہے نہ کہ عداوت کرنی اور نقصان پہنچانا۔ اور اگر اس لئے ذبح کرتے ہیں کہ ہندوؤں کو رنج پہنچے تو ایسے ہمسائے جن کے ساتھ پُشت ہا پُشت سے بود و باش ہو۔ اور آپس میں روزانہ ہزاروں طرح کا ضروری اور رواداری لین دین ہوتا ہے انکو چڑانے اور رنج پہنچانے کا خیال پیدا ہو اس کا بھی کوئی باعث ہونا چاہئیے بے وجہ ایسی حماقت نہیں ہو سکتی۔ اِس لئے اگر مان لیا جائے کہ مسلمان اُنکو چڑاتے ہیں تو عداوت کا وجود اس سے پہلے ہوگا جس سے چڑانے کا خیال پیدا ہوا۔ اِس لئے عداوت کا باعث گاؤ کشی نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور گاؤ کشی کا فساد اُس کا نتیجہ سمجھنا چاہئیے -

غرض اگرچہ میں دل سے چاہتا ہوں کہ مسلمان اپنے اختیار سے اپنے ہمسائیوں کے مذہبی نفرت کا خیال کرکے ہز مجسٹی امیر کابل کی مثال کی پیروی کریں اور جہاں تک ہوسکے گاؤکشی کی رسم کو کم کردیں۔ مگر اس خیال کو یقیناً غلط سمجھتا ہوں کہ گاؤکشی سے ہندو مسلمانوں میں عداوت پیدا ہوئی ہے۔ البتہ اب عداوت پیدا ہونے کے بعد اس خیال کو پیش کرکے نادانوں کو بھڑکایا جاتا ہے اور اس وجہ سے جو لوگ نفرت کرنے لگے ہیں دانا ہندوؤں کا فرض ہے کہ انکو سمجھائیں اور بھڑکانے والوں کی نیت ظاہر کریں۔ اس بارے میں بعض گورکھشا سبھاؤں نے جو روش اختیار کی ہے میرے نزدیک نہایت ہمدردانہ نہایت مفید اور نہایت مناسب ہے اور وہ لوگ مسلمانوں سے نفرت رکھنے اور گاؤکشی کے بہانہ سے مسلمانوں کو بھڑکانے کی بجائے اس طرح سے گائے کی خدمت زیادہ کرسکتے ہیں اور اگر اپاہج جانوروں کی خبرگیری کے ساتھ عمدہ نسل پیدا کرنے کا بھی انتظام کیا ہے تو ایک مفید نسل کو ترقی دینے کے خیال سے یہ بھی مناسب ہوگا کہ مسلمان ان لوگوں کا ہاتھ بٹائیں اور اس نسل کی حفاظت اور افزائش میں مدد دیں۔

مذہبی خیالات۔ بعض طبیعتوں کو مسلمانوں کا مسلمان اور ہندوؤں کا ہندو ہونا بھی اختلاف کا سبب معلوم ہوتا ہے اور وہ لوگ مذہبی اختلاف کے ساتھ قومی اتفاق کو ناممکن سمجھتے ہیں۔ بیشک مذہبی اختلاف جبکہ کوئی مذہب نیا پیدا ہو مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے۔ کیونکہ ادھر نیا مذہب لانے والوں میں ایک جوش ہوتا ہے اور اپنے عقاید کو زور کے ساتھ ظاہر کرتے اور انکی اشاعت کی آرزو رکھتے ہیں اور ادھر پرانے مذہب والے پہلی بار اپنے مذہب کی تردید سننی گوارا نہیں کرتے اور اس طرح پر حسب موقع جنگ و جدال کشت و خون مقدمات یا سخت کلامی تک نوبت پہنچتی ہے اور کئی کئی طرح کی رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن پھر رفتہ رفتہ ادھر والوں کا جوش کم ہونے لگتا ہے اور ادھر والوں کو نئی بات سنتے سنتے مساوات ہو جاتی ہے۔

اور مخالفت کی جگہ صرف اختلاف رائے رہجاتا ہے اور دشمنی کی جگہ مصالحت عود کر آتی ہے ہندو مسلمانوں پر یہ سب مرحلے گذر چکے ہیں۔ اب نہ مسلمان اس ملک میں نئے آئے ہیں اور نہ ہندوؤں نے یہ خیالات پہلے پہل سُنے ہیں۔ اس لئے یہ تازہ عداوت جو پیدا ہوئی ہے اس کا باعث مذہبی اختلاف نہیں۔

مذہبی بحثیں۔ البتہ مذہبی بحثوں کی جیسی کچھ آزادی اور خیالات کو مشتہر کرنے کی جیسی کچھ سہولت اس زمانے میں ہے پہلے نہ تھی اور بیشک اس آزادی اور اس سہولت سے فائدہ اُٹھا کر ہر دو فریق نے اپنے خیالات کی اشاعت پہلے سے زیادہ کی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ بہت کچھ سختی اور دل آزاری کا رواج ہوگیا ہے اور مُلک کے بہت سے دانا اس کو عداوت کا باعث قرار دیتے ہیں۔ گو اس میں تو شک نہیں کہ ایسے مباحثے جو تہذیب اور انسانیت سے بہت دور ہیں عداوت کو ترقی دیتے ہیں اور اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو چونکہ دونوں طرف جاہل زیادہ ہیں ممکن نہیں کہ کبھی مصالحت پیدا ہو۔ اور بدقسمتی سے مُلک کا مذاق ایسا بگڑا ہوا ہے کہ ان خلاف تہذیب تحریروں کو جائز سمجھا جاتا ہے اور محض حق کو تلاش کرنے کے لئے مہذبانہ گفتگو کسی کو پسند نہیں اس لئے امید بھی نہیں کہ یہ زہریلی ہوا ملک سے جلدی نکل جائیگی۔ لیکن ان سب باتوں کو مان کر بھی صرف مذہبی بحث کو عداوت کا سبب قرار دینے میں تامل ہے۔ دیکھنا چاہیئے کہ ایک تو مذہبی اختلاف ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ وہ ایک عرصے کے بعد مخالفت کا باعث نہیں رہتا اور یہاں وہ عرصہ گذر چکا ہے اور ایک اپنے اختلافی خیالات کو تہذیب کے ساتھ ظاہر کرنا اور دوسرے کے خیال کو نرمی کے ساتھ غلط ثابت کرنا۔ یہ بھی ابتدا میں مخالفت کا باعث ہوا کرتا ہے اور نئے مذہب کی نرم بات بھی گوارا نہیں ہوتی مگر ایک عرصے میں یہ بات نہیں رہتی اور خدا کو نہ ماننے والے کا انکار اور جسمانیات

کو خدا جاننے والے کا احترام بھی معلوم نہیں ہوتا اور ہم روزانہ اپنے دوستوں میں
اپنی بحثیں کرتے رہتے ہیں اور جب تک تہذیب کی پابندی رہے رنج پیدا نہیں ہوتا
اور پھر اگر کوئی شخص جوش میں تیز ہو جاتا ہے اور ناگوار کلمہ کہہ بیٹھتا ہے۔ اگر
خالص دوستوں کا مجمع ہے تو اُس کو ہنسی میں اُڑا دیا جاتا ہے اور اس شخص کو غصیلا
اور پاگل کہکر ٹال دیتے ہیں۔ لیکن اگر کسی مجمع میں دو ایسے شخص موجود ہوں جن میں
پہلے سے رنجش ہے اور ان میں ایسی زیادتی ہو جائے تو پھر بات کا بتنگڑ بنجاتا
ہے اور بحث سے لڑائی ہونے لگتی ہے۔ اُس وقت کہنے کو یہی کہا جاتا ہے کہ
اُس نے بدتہذیبی کی تھی۔ ہمارے پیشواؤں کو بُرا کہا تھا یا کُفر کا کلمہ بولا تھا۔
اِس لئے غصہ آگیا مگر حقیقت میں لڑائی کا باعث وُہی پہلی رنجش ہوتی ہے اور
یہ فعل اُس رنجش کو پوشیدہ سے ظاہر کر دینے کا اور آئندہ کے لئے بڑھا دینے
کا باعث ہوتا ہے۔ اب دیکھنا چاہیے کہ ہندو مُسلمانوں کا مذہب نیا نہیں۔
ہندوستان میں اس میل کو ہزار برس سے زائد گذر گئے اور اس عرصے میں جس قدر
اشاعت مسلمانوں کے عقائد کی ہندوؤں میں اور ہندوؤں کے عقائد کی مُسلمانوں
میں ہو چکی ہے۔ آجکل کے پریس اور اخباروں نے اس سے زیادہ واقفیت کیا
پیدا کر دی ہوگی۔ اِس لئے صرف اتنی بات سے آج مخالفت پیدا ہونے کا کوئی
موقع نہیں۔ رہیں مذہبی دل آزار تحریریں انکو اس آزاد زمانے میں شروع بیشک
دو ایک ہندو مسلمان مذہبی دیوانوں نے کیا ہوگا۔ مگر بجائے انکے اس نئے فعل پر
لعنت بھیجنے کے اب جو بعض آریا اور بعض مُسلمان مذہبی اخبار نویس اور پیشہ ور
بحث کرنے والوں نے ایک دُوسرے کو گالیاں دینے کا طریق اختیار
کر لیا ہے اور پبلک اُن کی تحریروں کو اس شوق سے دیکھتی ہے کہ اُن کے
برابر اشاعت اور اخباروں کی نہ ہوگی تو اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ پہلے کی

دونوں فرقوں میں رنجش ہے اور اب ایک دوسرے کی گالی گلوچ اس رنجش کا بدلہ لینے اور مخالفانہ جذبہ کو بھڑکانے کا باعث ہو رہی ہے - اس لئے میں عداوت کا نشان ان دل آزار تحریروں سے پہلے دیکھتا ہوں اور باہم گر علت و معلول نہیں سمجھتا -

اس استدلال میں ایک نقص رہ گیا کہ آریا پارٹی ایک جدید فرقہ ہے اور ان میں جدت کے سبب سے جوش بھی بعید ہے - اگرچہ آریا نے پرانے ہندوں کے بہت سے وہ خیالات چھوڑ دیئے ہیں جن سے مسلمانوں کو اختلاف تھا تو اگر رواداری اور تحمل سے کام لیا جاتا تو مذہبی خیال سے پرانے ہندوں کی نسبت انکے ساتھ زیادہ دوستی ہو سکتی تھی - مگر انہوں نے چھوٹتے ہی تمام مذاہب کی تردید اس بد آہنگی سے کی کہ دلوں میں ناسور ڈال دیئے اور اُدھر بعض جواب دینے والے بھی ایسے جوشیلے نکلے کہ مخالفت کی آگ بیش از پیش بھڑکتی گئی اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ ہندو مسلمانوں کی عداوت کا باعث ہندو مسلمانوں کا مذہبی اختلاف نہیں تو آریہ مسلمانوں کا مذہبی اختلاف ضرور ہوگا - کیونکہ یہ تازہ پیدا ہوا ہے اور ابھی مخالفت کے عرصے کو طے نہیں کر چکا - لیکن میں جو عداوت کو اس اختلاف پر مبنی نہیں سمجھتا تو اس لئے کہ کچھ تو باعث ہوگا جس سے آریا نے مذہبی حیثیت سے قریب آنے کے باوجود مسلمانوں سے لڑائی اور زیادہ ٹھان لی اور دوسرے آریہ پارٹی کا اثر پنجاب اور ممالک متحدہ میں زیادہ ہے اور اس سے آگے کہیں تو کچھ بھی نہیں اور کہیں ہے مگر کم - لیکن مخالفت اور کاوش اگر موجود ہے تو وہ پنجاب کے ہندو مسلمانوں میں جس قدر ہے اسی شدت سے بمبئی پریسیڈنسی اور بنگال کے روشن خیال طبقہ میں موجزن ہے اور جو سکائیں

یہاں ہیں وہی وہاں پائی جاتی ہیں۔ اس لئے اگر آریاؤں کا اختلافِ مذہب مخالفت کا باعث ہو جب بھی اس کے علاوہ ایک اور سبب ضرور موجود ہے جس نے یہاں سے وہاں تک تمام ایسی جگہوں میں آگ لگا چھوڑی ہے جہاں آریا اثر نہیں پہنچا۔

مسلمان بادشاہوں کے مظالم۔ کہتے ہیں کہ ہندوؤں کو مسلمان بادشاہوں کے ظلم وستم نہیں بھولتے اور وہ مسلمانوں سے صاف نہیں ہو سکتے اور مسلمان ہندوؤں کے ایسے تذکروں سے ناراض ہوتے ہیں۔ اس لئے عداوت چلی جاتی ہے۔ لیکن غور کرنے کی بات ہے کہ اگر کسی خاص مسلمان بادشاہ کے ہاتھ سے کسی خاص ہندو یا کسی جماعت کو تکلیف پہنچی ہے تو ایسے بادشاہ بھی مسلمانوں ہی میں گذرے ہیں جو نہایت رحمدل و فیاض منصف اور منتظم تھے تاریخ کو دیکھا جائے تو ایسوں کی تعداد زیادہ نکلیگی بہ نسبت ان لوگوں کے جنکے تعصب اور ظلم کی فریاد کی جاتی ہے۔ پس اگرچہ ہندوؤں کا مسلمانوں کے مظالم کو یاد کرنا اور دہرانا مسلمانوں کو برا معلوم ہوتا ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ہندوؤں کو اس کی ترغیب کیوں ہوئی۔ ایک آدھ بادشاہ کی جگہ وہ سب بادشاہوں کو ظالم کہیں اور ایک آدھ سچے واقعے کی جگہ سیکڑوں غلط روایتیں ظلم وجور کے متعلق اختیار کریں اور بجائے کسی بادشاہ کا ذاتی فعل کہنے کے ان مفروضہ ظلموں کو مسلمان بادشاہوں کا اور اسلام کا خاصہ قرار دیں۔ علاوہ پھر جب وہ سب معاملہ گذر چکا اور جو لوگ انکے خیال میں ظالم تھے مر چکے اور اب جو مسلمان زندہ ہیں انکو ان افعال میں کوئی دخل نہیں تو ان لوگوں سے عداوت رکھیں۔ صرف اس وجہ سے کہ ان کے ہم قوم بادشاہ گذشتہ زمانے میں ہم پر ظلم کیا کرتے تھے یہ سب زبردستیاں بغیر کسی پہلی کاوش کے

سلیم المزاج آدمی کے دماغ میں نہیں آسکتیں۔ چہ جائیکہ خواہ مخواہ ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم اُنکے ارتکاب کو اپنا مشن بنا لے اور رات دن تحریر و تقریر میں غلط روایتوں کا وظیفہ رٹے۔

چھوت کا مسئلہ۔ ہندوؤں کا چھوت کا رواج بھی بعض لوگوں کو رنجش کا سبب معلوم ہوتا ہے اور جب کبھی سودا لینے کے لئے ہم ہندو دکان پر جاتے ہیں اور وُہ کہتا ہے "میاں جی پرے پرے" اور اُدھر ہم سے زیادہ میلے لباس اور میلے جسم کا کوئی ہندو آکر اسی دوکان سے کوئی کھانے کی چیز ہاتھ میں اُٹھا کر بھاؤ پوچھتا ہے اور ہمارے ہاتھ پر مٹھائی کا دونا اُوپر سے پھینک دیا جاتا ہے۔ تو ایسا سلوک بیشک ازحد ناگوار گذرتا ہے۔ ہندو اگر اس رسم کو ترک کردیں تو ملک کی قسمت میں بڑا انقلاب پیدا کرینگے۔ مگر جب دوکاندار خود میلے ہوتے ہیں اُن کے ہندو گاہک میلے ہوں جب بھی ہاتھ لگا سکتے ہیں اور ہم صاف سُتھرے ہوں جب بھی دامن سے چھونے کے قابل نہیں۔ اس منظر کو دیکھکر میں تو دل میں ہنسا کرتا ہوں۔ کیونکہ ہم پر کیا منحصر ہے اُنکے ہاں آپس میں اعلیٰ ذات کا ہندو ادنیٰ ذات کے ہاتھ کا پکا نہیں کھا سکتا حقہ نہیں پی سکتا۔ البتہ کلی پی سکتا ہے۔ کوئی برتن کو مُنہ لگا کر پانی پی لے جب تک مٹی سے مانجھ نہ لیا جائے سگا بھائی مُنہ نہ لگائے گا۔ ہاں چاندی یا سونے کا برتن ہو تو مانجھنے کی ضرورت نہیں۔ اُس میں ناپاکی نہیں گھُستی۔ اپنے گھر کا کھانا کھانے بیٹھیں تو باپ بیٹا اور بھائی بھائی ایک برتن میں نہیں کھا سکتے۔ چوکے میں کھانا کھانے جائیں تو خود انکا اپنا بدن بھی گندہ ہے نہا کر آئیں۔ دھوبی کے دھوئے کپڑے گندے ہیں۔ نہا کر وہی دھوتی اپنے ہاتھ سے نچوڑ لیں تو پاک ہو۔ وُہ باندھ کر کھانے بیٹھیں۔ غرض اُن کے

ہاں چھوت کے مسائل ایسے عجیب اور خلاف قیاس ہیں کہ سب کو دیکھنے کے بعد غصہ نہیں آتا۔ تعجب رہ جاتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ صرف مسلمان کی چھوت دیکھکر اکثر دلوں میں غصہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ کام بھی آج کا نہیں اور ہمارے باپ دادا صدیوں سے باوجود ان پر حاکم ہونے کے یہی سلوک دیکھنے کے عادی ہیں اس لئے اب اگر محض اس وجہ سے غصہ آیا ہے تو کیوں آیا۔ اور کیا بات دل میں سمائی کہ جو کام سیکڑوں برس سے دیکھتے تھے اور بُرا نہ مانتے تھے اب اسی کام پر دفعۃً جھلا اُٹھے۔ ضرور کوئی وجہ ہے اور وہی وجہ عداوت کا باعث ہے۔

طلب حقوق۔ ایک وجہ یہ بھی خیال کی جاتی ہے کہ مسلمانوں نے گورنمنٹ سے حقوق طلب کرنے میں ہندوؤں کا ساتھ نہیں دیا اور اپنے لئے جداگانہ حقوق طلب کرنے لگے۔ جس پر ہندوؤں کو طیش آیا اور یہ بھی اُن کے حقوق کے خلاف اور اپنے خاص حقوق کے متعلق کوشش کرنے لگے۔ اس واقعے سے انکار نہیں اور بیشک مسلمانوں نے کانگریس اور سیلف گورنمنٹ کے بہت سے مطالبات میں ہندوؤں سے اختلاف کیا مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان بعض مطالبات کو جو ہندوؤں کی طرف سے پیش ہوئے نامناسب سمجھتے ہیں اور اس خیال سے وہ مجبور ہیں کہ ایسے مطالبات میں شریک ہوں۔ کچھ حقوق جو وہ جداگانہ طلب کرتے ہیں انکو اپنی قوم کے لئے ضروری سمجھتے ہیں اور حتی الوسع ہندوؤں کے حقوق میں دست اندازی کرنی نہیں چاہتے۔ پس اگر اس سے پہلے دلوں میں صفائی ہوتی تو ملکی معاملات میں اختلاف رائے اور حقوق کا معاملہ ایسا نہ تھا جس پر عناد پیدا ہو جاتا۔ ایسا اختلاف اور ایسے قانونی جد و جہد اور ملکوں میں بھی ہوتے ہیں۔ انگلستان کے اندر پولیٹیکل

معاملات میں کئی کئی فریق موجود ہیں اور ہر فریق اپنی رائے الگ اور اپنے حقوق جداگانہ رکھنے کا دعویدار ہے۔ یہی حال میں عوام اور اُمراء کے حقوق میں بحث ہو رہی ہے۔ عوام انکا جداگانہ مجلس قائم کرنے کا حق نہیں سمجھتے اور اُمرا اپنے دیرینہ اختیارات کو چھوڑنا نہیں چاہتے۔ اپنی اپنی کوشش میں کوئی دقیقہ باقی نہیں چھوڑا جاتا۔ لیکن باوجود اس کے انگلش نیشن ایک چیز ہے اور عناد و عداوت کا کوئی نشان نہیں۔ حلف شاہی کے الفاظ پر رومن کیتھولک فرقے کو اعتراض ہے۔ بعض پروٹسٹنٹ الفاظ کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ پارلیمنٹ میں بحث زور سے ہوئی۔ مگر کینہ وری سے واسطہ نہیں اور یہ سب اس لئے کہ پہلے سے کوئی عناد موجود نہیں اور حقوق پر اصرار کرنا اور رائے میں اختلاف رکھنا تقاضائے بشریت سمجھا جاتا ہے اور ہندوستان میں رائے مختلف ہونے اور حقوق طلب کرنے پر ایک کو دوسرے سے شکایت ہوتی ہے تو سبب یہی کہ دل پہلے سے پھٹے ہوئے ہیں۔ ہم شخصی معاملات میں دیکھتے کہ دو بھائی جائداد تقسیم کرنی چاہتے ہیں۔ اگر سلوک ہوتا ہی تو چُپ چاپ فیصلہ ہو جاتا ہے اور ایک بھائی کچھ زیادہ لے جائے تو کہا جاتا ہے کہ "خیر بھائی لیگیا غیر تو نہیں" لیکن اگر پہلے سے دلوں میں کینہ ہوتا ہے یا بھڑکانے والے جادو چلاتے ہیں تو زیادہ لینا ایک طرف بھائی کو اُس کا حق دینے میں بھی تامل ہوتا ہے اور عدالتوں میں تمام جائداد کو برباد کر دینا گوارا کرتا ہے۔ یہی صورت یہاں ہوئی کہ پہلے سے کاوش موجود ہے۔ مانگنے والوں کے دل میں نہیں تو بھڑکانے والوں کے دل میں ہے۔ وہی پہلی کاوش خواہ کسی کے دل میں ہو۔ حقوق طلب کرنے پر ظاہر ہوتی ہے اور عداوت کا موجب بنتی ہے۔

سب کا مجموعہ۔ غرض میرے خیال میں مذکورہ بالا اسباب میں سے کوئی ایک بھی صفائی کے بعد عداوت پیدا کرنے کے لئے کامل سبب بننے کے قابل نہیں

اور اگر کہا جائے کہ کامل سبب نہ سہی کسی قدر نفرت تو ان وجوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اِس لئے الگ الگ نہ سہی۔ سب ملکر عداوت پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئے تو مَیں کہونگا کہ مَیں اس نتیجہ پر پہنچا ہُوں کہ اِن میں سے نفرت کسی سبب سے بھی پیدا نہیں ہوتی۔ البتہ پیدا شدہ نفرت کو بڑھانے اور بھڑکانے کے لئے یہ سب باتیں بہانہ ضرور بن سکتی ہیں اور اس لئے یہ اَور بھی ناممکن ہے کہ پہلے دلوں میں صفائی ہو اور یکایک گاؤکشی کو دیکھکر غصہ کی آگ بھڑکانے کا خیال آنے لگے۔ مذہبی اختلاف کو دیکھکر دل آزاری کی خواہش ہونے لگے۔ مُسلمانوں کی حکومت کا خیال آئے اور بادشاہوں پر غلط الزام لگانے اور اسلام کو بدنام کرنے کی سوجھنے لگے اور حقوق طلب کریں تو اُس کو بھی دشمنی کا باعث سمجھیں۔ غرض ہر ادا بُری معلوم ہو اور ہر بات میں نئی نکالی جائے۔ یہ ہو ہی سکتا ہے۔ اس صُورت میں کہ عداوت پہلے موجُود ہو اور آتش گیر مادہ کو صرف بتی دکھانے کی دیر ہو۔ اِس لئے ہمیں ان سب اُمور سے پہلے کے واقعات میں اس ناگوار تخم کا پتہ لگانا چاہیئے۔

عداوت کا وجود۔ مگر کیا عداوت موجُود ضرور ہے؟ ہم تو دیکھتے ہیں اب بھی ہندو مُسلمان ایک دوسرے کی تقریبوں میں شریک ہوتے ہیں اور ہر شخص کے دوستوں کے دائرہ میں اگر زیادہ ہمقوم ہیں تو چند دُوسرے گروہ کے لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ کاروباری لین دین کے علاوہ برادرانہ لین دین بھی جاری ہے اور احسان و مروت کے نشان بھی کہیں کہیں دیکھے جاتے ہیں۔ کسی مُسلمان کی کوشش سے ہندو کو اور ہندو کی کوشش سے مُسلمان کو نوکری بھی ملجاتی ہے۔ فقیر صدا کرتا ہے اور ہندو پیسہ دیدیتے ہیں۔ سادھو الکھ جگاتا ہے اور مسلمان عورتیں کہتی ہیں ہندو ہے روٹی نہ لیگا آٹا دیدو۔ یہ کام ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ساتھ ہی جہاں چند ہندو مسلمان جمع ہوں اور کسی پولیٹکل مسئلہ کا ذکر چھڑ جائے یا کسی فرقے

کے حقوق کا تذکرہ ہو۔ دُوسرے گروہ والے باوجود دوست ہونے کے اُسوقت وُہ بات کرینگے جو اپنے فرقہ کی فیور میں ہو اور دُوسرے کی بات کاٹنے کو فرض سمجھینگے۔ کسی فریق کا ایک ممبر برسرِ حکومت ہو تو اپنے محکمہ میں نیچے سے اوپر تک اپنے ہمقوموں کو جمع کرنا خواہ اُنکا کوئی حق نہو اور دُوسری قوم کو بیدخل کرنا خواہ وُہ زبردست حقوق رکھتے ہوں فرض وواجب جانتا ہے۔ ہندو مُسلمانوں کے فساد نئے نہیں۔ دو برتن بھی پاس رکھے ہُوئے ٹکرا جاتے ہیں اور شریر اور فتنہ پرداز ہر قوم میں موجُود ہیں اور بالعموم لڑائی ہوتی بھی جبھی ہے کہ ایک طرف سے شرارت ہو تو دُوسرے اس سے بڑھکر شرارت کا ارتکاب کریں ورنہ ایک ہاتھ سے تالی نہیں بجتی اور ایک فریق بالکل صلح جو ہو تو چند شریروں کو خود ان کے ہمقوم بھی دبا سکتے ہیں اور اِس لئے بلوے میں زیادتی عموماً دونوں کی ہوتی ہے مگر ایسے موقعوں پر بجائے شریروں کا کھوج لگانے اور اُن کی بد ذاتی کو ظاہر کرنے کے۔ تمام حمایت کرنے والے تمام قانون پیشہ اور تمام لکچرار اپنی قوم کو مظلوم اور دوسروں کو فتنہ پرداز ثابت کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ اور نہ صرف مقامی اشخاص بلکہ ہندوستان کے ایک سرے سے دُوسرے سرے تک یہی فیلنگ کام کرنے لگتا ہے اور تمام مُلک میں ہر شخص اپنی قوم کی مصیبت کا مرثیہ پڑھتا اور دُوسروں کے جور وظلم کی فریاد کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایک فریق گورنمنٹ سے کوئی درخواست کرتا ہے اور درخواست ضرور نہیں کہ ہمیشہ ناواجب اور دُوسرے فریق کے حق میں مضر ہی ہو مگر مُلک کے رہنما اخباروں اور مضمون نگاروں کی ڈیوٹی ہے کہ ہموطنوں کی ہر درخواست کو غلط کہیں اور اپنی قوم کے حق میں ظلم سمجھیں۔ اور کبھی کسی درخواست اور سند کی نسبت نہیں دیکھا گیا کہ ایک نے دُوسرے کے حق میں خیر کا کلمہ کہا ہو۔ اور باستثنا خال خال نفوسِ قدسیہ کے جوش ذوناد اس کے خلاف

عمل پیرا ہوں تمام ملک کا یہی طریق ہو رہا ہے - پس ایک طرف اس طرح کی باہمی ہمدردی اور دوسری جانب اس طرح کی خلا ور بیگانگی سے ثابت ہوتا ہے کہ اکثر اشخاص باہمدگر ہمدرد اور دوست ہیں مگر قوم بحیثیت قوم ایک دوسرے کے دشمن اور مخالف ہے - اور اس نتیجہ پر پہنچکر ایک طرف دونوں قوموں کے پہلے تعلقات اور دوسری طرف قومیت کی نسبت موجودہ عقاید اور خیالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مخالفت اور عناد کے دو سبب ہیں - دونوں فرقوں کے پہلے تعلقات میں انقلاب پیدا ہونے سے ایک حد تک خودغرضی پیدا ہوئی تھی اور کچھ عرصے کے بعد وہ معدوم ہو جانے کو تھی مگر قومیت کے موجودہ عقائد نے جو خاص اسباب سے پیدا ہوئے خودغرضی کو عداوت تک پہنچایا اور جب تک خیالات کی یہ حالت ہے - عداوت کم نہ ہوگی بلکہ بڑھتی جائیگی -

(باقی دارد)

غزل

اہلِ ہستی کو عدم کا مرحلہ درپیش ہے
موت کو نزدیک جو سمجھے وہ دوراندیش ہے

میکدے میں عمر گذرے اور دامن تر نہ ہو
میکشو پیرِ مغاں پہنچا ہوا درویش ہے

کچھ نہ کچھ حسرت زدوں کے ہو ستا نہیں مزہ
درد اُسی کی جان کا دشمن ہے جو دلریش ہے

آخرِ سن میں بُری ہے شیخ کو عقبیٰ کی فکر
آدمی سیدھا ہے لیکن عاقبت اندیش ہے

آنکھ کی پتلی سے دُنیا دیکھ کر آنکھیں کھُلیں
کوئی ہو کتنا ہی کم پھر بھی وہ ہم سر خویش ہے

کچھ ریاضت کی بھی ہے کشکول میں پونجی حفیظ
یا دکھانے کو گلے میں خرقۂ درویش ہے

حفیظ جالندھری

بلینک ورس

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

مولوی نجم الغنی صاحب نے بجائے سہ اقسام نثر ایک چوتھی قسم مقفیٰ اور لکھی ہے۔ حالانکہ مقفیٰ کوئی مستقل قسم نثر کی نہیں۔ بلکہ مسجع میں داخل ہے۔ چنانچہ علامہ سکاکی تلخیص میں فرماتے ہیں السجعُ ھُوفِی النَّثرِ کَالقافِیۃِ فِی الشِّعرِ سجع کی تین قسمیں ہیں:۔ مطرف و مرصع و متوازی۔ متوازی کی ایک صورت مقفیٰ بھی ہے۔ قتیل و عبدالرزاق و صاحب غیاث و مؤلف فرہنگ اندراج و مصنف انشا رفیض رسان سب کے سب تین ہی قسمیں۔ مرجز و مسجع و عاری لکھتے ہیں۔ اور ملا حسین واعظ کاشفی نے بھی بدیع الافکار میں یہی تین قسمیں لکھی ہیں۔

پھر سجع کی تعریف و مثال میں بھی سہو ہوا ہے۔ فرماتے ہیں "مسجع وہ نثر ہے کہ الفاظ فقرتین وزن میں برابر ہوں اور حرف آخر میں بھی موافق ہوں یعنی پہلے فقرے کے تمام الفاظ دوسرے فقرے کے تمام الفاظ سے وزن و حروف آخر میں موافقت رکھتے ہوں جیسے کان ملاحت معدوم میان الخ۔ و جان صباحت موسوم دہان الخ"۔ نہیں معلوم مولویصاحب نے تعریف مسجع جو لکھی ہے یہاں وزن سے وزن بحور کیوں نہیں مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح نثر مرجز میں بھی وزن سے مراد وزن صرفی ہی ہے۔

تعریف سجع جو مولوی صاحب نے لکھی ہے وُہ تعریف مرصع ہے جو سجع کی تین قسموں میں سے ایک قسم ہے۔ اور سجع اُن تینوں قسموں کو شامل ہے۔ اور سجع کی تعریف یہ ہے کہ پہلے فقرے کے آخر کا کلمہ دُوسرے فقرے کے آخر

کے کلمے سے حرفِ اخیر میں موافق ہو۔ اور یہ تعریف سکاکی اور فقیر دہلوی نے لکھی ہے۔ اور قتیل کہتے ہیں۔ مسجع نثریست کہ در آخر فقرہ لفظے آرند و مقابل آن لفظ در فقرہ دیگر لفظے باشد کہ در روی و ردف یا ردفین و تاسیس و دخیل و خروج وصل و غیرآں موافق باین لفظ باشد و مقید بوزنے نبود۔ جیسے قاصد تمہارا خط لایا۔ اور تمہارا پیغام سُنایا۔ الف اوّل لایا اور سُنایا میں روی اور موافق ہے مگر وزن لایا اور سُنایا کا مختلف ہے۔

پس مختصر تعریف ہر سہ اقسام نثر کی یہ ہوئی کہ مسجع وہ نثر ہے کہ جس میں قافیہ ہو اور وزن نہ ہو۔ اور رجز وہ نثر ہے کہ جس میں وزن صرفی یا عروضی ہو اور قافیہ نہ ہو اور عاری وہ نثر ہے جس میں نہ وزن ہو اور نہ قافیہ۔ ان تینوں نثروں کی تعریف میں وزن سے مراد کہیں بھی وزنِ بحور نہیں۔ اور یہی تعریف ملا حسین واعظ کاشفی نے بدیع الافکار میں تحریر فرمائی ہے۔ اور بیان اقسام نثر سے پہلے تعریف نثر یوں لکھی ہے۔ کلامے را گویند کہ موزون نباشد۔

یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ مولوی صاحب نے یہ مضمون کس کے مضمون کو دیکھکر لکھا ہے۔ اگر جناب احسن کے دوست کے مضمونوں کو دیکھکر لکھا ہے تو اگرچہ وہ مضمون بھی میرا دیکھا ہوا نہیں ہے مگر جناب احسن کے نوٹ سے جس قدر مستنبط ہوتا ہے وہ یہی ہے کہ بلینک ورس یعنی نظم غیر مقفیٰ کے اُردو میں بھی لکھے جانے کی خواہش کرتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ نثر مرجز ہو یا کوئی اور چیز یا پیشتر سے نظم غیر مقفیٰ کا وجود فارسی میں پایا جاتا ہو۔ آپ کا جوجی چاہے بلینک ورس کا نام اُردو میں رکھئے مگر اس امر میں رائے ظاہر کرنا چاہیئے کہ بلینک ورس کی اردو میں کہے جانے کی ضرورت ہے یا نہیں اور اُس سے نظم اُردو میں سہولت و وسعت ہوگی یا نہیں۔

نوٹ اور مضمون دونوں ہیں اس امر پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ بلینک ورس نثر مرجز ہے اور اس کا وجود ہمارے یہاں بیشتر سے فارسی میں پایا جاتا ہے۔ اس پہلو پر بحث نہیں کی گئی کہ آیا نظم بلا قافیہ مشرقی لوگوں کو مرغوب ہے یا نہیں۔

زبان پابندِ قواعد نہیں

مولوی صاحب یہ بہت صحیح ارشاد فرماتے ہیں کہ ایک زبان کی تقلید دُوسری زبان میں پُورے طور پر نہیں ہو سکتی ہے۔ گو وُہ زبان اس دُوسری زبان کی ماتحت ہی کیوں نہ ہو۔ کیونکہ ہر زبان کی کچھ خصوصیات خاص ہیں۔ مگر جس قدر کہ ہمارے جدید روشن خیال اشخاص مغربی تقلید کے دلدادہ ہیں۔ اسی قدر ایشیائی تعلیم کے فریفتہ اپنی مشرقی تعلیم پر مستعد ہیں ۔ چنانچہ جناب آغا رفیق صاحب بلند شہری فصیح الملک نمبر (۱۱) جلد ۲ میں تذکیر و تانیثِ الفاظ عربیہ سے بحث کرتے ہوئے قاعدہ کُلّیہ عربیہ کُلُّ الجُمُوعِ مُؤَنَّثٌ کا پابند ہم کو اُردو میں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس قاعدہ کلّیہ کے لحاظ سے علاوہ اُس جمع کے کہ جس کا مفرد مؤنث ہو۔ ہمیں ہر ایسے جمع کو بھی مؤنث ہی بولنا چاہیئے کہ جس کا مفرد مذکّر بھی ہو۔ کیونکہ کُلّیہ بلا کسی قید کے ہے۔ اس لحاظ سے اوراق۔ اوصاف۔ ابیات بھی مؤنث ہی ہونگے ۔ حالانکہ جناب احسن نے فصیح اللّغات میں ان جمعوں کو مذکر لکھا ہے۔

جناب والا! زبان قواعد کی پابند نہیں اور قواعد پابندِ زبان ہوتے ہیں۔ زبان قواعد سے مقدّم ہے اور قواعد زبان پر بنائے جاتے ہیں۔ پھر کیوں آپ زبان کو قواعد کے تحت میں لاتے ہیں۔ تذکیر و تانیث ہو یا کوئی دُوسری بات متعلّق زبان اس میں بول چال کی پابندی ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے ایک مدّت بعد

جب زبان میں تغیر ہوجاتا ہے۔ اور تذکیر تانیث میں زیادہ ہوتا ہے۔ تو ضرورت اس کی ہوتی ہے کہ قواعد میں ترمیم ہوتی رہے۔

یہ خیال صحیح نہیں کہ الفاظ عربیہ رائج اردو میں اعتبار قواعد عربی کا کیا جائے اور نہ ایسا کسی زبان میں ہوتا ہے۔ گلاس انگریزی زبان کا لفظ ہماری زبان میں گھل مل گیا۔ ہم اس کو مذکر بولتے ہیں۔ لیکن انگریزی میں وہ (نیوٹر) ہے یعنی نہ مؤنث نہ مذکر۔ انگریزی میں مذکر کے لئے (ہی) اور مؤنث کے لئے (شی) اور نیوٹر کے لئے (اِٹ) ضمائر ہیں۔ اور ہمارے یہاں یہ تیسری قسم ضمیر کی ہے ہی نہیں۔ تو چونکہ گلاس انگریزی سے اردو میں آیا ہے لہٰذا اصل انگریزی کے تتبع کے لئے اب ہم ایک ضمیر neuter (نیوٹر) ایجاد کریں۔

فارسی کے افعال میں تذکیر و تانیث نہیں ہے۔ مگر عرب جو اسمار کہ فارسی سے اپنی زبان میں لے گئے ہیں مثل فیل و نرجس وغیرہ ان اسمار کے ساتھ اپنی قرارداد کے موافق فعل مذکر یا مؤنث لاتے ہیں۔ اگر اصل کا لحاظ کیا جاتا تو چاہئے تھا کہ عربی میں ایسے افعال بھی ایجاد کرتے کہ وہ نہ مذکر ہوتے اور نہ مؤنث۔ اسی طرح اردو میں بھی الفاظِ عربیہ کی تذکیر و تانیث بلحاظ روزمرہ اردو ہونا چاہئے۔ عام اس سے کہ موافق عربی ہو یا نہ ہو۔ چونکہ یہ مسئلہ میرے بحث سے خارج ہے لہٰذا زیادہ توضیح کی ضرورت نہیں۔ افراط و تفریط ہر دو گروہ کے ذکر میں یہ بحث بھی ضمناً آگئی۔ اکثر لوگ اس مغالطہ میں پڑے ہوئے ہیں اور قواعد کو اصل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ زبان کے پابند قواعد ہوتے ہیں۔ حتیٰ کہ جب قواعد سے احصار نہیں ہوسکتا ہے اور زبان میں اس بنائے ہوئے قاعدہ کے خلاف بھی پایا جاتا ہے تو مجبوراً شاذ کہنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر قواعد اصل ہوں تو شواذ غلط ٹھہرینگے۔

ہمارے اولڈ فیشن کے لوگ علم کو منحصر عربی میں سمجھتے ہیں آخر کسی وقت میں معانی بیان وغیرہ علوم کی تدوین نہ تھی اُسکو زبان پر لحاظ اور غور کرکے قواعد بلاغت ایجاد کئے۔ کیا اب یہ ممکن نہیں کہ بلا استمدادِ عربی کوئی صحیح التاغ قواعدِ بلاغت اُردو میں بھی ایجاد کرسکے اور نئی اصطلاحیں اُردو کے لئے نکالے۔ میرے نزدیک تو فیضانِ الٰہی ہی کی نہیں آئی ہے اور اب بھی موجد ہونا ممکن ہے۔ یہ امور یعنی ایجاد فنون و صنائع نبوت نہیں ہیں۔

آیات نہ نثر مرجز ہیں اور نہ شعر

جن آیات کو جناب مولوی صاحب نے نثر مرجز کہا ہے وُہ نثر مرجز دو وجہوں سے نہیں۔ اوّل تو نثر مرجز میں وزنِ بحور نہیں ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے ثابت کرچکا ہوں اور ان آیات میں وزن بحور موجود ہے۔ دوسرے اُنکا فقرہ متقابلہ نہیں ہے جس سے یہ دیکھا جائے کہ الفاظ متقابلہ وزن میں متحد ہیں یا نہیں اور قافیہ پایا جاتا ہے یا نہیں کہ حکمِ مرجز لگایا جاسکے۔

اور شعر اس وجہ سے نہیں کہ شعر بحر مسدس میں چھ رکن پر اور بحر مثمن میں آٹھ رکن پر تمام ہوتا ہے۔ اور ان آیات میں ایسا نہیں ہے لہٰذا کوئی آیت بھی ان میں سے شعر نہیں۔ کیونکہ ہر آیت مرقومہ میں یا تین رکن ہیں یا چار رکن۔ حاصل یہ کہ مصرع پر شعر کا اطلاق نہیں ہوتا ہے اور یہ سب آیات مصاریع مختلفہ ہیں۔

قرآن شریف میں دو مصرعے ہموزن بامعنی ایک ساتھ برابر برابر کہیں نہیں ہیں ایک جگہ یہ جزوِ آیت دُوسرے پارہ کے آخر میں موزون ہے۔

يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ

جو بحر کامل میں ہے اور وزن اُس کا مستفعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن متفاعلن مستفعلن ہے۔ یہ شعر اس وجہ سے نہیں ہے کہ جزو آیت ہے اور بغیر اوّل و آخر کچھ ملائے ہوئے اس کے معنے ناتمام ہیں۔ چنانچہ شروع اس آیت کا یہ ہے وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ اور آخر اُسکا یہ ہے مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۔

دوسری جگہ یہ جزو آیت اٹھائیسویں پارہ آخر سورۂ تحریم میں۔

مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ

بحر رمل میں ہے بروزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن دو بار جبکہ دونوں مصرعوں کی آخری۔ ت کو منون پڑھیں۔ اور اگر ساکن پڑھیں تو وزن فاعلاتن فاعلاتن فاعلان ہوگا۔ اور اس آیت کی بھی وہی حالت ہے۔ چنانچہ اس کا اوّل عَسٰى رَبُّهٗٓ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗٓ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ ۔ اور آخر اس کا ثَيِّبٰتٍ وَّاَبْكَارًا ہے اور بغیر اوّل و آخر ملے ہوئے آیت سے معنے مستقل و مفید پیدا نہیں ہوتے۔

اور تیسری جگہ یہ جزو آیت پارہ الٓمّٓ بعد نصف میں ہے۔

ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ

اس آیت کا بھی تعلق اوّل سے اور آخر سے ہے جب تک اَنْفُسَكُمْ نہ ملایا جائے بے معنی ہے۔ پس یہ سب آیتیں بھی بوجہ کلام مفید ہونے کے کلمات ہیں اور بغیر انضمام بعض الفاظ دیگر معنے تمام نہیں ہوتے۔ اس بنا پر یہ کلام ہی نہیں ہیں۔ چہ جائیکہ شعر۔ کیونکہ شعر کو کلام موضوع ہونا چاہئے۔ کلام غیر مفید کلام ہی نہیں۔ اور جب معنوں کا لحاظ نہ کیا جائے تو ہر نثر سے جتنے شعر جی چاہے نکال لو۔

ناظرین غور فرمائیں کہ یہ استدلال میرا اگر صحیح ہے تو میں نے یہ بات بالکل نئی نکالی ہے اور یہ جواب کسی نے آجتک نہیں لکھا ہے۔ عمد و قصد و سُوء ادب جتنے جواب دیئے جاتے ہیں سب ناکافی ہیں۔ کسی شعر میں جب وزن موجود ہے تو وہ حقیقۃً شعر ہے۔ چاہے عمد و قصد ہو یا نہو۔ اور اسی طرح سُوء ادب سے آیت کو شعر نہ کہنا جبکہ وُہ شعر ہو۔ شعر ہونے سے خارج نہیں کرتا۔ مَیں اُمید کرتا ہُوں کہ ناظرین میرے اس مضمون میں بہت سی نئی باتیں پائینگے۔ اور بعض امُورِ غیر حل کو اس میں حل دیکھینگے۔

بعض مُصنفینِ فنِ عروض نے بالغ نظری سے کام نہ لیکر تعریفِ شعر میں قیدِ قصد قائل لگاکر شعر بلاقصد کو شعر کو نہیں مانا ہے اور یہ بھی اُن کی کم توجہی ہے۔ جب اُس میں وزنِ شعری موجود ہے تو وُہ شعر بھی ضرور ہے۔ فرض کرو کہ ایک شعر جو حقیقۃً بلاقصد نظم ہوا ہو اور وُہ کسی وقت ہمارے سامنے آئے اور ہم کو کوئی علم قصد یا غیر قصد کا نہ ہو تو باوجود وزن شعر نہ کہا جائیگا تو اَور کیا کہا جائیگا۔ میرے نزدیک وہ شعر ضرور ہے مگر اُس کا کہنے والا شاعر نہیں۔ اگر پھر بقصد و اختیارِ خود شعر نہیں کہہ سکتا ہے اسی وجہ سے یہ مقولہ مسلّم ہے۔ مَنْ قَالَ بَیْتَیْنِ فَھُوَ شَاعِرٌ کیونکہ ایک شعر تو بلاقصد ممکن ہے مگر دوسرا شعر اُسی ردیف و قافیہ میں بلاقصد ممکن ہی نہیں۔ شعر کسی طرح سے اپنے قواعد پر صحیح اُترجائے۔ وُہ شعر ہے مگر شاعر ہونے کے لئے قصد و ارادہ کی ضرورت ہے۔ قائل بلاقصد شاعر نہیں۔ محققینِ فنِ عروض تعریفِ شعر میں نہ قیدِ قصد لگاتے ہیں اور نہ قیدِ قافیہ۔ اور یہی تعریف صحیح ہے۔

فرقِ نظم و شعر

شمس العلما جناب مولوی حالی صاحب نے تعریفِ منطق کو مختلط نہیں کیا ہے کیونکہ منطقین کے نزدیک شعر میں وزن کی بھی ضرورت نہیں ہے اور جناب مولوی صاحب

نہ ہر جز میں تجویز وزن کر کے اُسے از قسمِ نظم شمار کرتے ہیں اور شعر میں بھی وزن مانتے ہیں پھر اختلاطِ تعریف منطق کہاں سے آیا۔

اِس میں شک نہیں کہ کسی نے نظم و شعر میں کچھ فرق نہیں کیا ہے مگر بعض اُمور مقتضی اس بات کے ہیں کہ دونوں میں کچھ فرق ہو۔ مثلاً ایک مصرع با معنی ہمارے سامنے آئے اُسے شعر اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ شعر میں چھ رُکن یا آٹھ رُکن ہونا چاہئیں۔ اور ایک مصرع میں تین یا چار ہی رکن ہونگے۔ اور بوجہ وزن نثر بھی نہیں کہہ سکتے۔ پھر آخر اس کا نام کیا رکھیں۔ بہتر یہ ہے کہ کلامِ منظوم کہیں۔

میرے نزدیک مناسب یہ ہے کہ نظم کو مقابلِ نثر ایک جنس یا مقسم قرار دیکر یہ تعریف کیجائے۔ کلامِ موزون مخیل۔ تاکہ تمام اقسام کلامِ موزون پر صادق آئے حتٰی کہ فرد اور مصرع پر بھی اور نظمِ غیر مقفّٰی پر بھی۔ اور شعر کو نظم کی نوع یا قسم مانکر یہ تعریف کیجائے۔ کلامِ موزون مخیل مقفّٰی۔ پس گویا تقسیم کلام اس طرح ہو گئی۔ کلام کی دو قسمیں ہیں منثور و منظوم۔

کلامِ منثور کی تین قسمیں ہیں۔ مرجز و مسجع و عاری۔

اور کلامِ منظوم کی دو قسمیں ہیں نظمِ مقفّٰی۔ و نظمِ غیر مقفّٰی۔

نظمِ مقفّٰی کی نو قسمیں ہیں۔ غزل۔ قصیدہ۔ قطعہ۔ مثنوی۔ رباعی۔ مخمس۔ مسدس۔ ترکیب بند۔ ترجیع بند۔

غیر مقفّٰی کی ایک قسم ہے فرد۔ اور اِس صنف میں بلینک ورس شامل ہے۔ مولوی نجم الغنی صاحب شعر کے لئے قافیہ کو ضروری بھی فرماتے ہیں اور فرد جو بلا قافیہ اکثروں کے نزدیک ہو اُس کو شعر بھی سمجھتے ہیں۔ جب تعریف شعر کلامِ موزون مقفّٰی مانی گئی تو یہ تعریف فرد پر کیونکر صادق آیگی۔

ایک قول حکما کا بھی ایسا ملتا ہے کہ جس سے نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ حکما کا قول ہے کہ نسبت تالیفیہ جس چیز میں پائی جاتی ہے باعث انجذاب اہتزاز نفس ہوتی ہے۔ اور تالیفیہ عبارت ہے نسبت قدر تفاوت میان اوسط و اصغر بقدر تفاوت میان اوسط و اکبر مثل نسبت اصغر با کبر ہے۔ اور بہت سے دقائق علوم و اسرار حکمت مبنی بر احکام نسبت ہیں۔ اسی نسبت شریفہ اعتدالی کی وجہ سے کہ اجزائے عناصر میں ہے تعلق نفس بدن کے ساتھ پایا جاتا ہے اور جب زوال اس نسبت کا ہو جاتا ہے تو باعث قطع تعلق نفس و بدن ہوتا ہے۔ اور جب یہی نسبت اعضا میں پائی جاتی ہے تو حسن ہے اور اصوات میں پائی جائے تو نغمہ ہے اور کلام میں پائی جائے تو نظم و فصاحت ہے اور حرکات میں پائی جائے تو ناز و ادا ہے اور عناصر میں پائی جائے تو اعتدال مزاج ہے اور نفس میں پائی جائے تو عدالت ہے اور نفس ہر مقام میں عاشق و طالب اس نسبت کا ہے۔

یہ تعریف نظم کی عام تر ہے - نظم کی اس تعریف کے بعد شعر کی تعریف چاہے کلام موزون مخیل سمجھئے یا کلام موزون مخیل مقفٰے۔ بہر صورت نظم و شعر دو جداگانہ چیزیں ہونگی۔ اور مولانا حالی کا نظم و شعر کو دو جداگانہ چیزیں سمجھنا صاف و درست معلوم ہوگا۔

مولوی نجم الغنی صاحب کی تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا حالی قافیہ کو نظم ہی کے لئے ضروری سمجھتے ہیں نہ شعر کے لئے۔ اس تحریر میں سہو کاتب و ناقل کو اگر دخل نہیں ہے تو میری رائے اس کے برعکس ہے۔ یعنی نظم کے لئے قافیہ ضروری نہیں اور شعر کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ نظم مقابل نثر ہے۔ نہ شعر۔ پس نظم کو شعر سے عام ہونا چاہئے۔

مقدمہ دیوان جناب حالی دامت فیضہ میرا دیکھا ہوا ہے مگر میرے پاس موجود

نہیں ہے۔ جواب دیکھکر اطمینان کرلیتا۔ گر اس تحریر کو صحیح مانکر اتنا ضرور ہے کہ قولِ اول جناب شمس العلما اس صورت میں معارض قولِ ثانی ہے۔ اس لئے کہ بلینک ورس کو نظمِ غیر مقفیٰ بھی فرماتے ہیں اور پھر قید قافیہ بھی نظم ہی کے لئے ضروری ارشاد کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے تو اسے شعر غیر مقفیٰ کہنا چاہئے تھا۔

اگرچہ میں صاحب مذاق بزرگ نہیں اور نہ مثل مولانا حالی اس مسئلہ پر روشنی ڈال سکتا ہوں۔ لیکن جناب احسن نے نوٹ میں تحریر فرمایا تھا کہ (اگر مولانا حالی خود اس باب میں تحریر فرمائیں تو کیا کہنا ورنہ امید ہے کہ کوئی نہ کوئی صاحبِ مذاق بزرگ اس مغالطے اور معمے کو ضرور حل فرمائینگے) میں نے اپنے آپ کو صرف کوئی نہ کوئی میں سمجھکر خامہ فرسائی کرکے دوسروں کا وقت لیا اور اپنا وقت صرف کیا ہے۔ اگر اس مضمون میں سے کچھ بھی پسند ارباب کمال ہو جائے تو زہے قسمت +

سید اولاد حسین شادان بلگرامی

کلیاتِ اسمٰعیل

مولانا مولوی محمد اسمٰعیل صاحب میرٹھی کے کلام کے دلدادہ یہ سنکر خوش ہونگے کہ اُنکی دلچسپ سلیس اور معنی خیز نظموں کا بیش بہا مجموعہ شائع ہوگیا ہے۔ اورینٹل پبلشنگ کمپنی میرٹھ سے مل سکتا ہے۔ چھپائی میں بھی خاص اہتمام کیا گیا ہے اور کاغذ عمدہ لگایا گیا ہے۔ سرورق پر جناب مولانا کی ہاف ٹون عکسی تصویر ہے۔ علاوہ درسی اور قومی نظموں کے مولانا کا دیوان بھی اس کلیات میں شامل ہے اور قابلِ دید ہے۔ کتاب کا حجم ۳۷۵ صفحے ہے اور قیمت مع جلد صرف دو روپیہ ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب عام طور پر مقبول ہوگی۔

حکیم فیثاغورس

(سلسلۂ تاریخ الحکما)

حکیم فیثاغورس قریب ختم اولمپیاد ۶۰ میں ظاہر ہوا اور ۶۲ اولمپیاد میں ایطالیہ (اٹلی) کو چلا گیا۔ اور اسّی (بقول لے نوٹے) سال کی عمر میں راہی ملکِ بقا ہو گیا۔

ملکِ اٹلی میں ایک فرقہ فلاسفہ یونیا کے نام سے موسوم ہے۔ وہ اسی حکیم کے متبع ہیں۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ یونان میں طالیس اور اٹلی میں فیثاغورس فلاسفہ کے اُستاد الکل ہیں۔

ارستیب غرفیانی نے لکھا ہے کہ اس حکیم کو فیثاغورس اس لئے کہا جاتا تھا کہ یہ اکثر اپنی قوتِ کہانت کے باعث غیب کی باتیں بتلایا کرتا تھا۔ اور آخر وہ باتیں اسی طرح واقع ہوتی تھیں جس طرح وہ بیان کرتا تھا۔

اسی حکیم نے سب سے پہلے بلحاظِ تواضع یا کسرِ نفسی اپنے آپ کو حکیم نہیں کہلایا بلکہ فلسفی کا لقب اختیار کیا۔ اصلیت یہ ہے کہ یہ حکیم جزیرۂ ساموس میں پیدا ہوا۔ اُس کے والد کا نام امینزارک نقاش تھا۔ لیکن بعض محققین کا قول ہے کہ وہ طوسکانہ کا رہنے والا تھا اور اُن ہی جزائر میں سے ایک چھوٹے سے جزیرہ میں پیدا ہوا تھا۔

فیثاغورس اپنے باپ کا ہنرِ نقاشی خوب جانتا تھا۔ چنانچہ اُس نے تین سونے کے پیالے نہایت خوبصورتی کے ساتھ نقش و نگار کر کے مصر کے تین مشہور قسیسوں کو تحفہ میں بھیجے تھے۔

اس حکیم کو اپنے معلمِ اوّل فیرسید سے بے انتہا محبت تھی۔ اور اُستاد بھی

اپنے شاگرد سے بہت محبت رکھتا تھا۔ کہتے ہیں ایک مرتبہ فیرسید بیمار ہوا حکیم فیثاغورس اس کی عیادت کے لئے گیا تو اُستاد نے شاگرد کو آتے دیکھ کر اس خوف سے کہ کہیں میرا مرض متعدی نہ ہو اور فیثاغورس اس میں مبتلا نہ ہو جائے فوراً دروازہ بند کرا دیا اور اپنی انگلیاں دروازے کے سوراخ میں سے نکال کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا کہ لو ان کو دیکھ کر سمجھ جاؤ کہ میں کتنا نحیف و نزار ہو گیا ہوں۔

فیرسید کے مرنیکے کئی سال بعد تک فیثاغورس وہیں رہا۔ اور اس زمانہ میں ہرموامنط سے بہت ربط وضبط رکھا۔ آخر شوقِ تعلم و سیاحت نے اسکو ترکِ وطن پر مائل کیا۔ اپنا تمام اثاثہ فروخت کر کے وطن سے چل پڑا۔ ایک مدت طویل سفر میں رہا اور بہت سے قسیس سے ملا اور اُنکے دین کی خفیہ رموز سیکھے۔ اسی زمانہ میں اُس کے بادشاہ بولیقراط نے ازیس بادشاہِ مصر کو اس حکیم کے عزت و احترام کرنے کو لکھا۔ اس کے بعد فیثاغورس کلدانیوں کے ملک میں اس غرض سے گیا کہ وہاں مجوسیوں کا علم سیکھے۔ پھر بلادِ مشرق میں پھرتا پھرتا مملکت اکریطہ میں پہنچا اور حکیم ابمینیدس سے مل کر دوستی پیدا کی۔ اور وہاں سے پھر اپنے وطن جزیرہ ساموس چلا گیا۔ یہاں آکر اُس نے دیکھا کہ اُس کے اہلِ وطن پر زیر حکم بولیقراط سخت ظلم و تعدی ہو رہا ہے۔ جس سے اُس کو سخت رنج ہوا۔ مگر سوا اس کے اور کچھ نہ بن پڑا کہ اُس نے خود ہمیشہ کے واسطے ترکِ وطن کر دیا اور ملک اٹلی کے شہر باقروطوں میں گیا اور میلون کے مکان پر فروکش ہوا۔ اور یہیں بیٹھکر اُس نے تعلیم و تعلم کا وہ سلسلہ جاری کیا کہ جس نے اسکو فلاسفہ اٹلی کا اوستاد الکل بنا دیا۔ چند ہی روز میں اسکا شہرہ تمام ملک اٹلی میں پھیل گیا۔ اور شاگردوں کی وہ کثرت ہوئی کہ تین سو سے زیادہ تعداد پہنچ گئی۔ ایک فرقہ ہی الگ بنگیا۔ جو ملک میں ممتاز سمجھا جاتا تھا۔

کہتے ہیں کہ شہزادہ "نوما" بھی ان ہی لوگوں میں ایک تھا کہ جو شہر اوقر وطون میں فیثاغورس کی ملازمت میں رہا اور اپنے تخت نشین ہونے سے پہلے اُس کی خدمت و صحبت نہ چھوڑی۔ لیکن بتحقیق یہ ہے کہ شاہ نوما حکیم فیثاغورس سے بہت پہلے ہو گذرا تھا۔ یہ بات ضرور تھی کہ اس بادشاہ کی رائے کو یہ حکیم بہت ہی پسند کرتا تھا۔

حکیم فیثاغورس کا قول تھا کہ ایک دوست کی چیز گویا تمام دوستوں کا مال ہے۔ دوستی تمام دوستوں کے درمیان میں رشتہ مساوات پیدا کرتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے تمام شاگرد یک جان و چندیں قالب تھے۔ کوئی چیز کسی خاص شخص کے لئے مخصوص نہ تھی۔ بلکہ ایک کی چیز سب کے استعمال میں آتی تھی۔ حتیٰ کہ نقدی کا بھی یہی حال تھا۔

فیثاغورس کا ہر ایک شاگرد پانچ برس اُس کے پاس رہتا تھا۔ پہلے سال وُہ اپنے معلّم کے اصُول کو صرف سُنا کرتا تھا۔ اس کی یہ مجال نہ تھی کہ کسی معاملہ میں لب کشائی کر جائے۔ اس امتحان طویل اور اس شدّت کو برداشت کرنے کے بعد اسکو اجازت ہوتی تھی کہ وُہ کلام کر سکے اور فیثاغورس سے مل سکے یا بات کر سکے۔

فیثاغورس نہایت صاحبِ رعب و داب۔ معتدل القامت حسین صورت شخص تھا ہمیشہ پاک و صاف سفید صوف کے کپڑے پہنتا تھا۔ حظوظِ نفس کی طرف کبھی مائل نہ ہوتا تھا۔ اگر کوئی اپنا راز اس کو بتلا دیتا تو وُہ اُس کو کبھی ظاہر نہ کرتا تھا۔ کسی شخص نے اس کو کبھی ہنستے۔ مذاق کرتے یا فضول بات زبان سے نکالتے نہ سُنا۔ غیظ و غضب میں بھی کبھی کسی کو ملامت نہ کرتا تھا۔ اپنے غلاموں کو کبھی اپنے ہاتھ سے نہ مارتا تھا ان ہی صفات سے اس کے شاگرد اس کی الوہیّت کے قائل ہو گئے تھے۔ تمام ملک سے لوگ اس کے پاس فوج در فوج آتے تھے۔ اور اس کے حلقہ درس میں بیٹھکر اس کی باتیں سُنتے اور ان پر غور کرتے تھے۔ جس شخص کو اُس سے باتیں

کرنے یا پاس بیٹھنے کا موقعہ مل جاتا تھا وُہ اپنے آپ کو سعید ترین انسان سمجھتا تھا۔
فیثاغورس نے لوگوں کی درخواست پر ہر فرقہ کے لئے الگ الگ قوانین بنا دئیے تھے۔ اس حکیم کا احترام اس درجہ تک لوگوں کے دلوں میں بڑھ گیا تھا کہ عوام الناس اپنے بتوں کی طرح اس کی بھی قسم کھایا کرتے تھے۔ اس کا قول تھا کہ انسان کو چاہئیے کہ اپنے اوپر اس درجہ جبر کرے کہ وُہ ایسا صاحب کمال ہو جائے کہ لوگ اس کا نام سُنتے ہی اس کے کامل ہونے کی تصدیق کریں۔
فیثاغورس کا خیال تھا کہ اس عالم کو رُوح و ادراک حاصل ہے۔ اسی رُوح سے اور بہت سی ارواح نکلتی ہیں۔ جو تمام آدمیوں اور حیوانات میں منقسم ہیں۔
فیثاغورس کا خیال تھا کہ رُوح فنا نہیں ہوتی بلکہ ایک جسم سے نکل کر بذریعہ ہوا کے دُوسرے جسم میں داخل ہو جاتی ہے خواہ کوئی جسم اس کو مل جائے۔ مثلاً ممکن ہے کہ کسی انسان کی رُوح نکل کر کسی گھوڑے۔ بھیڑئیے۔ گدھے۔ مُرغ یا مچھلی یا کسی اَور کے جسم میں داخل ہو جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ انسان کی رُوح انسان ہی میں اور حیوان کی حیوان ہی میں داخل ہو۔ بلکہ رُوح کو جو جسم مل جائیگا اُسی میں داخل ہو جائیگی۔ یہی وجہ تھی کہ فیثاغورس جانوروں کے کھانے سے منع کرتا تھا۔ اور اسی وجہ سے اس کا یہ خیال تھا کہ ایک مکھی یا بھڑ کے مار ڈالنے کا اتنا ہی گناہ ہے جتنا کہ ایک آدمی کے قتل کر دینے کا۔ کیونکہ تمام ارواح ایک ہیں اور وُہی تمام حیوانات میں منتقل ہوتی رہتی ہیں۔
جب فیثاغورس نے ارادہ کیا کہ اپنے شاگردوں سے تناسخ ارواح تسلیم کرائے تو اس نے اُن سے بیان کیا کہ مَیں عطارد (ایکے از بتانِ یونان) کا بیٹا ہوں۔ اور سب سے پہلے ایثالیدس کے قالب میں تھا۔ عطارد نے مجھ سے کہا تھا کہ بقاء دوام کے سواء جو کچھ تم مجھ سے طلب کرو۔ مَیں تمہیں عطا کر دوں۔ مَیں نے اُس سے ایسی قوت مانگی کہ جس کے ذریعہ سے مَیں دُنیا کے تمام حالات اور اپنی پچھلی زندگی کے حالات و

واقعات کو یاد رکھ سکوں۔ چنانچہ اُسوقت سے مجھے وہ علم حاصل ہوگیا۔ جو کچھ دُنیا میں واقع ہوتا ہے۔ وُہ مجھے معلوم ہے اور نیز میری پچھلی زندگیوں کے حالات مجھے پُوری طرح یاد ہیں۔ غرض ایثالیدیں کے قالب سے نکلکر میں او فوربہ کے قالب میں آیا۔ جنگ ٹروا وہ میں موجود تھا اور ایک شخص مینیلاس نامی کے ہاتھ سے میں نے زخم شدید کھایا۔ اس کے بعد میں ہرموتیموس کے قالب میں آیا۔ اور اس حالت میں میں نے اس عطیہ کو ثابت کرنا چاہا جو مجھے عطارد سے حاصل ہوا تھا۔ چنانچہ میں شہر ابرانخیدی میں جاکر ہیکل اوپولون میں گیا اور وہاں میں نے وُہ سپر دیکھی۔ جو مینیلاس نے اپنے مقابل سے بحالت جنگ چھینی تھی اور اپنی فتح کی یادگار میں اس ہیکل کو نذر کردی تھی۔ ہرموتیموس کے قالب سے نکل کر میں ایک چڑی مار کے جسم میں آیا اور اُس سے جُدا ہوکر اس جسم فیثا غورسی میں اس تناسخ میں میں اُس زندگی کو شمار نہیں کرتا ہوں کہ جو بقالب مُرغ وطاؤس میں نے گذاری ہے"۔

اسی ضمن میں فیثا غورس نے یہ بھی بیان کیا کہ جب میں میدانِ جہنم کی سیر کر رہا تھا تو اس وقت میں نے دیکھا کہ ہزیودس شاعر کی رُوح ایک ستون سے بندھی ہُوئی ہے اور اُس کے گلے میں طوق پڑے ہُوئے ہیں۔ اور وہ سخت تشدد اُٹھا رہی ہے۔ پھر ہومیرس شاعر کی رُوح کو دیکھا کہ وُہ ایک درخت پر ٹنگی ہُوئی ہے اور ہر طرف سانپ اُسکو لپیٹے ہوئے ہیں۔ یہ اُن جھوٹوں کی سزا ہے کہ جو بتوں کی شان میں بکے تھے۔ اسی میدان میں میں نے اُن لوگوں کی رُوحوں کو سخت ترین عذاب میں دیکھا کہ جو اپنی عورتوں سے اچھی طرح پیش نہ آتے تھے اور اُنکو بُرا سمجھتے تھے۔

کہتے ہیں کہ فیثا غورس نے اپنے لئے ایک تہ خانہ بنوایا۔ اور اس میں داخل ہونے سے پہلے اپنی والدہ سے عہد لے لیا کہ جب تک میں اس تہ خانہ سے نکلوں جو کچھ میرے پیچھے شہر بھر میں واقعات گذریں نہایت تحقیق کے ساتھ انکو قلمبند کرتی ہے

پھر تہ خانہ میں گھس کر اندر سے قفل لگا لیا۔ اور ایک سال برابر باہر نہ نکلا۔ اور جب نکلا تو نہایت نحیف و لاغر۔ ژولیدہ مو۔ پریشان رُو تھا۔ اور لوگوں کو جمع کر کے کہنے لگا کہ مَیں دوزخ کی سیر کے لئے گیا تھا۔ اور اپنی تصدیق کے لئے اُس یادداشت کے رُو سے جو اُس کی ماں نے اُس کے واسطے تیار کر رکھی تھی وُہ تمام واقعات بیان کر دیئے جو اُس کی غیر حاضری میں گذرے تھے۔ چنانچہ لوگ اسکو معمولی انسانوں سے کچھ زیادہ سمجھنے لگے۔

ایک روز فیثاغورس معمولی سالانہ کھیلوں میں شامل تھا کہ اُس نے ایک آواز ماری جسکو سُن کر ایک گِدھ اُڑتا ہوا اُتر آیا جسکو دیکھکر لوگ حیران رہ گئے۔ یہ بھی فیثاغورس کا ایک کرشمہ تھا۔ اصل یہ ہے کہ وُہ ایک گدھ کو پوشیدہ طور پر اس کی مشق کرا چکا تھا کہ اس کی وُہی خاص آواز سُن کر اُتر آیا کرتا تھا۔ اُس نے اپنا اعتقاد لوگوں کے دلوں میں بٹھانے کے لئے ایک یہ بھی ترکیب کر رکھی تھی کہ اپنے گھٹنے سے اوپر ایک ران سونے کی بنوا رکھی تھی۔

بُتوں کے سامنے وُہ ہمیشہ آٹے یا گیہوں کی قربانی چڑھایا کرتا تھا۔ اور کہتا تھا کہ ذی الارواح کی قربانی بُتوں کی گُستاخی ہے۔ کیونکہ وُہ ایسی قربانیوں سے سخت ناراض ہوتے ہیں۔

فیثاغورس کے اصُول سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وُہ شکم سیری کو کسی قدر کم کھانے پر ترجیح دیتا تھا۔ تاکہ صحت قائم رہ سکے اور غور و فکر میں بندۂ شکم ہونا مانع نہ آسکے۔ اور عقل کو اپنے کام میں لگنے کا موقع مل سکے۔ جو کچھ وُہ دُوسروں سے کرانا چاہتا تھا۔ پہلے اس کی مثال اپنی ذات پر قائم کرتا تھا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اُس نے پانی ہی پر کئی کئی دن گذار دیئے ہیں۔ اور اگر غذا کھائی ہے تو بہت تھوڑے سے دانے یا شہد یا میوے یا کوئی ترکاری۔ باقلہ وُہ کبھی نہ کھاتا تھا۔ نہ اس کے چھوڑنے کی کوئی وجہ کسی کو معلوم تھی۔

فیثاغورس کہا کرتا تھا کہ لوگ بحالتِ حیاتِ دُنیا اُن لوگوں کی طرح ہیں جو کسی میلے میں جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض تو آئے اور سیر کر کے چلے گئے۔ بعض نے خرید فروخت کی۔ بعض نے اپنے جدال و قتال سے لوگوں کو سیر دکھائی۔ بعض محض اسیر فخر ہیں اور بعض بندۂ حرص۔ بہت کم ایسے بھی ہوتے ہیں جو حقائق معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

کہا کرتا تھا کہ انسان کو چاہیئے کہ اپنے لئے کسی چیز کی خواہش یا دُعا نہ کرے کیونکہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ میرے لئے کونسا امر مناسب ہے اور کونسا نہیں۔

فیثاغورس کہتا تھا کہ انسان کی عمر کے چار مساوی حصے ہیں۔ بیس برس کی عمر تک وہ بچہ رہتا ہے۔ چالیس برس کی عمر تک جوان۔ ساٹھ تک مرد جوان اسی تک بوڑھا۔ اس کے بعد جو عمر گذرے وُہ زندگی میں شمار نہیں ہے بلکہ وبالِ جان ہے۔

اس حکیم کو علم ہندسہ و ہیئت کا بڑا شوق تھا۔ اسی نے یہ بات معلوم کی ہے کہ جو ستارہ بعض وقت صبح کو نکلتا ہے وُہی ستارہ بعض وقت شام کو نکلا کرتا ہے۔ سب سے پہلے اسی نے اسکو ثابت کیا ہے کہ مثلث قائم الزاویہ کے وتر کا مربع باقی دونوں ضلعوں کے مربع کے مجموعہ کے برابر ہے۔ کہتے ہیں کہ جب فیثاغورس نے یہ مسئلہ ثابت کیا تو اس کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ یہانتک اسکو الہام الٰہی سمجھا۔ اور فوراً یہ ارادہ کیا کہ سو گائیں برائے اظہار شکر قربانی کرے۔ اگرچہ یہ امر تمام کتابوں میں درج ہے۔ لیکن جب اس پر غور کیا جاتا ہے کہ وُہ ذوی الارواح کی قربانی جائز نہیں رکھتا تھا تو قابلِ اعتبار نہیں رہتا۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ جس طرح اُسکے متبع آٹے اور شہد کی گائے اور بکری بنا کر قربانی کرتے ہیں اُس نے بھی کر دی ہو تو ممکن ہے۔ بعض نے یہی لکھا ہے کہ اُس کو

اسی خوشی میں شادی مرگ ہوگیا۔ لیکن حکیم لوئر تھر نے لکھا ہے کہ یہ بالکل غلط ہے۔

یہ حکیم اپنے شاگردوں کی آپس میں دوستی قائم رکھنے میں بہت ساعی رہتا تھا اور اکثر اُن کو بذریعہ اشارات کے تعلیم دیتا تھا۔ چنانچہ کہا کرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہ تم ملک میں پورے نہ اترو یعنی حدود قانون سے نہ گذر جاؤ۔ کہا کرتا تھا جو کچھ تمہیں میسّر ہو اُس کو ایک ہی وقت نہ کھا جاؤ۔ یعنی آئندہ کا خیال رکھو۔

اپنے شاگردوں کو تاکید کر رکھی تھی کہ ہر شخص سوتے وقت اپنے نفس سے مخاطب ہو کر یہ کہے کہ اے نفس آج تو نے کیا کیا۔ کہاں رہا۔ اور کیا کیا اچھا یا بُرا کام کیا وغیرہ۔ شاگردوں کو حکم تھا کہ اپنا ظاہر حال اصل حال سے موافق رکھیں۔ خوشی و رنج کا اظہار نہ کریں۔ والدین کے ساتھ نیکی کرتے رہیں۔ ورزش کریں تاکہ بہت موٹے نہ ہو جائیں۔ اپنے اُستادوں کا ادب کریں۔ اور اپنی عمر بے سفر میں ضائع نہ کریں۔ عبادتِ الٰہی کی سخت تاکید رکھتا تھا۔

اس حکیم کا ایک تاتاری غلام زاموکنیز نامی تھا جس نے اپنے آقا سے تمام علوم سیکھے تھے اور اس کے قواعد معارف معلوم کئے تھے۔ جب وُہ اپنے وطن میں واپس گیا تو تاتاریوں نے اس کا بڑا احترام کیا۔ اس کے لئے قربانیاں کیں اور اس کو بڑے آدمیوں کے زمرہ میں شامل کر لیا۔

فیثاغورس کا خیال تھا کہ تمام اشیا کی اصل اوّل ایک ہی ہے۔ اُسی سے اعداد نکلتے ہیں۔ اُسی سے نقطے۔ نقطوں سے خطوط۔ خطوط سے سطح۔ سطح سے اجسام اور اجسام سے عناصر اربعہ یعنی آب۔ آتش۔ ہوا۔ خاک۔ جس سے عالم بنا ہے۔ جو ہمیشہ تحلیل اور متغیر ہوتا رہتا ہے۔ ایک چیز دُوسرے میں جا ملتی ہے۔ جواہر عالم میں سے کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی۔ جو کچھ تبدیلی نظر آتی ہے وُہ محض تغیر ہے۔

اس حکیم کا قول ہے کہ زمین گول ہے ۔ عالم کے درمیان میں واقع ہے ۔ او
ہر طرف آباد ہے ۔ یعنی اگر ایک شخص کے قدم سے لیکر خط کھینچا جائے تو وہ
خط دوسری طرف کے آدمی کے قدم پر ختم ہوگا ۔ یہی خط اس کرہ کا قطر کہلاتا ہے۔
بقولِ فیثاغورس جو ہوا محیطِ زمین ہے وہ نہایت آہستہ چلتی ہے اور
بھاری ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس دنیا کے تمام حیوانات میں مرنے کی قابلیت
ہے ۔ برخلاف اس کے جو ہوا محیطِ آسمان ہے وہ نہایت رقیق ہے اور بہت
تیز چلنے والی ۔ اسی وجہ سے جو ذوی الارواح آسمان میں ہیں وہ غیر فانی ہیں
اور اپنے ازلی و ابدی ہونے کی وجہ حق رکھتے ہیں کہ اُن کو خدا کہا جائے ۔
چنانچہ چاند اور سورج اور تمام ستارے یہی خدا ہیں ۔ کیونکہ وہ اس رقیق ہوا اور
اس حرارت میں واقع ہیں جسکے اثر سے زوال نہیں ہو سکتا ۔

اس حکیم کی وجہِ موت میں مختلف اقوال ہیں ۔ بعض مورخین نے لکھا ہے کہ
اس نے اپنے بہت سے شاگرد نکال دیئے ۔ جس سے اُن کو سخت غصہ آیا ۔
اور اُنہوں نے اس مکان میں آگ لگا دی جس میں یہ حکیم مقیم تھا ۔ بعض نے لکھا ہے
کہ شاہ اقرطینیا نے اس خوف سے اُس کے گھر میں آگ لگا دی تھی کہ کہیں وہ
جمعیت بہم پہنچا کر اس کا تخت تاج نہ چھین لے ۔ جب فیثاغورس نے ہر طرف
شعلے اٹھتے ہوئے دیکھے تو اپنے چالیس شاگردوں کو ساتھ لیکر وہاں سے بھاگ
نکلا اور ایک ایسے جنگل میں پہنچ گیا جہاں بھوکوں مر گیا ۔ بعض نے لکھا ہے کہ
اس جنگل میں باقلا بہت ہوتا تھا ۔ مگر اُس نے نہ باقلا کھایا نہ کھیتوں کو روندا اور
اسی حال میں مر گیا ۔ بعض کہتے ہیں کہ بادشاہ وقت نے ایک دوسری قوم
پر فوج کشی کی ۔ یہ قوم اس حکیم کی مداح اور صحبت یافتہ تھی ۔ اس لئے فیثاغورس نے
ان کا ساتھ دیا ۔ اور جب یہ شکست کھا کر بھاگے تو فیثاغورس بھی اُن کے

ساتھ تھا۔ اثنا راہ میں ان فراریوں کو باقلا کے کھیت میں سے گذرنا پڑا۔ مگر اس حکیم نے اس کھیت کو نہ روندنا چاہا۔ اور وہیں کھڑا رہ گیا۔ فوج مظفر نے اُس کو وہیں اپنا نشانہ بنا کر قتل کر دیا۔ اور اُس کے ساتھ ہی اس کے بہت سے شاگرد سوار معدودے چند کے قتل کر دیئے گئے۔ ان ہی تقیۃ السیف میں اس کا شاگرد داشیتاس باشندہ طرنطینہ تھا کہ جو اپنے وقت کا سب سے بڑا مہندس تھا +

(ترجمہ از عربی)　　　محمد خلیل الرحمٰن

غزل

کوئی عالم میں باوفا ہی نہیں　　　اب کوئی ہم کو پوچھتا ہی نہیں
کہئے بیت الصنم سے ہم چلئے　　　کیا ہمارا کوئی خدا ہی نہیں
دیدنی ہے مرا تحیّر بھی　　　کوئی عالم میں آشنا ہی نہیں
تم سے کہتا ہوں دردِ دل اپنا　　　کچھ سُنا تم نے یا سُنا ہی نہیں
کہئے یہ مر گیا مریضِ غم　　　اِس مرض کی کوئی دوا ہی نہیں
دل نہیں جب تو کیا جیوں ہیں جا کر　　　میری کشتی کا ناخدا ہی نہیں
اے مرا حال پُوچھنے والے　　　زیست کا کوئی آسرا ہی نہیں
تُم تھے اور ہم تھے دَورِ ساغر تھا　　　ہائے وُہ وقت بھُولتا ہی نہیں
چشمِ تر دل میں جس سے طُوفاں تھا　　　وُہ تو قطرہ ابھی بہا ہی نہیں
آہ کرتے ہیں کہہ دو گردوں سے　　　ہم نہیں یا یہ فتنہ زا ہی نہیں
جائیں قبروں پہ دوستوں کی کیا　　　واں کوئی ہم سے بولتا ہی نہیں
لاکھ دُنیا نے کھائے ہیں چکّر　　　اپنے مرکز سے مَیں ہٹا ہی نہیں
واہ کیا زندگی ہماری تھی　　　رہ کے دُنیا میں کچھ کیا ہی نہیں
اے شبِ ہجر کس سے حال کہوں　　　کوئی اسوقت جاگتا ہی نہیں
کیا اُٹھیں ہم عزیز مقتل سے　　　فیصلہ تو ابھی ہوا ہی نہیں

[illegible]

میر انیس اور ہم

اس عنوان میں ایک مضمون رسالہ مخزن نومبر ۱۹۱۰ء میں میری نظر سے گذرا۔ یہ مضمون جناب واسطی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کو ایک شاعر وہی مانا ہے اور اُن کی شاعری کی نوعیت کو بہر وجوہ اعلیٰ معیار پر تسلیم کیا ہے لیکن اس رَو میں فاضل نامہ نگار سے جو غلط فہمی واقع ہوئی ہے وہ مخزن کے ناظرین اور ہندوستان کی پبلک کو غلطی میں ڈالتی ہے اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کمی کو پورا کر دیا جائے۔ فاضل مضمون نگار یہ بھی فرماتے ہیں کہ "اگر یہ بزرگ لندن میں پیدا ہوتے تو اس وقت اُنکے کمال کی چار دانگ عالم میں دھوم ہوتی" مَیں عرض کرتا ہوں کہ جس طرح مغربی اہلِ کمال کی شہرت ہندوستان کے تعلیم یافتہ گروہ میں عالمگیر ہے اسی طرح اس شاعر فلسفی کی شہرت سات سمندر پار پہنچکر (انسائیکلوپیڈیا) کے صفحاتِ زریں میں اپنا جلوہ دکھا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مغرب میں ترقی علم و فن کا آفتاب معراجِ کمال پر ہے۔ اور ہندوستان پر جہالت وغفلت کی تاریکی چھائی ہے۔ مگر مورخانہ نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مغربی ملکوں میں علم و عمل پھیلانے کا زمانہ وہاں کے باشندوں کو تقریباً چار سو سال سے نصیب ہوا اور ہندوستان میں تعلیم مغربی کے آفتاب کی شعاعیں صرف پچاس سال سے نور افشانی کر رہی ہیں۔ لہٰذا اس کمی پر نظر ڈالتے ہوئے ہم کو حیرت انگیز نگاہوں سے دیکھنا پڑتا ہے کہ باوجود عدم اسباب و علل میر انیس کی شہرت کمال کو مقبولیت کے فرشتوں نے کہاں سے کہاں تک پہنچا دیا۔ فاضل مضمون نگار نے میر انیس کی شہرت اور مقبولیت پر محض ایک سطحی نظر ڈالی ہے اگر کچھ نظر تحقیق میں فرما

تعمق اور شوق ہوتا تو انکو معلوم ہو جاتا کہ میر انیس کے کلام اور میر انیس کی شہرت کس مرتبہ کی
کی حالت میں نہیں اور ہندوستان کا کوئی شاعر یا اہلِ کمال میر انیس کی شہرت کے
قریب ابھی تک نہیں پہنچا اور نہ سو پچاس سال کی دوڑ میں پہنچ سکتا ہے۔
قطع نظر اسکے مشرقی دُنیا میں ابھی تک وُہ طریقہ ہی جاری نہیں کہ جس ذریعہ سے
اہلِ کمال کی شہرت غیر ملکوں کے باشندوں تک پہنچائی جاتی ہے۔ یہ جو کچھ بات
میر انیس کو حاصل ہُوئی یا محض تائید آسمانی یا تاثیر فلسفۂ شاعری سمجھنا چاہیئے۔ ہندوستان
میں اُردو لٹریچر کی ترقی کا زمانہ دیکھتے ہُوئے لندن کے لٹریچر سے مقابلہ کرنا
کیسی غلطی کی بات ہے۔ جس قوم کو اپنی زبان کی درستی اور اُسکو اعلیٰ پیمانہ پر
لانے میں صدیاں گذر گئی ہُوں۔ اس کے مقابل میں اُردو کے طلوع ہونیوالے آفتاب
نے اپنی ایک منزل بھی طے نہیں کی ہے۔ ایسی حالت میں مغربی اہلِ کمال اور مشرقی
شعراء کا موازنہ کرنا جادۂ تحقیق و انصاف سے انحراف کرنا ہے۔ ہندوستان کے
مشاہیر اہلِ کمال سے قطع نظر کرکے اب مجھے صرف میر انیس کی شہرت کی بابت
جناب واسطی کو مطمئن کرنے کی ضرورت ہی۔
سُنئے ہندوستان کے شہروں میں نصف باشندوں کے گھروں میں میر انیس
کا متبرک کلام موجُود ہے۔ ہندوستان کے بچّے اور عورتیں بھی اس مقدس نام سے
ناواقف نہیں۔ ہم نہیں سمجھتے کہ پھر اَور شہرت اور مقبولیت کس چیز کا نام ہے۔
انیس انیس پُرانے خیال والوں کے بستوں میں اور انگریزی تعلیم یافتوں کی میزوں
پر موجود ہیں۔ موجودہ اہلِ قلم کیسی ہی بے پروائی کریں مگر اس قدرتی شہرت کو
کوئی روک نہیں سکتا۔ فاضل مضمون نگار ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں:۔ میر صاحب
کی سوانح عمری اور انکے حالات زندگی۔ اُنکے کلام پر تنقید لکھنا تو ایک مہتم بالشان
کام تھا اُنکے معتقدین بلکہ اعزہ اور اقربا سے اتنا نہ ہو سکا کہ مرحوم کے کلیات

کا ایک صحیح نسخہ تو تیار کر دیتے اس بے دردی مردہ دلی بے حسی اور بے پروائی کا یہیں خاتمہ نہیں ہوا بلکہ یہاں تک تحمّل اختیار کیا کہ میر صاحب کے اعلیٰ سے اعلیٰ مرثیے بھی مرحوم کے گھرانے والوں نے آپس میں اس طرح تقسیم کر لیے جیسے جائداد اور انہیں اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کا مال۔ اکثر متداول اور مطبوعہ مرثیوں میں بند کے بند الحاقی بیان کئے جاتے ہیں۔ رسم الخط اور کتابت کی غلطیاں تو اس قدر ہیں کہ ناقدری اور بے توجہی پر غصّہ اور افسوس آتا ہے۔"

جناب واسطی کو یہ تو معلوم ہے کہ میر انیس کے متعلق مختلف مضامین کے علاوہ تین مبسوط کتابیں تین سال کے اندر چھپ کر شائع ہو گئیں اور اپنے اپنے طور پر مقبولیت حاصل کر چکیں مگر دنیا میں اقتدار پرستی اور وجاہت پسندی کی ہوا ایسی تیز چل رہی ہے کہ انصاف کے پھول پامال ہوئے جاتے ہیں۔ علامہ شبلی کی تصنیف کی بابت حضرت واسطی اس طرح مدح سرائی فرماتے ہیں:۔ "علامہ شبلی! آپ جُگ جُگ جئیں۔ آپ کی کوششوں کو چار چاند لگیں کہ آپ نے میر صاحب کے کلام کو اصولی نظر سے ملاحظہ فرمایا۔ موازنہ انیس و دبیر کو میں آپ کے اولیات میں سے سمجھتا ہوں۔ آپ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے زمانۂ حال کے اصولِ تنقید کے موافق میر صاحب کے کلام پر ریویو لکھا" خیال فرمایئے اور انصاف کیجئے کہ جب آپ علامہ شبلی کی بابت جوشِ عقیدت میں ایسی رطب اللسانی فرمائیں اور غریب احسن اور مرحوم شہری کی تالیف کو نقش ثانی اور ثالث بنا کر خاموش ہو جائیں تو ہم جیسے بے سواد کم علم اہل قلم کا حوصلہ پست ہو جائے یا نہیں۔ جب ہماری محنت اس طرح خاک میں ملائی جائے تو دوسرے اہل قلم کو بمقابل ان شمس العلماؤں کے دنیا میں کچھ کام کرنے کا حوصلہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ علامہ شبلی کی تالیف کو جوشِ عقیدت اور اقتدار پرستی کی وجہ سے آپ نے بالاستیعاب ملاحظہ فرمایا اور واقعاتِ انیس اور حیاتِ انیس کا نام سُن کر

آپ نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ ہُو بہو ایک عالم کی تصنیف کے مقابل میں احسن نے کیا لکھا ہوگا اور اثہری مرحوم نے کیا توپ داغی ہوگی۔ مجھے خود تسلیمات کا اقرار ہے کہ میرے مخدوم علامہ شبلی علمی دُنیا میں ایک قابل قدر شخص ہیں مگر نفس معاملہ سے اغماض کرنا سراسر ناانصافی ہے۔ اثہری مرحُوم کی حیاتِ انیس میں صداقتِ واقعات سے مجھے انکار ہے تاہم اُنکی کتاب میں حسبِ قسمہ محاسن ہیں۔ مَیں نے اپنی کتاب میں اُن کی مع سرائی کی ہو۔ اسی طرح ان تینوں کتابوں پر کافی نظر ڈال کر ہر ایک کی مخصوصات کا تذکرہ اگر آپ فرماتے تو ایک غریب کم علم بھی آپ کی رائے کا منت پذیر ہوتا۔ آپنے اولیت کا سہرا علامہ شبلی کے سر پر باندھا مگر اولیت کا انعام دینے میں سب سے زیادہ آپ نے بیدردی اور کم توجہی فرمائی۔ مجھے اُمید ہے کہ اس مضمون کو ملاحظہ کرنے کے بعد آپ حیاتِ انیس اور واقعاتِ انیس پر دوبارہ نظر ڈالینگے اور انشاء اللہ اپنے مضمون مندرجہ رسالہ مخزن کا موضوع آپ واقعاتِ انیس میں پائینگے کیونکہ نصف کا حصہ واقعاتِ انیس کے لئے مخصوص ہو۔ اب رہا یہ امر کہ میر انیس کے مرثیے جائداد کی طرح تقسیم ہوگئے تو اس میں شک ہی کیا ہے۔ خاندان انیس کی معاش کا ماجب مرثیہ خوانی پر ہے تو مرثیوں کو اُنکی جائداد کہنا نہایت درست ہے۔ اُنکا حق تھا اُنہوں نے لیا اور قبضہ کر لیا کیونکہ اُن مرثیوں سے اُنکو اپنی مالی منفعت اور ترقی خاندان کی اُمید تھی۔ وہ وارث تھے۔ میراث کے مستحق تھے تو اس میں کوئی مقام استعجاب و اعتراض نہیں اور نہ کوئی حق تلفی کہہ سکتا ہے۔ الحاقی بندوں کی بابت میرا یہ جواب ہو کہ پیشہ ور مرثیہ خوانوں نے اپنی ضرورت کے لئے ان بزرگوں کے کلام میں تصرف کیا۔ دیہاتی اور قصباتی لوگوں کو دھوکا دینے کے لئے کسی نئے مرثیے کا مطلع پرانے میں شامل کر دیا۔ کسی کے بند کسی میں ملا دئے۔ کسی کی جنگ کسی میں داخل کی اور مالی فائدہ اٹھایا یہ محض اُنکی ابلہ فریبیاں ہیں۔ اس فعل کا اثر میر صاحب یا اُنکے خاندان پر کیا پڑ سکتا

مرثیہ تو مرثیہ ہے جب علما تے دین سیکڑوں حدیثوں کو وضعی اور اختراعی قرار دے رہے ہیں اور آجتک اس مسئلہ کا فیصلہ نہیں ہوتا تو مرثیہ خوانوں نے اپنے فائدہ کے لئے اگر ایسے تصرفات کئے تو اصلی چیز پر کیا الزام آسکتا ہے۔ جو لوگ تحقیق سے کام لیں اُنکو میر انیس کے صحیح مرثیے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اب رہی کتابت رسم الخط یا خوانندگی کی غلطی اس کا الزام بھی کاتب اور خوانندہ کے سر تھوپا جائیگا۔ مصنفین اس الزام سے ہمیشہ بری ہیں آتی احتیاطیں تو آج تک کسی سے ہوسکیں اور نہ آیندہ ہو سکتی ہیں۔

یہ بھی فقرہ جناب واسلی تحریر فرماتے ہیں کہ "میر صاحب کے عزیزوں نے اُن مرثیوں کو اس طرح چھپا لیا جیسے چوری کا مال"۔ میرے نزدیک یہ غلط فہمی ہے بلکہ اس طرح چھپا لیا جیسے کوئی شخص بیش قیمت جواہر کو چوروں سے چھپاتا ہے۔ پھر بھی اگر چور کبھی اتفاق سے کامیاب ہو گئے تو بجائے ایک بیش قیمت ہیرے کے کہیں کانچ کا نگینہ لگا دیا اور کہیں پتھر کا ٹکڑا نصب کر دیا جس سے آج مخالفین کو اعتراضوں کا موقع ملا۔ میر صاحب کے خاندان سے جو مرثیہ تقسیم ہوا وہ صحیح نکلا اس کے بعد ایک دوسرے سے سیکڑوں نقلیں اُتارتے ہیں۔ رفتہ رفتہ غلطیوں کی تعداد بڑھتی گئی۔ اُن غلطیوں کا صحیح کرنا خاندان میر انیس کا کام نہ تھا اور نہ یہ امر ممکن تھا کہ سیکڑوں مرثیے تلاش کر کے اُنکی تصحیح کی جاتی۔

دوسری یہ بات کہ بہت سے مرثیہ خوان اس قسم کے ہیں کہ جو سال بھر حجامت بناتے ہیں یا تارکشی کرتے ہیں اور محرم میں فتوح حاصل کرنے کے لئے نخاس سے دو دو پیسے والے چھپے ہوئے مرثیے مول لیکر نہایت شان و شوکت سے شہر کے باہر نکلتے ہیں اور اپنے آپ کو ارشد تلامذہ انیس و نفیس ظاہر کرتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو معزز حضرات کو اُن کی میزبانی کا شرف کیونکر حاصل ہو اور جہان کو فائدہ کیونکر پہنچے۔ اب اگر ایسے لوگوں سے دریافت کیا جائے کہ اُبی ہوئی کسے کہتے ہیں تو وہ

غریب کیا جواب دے سکتے ہیں۔ کسی کام کا اہل ہونا اور بات ہے اور کسی کام کو غصہ اختیار کرنا اس کے کچھ اور معنی ہیں۔

ایک مقام پر فاضل مضمون نگار صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"دو برس ہوئے کہ راقم کو ایک لکھنوی ذاکر کی عزت میزبانی نصیب ہوئی۔ خاندان میر صاحب سے تعلق تلمذ بیان کرتے تھے۔ مرثیوں کے چیدہ چیدہ بند سنانے لگے پیپلا سروہی کھانڈا وغیرہ الفاظ جو آئے تو ایک صاحب پوچھ بیٹھے کہ حضرت پیپلا سروہی اور کھانڈا میں کیا فرق ہے ؟

تیور بدل کر فرمایا کہ یہ بال کی کھال نکالنا ترقصابوں کی طرح کچھ پنجابیوں ہی کو خوب آتا ہے۔ اُنہوں نے پھر پوچھا کہ حضور ! یہ اُپی ہوئی کیا ؟ بڑی سنجیدگی سے جواب دیا کہ یہی اُپی ہوئی"۔

مرثیہ خواں صاحب کے جواب سے اُنکی تہذیب بتا رہی ہے کہ وہ کس درجہ کے مرثیہ خواں تھے مگر مرثیہ خواں سے زیادہ میں سوال کرنے والے کی حالت پر افسوس کرتا ہوں کہ وہ (پیپلا) بھی نوع اسلحہ سے سمجھے۔ کھانڈا یہ بھدا لفظ مجھے یقین نہیں آتا کہ میر انیس کے کلام میں کہیں ہو ایک مقام پر حضرت واسطی میر انیس کے نقادوں سے فرمائش کرتے ہیں کہ میر صاحب کے کلام میں جابجا تلمیحاً احد خندق خیبر بدر صفین وغیرہ کا ذکر آگیا ہے۔ نقاد کو یہ بھی بتانا چاہئے کہ یہ مقامات کہاں ہیں اور کس سنہ میں ان مقامات پر غزوات واقع ہوئے۔

یہ مقامات کہاں ہیں۔ اسکو جغرافیہ بتائیگا اور کون کون لڑائی کس سنہ میں ہوئی۔ اس مسئلہ کو تاریخ حل کریگی۔ پھر آپ ایک مقام پر تحریر فرماتے ہیں کہ کمان چلہ گوشہ وغیرہ سے لوگ ناواقف ہیں۔ تیر اور خدنگ سوفار پیکان ناوک کسے کہتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا۔

ہاں ایک آپ کا سوال یہ بھی ہے کہ ابن سعد خولی شمر سنان بن انس حُر مسلم عوسجہ عنتر رجب کون تھے۔ یہ بھی تنقید کرنے والے کو بتانا چاہیئے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ یہ مسئلہ علم رجال سے حل ہو جائیگا اور اگر ایک مرتبہ ہم کسی جاہل کو بتا بھی دیں تو پھر بھول جائیگا۔ اب رہے اہل علم۔ انکی پیش نظر کتب علم رجال و انساب ہیں وُہ دیکھ سکتے ہیں۔

آخر میں جناب و اسلی جناب رشید مدظلہ سے مخاطب ہوتے ہیں اور انکو یادگار جناب نفیس تحریر فرماتے ہیں۔ یا للعجب آپ اپنے ہمعصروں کا حال نہیں جانتے اور سیکڑوں برس گذشتہ کے اسمار کی تحقیق میں اتنی کوشش۔

سُنئے یادگار جناب نفیس ؛۔ برادر مکرم دُولہا صاحب ہو سکتے ہیں یا اخی معظم میر علی محمد صاحب عارف کو یادگار نفیس کہنا چاہیئے۔ ہاں البتہ انیس کے نواسے ہونے کی وجہ سے۔ مخدوم و مکرم رشید صاحب یادگار کہے جاسکتے ہیں۔ بہرکیف یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا اصل مقصد یہ ہے کہ جناب و اسلی جناب رشید مدظلہ سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ آپ میر انیس کے تمام کلام پر تنقید لکھ ڈالئے اور تنقید میں ان مطالب کو پیش نظر رکھئے۔ لوازم شاعری تخیل انسی۔ فنون سپہگری علم رجال علم انساب تشریح آلات حرب و ضرب۔ تفصیل اقسام اسلحہ توضیح غزوات جناب رسالت مآب صلعم فہرست اسماء مجاہدین و انصار شمار افواج کفار۔ نقشہ میدان کربلا وغیرہ وغیرہ کوئی بات رہ نہ جائے۔ میں بھی دُعا کرتا ہوں کہ خداوند کریم میرے مخدوم کی عمر میں پچاس سال اس کام کے لئے اور عنایت فرمائیے کہ وُہ اپنے فرائض حصول معاش یعنی مرثیہ گوئی کو چھوڑ کر ہمہ تن مصروف ہو جائیں۔ مگر خوف یہ ہے کہ اسکو بھی لوگ نقش رابع کہکر خاموش ہو جائینگے۔

سید مہدی حسن احسن لکھنوی

ہجومِ فرائض

توکز محنتِ دیگراں بے غمی
نشاید کہ نامت نہند آدمی

یہ مضمون لاہور کی پردہ کلب کے ایک جلسہ میں جس میں ہندو مسلمان معزز خواتین اور بہت سی انگریز لیڈیاں شریک تھیں۔ برج کماری صاحبہ نے جو کہ دیوان نرندر ناتھ صاحب بہادر ایم۔ اے کی صاحبزادی ہیں پڑھا تھا اور بہت پسند کیا گیا تھا۔ ہم اسے نہایت خوشی سے چھاپتے ہیں۔

ایشور نے انسان کو خلعتِ ہفت پارچہ یعنی حواسِ خمسہ اور عقل و روح سے سرفرازی دے کر خطابِ اشرف المخلوقات عطا کیا جو اس کی حالت کے بالکل مناسب تھا۔ عقل کا بیش بہا تحفہ اپنی تمام پیدا کردہ مخلوقات میں سے اس کو بخشا۔ ہندوؤں کا فلسفہ بُدھی کو آتما کا اعلیٰ ترین وصف قرار دیتا ہے۔ ہماری مُسلمان بہنوں کی دینی کتاب قرآن شریف میں آیا ہے کہ خدا نے امانتِ عقل کو زمین آسمان اور پہاڑوں کے آگے پیش کیا۔ مگر سب نے اسکو لینے سے پہلو تہی کی اور ڈر گئے مگر انسان نے اس کو قبول کیا اور اس میں کچھ شک نہیں کہ وُہ بڑا ہی ظالم اور بڑا ہی نادان تھا۔ عقل کے قبول کرتے ہی ہزاروں فرائض لاکھوں بکھیڑے کروڑوں مخمصے۔ انسان پر پڑ گئے۔ جانوروں کی طرح صرف زندہ رہنا اپنی ضروریات مہیا کر لینا اور اپنا پیٹ پالنا ہی اس کا فرض نہ رہا۔ بلکہ اپنے ہمجنسوں کے فرائض انکے ناموس کا پاس انکے بہبُود کی کوشش یہ سب اس پر فرض ہُوا۔ غرض اس چند روزہ زندگی میں فرائض کا بڑا بھاری ہجوم اس کے واسطے ہو گیا اور زندہ رہنا اور دُنیا

کی نعمتوں سے حظ اٹھانا۔ کوئی آسان کھیل نہ رہا۔ بلکہ اس سفر کی راہ پُرخطر اور منزلیں بہت ہی دشوار گذار بن گئیں۔ ایک یونانی مصنف کا قول ہے کہ انسان ایک نقطہ کی مانند ہے جسکا مرکز صرف ایک اور دائرے بہت سے ہیں۔ پہلا دائرہ والدین وغیرہ کا۔ دُوسرا گھربار بال بچوں کا۔ تیسرا دیگر عزیز و اقربا کا۔ چوتھا ملک وملت کا۔ ہمیں اکثر خیال آتا ہے کہ اگر ان سب فرائض سے آزاد ہوتے تو شاید ہماری زندگی بہت اچھی طرح کٹتی۔ مگر یہ خیال محض غلط ہے۔ شروع شروع میں تو ان سب فرائض سے الگ ہو بیٹھنا شاید کچھ بھلا معلوم ہو۔ مگر رفتہ رفتہ اس قسم کی آزادی ضرور دُوبھر معلوم ہونے لگے گی۔ اور جی چاہیگا کہ اسی طرح پابند فرائض ہو جاویں اور ان تمام فرائض کو جن کی ادئیگی روز ازل سے ہمارے اوپر فرض کی گئی ہے ادا کریں اور اس راحت کی وجہ سے جو اس سے حاصل ہو۔ طمینان سے بیٹھیں۔ ایک دُوسرا مصنف کہتا ہے کہ فرض ادا کرنے سے وہ فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے جو کسی بڑے سے بڑے شہنشاہ کو تختِ زرین پر بیٹھکر اور مرصع تاج سر پر رکھکر بھی نہیں ہوتی۔

میں اس وقت اُس فرض کی نسبت کچھ کہنا چاہتی ہُوں۔ جس کا سب سے آخر نام لیا ہے۔ یعنی فرض ملک وملت۔ یہ فرض کسی ایک شخص پر نہیں ہے بلکہ قوم کے ہر فرد پر اپنے ملک کو بنانا اس کی گری ہُوئی حالت کو اُبھارنا۔ کھوئی ہُوئی عظمت اور برباد شدہ حرمت کو سنبھالنا۔ وہ ملک جو کسی وقت دُنیا کی اعلیٰ ترین قوموں میں سے تھا مگر جس کی عظمت دورِ فلک نے جو کبھی کسی ملک یا قوم کی حالت ایک سی رہنے نہیں دیتا۔ جس کا روزِ ازل سے بنا بنا کر بگاڑنا اور جگا جگا کر سُلا دینا شیوہ رہا۔ آج ہماری حالت بھی دگرگوں کر دی۔ یہاں تک کہ گزشتہ عظمتوں کے صرف تذکرے ہی باقی رہ گئے ہیں

ہے کیسا یہ انقلاب جاری زماں میں سارے مکاں میں ساری
نہ اس سے خاکی بچا نہ ناری فلک پہ پہنچا زمیں پہ چھا کر

اب ہماری نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ علم کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ تعصب کی گھنگھور گھٹا چھائی ہوئی ہے۔ رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت گردن پر سوار ہے۔ امرا۔ جو ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ غافل اور بے پروا ہیں۔ علما۔ جنکو ملت کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے۔ زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں کی طرف متوجہ نہیں۔ ایسی قوم کو سنبھالنا اسکی بگڑی بنانا۔ اسکی حالت درست کرنا کسی ایک فرقہ کی کوشش سے نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر شخص کی بڑی جانفشانی سے ہو سکتا ہے۔ کسی عالیشان اور خوبصورت عمارت کے بنانے میں طرح طرح کے وسائل اختیار کئے جاتے ہیں۔ نرمی سختی نزاکت پختگی وغیرہ وغیرہ۔ عمارتِ قومی کی بنیاد میں اگر انکسار کی ضرورت ہو تو ہم سب کو بھی کنکر بنکر پڑ جانا چاہئے۔ وہ وقت بھی آئیگا کہ ہم اسکو ایک عالیشان اور خوبصورت عمارت بنا ہوا دیکھینگے۔ اب صرف زبانی جمع خرچ ہی کی ضرورت نہیں بلکہ سخت محنت کی حاجت ہے۔ جو ابھی تک کہیں نظر نہیں آتی۔

اس نیک کام کا آغاز کسی خاص تعریف یا شہرت حاصل کرنے کے خیال سے نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ صرف اپنے ملک کی محبت اور فرض کے خیال سے۔ ملک رُوم میں ایک زمانہ تھا جب وہاں کے پہلوان درندوں اور جنگلی جانوروں سے نہایت بہادری کے ساتھ لڑا کرتے تھے۔ مگر ان کی وہ بہادری اور دلیری اس خیال سے کہ وہ صرف روپیہ کے لالچ اور لوگوں سے تعریف حاصل کرنے

کے لئے بھی ہرگز پسندیدہ نہیں۔ خدا کے غیر فانی ہاتھوں کی بنائی ہُوئی چیزیں بھی رفتہ ہی رفتہ ترقی کرتی ہیں اور یہی اصُول نباتات۔ جمادات۔ حیوانات سب پر حاوی ہے۔ ترقی ملک وملت بھی ہمیشہ چھوٹے چھوٹے کاموں سے ہی شروع ہوتی ہے۔ جو ایک روز اپنی ترقی سے اہل دُنیا کو محوِ حیرت کردیتی ہے۔ انگلستان جیسا اسوقت ہے صدیوں کی کوشش کے بعد بنا۔ وہاں کی عمارتِ قومی کے معماروں اور تہذیب بنانے والوں میں ہزاروں مثالیں ایسی بھی ہیں جنہوں نے اپنی زندگی خدمت ملکی و قومی میں وقف کردی اور انکا نام بھی کسی کان تک نہ پہنچا۔ نہ ان کی سوانح عمریاں لکھی گئیں۔ نہ ماتمی جلسے ہُوئے۔ نہ کسی نے فاتحہ پڑھی۔ اور نہ کوئی چشم تر ہُوئی۔ اگرچہ اُنھوں نے دُنیا میں نام نہ پایا۔ عمر بھر اپنی کوششوں کو کامیاب ہوتا نہ دیکھا۔ مگر اپنا فرض ادا کیا اور مثال قائم کرگئے۔ اور آنے والوں سے اُمید رکھی کہ وُہ اُنکی ڈالی ہُوئی بنیاد کو مکمل کرینگے۔ دُنیا ایک میدان کارزار ہے جس میں فتح کا فخر اور تعریف حاصل کرنے والے معدودے چند ہیں۔ اگرچہ ظفر چھوٹے چھوٹے کاموں پر ہی مبنی ہے۔ خداوند دو عالم نے انسان کو وُہ قوتِ ارادہ بخشی ہے کہ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ کرے تو ہرگز کوئی بات مانع نہیں ہوسکتی ایک انگریز فلسفی جان سٹوارٹ مل کا قول ہے کہ ہم یہ بخوبی معلوم کرسکتے ہیں کہ ہم کسی جادو کے زور سے کسی خاص بات کی پابندی پر مجبور نہیں۔ اور جو کچھ بہتر سمجھیں کرسکتے ہیں۔ اور اس کے برخلاف خیال کرنا اپنی قابلیتوں کو گھٹانا اور اپنے رُتبہ کی ہتک کرنا ہے۔ آئین و قوانین کا مقرر ہونا اور سب کا ان پر عمل کرنا اس بات کی پُوری پُوری دلیل ہے۔ ایک دُوسرا مصنف کہتا ہے کہ سب سے بڑا کمینہ وہ ہے جسے اپنی طبیعت پر قابو نہیں۔ اور جو اپنے ارادہ کو پورا نہیں کرتا

جب تک ہر فرد بشر جس میں ہم عورتیں بھی شامل ہیں۔ اپنی فلاح کی کوشش نہ کرے اور جو کچھ بن پڑے کرنے پر آمادہ نہ ہو۔ ہماری ترقی مشکل ہے۔ ہمارا فلاح ملک و ملت میں دخل دینا اور اپنی بہبودی اور بہتری کی کوشش کرنا کوئی نئی بات نہیں۔ غیر ملک تو رہے درکنار ہمارے اپنے ہندوستان میں عورتیں ہمیشہ ملکی خدمات بجا لاتی رہی ہیں۔ سوشل ترقیوں کی کوشش تو خیر ان کے بس کی ہی بات ہے۔ ہندو اور مسلمان بہنوں نے بعض موقعوں پر ملکی امور میں عجیب و غریب بہادری دکھائی ہے۔ راجپوتانہ کی تواریخ کے صفحات راجکماریوں کے کارناموں سے بھرے پڑے ہیں۔ ہمارے پیارے ہند کی مستورات ہمیشہ سے اپنے اس بڑے فرض سے ایسی غافل نہیں تھیں۔ جیسی کہ اب ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے ملک اور ملت کے لئے جان دینے کو آمادہ تھیں اور اس زندگی کو جو خدمات ملکی اور قومی میں صرف ہوتی۔ ابدی زندگی کہتی تھیں۔ مجھے اس مضمون کو اپنی بہنوں کے آگے پڑھ کر ان کو اپنے فرائض یاد دلانا منظور ہے۔
ہمارے ملک کی فلاح بغیر ہماری مدد کے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بقول ایک لائق خاتون کے عمارت قومی کے معمار مرد نہیں بلکہ ہم ہیں۔ ہم سب کو واجب ہے کہ تھوڑا تھوڑا حق اپنی قوم کی مائیں اور بہنیں ہونے کا ادا کریں اور ان کاموں کی بنا ڈالیں کہ جو ابھی تو نہیں مگر وقت پا کر وہ نتائج پیدا کرینگے۔ جن سے ہماری قوم کی فلاح میں بہت بڑی مدد ملیگی۔ اور ہم سب اس اشتیاق کے ساتھ اس مبارک وقت کی منتظر رہیں۔ جب ہمارے لگائے ہوئے پودے برگ و بار لائینگے ۔

مس نرندر ناتھ

تصویر کے دو رُخ

"رشید۔ اخاہ کب آئے۔ رہے تو اچھے۔ کہو لکھنؤ اور دیوبند میں کیسی گذری۔ سنتے ہیں کہ ان دونوں جگہوں میں عربی فارسی کی تعلیم کا انتظام اچھا ہے اور غریب و نادار طالبعلموں کو بھی مخیر و مستطیع لوگ امداد پہنچاتے ہیں۔ تم نے خوب مستعدی سے پڑھا ہوگا۔ ماشاء اللہ تم پہلے ہی سے طبیعت دار تھے۔ یہاں بھی جب تک تم رہے اپنے ہم سبق لڑکوں میں بڑھ چڑھ کر تھے۔ ذہین تم تھے ہی اور تمہیں عربی فارسی پڑھنے کا بھی شوق تھا۔ استاد تو تم سے خوش رہے ہونگے اور تمہارے ساتھیوں نے بھی تمہاری خداداد لیاقت دیکھ کر کہا ہوگا کہ یہ بھی کچھ ہے۔ ہاں بھئی! تم ٹھیک کہتے ہو کہ آجکل لوگوں کی طبیعتیں انگریزی پر اتنی مٹی ہوئی ہیں کہ عربی فارسی کا نام تک نہیں لیتے بیٹا! انگریزی پڑھنے میں تو کوئی حرج نہیں لیکن اسی کے ساتھ ہم پر فرض ہے کہ ہم اپنے مذہب کو نہ بھولیں اور خدا و رسول کو پہچانیں۔ خدا ان لوگوں کی ہمت میں برکت دے جو اس زمانے میں بیچاری عربی فارسی کی دستگیری کرتے ہیں"۔

"رشید! تم تو بہت اچھی اچھی باتیں سیکھ کر آئے ہو۔ اب تو ہم کو جو بات نہ معلوم ہوگی تم سے پوچھا کرینگے اور تم بھی بتانے میں لحاظ نہ کرنا۔ دیکھو تو تم کتنی اچھی تقریر کرتے ہو اور بات بات میں قرآن و حدیث کی سند لاتے ہو۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو "ہونہار برواکے چکنے چکنے پات"! ہم تو پہلے ہی بھائی جان سے کہتے تھے کہ انشاء اللہ تعالیٰ رشید بہت

نیاقت حاصل کریگا۔ الحمدللہ کہ تم نے میری بات رکھ لی۔ ہاں بیٹا! دیکھو تم یہاں تکلّف نہ کرو۔ یہ تمہارا گھر ہے میں تم کو سعادت (ان کا لڑکا) سے کم نہیں سمجھتا۔ اچھا آرام سے بیٹھ جاؤ۔ اچکن اُتار کر کیل سے لگا دو"۔

واہ بھئی واہ! اب کوئی جانے کا وقت ہے۔ کھانا تیار ہے۔ کھا کر آرام سے یہیں لیٹنا۔ شام تک چلے جانا۔ اس وقت دھوپ بھی زیادہ ہو گئی ہے تکلیف ہو گی۔ اور ابھی تو تم سعادت سے نہیں ملے وہ اب آتا ہی ہو گا۔ کل سے اپنی خالہ اماں کے یہاں گیا ہے۔ اُن کا تو اصرار تھا کہ میں سعادت کو دو چار دن نہ آنے دونگی مگر میں نے کہا کہ نہیں اس کے پڑھنے کا ہرج ہو گا۔

"ہاں سعادت اب مکتب جاتا ہے۔ پہلے تو ڈیڑھ سال تک میں نے خود اُسے گھر پر پڑھایا اور جب دو چار فارسی کی کتابیں نکل گئیں تو میں نے اُسے لوی مظہر اسلام صاحب کے سپرد کر دیا ہے۔ مولوی صاحب بیچارے بہت نیک آدمی ہیں اور لڑکوں کو ایسی محبت کے ساتھ پڑھاتے ہیں کہ وہ اُن سے بہت مانوس ہو جاتے ہیں۔ اب سعادت کا یہ حال ہے کہ مکتب جانے سے ذرا بھی جی نہیں چُراتا۔ بلکہ اگر روکو بھی تو نہیں مانتا۔ کل کی بات ہے کہ گھر میں حضرت (ان کے پیر) کی دیگ تھی۔ میں نے اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو مدعو کیا تھا۔ تمہاری چچی (ان کی بیوی) نے سعادت سے کہا کہ آج مکتب نہ جانا۔ گھر پر ہی رہنا۔ سب لوگ آئینگے۔ دیکھنا بھالنا۔ مگر وہ نہ مانا۔ میں نے سمجھا کہ شاید میرے خیال سے یہ ایسا کہتا ہے میں نے بھی اس سے کہا کہ ہاں آج پڑھنے نہ جانا۔ ہم مولوی صاحب سے کہدینگے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ نہیں باوا! میں جلدی چلا آؤنگا۔ سبق کا ہیکو ناغہ ہو"۔

" لو سعادت بھی آگیا۔ سعادت ادھر آؤ۔ دیکھو تمہارے رشید بھیّا

آ گئے ہیں۔ دونوں بھائی ملو۔ رشید تم نے تو اسے پہچان لیا ہوگا۔ لیکن شاید اس نے تمہیں نہ پہچانا ہو (سعادت سے) یہ تمہارے بڑے بھائی ہیں۔ تمہارے چچا جان جو لا لا کر مٹھائی اور کھلونے دیا کرتے تھے اور تمہیں بہت پیار کرتے تھے۔ اُن کے یہ بیٹے ہیں۔"

"اچھا سعادت! اب اپنے بھیا کو کھانا نہ کھلواؤ گے۔ دیکھو تیار ہوگا۔ لو لاؤ۔"

"دیکھو میاں رشید! تم تکلف نہیں چھوڑتے۔ ارے بھائی کھانے میں تو کسی کو تکلف نہ کرنا چاہئے اور پھر یہ تو تمہارا گھر ہے۔ گھر میں آدمی کو کس بات کا لحاظ ہوتا ہے خوب سیر ہو کر کھاؤ۔"

"گل چمن! دیکھو رشید کے لئے اور میٹھا لانا۔ سعادت! یہ کباب کی طشتری رشید کی طرف بڑھا دو۔ رشید! دیکھو یہ میٹھی چٹنی کتنی لذیذ ہے اور یہ پیٹھے کا مربہ خاص قسم کا ہے۔ اس ٹکڑے کو دیکھو ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے بالکل کچے ہوں۔ مگر ذائقہ میں بہت اچھے ہیں۔ کھانے میں بھی کرکراہٹ پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ترکیب سے بنتا ہے۔"

"بس واہ! ابھی اور کھاؤ۔ تم تو اس قدر تکلف کرتے ہو جس کی انتہا نہیں۔ اچھا بالائی کے ساتھ تھوڑا سا میٹھا اور کھا لو۔ بہت اچھا معلوم ہوتا ہے۔ دو ایک قاش مربے کی اور لو۔ منہ نمکین کرنے کے لئے اچھا تھوڑا سا شامی کباب چکھ لو۔"

"بخدا! میں نے تمہاری وجہ سے کوئی تکلف نہیں کیا۔ گھر میں جو کچھ معمولی طور سے پکتا تھا وہی تمہارے سامنے آیا ہے۔ صرف میٹھا اور پکوا لیا تھا اور یہ مربے وغیرہ تو میرے ہاں ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ یہ گاجر کا

حلوہ سعادت اپنی خالا اماں کے یہاں سے لایا تھا۔ اُن کو مربّے اچار۔ چٹنی وغیرہ بنانے کا بہت شوق ہے۔"

"بھئی اب جانے کی کیا ضرورت ہے۔ مَیں تو سمجھتا ہوں شام تک جانا۔ اب یہیں کچھ دیر آرام کرو۔"

"خیر! اگر ایسی ہی مجبوری ہے تو مَیں زیادہ اصرار نہیں کرتا لیکن میاں رشید کبھی کبھی اس طرف آنکلنا چھوٹے کو بہت بہت پیار کر لینا۔ آج تم سے اس کی علالت کا حال سُنا ہے۔ میری طبیعت لگی رہیگی۔"

"اچھا (گلے لگا کر) خدا حافظ" (رشید کے ہاتھ میں دو روپیہ رکھ دیتے ہیں اور رشید واپس کرنے کی کوشش کرتا ہے)۔

"نہیں نہیں مَیں نہ مانوں گا۔ خالی ہاتھ تھوڑے جاؤگے۔ بھئی اچھا اگر تمہیں لینے میں عار ہے تو راستہ میں کہیں سے چھوٹے کے لئے مٹھائی لیتے جانا اور دیکھو محمود تمہارے ساتھ آتا ہے۔ اس مرتبان میں کچھ مربّہ اسے دیدیا ہے گھر میں سب کو دیدینا ...."

میر فرخندہ علی پُرانی وضع کے ایک متوسط الحال پیرمرد اپنی نشستگاہ میں بیٹھے ہُوئے ہیں۔ یہ کمرہ ان کا گویا ڈرائنگ رُوم ہے۔ لیکن یہاں آپ کو آرائش کا وُہ سامان نظر نہ آئیگا جسکے بغیر کسی مہذّب جنٹلمین کی عزت میں بٹہ لگجاتا ہے۔ پھر بھی دیکھئے باوجود اپنی سادگی کے یہ جگہ کس قدر دلچسپ ہے۔ دری کا فرش ہے۔ اُس پر سفید بُرّاق چاندنی کتنی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ صدر میں ایک قالین لگا ہُوا ہے اور اُس پر دیوار سے ملا ہُوا ایک گاؤ تکیہ رکھا ہے۔ تکیہ پر بھی صاف غلاف چڑھا ہُوا ہے۔ ایک کونے میں آگرے کی بنی ہُوئی خوبصورت جانماز بچھی ہے اور اس کے سرے پر عقیق البحر کی ایک تسبیح رکھی ہے۔ جانب مغرب ایک مختصر الماری

میں کچھ کتابیں ہیں۔ کتابوں میں آجکل کے ناول نہیں جو نوعمروں کو اپنے پیچھے باؤلا بنائے ہوئے ہیں بلکہ اُن میں زیادہ تر فارسی تصانیف ہیں۔ ان کو میر صاحب نہایت عزیز رکھتے ہیں اور فرصت میں ان کے مطالعہ سے حظ حاصل کرتے ہیں اور اکثر اُن کے پُرلطف مضامین اپنے یار دوستوں کو بھی سناتے ہیں۔

اس وقت ایک نوجوان ان کا مخاطب ہے۔ یہ میر صاحب کے ایک دوست کا صاحبزادہ ہے۔ میر صاحب اور اس کے والد میں بہت ارتباط ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت ہمدردی و محبت کرتے ہیں۔ یہانتک کہ میر صاحب اپنے دوست کو جن کا سن ان سے کسیقدر زیادہ ہے۔ بھائی جان کہا کرتے ہیں۔ رشید کو دیکھکر میر صاحب بہت مسرور ہیں اور اُن کی خوشی کا اظہار اُنکی حرکات و سکنات سے ہو رہا ہے۔ دیکھئے باتیں بھی کتنے مزے کی ہیں کہ دلی محبت ٹپکی پڑتی ہے۔ باتیں کیا ملنساری اور بزرگانہ عنایت کی ہوبہو تصویر ہیں۔

نئی روشنی والے پُرانی وضع کے بزرگوں کو خواہ کسی قدر ذلت کی نگاہ سے دیکھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ یہ لوگ وضعداری اور خلوص و محبت کے خاص طور پر پابند ہوتے ہیں۔ محدود خیالات اور کم نظری کے باوصف اُن میں بعض مخصوص صفات ایسی پائی جاتی ہیں جو ہمارے ملک کے نئے طبقہ میں بالکل مفقود نظر آتی ہیں۔ ان میں وہ اوصاف بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں جو حقیقی اُلفت اور صحیح ہمدردی کی سچی تصویر کہے جانے کے مستحق ہیں۔ اُن کا خلق ظاہری نمائش اور بناوٹ سے معرّا ہوتا ہے۔ اُن کا اخلاق نہایت وسیع اور ہر کہ ومہ کے ساتھ یکساں رہتا ہے۔ اگرچہ بظاہر وہ قومی ہمدردی سے محض ناواقف ہوتے ہیں۔ تاہم فرداً فرداً وہ اپنے دوستوں آشناؤں۔ مہمانوں اور عزیزوں کے ساتھ ایثار نفس اور خالص اُنسیت کا برتاؤ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے

اُن میں ایک قابلِ تعریف بات یہ ہوتی ہے کہ ظاہرداری اور تصنّع سے اُن کے قول و فعل کو مطلق لگاؤ نہیں ہوتا۔ جو بات اُن کے دل میں ہوتی ہے اُس کے اظہار میں وُہ تامل نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ اوروں کے جذبات کو صدمہ پہنچانا گناہِ کبیرہ سے کم نہیں سمجھتے۔ اُن کی وضع و قطع سیدھی سادی ہوتی ہے۔ اُن کا طرزِ زندگی سادگی اور کفایت شعاری کا مکمل نمونہ ہوا کرتا ہے۔ اُن کی گفتگو بے تکلف اور روزمرہ کی زبان میں اُنکے اصلی خیالات و خواہشات کا سچا عکس ہوتی ہے۔ وُہ جس سے ملتے ہیں خلوصِ دل کے ساتھ اور بے غرض ملتے ہیں۔ غیروں کی امداد میں اُن سے جو کوشش ممکن ہوتی ہے اُس سے اُنہیں دریغ نہیں ہوتا۔ غرضکہ وُہ نہایت راستباز اور متواضع ہوتے ہیں اور اُنہیں اخلاق مجسم کہنا واقعیت کا اظہار کرنا ہے۔

اِس کے برخلاف ہم پر نظر ڈالئے جو نئی روشنی کے شعاعوں سے اپنے دل و دماغ کو منور کر چکے ہیں اور عالی خیال و تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے اُس جماعت سے وابستہ سمجھے جاتے ہیں۔ جس کی حوصلہ افزا و دل خوش کن مساعی پر مُلک کی نجات منحصر ہے۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھئے اور ہماری اور اُن بڑے بوڑھوں کی حالتوں کا موازنہ کیجئے تو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا۔ وہاں اگر نمائش اور ظاہرداری کی جھلک تک نظر نہ آئیگی تو ہم یہاں سر سے پیر تک تصنّع سے ملوّث دکھائی دینگے۔ جس چیز کا نام ہم نے تہذیب رکھا ہے وُہ آپ کو ہمارے یہاں چند معاشرتی پابندیوں کی صورت میں ملیگی۔ جس چیز کو ہم اخلاق کہتے ہیں اُسے آپ ہمارے یہاں چند خوش آیند الفاظ کے بھیس میں پائینگے۔ ہمارے یہاں محبت و ہمدردی اُس تصویر کا نام ہے جو اوپر سے نہایت خوش وضع اور نظر فریب بنائی گئی ہے لیکن اُس میں جان نہیں۔ ہمارے یہاں اخلاص و

مروت کا لقب اُن خیالات کو دیا گیا ہے جو اظہار تمدن و تمکنت کے طریقے پر دوسروں
کے سامنے ظاہر کیے جاتے ہیں۔ قومی ہمدردی ہمارا صبح و شام کا وظیفہ ہے لیکن یہ
اُس شاعر کی دُعا کی طرح بے اثر ہے جس نے اپنی نارسائی قسمت پر عاجز آکر یہ کہدیا
تھا کہ ؎

مانگا کرینگے اب سے دُعا ہجر یار کی آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

تصویر کا ایک رُخ دیکھنے کے بعد بھی اگر آخری فیصلہ تک پہنچنا دشوار ہو تو
آیئے ہم عینی مثال و مشاہدے سے یہ بات آپ کے دل نشین کر دیں کہ عجب
پُرانے قسم کے بزرگوں کو جنہیں ہم بعض اوقات پیر فرتوت کہکر اپنی دریدہ دہنی
کا ثبوت دینے میں عار نہیں رکھتے۔ نئی اُمت سے سچے اور صحیح اخلاق و
تہذیب میں کسی حد تک فائق ہیں یا نہیں۔

حامد و محمود دونوں نئی طرز کے تعلیم یافتہ نوجوان۔ دونوں مغربی وضع
کے پابند اور دونوں سیج پچ کے صاحب بہادر ہیں۔ طرز معاشرت کی یکسانیت
کے ساتھ خیالات کی یکرنگی نے دونوں کو ایک دوسرے کا دوست بنا دیا ہے۔
ناواقف لوگ جانتے ہیں کہ حامد و محمود ایک جان دو قالب ہیں۔ مگر آہ!
یہاں وُہ سچی اُلفت نام کو بھی نہیں۔ بے تکلفی یہاں عنقا صفت معدوم ہے
یہاں اُس خلوص و یگانگت کا سایہ تک نہیں پڑا جس کی وجہ سے میر فرخندہ علی
رشید کے والد کو بھائی جان کہنے پر مجبور تھے اور جس نے سعادت کے
کان میں پھونکدیا تھا کہ رشید تیرا بڑا بھائی ہے۔ یہاں تو ڈیر محمود ڈیر حامد
کے القاب ہیں جو خواہ کسیقدر دلچسپ معلوم ہوں لیکن معنوی اعتبار سے
ان الفاظ کے مہمل ہونے میں کُچھ شبہ نہیں۔

لیکن حامد و محمود کے دل میں بھی کبھی اسباب کا گمان نہ گذرا ہوگا کہ آپس کی

پاسداری کے باوجود وہ ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھانے کے مجاز ہیں جوا۔ محمود حامد سے دن بھر میں بیس دفعہ ملنے آئے۔ لیکن حامد ہی کو قسم ہے کہ اگر اُسے ایک پیالی چاء کے لئے بھی پوچھے۔ اسی طرح جب تک کوئی موقع نہ آئے اور خاص طور پر دعوت کا پیام نہ بھیجا جائے اُس وقت تک حامد کو محمود کے یہاں کھانا حرام ہے۔ باتیں کرنے میں اُسے یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ غیر ضروری امور میں مسٹر محمود کا وقت نہ ضائع کرے۔ نہ طول کلامی سے دماغ پراگندہ ہونے پائے۔ گفتگو پر اگر سرسری نگاہ ڈال لیئے تو تصنع اور ریاکاری کے رنگ میں رنگی ہوئی پائیگا اور اُس میں اُس فراخ حوصلگی اور کشادہ دلی کا نام تک نہیں جو دو قلبی دوستوں کی بات چیت میں ہونا ازبس لازمی سمجھی جاتی ہیں۔

"ڈیر حامد! مجھے آپ سے ملکر بیحد مسرت ہوئی۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیریت ہوگا۔"

"تھینک یُو۔ میں آپ کے اس عنایت آمیز استفسار کا شکریہ تہ دل سے ادا کرتا ہوں اور ایک خاص ضرورت سے میں آپ کو اسوقت تکلیف دینے پر مجبور ہوا ہوں کہ ...."

"اس بارے میں مجھ سے جو کچھ ممکن ہوگا اُس کے لئے میں ہر طرح حاضر ہوں لیکن آپ خیال کر سکتے ہیں کہ میری کوشش اس امر خاص میں شاید زیادہ کارگر نہ ہو۔ باوجودیکہ مسٹر فلاں کی مجھ پر نظرِ عنایت ہے۔ مگر وہ کسی قدر خشک مزاج واقع ہوئے ہیں اور اُن کے سامنے کسی ضرورت کو پیش کرتے ہوئے پس و پیش ہوتا ہے کہ کہیں زبان نہ خراب ہو۔"

"ڈیر محمود! میں اس معاملہ میں آپ پر بار ڈالنا پسند نہ کرتا لیکن چونکہ یہ ایک قومی کام ہے اور آپ ہر کارِ خیر میں حصہ لینے کے ایک طرح سے عادی ہیں اس لئے

میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی اپنی امکانی امداد سے دریغ نہ فرمائیں۔"

"ہاں ہاں۔ میں آپ کو پورا اطمینان دلاتا ہوں کہ میں آپ کا ہمخیال ہوں اور تعلیم نسواں کے مسئلہ سے تو مجھے خصوصیت کے ساتھ وابستگی ہے۔ لیکن کیا کروں۔ مکروہاتِ دنیاوی سے سر اُٹھانے کی بھی فرصت جلسہ کا زمانہ بہت قریب ہے اور ابھی ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔ افواہاً میں نے سنا ہے کہ کوئی مولوی صاحب ہیں اُنہوں نے ایک پمفلٹ شائع کیا ہے اور لوگوں کو اس جلسے کے خلاف اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ حامد! ان مُلّاؤں نے ناک میں دم کر دیا ہے۔ یہ کسی پہلو چین نہیں لینے دیتے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے دُنیا کو کیا فائدہ پہنچتا ہے اور مشکل سب سے بڑی یہ ہوتی ہے کہ عوام انہیں کم عقلوں کی تقلید کو جنّت کی کنجی سمجھتے ہیں۔ اِن سے خدا سمجھے۔"

"ان تمام دقتوں کے باوصف ہمیں اپنے کام کی طرف غفلت نہ کرنا چاہئے ہاں اچھا یاد آیا محمود! میں نے لعل محمد (حامد کا ملازم) کے ذریعہ کل اُس کتاب کی قیمت آپ کی خدمت میں بھیجدی تھی جو میں آپ کے یہاں سے ایک ہفتہ ہوا ضرور ساتھ لیگیا تھا اور جس کے اتفاقیہ گم ہوجانے کا حال بھی میں کئی دن ہوئے آپ سے عرض کر چکا ہوں۔"

"بیشک مجھے وہ رقم مل گئی ہے اور میں آپ کی اس توجہ کا شکر گذار ہوں۔"

"اب میں اپنی باتوں سے آپ کا زیادہ وقت نہیں صرف کرنا چاہتا اور اجازت طلبگار ہوں۔"

"بہت خوب اب میرے کھانے کا وقت بھی آگیا ہے۔ گُڈ بائی۔"

گفتگو میں سنجیدگی اور متانت کا پہلو قائم رکھنے کی کوشش پوری پوری کی گئی ہے۔ لیکن اس لب ولہجہ ان تکلّف آمیز الفاظ اور اِن مہذب مگر خشک خیالات

سے ان دونوں دوستوں کے خلوص و محبت کا کس حد تک اظہار ہوتا ہے؟ آہ! فرمانبرداری اور شائستی تہذیب اب ہمارے رگ و ریشہ میں گھر کر چکی ہے اور مغرط اخلاق ہماری صفاتِ حسنہ سے کب کا خارج ہو چکا۔ اس افسوسناک انقلاب کو دیکھ کر حضرت لسان العصر کی زبان سے بے ساختہ نکل گیا ہے سہ اکبر؎

نہ کوئی تکریم باہمی ہے نہ پیار باقی ہے اب دلوں میں
یہ صرف تحریر میں ڈیئر سر ہے یا جناب مکرمی ہے

ایک آنہ فنڈ

لکھنؤ میں کچھ عرصہ سے ایک فنڈ قائم ہے۔ جس کا مقصد مساجد کی مرمت اور آبادی ہے۔ یہ فنڈ چھوٹی مقدار کے چندوں سے بہت بڑی کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر اس کی رفتارِ ترقی اسی طرح قائم رہے۔ حال میں سیّد خلیل احمد صاحب آنریری سکرٹری نے اس فنڈ کی دوسری روداد شائع کی جو دلچسپ معلومات سے پُر ہے اور جس سے اس جماعت کے کام میں خاطر خواہ ترقی نظر آرہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ مساجد بہت کچھ توجہ اور امداد کی محتاج ہیں اور اُمید کی جاتی ہے کہ مخیّر اصحاب اِس کارِ خیر کی مدد فرما کر داخلِ حسنات ہونگے *

کلامِ اکبر

مذہبی وعظ کا سودا نہ رہا گو سر میں — میرزایانہ تعلّی تو ہے لٹریچر میں
کھیتیاں خشک ہوئیں سوکھ گئے گلشن و باغ — عرش پر پھر بھی ہے ایران کی انشا کا دماغ
دہر کہتا ہے کہ اس آتشِ فارس کو بجھا — ڈارونیہ انہیں کرمکِ بے مضمون سمجھا
تازی و پارسی جب تک کہ نہ یہ بھولیں گے — اِن کے اوہام سدا عرش ہی پر جھولینگے
خیر ماضی نہ سہی حال کی نظمیں دیکھو — حضرتِ اکبر و اقبال کی نظمیں دیکھو

ان کو کس بحر سے مضمون کے دُر ملتے ہیں
وُہ ترانے ہیں کہ افلاک سے سُر ملتے ہیں

حفظِ عصمت بھی سہی لیکن یہ پردہ ہند میں — مُسلموں کے جاہ و شانِ تمکنت کی بات تھی
پردہ در کہتا ہے اب اسکی ضرورت ہی نہیں — میرزایانہ ادا تھی تمکنت کی بات تھی

خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھیگا کبھی
خوب تھا پردہ نہایت مصلحت کی بات تھی

بتوں سے میل خُدا پر نظر یہ خوب کہی — شبِ گناہ و نمازِ سحر یہ خوب کہی
فنِ نفیس ٹرک خوشنما ڈنر ہر شب — یہ لُطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی
تمہاری خاطرِ نازک کا ہے لحاظ فقط — وگرنہ مجھ کو رقیبوں کا ڈر یہ خوب کہی
ہزار جان سے مشتاق خود ہوں خدمت کا — تمہارے کام میں اور دردِ سر یہ خوب کہی
درست ہیں نہ عقیدے نہ ہیں عمل اچھے — دُعا میں کیوں نہیں ہوتا اثر یہ خوب کہی

مری نگاہ میں اے ہمنشیں جہاں ہے سیاہ — شبِ فراق میں لُطفِ قمر یہ خوب کہی
جنابِ شیخ کا ہو جاؤں معتقد معقول — نگاہِ یار رہے بے اثر یہ خوب کہی
شباب و بادہ و فکرِ مآلِ کار چہ خوش — جنونِ عشق و خیالِ خطر یہ خوب کہی

نظمِ رخصت

یہ نظم مسٹر وہاج الدین حیدر صاحب بیرسٹر لکھنؤ نے اپنے بھتیجوں نظام الدین حیدر اور وحید الدین حیدر کے لندن جانے کے وقت بمبئی بھیجی تھی کہ جہاز پر قدم رکھتے ہی اُن کو ملے :-

نظامؔ جاتے ہو لندن مگر خیال رہے! — وحیدؔ تم کو بھی اندیشۂ مآل رہے!
ہمارے دردِ جدائی کا کچھ اثر بھی ہے — ہمارا حال ہے کیا - کچھ تمہیں خبر بھی ہے!
خبر ہے تمکو یہ کیوں دے رہے ہیں اذنِ سفر — تمہارے ہجر کا رکھتے ہیں دل پہ کیوں پتھر
یہ جانتے ہو کہ ہم سب کو آرزو کیا ہے؟ — جو بھیجتے ہیں تمہیں اُن کو جستجو کیا ہے!
یہ آرزو ہے کہ دُنیا میں شاد و کامراں ہو — دُعا یہ ہے کہ زمانہ میں نیکنام رہو
سُنو کہ خواہشِ اوّل یہی ہے ہم سب کی — وہاں بھی تم کو رہے قدر اپنے مذہب کی
وہ مذہب حنفی ضد جو ہے تعصب کا — کہ جس کا مسئلہ خُلق نقش ہے حُب کا
مگر بُرا نہ سمجھنا کسی کے مذہب کو — ہمیشہ چشمِ محبت سے دیکھنا سب کو
اُصول میں ہیں صریحاً تمام مذہب ایک — غرض ہے ایک ہی اصلاح نفس مطلب ایک
وہاں تمہیں نظر آئیگی اِک نئی دُنیا — نظر فریب تماشا ہے جسکے گلشن کا
کھلے ہوئے ہیں بہارِ طرب کے گل ہر سُو — نگارِ عیش کے بکھرے ہی رہتے ہیں گیسُو
نگاہ محوِ تماشائے شاہدِ گُل ہے — دلوں کے تاک میں وارستہ زلفِ سُنبل ہے

کنارِ ٹیمس وُہ ہنگامۂ نشاط وُہ دھوم | محاذِ آبِ سمندر وُہ گھنگھٹے وُہ ہجوم
وُہ بال رُوم میں رقصِ سرود و عیش و نشاط | کہ جیسے آگے نہیں جشنِ جم کی کوئی بساط
بھرے ہُوئے ہیں تھیٹر قمر جبینوں سے | نظر کو بھی نہیں ملتی جگہ حسینوں سے
سماں یہ دیکھ کے جو لوگ بُھول جاتے ہیں | وُہ راہِ منزلِ مقصود بھُول جاتے ہیں
بہارِ گلشنِ دُنیا ہے آدمی کے لئے | مگر بنا نہیں انسان محض اسی کے لئے
ضیائے شمعِ شبستاں ہو رات بھر کیلئے | فضائے منظرِ بستاں ہو اک نظر کے لئے
قرینِ عقل نہیں دِل پہ ہو نظر غالب | نظر فریب بھی کھائے تو دِل نہ ہو طالب
وُہ دِل کہ خونِ شرافت ہو موجزن جس میں | شعاعِ مہرِ سعادت ہے ضَو فگن جس میں
کمالِ علم ہی غایت ہو اہلِ بینش کی | سمجھتے ہیں جو غرض اپنی آفرینش کی
اِسی سے ہجر گوارا یہ جبر کرتے ہیں | خدا کو سونپتے ہیں تم کو صبر کرتے ہیں
اکیلے جاتے ہو پردیس میں خدا حافظ | جہاں مقام ہو ہر دیس میں خدا حافظ

دِلِ بیقرار سوجا

ناظرینِ مخزن منشی درگا سہائے صاحب سرور جہان آبادی کے انتقالِ پُرملال کی خبر غالباً اخبارات میں دیکھ چکے ہونگے۔ ان کے گذر جانے سے اُردو علم ادب کا ایک سچا خادم دُنیا سے اُٹھ گیا۔ افسوس کیسے کیسے لوگ کُوچ کرتے جاتے ہیں۔ اُن کی بھیجی ہُوئی دو ایک نظمیں ہمارے ذخیرہ میں باقی ہیں اُن میں مندرجہ ذیل نظم اپنے عنوان کے اعتبار سے شاعر کے حسبِ حال ہو چکا دِلِ بیقرار مدّت العمر تڑپ تڑپ کر آخر ایسی نیند سو گیا ہے جس سے حشر تک بیدار نہیں ہوگا :-

کسی مستِ خواب کا ہے عبث انتظار سوجا | کہ گذر گئی شب آدھی۔ دِلِ بیقرار سوجا

یہ نسیم ٹھنڈی ٹھنڈی - یہ ہوا کے سرد جھونکے
تجھے دے رہے ہیں لوری - مرے غمگسار سو جا

یہ تری صدائے نالہ - مجھے متہم نہ کر دے
مرے پردہ دار سو جا - مرے رازدار سو جا

تجھے خوں رلا رہا ہے ترا دمبدم تڑپنا
ترے غم میں آہ کب سے ہوں میں اشکبار سو جا

ابھی دہان پان ہے تو نہیں عاشقی کے قابل
یہ تپش کا آہ شیوہ نہ کر اختیار سو جا

نہ تڑپ زمیں پہ ظالم! تجھے گود میں اٹھا لوں
تجھے سینے سے لگا لوں - تجھے کر لوں پیار سو جا

تجھے جن کا ہے تصور - اے مست جام الفت
انہیں انکھڑیوں کے صدقے مرے بادہ خوار سو جا

تجھے پہلا سابقہ ہے - شب غم بری بلا ہے
کہیں مر مٹے نہ ظالم! دل بیقرار سو جا

[illegible]

شاعر خلقی ہوتا ہے

جلوۂ ماہ سے اسے نسبت
کہ کہ شب کو لاکھ تابندہ

ذرہ کسب ضیا سے ہوتا ہے
صورت مہر کب درخشندہ

باز آ اس خیال باطل سے
ورنہ آخر کو ہوگا شرمندہ

شاعری کسب سے اگر آتی
اک زمانہ تھا اس کا جویندہ

مٹے ہوتے یہ شاعر خلقی
نام رہتا نہ ایک کا زندہ

تجھ کو اس میں اگر ہے کچھ پس و پیش
اک سند ہے یہ بیت آئندہ

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

[illegible]

سید الشہدا حسینؓ

تجھ پر سلام اے شہِ جانبازِ کربلا! اے یکہ تازِ عرصۂ خوشنودیٔ خدا!
تنہا اِدھر تو، لشکرِ مور و ملخ اُدھر بیکس پہ یعنی نرغۂ افواجِ فتنہ گر!

ناری محاصرین تھے نورِ الٰہ کے
قبطی تھے گردِ موسیِ طورِ الٰہ کے

کیا جانے کوئی کیا تھا بیابانِ کربلا صد دشتِ حشر گوشۂ میدانِ کربلا
غربت، پیاس، بھوک، کڑاکے کی دھوپ تھی سہمی ہوئی تھی جان ہر اک جاندار کی
غش کھا رہے تمام جوانمرد تھے چہرے برنگِ چہرۂ مدقوق زرد تھے
بازارِ کشت و خون کی گرمی وہ الاماں! لاشوں کے ڈھیر، کشتوں کے پشتے یہاں وہاں

پائے ثبات تیرے پہ کب لڑکھڑائے ہیں؟
بل کب تری جبینِ شجاعت پہ آئے ہیں؟

دنیا پہ مر رہے ہیں جہاں کے ستیزہ جو ہیں پیروانِ آز یہاں کے ستیزہ جو
دُھن تھی فدا کے معرکۂ کارزار میں کی تو نے جاں نثار رہِ کردگار میں
باطل پرست حق سے نہ تجھ کو ہٹا سکے مو ضعیف کوہ کو کیونکر ہلا سکے

مضبوط خاک و خون سے تیرے بنا دیں
تصویرِ درد و غم سے ترے ماجرائے دیں

اے آنکہ از نمازِ تو شانِ نمازِ عشق! شرحِ حکایتِ تو بیانِ نمازِ عشق!
اُمت نے تجھ پہ ہاتھ جفا کے اٹھائے ہیں تو نے اٹھائے ہیں تو دعا کے اٹھائے ہیں
یہ حوصلہ، یہ صبر، یہ گُردہ، یہ دل کہاں! انسان کے وجود میں یہ آب و گل کہاں!

رازِ نہفتہ تیری شہادت بتا گئی　　قاتل کی تیغ چوم کے تھہرک سنا گئی

ہے بند بوالہوس پہ درِ ایوانِ یار کا

خنجر کی دھار رہ ہے شبستانِ یار کا

بھوپال

مولوی سید امجد علی صاحب اَشہری مرحوم و مغفور کا کلام جب کبھی مخزن میں نکلا۔ نہایت شوق سے پڑھا گیا۔ مندرجہ ذیل نظم اُن کی پُرانے مسودات میں ملی ہے۔ لیے ہم تبرکاً چھاپتے ہیں۔ ہائے ع اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانہ ہرگز

میں اٹاوہ سے چلا صورتِ نبضِ مضطر　　آیا بھوپال میں جوں آپ میں آتا ہی بشر

خستگی کھونے کو میں راہ کی سویا شب کو　　صبح کو اُٹھ کے چلا دیکھنے آثارِ سحر

سورۂ نور زباں پر ہوئی جاری میرے　　فرحت افزا ہیں ہوا فاتحہ پڑھنے کو گزر

اس میں مدفون ہیں نواب سکندر بیگم　　جو زمانہ میں ہوئیں نور جہانِ دیگر

کیا بتاؤں تمہیں کیسی تھی کتابی صورت　　کیا کہوں کیسی تھی پُر نور جبینِ انور

سطوت و رعب تھا صورت سے نمایاں اُنکی　　سارے اعضا کا تناسب تھا مناسب یکسر

قُدسیہ بیگم بھوپال تھیں مادر اُن کی　　تھیں جہانگیر کی خاتون خجستہ گوہر

انتظام اُن کا ہے مشہورِ زمانہ ایسا　　جو ہے ضرب المثل عام میانِ کشور

قبر باقی پہ ہوا لوٹ کے پھر فاتحہ خواں　　تھے سکندر کے جو داماد تہمتن پیکر

آپ ہی اپنا نظیر انکو سمجھتا تھا جہاں　　تھے یہ امراؤ کبھی شاہجہاں کے شوہر

کیا کہوں تم سے میں کیسا تھا سجیلا قامت　　کیا سینہ تھا گلا کیسا تھا کیسی تھی کمر

کیسی آنکھیں تھیں کہ شرمندہ ہو نرگس اُن سے   کیسے رخسار تھے جن سے ہو پشیماں گلِ تر
کوٹ کی دھج میری آنکھوں میں ہے اب تک گڑی   تاج کس درجہ تھا مرحوم کے کھلتا سر پر
بارہ سیر انکی بتاتے ہیں غذا تھی پہلے   شوقِ ورزش کا تھا کرتے تھے بہت ڈنڈ مگدر
لیک بیمار ہوئے جب تو ہوئی یہ حالت   گھل گیا جسم ہوئے سوکھ کے بالکل لاغر
پانچ ماشہ انہیں بتلایا تھا ساگودانہ   اس کے کھانے میں بھی ہوتا تھا تکلف اکثر
حسن اللہ کو دہلی سے بلایا لیکن   ایک یاقوتی کو معجون نے بخشا نہ اثر
حکیم حسن اللہ خان
تھک گیا تھا میں بہت اس لئے واپس آیا   دوسرے روز گیا صبح کو سوئے دیگر
شہر بھوپال سے باہر جو گیا تو دیکھا   اک حظیرہ ہے بنی قبر ہے اُس کے اندر
امتیاز اس سے نمایاں ہے بتا دیتی ہے   اس میں اک حاتمِ ثانی ہے وزیرِ کشور
منشی امتیاز علیخان
میری تاریخ کا اس پر کتبہ کندہ ہے   جو کہ ہے آیۂ قرآنِ خدائے اکبر
قبرِ صدیق حسن خاں کی اسی سمت ملی   جو تھے علامۂ بھوپال میانِ کشور
عقدِ ثانی تھا کیا شاہجہاں نے ان سے   اور اب ان کا شرف کیا کہوں اس سے بڑھ کر
ہائے دنیا بھی عجب محفلِ عبرت دیکھی   شمع کے پھول سرہانے تھے نہ پروانے کے پر
عاقبت دیکھی تو بھولے ہے راہِ سنت   آخرش دیکھا تو العلم حجاب الاکبر
پھر ملی جانبِ جیب راہ میں چلتے چلتے   قدسیہ بیگم بھوپال کی قبرِ انور
کرتے حفاظ تھے قرآں کی تلاوت بیٹھے   ہوتے نازل طبقِ نور فرشتے لیکر
یاں سے چلکر میں گیا باغِ نشاط افزا میں   جسمیں طوبیٰ سے نظر آئیں سرافراز شجر
دیکھی اس باغ میں اک قبرِ مصفا میں نے   مدفنِ شاہجہاں بیگم والا گوہر
دیکھنا ہو جسے ہمت کا نمونہ اُن کی   دیکھے بھوپال میں وہ تاج محل کو جا کر
ایک مسجد وہ بنا کی تھی کہ ثانی اُس کا   دیکھنے میں نظر آتا نہ میانِ کشور
فرش تھا شیشہ کا اٹلی سے منگا کر رکھا   احد بلور کا بنوایا تھا اُس کا منبر

آ گئی انکی قضا رہ گئی مسجد باقی   پڑھ سکیں اُن میں نہ وہ ہائے نماز آخر
شوق تعمیر میں تھیں شاہ جہانِ ثانی   جود و اکرام میں رکھتی تھیں نہ اپنا ہمسر
ہائے اس طرح اکیلا تو نہ دیکھا تھا کبھی   پاس حاجب ہے نہ دربان ہے نہ کوئی نوکر
آہ یوں بنتِ سکندر ہو زمیں میں پنہاں   یوں چھپے خاک میں سلطان جہاں کی مادر (عالیہ والیۂ بھوپال)
بادشاہوں کی صفت رکھتی تھی انکی فطرت   تاجداروں کے خیالات تھے ان سے کمتر

ہو گئے فرش نخ سے تھے دوشالے کمبل   ہو رہے سیلہ و مندیل تھے ململ سے بتر
یا خدا کی ترے بندوں پہ یہ اُس نے بخشش   بخش دے تو بھی اُسے جنتِ علیا یکسر
یا خدا واسطہ آدم و حوا تجھکو   یا الٰہی تجھے سوگندِ شفیعِ محشر
یا الٰہی تجھے معصومۂ زہرا کی قسم   یا الٰہی تجھے از بہر جنابِ حیدر
اس کو سادات کی تعظیم جو منظور ہوئی   تو بھی تعظیم سے رکھ اُس کو قریبِ کوثر
اُس نے دلداریٔ اطفالِ یتیماں کی ہے   اُنکے اشکوں سے تو دھو ڈال گنہ کا دفتر
یا پھر نوحہ کناں باغِ حیات افزا میں   اس میں تھے حسرت و ارمان کھڑے پیٹتے سر
قمریاں سوگ میں بیٹھی تھیں جھکائے گردن   بلبلیں نوچ رہی تھیں چمنستان میں پر
پھول کملائے ہوئے شاخوں پہ غنچے دلتنگ   بیلیں مرجھائی ہوئی پھولوں کی تھیں خاک بسر
پتے ملتے کفِ افسوس نظر آتے تھے   نخلِ ماتم تھا بنا باغ میں ہر ایک شجر
اس میں مدفون ہیں نواب نظیر الدولہ   تھے جو بھوپال میں سلطانِ جہاں کے شوہر
دفن ہیں آصف و بلقیس بہن زیرِ زمیں   جیسے بدلی میں چھپیں ساتھ قمر کے اختر
کتنی ہی نیک تھیں یہ دونو بہنیں   آنے پاتے نہ تھے گلزار تمنا میں ثمر
ایک تھی حافظۂ مصحفِ قرآنِ کریم   لڑکیاں ایسی کہاں ہند میں آتی ہیں نظر
بیلیں شادی کی منڈھے پر نہیں چڑھنے پائیں   پھولنے پائے نہ تھے ہائے جوانی کے شجر
آیۂ فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَار پڑھو   اور دیکھو یہ ہے دنیائے دنی کا منظر

ٹھہری تا بجا یاد کروگے ان کو
آہ و کشیدن سے تمہیں ضبطِ فغاں ہی بہتر

قطعۂ عزیز

میرے ایک دوست نے یہ طرح مجھ کو بھیجی اور قطعہ کی فرمائش کی تھی اسکی
ایک نقل ہدیۂ مخزن کرتا ہوں :-

(عزیز لکھنوی)

حسرتِ مردہ کا ماتم دار رہنے دیجئے
میرے سینہ میں دلِ غمخوار رہنے دیجئے

جنبشِ ابرو ہے کافی نیم بسمل کیلئے
کھینچئے میری طرف تلوار رہنے دیجئے

آپ کیوں دامن سے پونچھیں خون کے آنسو میرے
ان ستاروں کو یونہیں سیّار رہنے دیجئے

باز آیا مہربانی سے میں باز آیا حضور
آپ مجھ کو جان سے بیزار رہنے دیجئے

دل اگر یاد آئیگا حسرت سے کرلونگا نظر
کچھ دنوں یہ خوں بھرا سوفار رہنے دیجئے

روح تازہ ہے یہ ہر اِک آبلہ کے واسطے
پائے زخمی ہیں میرے کچھ خار رہنے دیجئے

کیا نگاہِ ناز سے پھر ہوگا جراحی عمل
میرے دل کا زخم دامندار رہنے دیجئے

پارہ پارہ جسمِ مردہ کس لئے کرتے ہیں آپ
زہرِ غم کے کچھ ذرا آثار رہنے دیجئے

دل کے فتنے مجتمع ہو کر بنے کیونکر ظہور
بس بس اے موسیٰ یہی اسرار رہنے دیجئے

اور ہی گرمی ہے اب ستم مزاجِ حسن میں
وہ پرانا عشق اور وہ پیار رہنے دیجئے

عشق کا طرزِ تمدن دور نے بدلا ہے اب
قصۂ جانبازیِ اغیار رہنے دیجئے

قیس کے افسانہ اور مجنوں کے افسانہ کو بھی
اب یہ اگلے وقت کے اذکار رہنے دیجئے

اب نمائش حسن کی ہر سال ہوتی ہے حضور
ناز تمکینت انا یہ وہ اصرار رہنے دیجئے

اب صدی کے مرنے والے جی نہیں سکتے کبھی
وہ قیامت خیز اب رفتار رہنے دیجئے

آجکل تشریح ہوتی ہے نئے اجسام کی
ہر بنِ مُو کو نہ آتشبار رہنے دیجئے

اب زمانہ ایسی باتوں کا اثر لیتا نہیں
شکوہ ہائے گنبدِ دوّار رہنے دیجئے

بن پڑے حضرت تو خادم قوم کے بنجائیے
اب گل و بلبل کے یہ اشعار رہنے دیجئے

جائیے کالج میں پڑھئے بھی علومِ مغربی
اب یہ حمد اللہ اے سرکار رہنے دیجئے

کچھ نہ کچھ تو دیکھئے یورپ کی تحقیقات سے
منطقِ پارینہ کے اسفار رہنے دیجئے

واں ابھی تک ہو چکا ترسٹھ عناصر کا ظہور
آپ آب و خاک و باد و نار رہنے دیجئے

سُنکے یہ شیخ طریقت ہو گئے مُلّا جلال
بولے اپنی شوخی گفتار رہنے دیجئے

مجھ کو کافی ہیں حدیثیں شارعِ اسلام کی
لندن و پیرس کے آپ اخبار رہنے دیجئے

دل ہی میرا چاشنی گیر مزاج المومنین
آپ اپنی شوخی گفتار رہنے دیجئے

آپ سے میں لوں سند ہرگز نہیں ہے احتیاج
یہ اجارہ میرا اے سرکار رہنے دیجئے

قلزمِ فطرت کے اُس پار آپ کر سکتے ہیں سیر
ہوں میں تر دامن مجھے اِس پار رہنے دیجئے

میں نے مانا آپ پکے مادی ہیں اے جناب
اشتہار و حب الاظہار رہنے دیجئے

قول لیکن آپ ہی جانیں مجھے تو اے جناب
پیرو قولِ شہِ ابرار رہنے دیجئے

حفظ کب تک ہونگے ملفوظاتِ اسپنسر کے اب
کچھ تو یادِ احمدِ مختار رہنے دیجئے

میں نے مانا تار برقی میں ہے الہامی اثر
خیر اب اس قسم کے اذکار رہنے دیجئے

میں خلافِ پردۂ نسواں اگر ہوں بھی تو کیا
شوق سے اُنکو سرِ بازار رہنے دیجئے

جھوٹا قرآں کل عدالت میں اُٹھائے تھا کوئی
راستی کا اپنی اب اظہار رہنے دیجئے

دیکھیگا آپ انہیں افسر خزانے جب آئیں
شاعرِ مفلس ہوں میں یہ بار رہنے دیجئے

دُوربینیں کام دینگی اور نہ آلاتِ رصد
اس ستارہ کو تو نہیں نمدار رہنے دیجئے

ہندی پر روز بھیجے خط لکھکے اُردو میں مجھے
کس سے پڑھواتا پھرونگا رہنے دیجئے

دیکھئے جاکر کلیسا میں بتانِ مغربی
مجھ کو اس مسجد ہی کا غمخوار رہنے دیجئے

دوزخی سمجھا ہوں راستی مرشی دونوں کو میں — آپ اپنا کیسہ دینار رہنے دیجئے
نبضیں نوالفطرہ ہوئیں مانا مریضِ قوم کی — آپ یونہیں اس کی ابتقار رہنے دیجئے
پردۂ امیدِ صحت میں ہے ذاتی انتفاع — ہیں بیماری کوششیں بیکار رہنے دیجئے
دیجئے غیروں کو چندہ حیف مذہب کے لئے — آپ اپنا بذل و ایثار رہنے دیجئے
ہے خیال اس کا کہیں پیدا اشکر رنجی نہ ہو — آپ یہ شیرینیِ گفتار رہنے دیجئے
مجھ سے تقلید آپ کے آئین کی ممکن نہیں — مجھ کو آپ آزاد و خود مختار رہنے دیجئے
اتحادی قوتِ ملکی کے پیرو ہوں جناب — اپنے ملت کا مجھے غمخوار رہنے دیجئے
صدرِ اعظم مجلسِ مشروطہ کے ہو جائیں آپ — مجھ کو حضرت محوِ استغفار رہنے دیجئے
شکلِ اقلیدس نہیں ہے یہ جسے سمجھے ہیں آپ — یونہیں قسمت کا خطِ پرکار رہنے دیجئے

بڑھ گیا پارہ کہیں اصلی حرارت سے جناب
شعلہ باری مزاجِ حار رہنے دیجئے

کاہلی

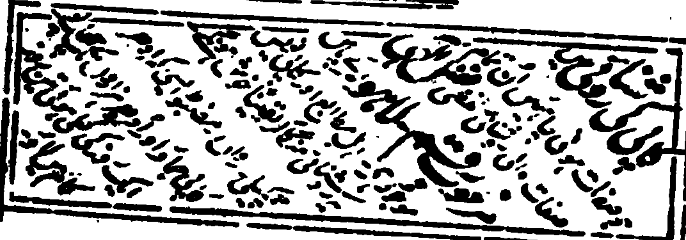
کاہلی سے اچھے اچھوں کی خراب اوقات ہے — مشکلوں کا زندگی بھر سامنا دن رات ہے
سچ ہے سستی سے جہاں میں آدمی بیکار ہے — سارے آزاروں سے بدتر ایک آزار ہے
جاں کو بھی ایماں کو بھی بس موجبِ نقصاں ہے یہ — شک نہیں کچھ باعثِ بربادیِ انساں ہے یہ
کاہلی ہے باعثِ افزائشِ آلام و غم — شادمانی و خوشی ہوتی ہیں اس عادت سے کم
بھاری ہو جاتی ہے آخر کاہلوں کی زندگی — روز جب تعطیل ہو تو کیا خوشی تعطیل کی
ہاں مزا تعطیل کا ملتا ہے کچھ محنت کے بعد — لطفِ راحت آدمی پاتا ہے کچھ محنت کے بعد

بستر راحت پہ فرماتے ہیں جو جلوہ گری — کاہلی کی اُن سے رہتی ہے سدا ہمسفری
اُن سے کب ہوتا ہے کوئی کام اچھا خلق میں — اُنکی بیکاری نہیں کرتی ہے رسوا خلق میں
رنج ہو جاتے ہیں دنیا میں ہزاروں اتفاق — اُنکو ملتی ہی نہیں ہے خوابِ غفلت سے نجات
خوب یاد آیا مجھے اک عالمِ یورپ کا قول — قابلِ تحسین ہے گراب ایمرسن کا قول
فی الحقیقت جسکو کہنا چاہئے کچھ کاہلی — واقفِ ناقابلیت ہی کی ہے خو جاہلی
یعنی ہیں ناقابلیت سے تو واقف سر بسر — پُر کمی کو وہ نہیں تسلیم کرتے خود مگر
جو ہے ٹیلر کا سخن اس بات پر کہ زور ہے — آدمی اس کاہلی سے زندہ زیرِ گور ہے
مثل مُردے کی ہے جسکو کاہلی کا ہے مرض — کچھ اُمید اس سے خدا کو نہ خدائی کو غرض
بے خبر رہتا ہے وہ دُنیا کی محسوسات سے — بے تعلق اختلافات و ضروریات سے
زندگی کے دن یوں پورے اسلیے جیتا ہے وہ — مثلِ حیوانات اب زندگی جیتا ہے وہ
میوہ ہائے باغِ دُنیا رات دن خوراک ہے — زندگی جس طرح سے کیڑوں کی زیرِ خاک ہے
عرصۂ مرگ آنے تک ہستی سی بھی ہو نابود وہ — لیکن اس عرصہ میں کچھ کرتے نہیں موجود وہ
ہل چلاتے ہیں نہ کرتے بار برداری ہیں وہ — اک مریضِ لاعلاج و درناچاری ہیں وہ
کرتے ہیں جو کچھ بھی وہ کرتے ہیں سب بے فائدہ — موجبِ نقصاں رسانی بے سبب بے فائدہ

وقت اور طاقت کو کردیتی ہے ضائع کاہلی
خلق میں ہے سب سے بدتر صرف بیجا کاہلی

سید امیر حیدر بخت

(ماخوذ از انگریزی)



تازہ غزلیں

(از حکیم سید محمد مہدی صاحب کمال خلف الصدق حضرت جلال لکھنوی)

یارب طلسمِ دل اُٹھا دیئے جس میں مزا ملے
وہ درد ہو کہ جس کی نہ ہرگز دوا ملے

تاکا ہے دل کسی کا جو یہ پوچھتے ہیں وہ
چوری کرے کوئی تو اُسے کیا سزا ملے

ہے میرے دل کو اُن سے تمنا وصال کی
جنکو خیال میں بھی جو دیکھا جُدا ملے

اُٹھ اُٹھ کے بیٹھتا ہے کسی کا غبار کیوں
ہے منتظر کہ دامنِ بادِ صبا ملے

تھا رُخ دل و جگر کی طرف سے پھرا ہوا
اُس کج ادا کے تیر بھی تو کج ادا ملے

بےخوف ہو کے پھر تو خطا پر خطا کریں
بڑھ جائیں حوصلے جو سزا پر سزا ملے

اُن کو جفائیں کرکے مٹانے سے کام ہے
حسرت ملے اُمید ملے مُدعا ملے

شکوہ کسی سے دل کے نہ ملنے کا کیا کریں
دو حرف لفظِ دل میں نہ باہم بھی آ ملے

تسکین بھی ہوا ہے تڑپ بھی علاج ہے
ہم سب میں خوش ہیں دُکھ ملے یا دوا ملے

بنتا ہی ہے جو دیر کا نقشا کسی کا دل
کعبہ اگر بنے تو اُسی میں خدا ملے

ہو لطف کی نگاہ بھی اہلِ گناہ پر
ملتی ہوئی کرم سے تمہاری سزا ملے

دل چھین لیں ادا سے اشارے نگاہ کے
جب لطف ہے کہ شوخ کسی کی حیا ملے

دل بھی گئے ہیں ضبطِ زباں بھی چھپائے ہے
مشکل ہے مُدعی کو مرا مُدعا ملے

بولا سما کے دل میں یہ تیرِ نگاہِ ناز
لے دیکھ ہم ہجومِ تمنا سے آ ملے

دل جا رہا ہے کوچۂ دلدار کی طرف
آنکھیں خیال کرتی ہیں وہ نقشِ پا ملے

یہ آرزو ہے سینے سے مجھ کو لگائیے
یہ چاہتا ہوں دردِ جگر کی دوا ملے

بیتابِ دل جو ہو تو سنبھلتا ہے کس طرح
ہم پوچھ لیں کہیں جو کوئی مبتلا ملے

دیکھا جو ہم نے تم کو تو آنکھیں نکال لیں | آئینہ گھورتا ہے اسے بھی مزا ملے
اس کا نشان پوچھتے ہو تم ای کمال | جسکا خیال میں نہ کہیں نقش پا ملے

(از جناب احمد علی صاحب شوق - قدوائی لکھنوی)

وہ خوش کہ ہر جگر کو نظر میں لئے ہوئے | میں خوش کہ ہوں نظر کو جگر میں لئے ہوئے
آتا ہوا عدم سے تو بزم وجود میں | آئے ہیں وہ عدم کو کمر میں لئے ہوئے
زلفوں سے دل کو پھینک بھی دو ورنہ عمر بھر | بیٹھے رہو گے درد کو سر میں لئے ہوئے
کہتے ہیں وہ حیا سے پسینے میں ڈوب کر | ہر کوئی مجھ کو دیدۂ تر میں لئے ہوئے
وسعت ہمارے عشق جنوں زا کی دیکھنا | دنیا کے حسن کو ہے یہ سر میں لئے ہوئے
جو تم نے دی نسیم کو۔ اور وہ ہے کوچہ گرد | ہم کو ملی تھی راہگذر میں لئے ہوئے
کیا شوق اس پہ چرخ تنگ ظرف کو ہو کبر | ایک اشرفی ہے جیب سحر میں لئے ہوئے

(از جناب عیش بھوپالی)

میری حسرت اور خالی جائے گی | ہو کشش کی لو یہ نہ ٹالی جائے گی
رہ گئے ولے ہزاروں ہوں تو کیا! | جان ہے گر جانے والی جائے گی
ایسی کیا لٹے جائیگی اس دل کے ساتھ | تیری تصویر خیالی جائے گی
مر کے بھی جانے سے چھٹتی ہے کہاں | جان پھر قالب میں ڈالی جائے گی
اللہ اللہ قدر میرے دل کی یہ | پھر اسی پر خاک ڈالی جائے گی
آئینہ دیکھا تو میرا ہرج کیا | تیری شان بے مثالی جائے گی
دن بہت گذرے زمانہ ہو گیا | یہ میری آشفتہ حالی جائے گی
روٹھ جانے دو طبیعت کو مری | ہرج کیا ہے پھر منالی جائے گی

صبح زندگی

[illegible]

مخزن ایجنسی لاہور کی موجودہ کتابیں

مقامِ خلافت - مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا۔ پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک (عہ)

رسومِ دہلی - مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلفِ فرہنگِ آصفیہ۔ قیمت مع محصولڈاک - ۱۲

منازل السائرہ - مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن (عہ)

خوابِ ہستی - مرزا محمد سعید صاحب ایم۔ اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن (عہ)

ابومسلم خراسانی - رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب رد ولوی نے مخزن ایجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت (عہ)

مکتوباتِ آزاد - اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ باتصویر۔ (۶ر)

کلامِ نیرنگ - سید غلام بھیک نیرنگ بی۔ اے وکیل کے کلامِ منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۶ر

انتخابِ مخزن - مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب۔ قیمت علاوہ محصولڈاک (عہ)

دردِ جاناں - مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی۔ دہلی کی زبان میں دہلی کا سچا قصہ۔ ۸ر

دربار نمبر - دربار تاجپوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا۔ ۸ر

مثنویاتِ میر حسن - مثنوی بےنظیر و بدرِ منیر کے سوا مثنوی گلزارِ ارم ایک مستند قلمی نسخہ سے نقل کرکے شامل کی گئی ہے (عہ)

سیرِ تبت - انگریزی کتاب فور ایئرس ان تبت کا بامحاورہ ترجمہ۔ تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱ر

مرقعِ خوشخطی - فنِ خوشنویسی کی ابتدائی کاپی جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے مبتدی بچوں۔ کاتبوں اور شائقینِ خط کے واسطے تیار کیا۔ جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات باسانی سمجھ میں آسکتے ہیں۔ علاوہ حسنِ ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے اس کے اہتمام میں مدنظر رکھا ہے دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر کاپی اس فن کیواسطے اسوقت ملک میں موجود نہیں لیکن منشی صاحب کی تصویر کے ۵ر

درخواستیں بنام مینیجر مخزن - لاہور آنی چاہئیں

عالیجناب نواب وقار الملک بہادر کے نام نامی کو
زندہ اور ہر وقت یاد رکھنے کے لئے ہم نے

وقار الملک

ترکی ٹوپی ابھی حال میں ولایت کے مشہور کارخانہ کرسٹی سے بنوا کر منگوائی ہے۔ اس جدید ٹوپی کی وضع اعتدال فیشن ایبل اور خوشنما ہے کر دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ قیمت مع پھندنا صرف عہ محصول

محسن الملک پیٹنٹ

یہ اس نئی طرز کی خوشنما ٹوپی کا نام ہے جو اپنی خوبصورتی کے سبب تمام ملک میں مشہور ہو چکی ہے۔ اور آج ہر فیشن ایبل شخص کے سر کا طرہ زیب ہے۔ تمام بہتر چمڑے کا ہے قیمت للعہ محصول فرمائشوں کے ساتھ سر کا ناپ آنا ضروری ہے۔ ہر رنگ کی ٹوپیاں موجود ہیں جس رنگ کی ضرورت ہو مفصل تحریر فرمائیے۔

ٹول کی عمدہ سلی سلائی قمیصوں کے علاوہ ہر قسم کا مال ہماری ہاں سے بارعایت و کفایت مل سکتا ہے۔

عبد الرشید برادر جنرل مرچنٹ انارکلی لاہور

عرق ماء اللحم انگوری دو آتشہ

جس میں انگور، سیب، بہی اور بیتر، بٹیر، مرغ اور ایک سو جڑی بوٹیاں اور مشک و زعفران ملا کر دو آتشہ کشید کیا جاتا ہے۔ نصف صدی سے ہر سال تیار ہوتا ہے اور لاکھوں بوتلیں ملک بھر میں فروخت ہو چکی ہیں۔ کیا دوا میں خالص ڈاکٹری طبیب یہ بوتل مرغوب صحت کر سکتا ہے ہرگز نہیں

عرق ماء اللحم کا پہلا اثر پھیپھڑہ پر ہوتا ہے کہ اسکی نازک ساخت کو مضبوط کر کے گلنے سڑنے سے بچاتا ہے۔ بلغم پیدا ہونی بند ہو جاتی ہے۔ بیتق الضیق (دمہ) کو تاد ہی۔ کھانسی جلد دور ہو جاتی ہے۔ اور جن بچوں میں سل و دق کی استعداد موجود ہو کوئی ان کے خاندان میں تپ دق۔ سل۔ بخار۔ کھانسی سے مرا ہو تو بلا خوف ما تقدم اسکے پینے سے رجوع سکتا ہے۔ جن طالبعلموں کی چھاتی تنگ اور اس پر چربی کم ہو۔ ذہین۔ ہوشیار ہوں انکو ضرور یہ عرق پینا چاہیئے۔ تاکہ وہ کثرت محنت سر لاغری کی وجہ سے بے وقت موت کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

دوسرا اثر دماغ پر یہ ہوتا ہے کہ تمام نروس سسٹم کا ضعف اور کمزوری جس سے حافظہ بگڑ جاتا ہے سر میں درد رہتا ہے سر گھومتا ہے سر میں بوجھ رہتا ہے۔ آنکھیں کمزور۔ نکان۔ پٹھوں میں اکڑاؤ اور بے چینی دور ہو جاتی ہے۔ تریاق سمومات شراب ہے۔

تیسرا اثر دل پر یہ ہوتا ہے کہ اسکی حرکت کو باقاعدہ کرنے سے دل کی دھڑکن۔ جوش دل غشی اور سانس پھول جانا بند ہو جاتا ہے۔

چوتھا اثر جگر پر یہ ہوتا ہے کہ اخلاط ردیہ مادہ سوداویہ کی پیدائش غیر معمولی کو روک دیتا ہے اور اس کے افعال باقاعدہ بناتا ہے۔

پانچواں اثر معدہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف معدہ دور ہونے سے بھوک خوب لگتی ہے۔ ہاضمہ کی طاقت بڑھ جاتی ہے جو کھاؤ ہضم۔

چھٹا اثر مثانہ پر یہ ہوتا ہے کہ ضعف مثانہ کی باعث کثرت اور رقت جریان بند ہو جاتا ہے اور افعال مثانہ اصلی حالت پر آ جاتے ہیں۔

ساتواں اثر اعضائے تناسل و نیز بلغم پر یہ ہوتا ہے کہ تو انائی دور شدہ دوبارہ پیدا ہونے سے انسان کی خوشگوار زندگی گزرتی ہے۔ گھر کے لوگ خوش۔ کاروبار کے قابل محنت برداشت کر سکتا ہے۔ اعضائے مغلوبہ رئیسہ کو تقویت دیتا ہے۔

آٹھواں اثر خون پر یہ ہوتا ہے کہ گندگی کو خون سے اور اخلاط ردیہ و زہریلے اجزا کو تحلیل کر کے خون صالح بمقدار کثیر پیدا کرتا ہے جس سے لاغر فربہ اور بلغمی مزاج سے بلغم کو تبدیل خون میں کر کے جسم میں تازہ جان پھونک دیتا ہے جس سے چہرے کا رنگ کندن کی طرح دمکنے لگتا ہے۔

الغرض عرق ماء اللحم اعضائے بیکار کو بکار اور خفتہ کو بیدار۔ غافل کو ہشیار اور ہشیار کو بار فتار بنا دیتا ہے۔

قیمت ایک بوتل دو روپے (۲ع) چھ بوتل گیارہ روپے (للعہ) درجن بوتل (عنہ)

نوٹ ۔ (۱) بذریعہ ڈاک تین بوتل سے کم روانہ نہ ہوگا۔ (۲) نئے خریدار قیمت پیشگی معہ محصول بذریعہ منی آرڈر روانہ فرماویں (۳) ریل کے ذریعہ منگانے پر محصول کم پڑیگا۔ ریلوے اسٹیشن و لائن کا پتہ صاف لکھیں۔ کتاب حل المشکلات پتہ لکھنے والوں کو مفت بھیجی جائیگی

حکیم ڈاکٹر [illegible]

پانچ روپیہ سے دو لاکھ روپیہ کس طرح ہو گئے

اس حیرت انگیز ترقی نے دنیا کو حیرانی میں ڈال دیا ہے۔ یہ کل کی بات ہے کہ میں ایک معمولی حیثیت کا انسان گنا جاتا تھا۔ آج ان سطروں کے پڑھنے والوں کے سامنے صرف ایک مفید ایجاد سے دس ہزار نہیں پچاس ہزار نہیں پورے دو لاکھ روپے کی جائداد کا بلا شرکت غیرے مالک مختار ہوں۔ میری کامیابی کا راز روح حیات ہے۔ ایجاد سے چند سال ہوئے کہ میں نے پانچ روپیہ کے سرمایہ سے روح حیات کی تجارت شروع کی تھی اور آج تک دس لاکھ کا فروخت ہو چکا ہے۔ جس شخص نے ایک دفعہ میری اس ایجاد کا استعمال کیا ہے وہ تمام عمر کے واسطے روح حیات کا مجسم اشتہار بن گیا ہے۔ ڈپٹی کمشنر بہادر میری تین یوم کی آمدنی ۲۸۸ روپیہ تصدیق کرتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب تک کوئی دوا مفید نہ ہو اس کی اس قدر کثرت سے بکری ناممکن ہے۔ بقول حضرت داغ دہلوی کے کہ وہ شخص بہت بدنصیب ہے جو آج تک روح حیات کے مجرب فوائد اور شرطیہ نجات سے محروم رہا ہے۔ سنئے روح کیا چیز ہے؟ روح حیات میں وہ طاقت بھری ہے کہ ہاتھی اور شیر کا مقابلہ ہے۔ اس کے پینے سے انسان کمزور سے شہ زور بنجاتا ہے۔ کیا آپ نے نہیں سنا کہ جناب ڈاکٹر بی۔ این صاحب بہادر انڈین میڈیکل سروس حضور شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم خلد اللہ ملکہ اور گورنمنٹ انگلشیہ کے معزز عہدہ داران اور رؤسا نے روح حیات کو طاقت میں بے نظیر بتایا ہے۔ روح حیات رگ و ریشہ میں تحریک پیدا کر ہڈیوں کے گودے یا فاسفورس کو چمکا کر خون صالح بکثرت پیدا کر کے اعصاب کی سستی کو اپنی بجلی کی آگ سے چاق اور چوبند کر کے ہر انسان کو ایسا صحیح اور تندرست بنا دیتا ہے کہ پھر اگر حوادث زمانہ تلواریں بھی ماریں تو بھی چیت ہو کر بے آب ہو جائیں۔ ہندوستان انگلستان اور ممالک غیر کے بہترین اور مانے ہوئے ڈاکٹران میڈیکل کالج کے لکچرار معزز عہدہ داران سلطنتوں کے سارٹیفکیٹوں اور موجودہ [illegible] زمانہ مدت کے استعمال ہونے پر بھی دن بدن ترقی کرتی ہوئی مانگ اور ۳۸۸ روپیہ روح حیات کی تین دن کی بکری سے کون ہے جو یہ نتیجہ نہ نکالے کہ روح اس وقت انسان کی دوبارہ زندگی کے لئے لاثانی دوا نہیں ہے۔ بچپن کے زمانہ یا جوانی کی بے پرواہ حالت میں بے اعتدالیوں کی وجہ یا خلاف قاعدہ قدرت عمل ہونے سے جو لوگ مرض کمزوری اعصاب پیدا کر کے دنیا کی تمام لذتوں سے محروم ہو بیٹھے ہوں روح حیات تریاق کامل تیر بہدف دوا ہے بلکہ اعصاب کی ایک طاقت لانا الغذا ہے جو دو یوم میں ہی قوت جسمانی کو بڑھانا شروع کر دیتا ہے۔ پہلے ہی دن کی ابداری حاصل ہوتی ہے۔ استعمال سے آپ خود اس کی دوسری خوبیوں کے قائل ہو جائیں گے جو ہم یہاں بیان کرنے سے معذور ہیں۔ قیمت فی شیشی دو روپے آٹھ آنے (عہ)

حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کیمیا گر پروپرائٹر شفا خانہ عام لاہور سے طلب کرو

قرآن [illegible]د کا ایک نیا معجزہ

قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت کا معجزہ تو قریباً ہر ایک مسلمان
کو معلوم ہے لیکن اس کا یہ نیا معجزہ صنعت تحریر ہے چنانچہ
حمائل شریف [illegible] صنعت جس کا یہ اشتہار ہے اس کے [illegible] صفحات
ہیں اور ہر صفحہ میں کل بارہ سطریں ہیں جن میں چھٹی یعنی درمیانی سطر سے
اوپر اور نیچے پانچ پانچ سطریں ہیں اور صنعت تحریر یہ ہے
کہ اس حمائل شریف کے تمام صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر سے
اوپر والی پانچوں سطروں کا نیچے والی پانچوں سطروں سے مقابلہ ہے یعنی
ہر صفحہ میں جن جن حروف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں انہیں
حروف سے نیچے والی سطریں شروع ہوتی ہیں اور درمیانی چھٹی سطر کا مقابل
کے صفحہ کی درمیانی چھٹی سطر سے ہے۔ پس آپ سوچ سکتے ہیں کہ سارے
قرآن شریف میں ایسی صنعتی تحریر کا ہونا معجزہ قرآن نہیں تو اور کیا ہے

نوٹ [illegible]

[illegible] لاہور

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی نے جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں اس کار اہم کیلئے سب کی نظریں انہی کی طرف اٹھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں تو وہ انہی کی ذات سے ہیں اور انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک احساس فرض کے ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی اس اہم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساس فرض کا ثبوت اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی حیثیت ہے لیکن حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں طب یونانی کی بقا کا سامان ہے۔ شخصی اغراض سے اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے یہ قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف احتمال باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز ساخت میں تہذیب ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض کے لئے عام طور پر اطبا برتتے ہیں۔ بلکہ محل کے وہ اصلی نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آتے تھے بالکل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک بیش بہا ہیرا ہے اور ایک انسانی جسم اس کے وجود کا گذرگاہ۔ اس لئے تمام ارباب ذوق کو ان اصلی اور منتخب یونانی اور ویدک ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام سے بنتی ہیں فائدہ اٹھانیکا اور اسکے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقع ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسن معاملہ کے بہت تھوڑے عرصہ میں اس دواخانے نے غیر معمولی ترقی کی ہے

خط وکتابت کا پتہ منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی

ایڈیٹر شیخ عبدالقادر

(۲۰) نمبر (۶)

مخزن

پشاور
کشمیر
لاہور
دہلی
آگرہ
لکھنؤ
الہ آباد
پٹنہ
کراچی
کلکتہ
رنگون
بمبئی
حیدرآباد
مدراس
بنگلور
سیلون

اردو علم ادب کی دلچسپیوں کا ایک ماہوار مجموعہ

نثر

مجوزہ محمڈن یونیورسٹی ۔ عبدالقادر ۔ ۱
ہوا میں اڑنا ۔ سید شہاب الدین صاحب مہدوی ۔ ۹
ہندو مسلمانوں کے تعلقات ۔ مولوی محمود علی صاحب ۔ ۲۸
جاپان میں تعلیم نسواں ۔ مسز کیلب صاحبہ ۔ ۴۸
کوہ سائنس ۔ محمد سجاد علی ایم اے (کرنال) ۵۴
نیا زمانہ ۔ پنڈت برج موہن صاحب
دتاتریہ کیفی (دہلوی) ۔ ۶۱
شکوہ محبوب ۔ محمد حسین صاحب محوی لکھنوی ۶۳
رباعیات ۔ جناب شاکر میرٹھی ۔ ۶۵
ہماری زبان ۔ مولوی غلام محمد صاحب طور بی اے (لاہور) ۶۷
تحمل ماتم ۔ سید احمد حسین صاحب امجد ۔ ۶۹

نظم

کلام اکبر ۔ سید اکبر حسین صاحب جج پنشنر (الہ آباد) ۔ ۵۰
عورت کی خستہ حالی ۔ منشی محمد صادق علی خاں صاحب (کشمیر) ۵۸
موسم بہار ۔ جناب ابوالاعجاز صاحب عرشی ۔ ۶۰
غزلیات
از جناب سید امداد حسین صاحب ظفر (نیوروی) ۷۰
از جناب آل لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم ۷۱
از حضرت ... مرزا پوری ۔ ۷۱
از منشی ... صاحب ... عاشق ۔ ۷۲

دس کروڑ ہندوستانی اردو بولتے ہیں اور اسی قدر اور ہندوستانی اردو سمجھتے ہیں۔

○ ان شہروں میں اردو مادری زبان ہے ◐ ان شہروں میں اردو مروج ہے ۔ ● ان شہروں میں اردو سمجھی جاتی ہے

باہتمام منیجر نول کشور پریس لاہور میں چھپا اور منشی فضل الٰہی پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ مع محصول ڈاک قسم اول ... فی پرچہ ساڑھے چار آنے

مخزن

مجوزّہ محمڈن یونیورسٹی

ذیل کا مضمون ایک لکچر سے اقتباس ہی جو لاہور کے ایک جلسہ میں ہزہائی نس سرآغاخاں کے ڈپوٹیشن کے پنجاب میں آنے کی تیاری کے زمانہ میں دیا گیا تھا۔ لکچر کا بیشتر حصّہ زبانی تھا جو بعد میں قلمبند نہیں ہو سکا۔ چونکہ یہ وُہ حصّہ ہی جس میں یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدائی حالت کا تاریخی ذکر ہے۔ اس لئے اسے اوراقِ مخزن میں جگہ دی جاتی ہے:۔

زبانِ خلق کو اگر بجا طور پر نقارۂ خدا کہا گیا ہی تو مُسلمانوں کی اپنی یونیورسٹی ہندوستان میں قائم کرنے کا مُبارک خواب جو علیگڈھ کالج کے نامور بانی اور مسلمانوں کی درماندہ قوم کے سچّے خیرخواہ اور رہبر سرسیّد مرحوم نے آج سے تقریباً چالیس برس پیشتر دیکھا تھا۔ یقیناً عملی صورت اختیار کرنے کو ہی۔ اسوقت ہر کہ و مہ کی زبان پر یہ الفاظ ہیں کہ اب یونیورسٹی قائم ہُوئی سمجھو۔ اور اگر خُدا کو منظور ہے تو یہ الفاظ عنقریب واقعات ہو جائینگے۔ اسباب و علل کا سلسلہ بھی اس تجویز کی کامیابی کی طرف اشارہ کر رہا ہی۔ ہزہائی نس سرآغاخاں جیسے مقتدر شخص کا اس جوش سے محمڈن یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے اُٹھنا اور ہندوستان بھر کا دَورہ کرنا اور ہر فردِ قوم کے آگے قوم کے لئے دستِ سوال دراز کرنا کوئی چھوٹی سی بات نہیں ہے اور صاف ظاہر ہو رہا ہی کہ

اُس مقلب القلوب نے جس کے ہاتھ میں تمام عالم کے دلوں کی باگ ہے۔ یہ بات سر آغا خاں بالقابہ کے دل میں بے سبب نہیں ڈالی۔ بلکہ کوئی اہم نتیجہ اس سے پیدا ہونے والا ہے۔ نہ صرف مسلمانانِ ہندوستان کی تاریخ میں یہ پہلی مثال ہے کہ ایک بزرگِ قوم جو شاہی نژاد ہونیکے علاوہ وجاہت اور دولت میں والیانِ ملک کا ہم رتبہ ہے۔ اس طرح گدایانِ قوم کی جماعت کی سرگروہی اختیار کرے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخِ عالم میں اس قسم کی مثالیں کمیاب ہیں۔ پس ایسے سوال کا رد کرنا کسی بامروت شخص کے اختیار میں نہیں۔

اس لئے یہ تو ہم فرض کئے لیتے ہیں کہ سر آغا خاں کا وفد انشاءاللہ ہر مقام پر وہاں کے باشندوں کی توفیق کے مطابق کامیاب ہوگا۔ اور جس رفتار سے اکابرِ قوم عطیے دے رہے ہیں یہ توقع بھی بیجا نہیں کہ بیس لاکھ روپیہ جو اس وقت سر آغا خاں نے جمع کرنا تجویز کیا ہے۔ جمع ہو جائیگا۔ بلکہ اگر اس سے زیادہ ہو جائے تو غیر ممکن نہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ یہ رقم بمقابلہ اُس مقصدِ اعظم کے جو مسلمانانِ ہند کے پیشِ نظر ہے قلیل ہے۔ جن لوگوں نے ہز ہائی نس کا وہ اڈریس دیکھا ہے۔ جو صاحب ممدوح نے گذشتہ دہلی دربار کے موقع پر جلاسِ کانفرنس منعقدہ دہلی میں بحیثیتِ صدرِ جلسہ پڑھا تھا۔ انہیں یاد ہوگا کہ اس وقت انہوں نے یونیورسٹی کی تکمیل کے لئے ایک کروڑ روپیہ کا اندازہ لگایا تھا۔ اب صرف بیس لاکھ کا مطالبہ کرنے سے یہ مقصود ہے۔ کہ اتنی رقم موجود ہو جائے۔ جو اس امر کی ضمانت ہو کہ یونیورسٹی بننے کی اجازت اگر مل جائے تو آغازِ کار میں روپیہ نہ ہونے کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ اور ہمیں یہ منصب حاصل ہو کر اپنی اس ہمت کی بنا پر کہ ہم نے تھوڑے سے عرصہ میں اس قدر رقم بہم پہنچا لی ہے۔ ہم سرخروئی کے ساتھ شہنشاہ قیصرِ ہند ہز مجسٹی جارج پنجم کے حضور میں یونیورسٹی کے چارٹر کی درخواست کر سکیں۔ ورنہ جو عظیم الشان کام شروع ہونے کو ہے۔ اُس کے لئے جتنا سرمایہ ہو کم ہے۔ یورپ کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں اور اُنکے خزانے اور سرمائے اس امر کے شاہد ہیں کہ اس زمانہ

میں دولتِ علم کسی قوم کو بغیر پانی کی طرح روپیہ بہائے حاصل نہیں ہوتی۔ گو اس میں شک نہیں کہ ایک مرتبہ تحصیلِ علم کے لئے چاندی صرف کرکے ترقی یافتہ قومیں اپنی علوم کی بدولت دونوں ہاتھوں سے سونا سمیٹتی ہیں اور جو خرچ ہوتا ہے۔ اس سے بدرجہا زیادہ نفع اٹھاتی ہیں۔ لیکن پہلے دل کھول کر روپیہ لگاتی ہیں۔ اور ہم اگر چاہیں کہ ترقی میں ان کے برابر پہنچ جائیں تو ہمیں بھی فیاضی سے کام لینا ہوگا۔

گو ہمارے کان یونیورسٹی کے لفظ سے ایک عرصہ سے آشنا ہیں اور اب ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام بھی ایک ممکن العمل خیال نظر آرہا ہے۔ تاہم عجیب بات ہے کہ مسلمان جو ایک زمانہ میں قرطبہ اور بغداد کی یونیورسٹیوں کے بانی تھے اور جو مشعلِ علم لیکر یورپ میں پہنچے تھے۔ آج یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ یونیورسٹی کیا چیز ہے۔ اور مسلمانوں پر کیا منحصر ہے۔ ہندوستان میں بہت سے لوگ عام اس سے کہ وہ ہندو ہیں یا مسلمان۔ یونیورسٹی کے صحیح مفہوم سے واقفیت نہیں رکھتے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یونیورسٹیاں ہندوستان میں نئی چیز ہیں جو انگریزی عملداری میں وجود میں آئی ہیں اور دوسری یہ کہ ہندوستان کی یونیورسٹیاں ایسے نمونہ پر بنی ہیں کہ وہ مقصدِ اصلی جو بیشتر ممالک یورپ میں یونیورسٹی کے ساتھ مخصوص رہا ہے۔ اُن سے پورا نہیں ہوتا۔ ہندوستان میں یونیورسٹیوں کا کام امتحان لیکر سند دینا ہے اور تعلیم و تعلم کالجوں اور دیگر درسگاہوں کے سپرد ہے۔ جن پر پہلے یونیورسٹیوں کی کوئی نگرانی نہیں ہوتی تھی اور اب نئے ایکٹ یونیورسٹی ہائے ہند کے بعد کسی قدر نگرانی یونیورسٹیوں کی طرف سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اس سے یونیورسٹیوں کی اس صفت میں فرق نہیں آتا کہ اس ملک میں وہ فقط امتحان لینے والی جماعتیں ہیں۔ مگر یورپ کی یونیورسٹیوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں یونیورسٹیاں پڑھنے والوں یا پڑھانے والوں کی جماعتیں تھیں اور اب تک بہت سی قدیم یونیورسٹیوں میں وہی شان باقی ہے۔

لفظ یونیورسٹی لغت کے اعتبار سے لاطینی زبان کے ایک لفظ یونیورسیٹیاس سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں کُل بمقابل جُزو۔ اور جماعت۔ گروہ۔ کمپنی۔ یا ایسوسی ایشن۔ اِسی اشتقاق کی وجہ سے لفظ کلیہ عربی زبان میں اسکا ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔ جماعت یا کمپنی کے معنوں میں لفظ یونیورسیٹاس اہلِ روما کے قوانین میں مستعمل رہا ہے اور اصطلاحی طور پر کسی ایسی جماعت کے لئے جو کسی خاص اور مسلسل مقصد کے لئے قائم ہو استعمال ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ یورپ کی تاریخ کے قرونِ وسطیٰ میں علمی درسگاہوں کے لئے کام آنے لگا جس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ معلموں کی کُل جماعت یا متعلمین کی کل سوسائٹی۔ یا دونو۔ جسے مجموعی طور پر کچھ حقوق و اختیارات حاصل ہوں۔ اور جو اپنے انتظام کیلئے آپ قواعد مرتب کر سکے۔ گو رفتہ رفتہ یونیورسٹی کے مفہوم میں یہ داخل ہو گیا کہ علوم کی تمام ضروری شاخیں یونیورسٹی میں پڑھائی جاویں اور آج کل سب بڑی بڑی یونیورسٹیاں سب بڑے بڑے علوم میں درس دیتی ہیں۔ لیکن بارھویں صدی عیسوی میں جب یہ لفظ پہلے پہل یورپ میں تعلیم گاہوں کے لئے استعمال ہونے لگا۔ تو یہ کوئی ضروری شرط نہیں تھی۔ پیرس کی یونیورسٹی فرانس میں اور کیمبرج اور اکسفورڈ کی یونیورسٹیاں انگلستان میں پہلے صرف ایک صیغے کی تعلیم گاہیں تھیں یعنی فقط آرٹس فیکلٹی رکھتی تھیں اور سکرنو اور مون پیے میں صرف طبیہ فیکلٹی تھی۔ بعض اصحاب کیمبرج اور اکسفورڈ کی موجودہ حالت سے استدلال کرتے ہوئے یہ خیال کرتے ہیں کہ یونیورسٹی کے وجود کیلئے ضروری ہے۔ کہ اس میں متعدد کالج ہوں جنکے مجموعہ کا نام یونیورسٹی رکھا جائے۔ مگر یہ ضروری نہیں۔ کالجوں کا تعدد یونیورسٹی کی لازمی صفت نہیں۔ جرمنی میں بہت سی یونیورسٹیاں ایسی ہیں جنکے ماتحت کوئی کالج نہیں۔ اور خود اکسفورڈ اور کیمبرج میں یونیورسٹیاں پہلے موجود تھیں اور کالج فیاض لوگوں کے ذاتی عطیوں سے بعد میں قائم ہوئے ہیں۔

یورپ میں یونیورسٹیوں کی ابتدا اور اُنکی ترقی کے حالات بجائے خود دلچسپ ہونے کے علاوہ ہمارے لئے بہت کچھ سبق آموز ہیں اور اُنکی ترقی کی دشوارگزار منزل میں راہبر کا کام دے سکتے ہیں۔ اِس لئے کسی قدر اور بسط کے ساتھ اُن کا ذکر نامناسب نہ ہوگا۔ یونیورسٹیاں جس حالت میں ہمیں اب نظر آرہی ہیں۔ قائم ہونے کے وقت اُن کی یہ صورت نہیں تھی۔ بتدریج بڑھتے بڑھتے اپنی موجودہ حالت کو پہنچی ہیں۔ علماٗ کا یہ طبعی میلان کہ علمی مشاغل میں ایک دوسرے کی مدد سے فائدہ اُٹھائیں اور مل کر علمی مشکلات کو حل کریں۔ اوّل اوّل اُن جماعتوں کے قیام کا باعث ہُوا۔ پہلے تو کلیسا ایسی جماعتوں کے وجود سے خوش نہ تھا۔ مگر پھر یہ سمجھکر کہ انہیں ہاتھ میں لینا انہیں مخالف بنانے سے زیادہ مفید ہے۔ کلیسا نے اُن کے وجود کو تسلیم کرنا شروع کیا اور ایسی جماعتیں یا پاپائے رُوما کے فرمانِ خاص یا بادشاہ کے حکم سے قائم ہونے لگیں۔ یا تسلیم کی گئیں۔ چنانچہ شاہ فرڈرک ثانی نے نیپلز یونیورسٹی کی بُنیاد ڈالی۔ پوپ گریگوری نہم نے ٹولوس کی یونیورسٹی قائم کی۔ اور پوپ انوسنٹ چہارم نے خود روما میں یونیورسٹی بنائی۔ بولونا کی یونیورسٹی حقیقت میں چار یونیورسٹیوں کا مجموعہ تھی۔ ایک لومبارڈ لوگوں کے لیے۔ دُوسری ٹسکنی کے باشندوں کے لیے۔ تیسری شمالی کوہستان کی دُوسری طرف کے ساکنوں کیواسطے اور چوتھی اہل رُوما کے لیے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ چاروں یونیورسٹیاں مختص القوم یونیورسٹیاں تھیں اور اُس وقت لفظِ یونیورسٹی کا مفہوم ہر ایسی جماعت تھی جو باقاعدہ تعلیم کے مقصد سے قائم ہو۔ اُسی زمانہ میں پیرس کی یونیورسٹی میں یہی نمونہ قومی تقسیم کا موجود تھا۔ فرانسیسی زبان کے بولنے والے ایک جماعت تھے۔ نارمنڈی کے علاقہ کے لوگ دُوسری جماعت۔ پیکارڈین لوگ تیسری جماعت اور انگلش چوتھی۔ گو انگلش حصہ کا نام بعد میں جرمن رکھا گیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کی یونیورسٹیاں کچھ بولونا اور کچھ پیرس کے نمونہ پر بنی تھیں۔ بولونا اصل میں متعلّمین کی جماعت تھی۔ اور پیرس معلّمین

کی مُقدم الذکر میں سب انتظام طلبہ کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ علی عہدہ دار جنہیں ریکٹر کہتے تھے۔ طالب علموں کے انتخاب سے مقرر ہوتے تھے۔ جنہیں اگر کبھی کسی جوابدہی کا موقعہ پڑے تو طالب علم ہی اُن سے جواب طلب کر سکتے تھے۔ یہ طلبہ عموماً پختہ عمر کے ہوتے تھے اور اپنا نفع نقصان سمجھنے کی قابلیت رکھتے تھے۔ برعکس اس کے پیرس میں جہاں معلمین کے اتحاد کا نام یونیورسٹی تھا۔ طلبہ عموماً کم عمر ہوتے تھے اور انتظام اساتذہ کے ہاتھ ہوتا تھا اور طلبہ ہر طرح اساتذہ کی زیرِ نگرانی ہوتے تھے۔ یہ یونیورسٹی درحقیقت یورپ کی مشہور ترین یونیورسٹیوں کا منبع ہے۔ نوٹرڈیم کے گرجا کے ساتھ ایک مدرسہ تھا جو اس یونیورسٹی کی ابتدا ہی۔ بعض کے نزدیک ۱۱۴۰ء میں اور بعض کے نزدیک ۱۱۷۰ء میں یہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ اس جماعت کو خاص خاص حقوق دیئے گئے تھے۔ گو سب ایک وقت میں نہیں ملے اور متواتر جدوجہد سے حاصل کئے گئے۔ ایک حق یہ تھا کہ جو لوگ یونیورسٹی کے زیرِ سایہ تھے وہ بعض ٹکسوں اور محصولوں اور دیوانی عدالتوں کے اختیارِ سماعت سے مستثنیٰ تھے اور جب کسی یونیورسٹی والے کے برخلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو وہ یہ حق رکھتا تھا کہ جس شہر میں یونیورسٹی ہے اس میں مقدمہ منتقل کرائے اور خود یونیورسٹی کے حکام اُس کے مقدمہ کو سنیں۔ اس کے علاوہ بعض اور چھوٹی چھوٹی رعائتیں اور حقوق یونیورسٹی سے متعلق تھے۔[۵]

اکسفورڈ اور کیمبرج میں جو طریق کالجوں کا بعد میں مروّج ہوا۔ وہ بھی پہلے پیرس ہی سے شروع ہوا۔ کئی مخیر آدمی کارِ ثواب سمجھ کر چاہتے تھے کہ غریب طلبہ کے رہنے کے لئے کوئی جگہ بنا دیں۔ تاکہ انہیں دورانِ تعلیم میں رہنے کی جگہ ڈھونڈھنے اور کرایہ کی زیرباری اُٹھانے کی تکلیف نہ ہو۔ اس طرح متعدد مکانات بن گئے۔ جن میں سے ہر ایک میں ایک خاص تعداد طلبہ کی ایک مستند عالم کی نگرانی میں رہنے لگی۔ نگران عالم کو ماسٹر کہتے تھے۔ اکسفورڈ اور کیمبرج میں یہی عمارتیں جدا جدا کالج قرار پائیں۔ جن کا

[۵] ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا۔

اندرونی انتظام بالکل انکے اپنے ہاتھ میں ہوتا ہے - اور اپنے اپنے طلبہ کی تعلیم کی نگرانی کالج ہی کرتے ہیں۔ البتہ ہر مضمون کے لئے یونیورسٹی کیطرف سے اعلیٰ درجہ کے استاد مقرر ہیں جنکے لکچروں سے سب کالجوں کے طلبہ یکساں مستفید ہو سکتے ہیں - اور امتحانات اور سندات کا انتظام یونیورسٹی کے ہاتھوں میں ہے - مگر سکاٹ لینڈ میں بعض یونیورسٹیاں مثل سینٹ اینڈریوز کے ایسی ہیں جن کے کالج ڈگریاں عطا کرنے کے لئے خود اپنے طلبہ کا امتحان لیتے ہیں - اور یونیورسٹی پڑھائی کا انتظام کرتی ہے۔

ممالک یورپ میں جرمنی وہ ملک ہے جس میں یونیورسٹیاں فرانس اٹلی اور انگلستان کے بعد قائم ہوئی ہیں اور وہ بہت سی باتوں میں فرانس کی یونیورسٹیوں سے اور بہت سی باتوں میں سکاٹلینڈ کی یونیورسٹیوں سے مشابہ ہیں - وہ پڑھانے والی جماعتیں ہیں اور ان کے پروفیسر وہ لوگ ہیں جو اپنے فن میں مہارت خاص رکھتے ہیں اور مدتوں ایک فن کی تحصیل میں مصروف رہتے ہیں ان کی بڑی رقم پروفیسروں کی تنخواہوں کے لئے مخصوص کی ہوئی ہیں جنکی آمد سے پروفیسر تنخواہیں پاتے ہیں۔ اسکا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلبہ کو ان کے لکچروں سے مستفید ہونیکے واسطے بہت کم فیس دینی پڑتی ہے - یونیورسٹی کے پروفیسروں کے فرائض کے متعلق جدید خیال یہ ہے کہ صرف طلبہ کو پڑھانا انکا کام نہیں ہے - بلکہ اس مضمون میں جس کے وہ پروفیسر ہیں کوئی نئی تحقیقات کرنا اور اسکی معلومات میں کچھ مفید اضافہ کرنا انکا خاص فرض قرار دیا گیا ہے - اور اس خیال کی وجہ سے طلبہ کو سبق دینا ان سے کم درجہ کے اساتذہ سے متعلق کیا جا رہا ہے تاکہ انہیں زیادہ وقت علمی تحقیقات اور جدید معلومات کیلئے مل سکے -

پرانی یونیورسٹیوں کے سوا انگلستان میں بہت سی نئی یونیورسٹیاں قائم ہوئی ہیں - جن میں سے اکثر ایک ایک کالج والی ہیں - یعنی پہلے ایک کالج تھا جو ترقی کرتے کرتے یونیورسٹی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے - ان میں علوم قدیمہ کی طرف کم توجہ ہے اور سائنس اور دیگر علوم جدیدہ پر زیادہ زور دیا جاتا ہے یہ عام لوگوں کے لئے مفید تر ہیں - اب قدیم یونیورسٹیاں یا تو طبقہ امرا کے لئے مخصوص ہوتی جاتی ہیں - یا ان لوگوں کے لئے جو ملازمت کے بعض سیغوں کے لئے پرانی یونیورسٹیوں کی ڈگریوں کو کارآمد پاتے ہیں -

محمدن یونیورسٹی کی تجویز کے متعلق بہت سے شکوک وقتاً فوقتاً پیش کئے گئے ہیں جن میں سے بیشتر کا جواب مندرجہ بالا تاریخی حالات میں موجود ہے۔ مثلاً کہا گیا ہے کہ مختص القوم یونیورسٹی بنانے کے نظائر نہیں۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اکثر یونیورسٹیاں پہلے مختص القوم تھیں اور اب تک بعض میں باعتبار مقصد خصوصیت باقی ہے۔ گو دوسری قوم کے لوگوں کو ان میں داخل ہونے کی اجازت ہے اور یہ بات مجوزہ محمدن یونیورسٹی میں بھی موجود ہوگی۔ ایک اور اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ علیگڈھ میں تاحال فقط ایک کالج ہے۔ اسے یونیورسٹی کا رتبہ کیونکر حاصل ہوگا مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت انگلستان میں کئی یونیورسٹیاں ہیں جو فقط ایک ہی کالج رکھتی ہیں۔ اور کالجوں کا یونیورسٹی سے ملحق ہونا یونیورسٹی کی ہستی کے لئے کوئی لازمی صفت نہیں ہے۔ بعض کا یہ خیال ہے کہ علیگڈھ کالج جب تک صرف آرٹس کی تعلیم دیتا ہے۔ اسے یونیورسٹی کا لقب کیونکر دے سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بانیان یونیورسٹی عزم تو یہ رکھتے ہیں کہ علیگڈھ علوم و فنون مختلفہ کا مرکز بنجائے۔ مگر جب تک وہ اس منتہائے خیال کو نہ پہنچ سکیں۔ اس سے پہلے بھی کسی ایک یا دو صیغوں کی تکمیل ہی اسے یونیورسٹی بنا دینے کے لئے کافی ہوگی۔ اصل چیز جس کے مسلمان آرزومند ہیں اور جس کا ہر دور اندیش شخص کو آرزومند ہونا چاہیئے۔ یہ ہے کہ اپنی تعلیم کی باگ اپنے ہاتھ میں ہو۔ شمس العلما مولینا شبلی نعمانی نے اس مطلب کو کس خوبی اور برجستگی سے اپنی نظم کے مطلع میں ادا کیا ہے۔ جو انہوں نے ۲۵۔ ماہ فروری کو لاہور کے اس عظیم الشان جلسہ میں پڑھی تھی۔ جس میں علاوہ ریاست بہاولپور سے ایک گرانبہا عطیہ کی امید کے اہل پنجاب کیطرف سے اڑھائی لاکھ روپیہ کے وعدے یونیورسٹی فنڈ کے لئے ایک نشست میں ہوگئے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:-

ہمیں یک لفظ از یونیورسٹی مدعا باشد   کہ ایں سر رشتۂ تعلیم ما در دست ما باشد

عبدالقادر

ہوا میں اُڑنا

سلسلہ کے لئے دیکھو "مخزن" بابت اکتوبر سنہ ۱۹۱۰ء جلد ۲۰ نمبر ۱

سنہ ۱۷۸۵ء میں بلانشارڈ اور ڈاکٹر جان جفریز نے بوسٹن سے بیلون میں بیٹھ کر ڈوور سے فرانس کی جانب گزرنے کی جُرأت کی اور یہ بمشکل ڈوبتے ڈوبتے بچے

اسی سال ایک انگریز لیڈی مسز سیج نے ۲۹ جون کو بیلون میں اُڑ کر اپنی جُرأت کے جوہر دکھائے۔ یہی پہلی انگریز لیڈی تھی جس نے پرواز میں اپنے ابنائے وطن پر سبقت کی۔

اسی سال بیلون سے پہلا مُہلک حادثہ ظہور پذیر ہوا۔ یعنی روزیار اور ایک نوجوان رُومان لانی نے ایک ہیڈروجنی بیلون کے ذریعہ فرانس سے انگلش چینل کو عبور کر کے انگلستان پہنچنے کا قصد کیا۔ حسبِ ضرورت قوتِ صعود کے بڑھانے گھٹانے کے لئے ایک چھوٹا بیلون نیچے لٹکایا گیا تھا۔ جب "بیلون" بلند ہوا تو اُوپر کی ہوا لطیف ہونے کی وجہ سے بیلون پر دباؤ کم ہوگیا اور ہیڈروجن کی قوتِ تمدّد سے "بیلون" پھٹ گیا۔ یا جیسے بعض کا قول ہے کہ "بیلون" کسی بے احتیاطی سے جل گیا اور یہ دونوں ساحلِ فرانس کے قریب تین ہزار فٹ کی بلندی سے چٹانوں پر گر کر پاش پاش ہوگئے

اس حادثہ سے لوگوں پر ایک سنسنی ضرور پھیل گئی۔ مگر اُنہوں نے ہوا میں اُڑنے کا خیال ترک نہیں کیا بلکہ اس کے بعد بھی سیکڑوں ہزاروں آدمی "بیلون" میں اُڑا کئے اور ہر زمانہ کے ماہرین اُن نقائص کی اصلاح کی جانب زیادہ تر توجہ دیتے رہے جن کی وجہ سے اس قسم کے حادثے ہُوا کرتے تھے چنانچہ "بیلون" کا

کیونکہ گیس کی قوتِ تمدد کا مقابلہ نہ کر سکنے کی وجہ سے بیلون پر باریک رسیوں کا جال تنا شروع کیا گیا۔ گیس کی کوئی حد معین نہیں تھی بہت سی اُلٹ پلٹ کے بعد اس کی مناسب مقدار "بیلون" کے اعتبار سے مقرر کی گئی۔ اسی طرح صابورہ[1] کی بھی مقدار معین کی گئی۔ چنانچہ گلیچر کو جو فرانس میں مشہور پرواز کنندہ ہے اس کی یہ رائے ہے کہ اگر بیلون کی وسعت نو ہزار (۹۰۰۰) مکعب فٹ ہو تو اس میں صرف ایک ثلث یعنی تین ہزار مکعب فٹ گیس اور چھ سو (۶۰۰) پونڈ صابورہ بھرا جائے۔ اس طرح صرف "بیلون" کے پھٹنے کا بچاؤ ہو گیا اور اوپر چڑھتے جانے کی تجویز نکل آئی۔ لیکن "بیلون سوار" کا اُترنا اس کے مطلق اختیار میں نہ تھا اور "بیلون" شترِ بے مہار کی طرح یا تو سیدھے اُوپر چڑھے جاتے یا ہوا کے تموج سے اِدھر اُدھر منڈلاتے پھرتے اور کہیں کے کہیں نکل جاتے تھے اس لئے تھوڑی تھوڑی بلندی تک اُڑنے کی صورت میں اُترنے اور بیلون کو قابو میں رکھنے کے لئے اُس سے ایک لمبی رسی باندھنا تجویز ہوا جس سے "بیلون" تموجِ ہوا میں ڈگمگانے سے محفوظ رہتا تھا اور اُترنا چاہتے تو نیچے سے پتنگ کی طرح رسی کو کھینچ لیتے تھے۔ اِس کی ابتدا ۱۷۹۴ء کی جنگ فرانس و جرمنی سے پائی جاتی ہے جس میں فرنچ جنرل جارڈوں کی ماتحت "بیلون پارٹی" نے ہوائی تموج سے "بیلون" کو روکنے کے لئے یہی تجویز اختیار کی تھی۔ چنانچہ فوجی غبارے جو جنگی اغراض کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ اُن میں اب بھی بعض وقت یہی ہوتا ہے کہ ایک دراز رسی[2] کا ایک سرا "بیلون" سے اور دُوسرا سرا ایک آلہ سے باندھ دیتے ہیں جس سے رسی حسبِ ضرورت بآسانی کھولی اور لپیٹی جا سکتی ہے۔

[1] وہ ریت مٹی وغیرہ جو اس غرض سے بیلون میں رکھی جاتی ہے کہ ضرورت کے وقت اسکو پھینک پھینک کر بیلون کو ہلکا کر دیا جائے ۱۲

[2] عموماً اس رسی میں ٹیلیفون کا تار ہوتا ہے جس کے ذریعہ بیلون سوار اپنے چشم دید حالات کی اطلاع دیتا رہتا ہے ۱۲

زیادہ بلندی تک اُڑانے میں یہ تجویز کام نہیں دیتی تھی۔ اس لئے ایسی صورت میں اُترنے کے لئے "پیرا شوٹ" یعنی ایک قسم کی چھتری ایجاد کی گئی۔ جو ایک رسّی کے ذریعہ بیلون سے بندھی رہتی تھی جب اُترنا مقصود ہوتا وہ رسّی کاٹ دیجاتی اور بیلون سوار "چھتری کو لیکر کُود پڑتا۔ چھتری کھل جاتی اور اُس میں ہوا بھر کر آہستہ آہستہ زمین پر اُتر آتا۔ چنانچہ اسکا استعمال ۱۷۹۷ء سے ثابت ہوتا ہے۔

بعض صورتوں میں یہ تجویز بھی ناکافی ثابت ہوئی اور اس میں بڑی خرابی یہ تھی کہ بعض وقت "بیلون" سے ہاتھ دھونا پڑتا تھا اس لئے اُترنے کے لئے ایک آلہ ایجاد کیا گیا یعنی بیلون میں اُوپر کی جانب ایک ڈھکنا لگانا تجویز ہوا جو ڈوری کھینچنے پر کھلتا اور خود بخود بند ہو جاتا تھا۔ جب اُترنا مقصود ہوتا یہ ڈوری کھینچنے سے ڈھکنا کھل جاتا اور ہلکی گیس اس میں سے خارج ہو کر "بیلون" بھاری ہو جاتا اور طبعاً سرِ نشیب ہونے لگتا۔ لیکن ڈھکنا کھولنے میں بڑی احتیاط اور ہوشیاری درکار ہوتی ہے کیونکہ اگر وُہ زیادہ کھلا رہے اور گیس کی کثیر مقدار خارج ہو جائے تو "بیلون" اپنی مساوی الحجم ہوا سے زیادہ بھاری ہو جانے کی وجہ اوپر پھینکے ہوئے پتھر کی طرح اس زور سے زمین پر گرے کہ اُسکے دھماکے سے بیٹھنے والے کو سخت ضرب پہنچے۔

ہیڈروجن گیس چونکہ بڑی دقت سے فراہم ہوتی تھی اِس لئے بنظرِ سہولت اِس کے عوض "کول گیس" بھرنا تجویز ہوا اور سب سے پہلے پروفیسر گرین (انگریز) نے اس کی رائے دی۔

ہم "بیلون" کی اِن مختصر اصطلاحات کا ذکر کرنے کے بعد پھر اُس کے تاریخی پہلو کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کے خیالات "بیلون" کی جانب زیادہ تر منعطف ہو گئے اور اُس سے مفید کام لینے کی دُھن ہو گئی تو جنگی اغراض کے لئے

اس کا استعمال مفید سمجھا گیا اور دشمن کی نقل و حرکت اور دوسری کل ایسی باتیں جو نظر سے اوجھل ہوں۔ بیلون کے ذریعہ بلندی سے دیکھ لینے کا خیال پیدا ہو گیا اور اس میں ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی اور بہت سے فوائد حاصل ہوئے چنانچہ جنگ فلورس واقع ۱۷۹۴ء میں جنرل جارڈن کی فتح "بیلون" پارٹی ہی کی وجہ سے ہوئی جو آسمان میں منڈلاتے ہوئے جرمنی فوج کا معائنہ کر لیتی اور اس کی نقل و حرکت کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیتی رہتی تھی۔ اہلِ جرمن جو اس سے محض لاعلم تھے نہایت متحیر تھے کہ ہماری حالت کا غنیم کو کس طرح پتہ لگ جاتا ہے اس کے بعد سے موڈن علاقہ فرانس میں "بیلون" کی تعلیم کے لئے خاص طور پر ایک مدرسہ قائم کر کے فوجیوں کو اس کی تعلیم ہونے لگی اور فرانس کی فوج میں کئی بیلون تیار کئے گئے اور اکثر جنگ کے موقعوں پر اس سے بڑا کام نکلا چنانچہ ۱۸۵۹ء جنگ فرانس و اٹالی میں فرنچ فوج نے بیلون سے بہت فائدہ اٹھایا رفتہ رفتہ دوسری سلطنتوں میں بھی اس کا رواج ہوتا گیا چنانچہ ۱۸۶۱ء سے ۱۸۸۵ء تک کی مقامی جنگوں میں امریکہ کے صیغۂ جنگ نے لاموئنٹن اور لو اور دوسرے ماہرینِ فن کے ماتحت ایک "بیلون" پارٹی مقرر کی تھی جس سے بڑے بڑے فوائد حاصل ہوئے۔ سب سے پہلے جنرل لو نے ہی چھ سو فٹ کی بلندی سے ایک برقی پیام بھیجا۔ جس کے بعد سے اکثر برقی پیامات ہی کا رواج ہوتا گیا۔ ورنہ پہلے "بیلون سوار" چشم دید حالات و واقعات کاغذ پر لکھ کر کسی وزنی شئے سے وہ کاغذ باندھ کر نیچے پھینک دیا کرتا یا اترنے کے بعد وہ کل کاغذات پیش کر دیا کرتا تھا۔ چنانچہ اب بھی بعض موقعوں پر یہی طریقہ جاری ہے۔

کچھ عرصہ بعد چند وجوہات اور بعض حادثات کی وجہ سے فرانس میں بھی "بیلون"

کو بیکار چیز سمجھ کر اس کا استعمال ترک کر دیا گیا تھا مگر ۱۸۷۰ء کی جنگ فرانس و جرمنی کے موقع پر مارشل لیبوف سے پھر "بیلونی لشکر" تیار کرنے کی درخواست کی گئی۔ اسی طرح اہل جرمنی نے بھی اپنی گورنمنٹ سے درخواست کی اور "بیلون پارٹی" مقرر کی گئی۔ لیکن غیر ماہر اشخاص کے زیر نگرانی اس کا انتظام ہونے سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں ہوا اور یہ صیغہ پھر نکال دیا گیا۔ جب "جرمنی" فوج نے پیرس کا محاصرہ کر لیا اس وقت "بیلون" کی اہمیت اس طرح ثابت ہوئی کہ اس نازک موقع پر اہل فرانس نے ان مقامات کی تلاش کے لئے جو ہنوز دشمن کے قبضہ میں نہیں گئے تھے "بیلون" سے کام لینا چاہا مگر کچھ عرصہ سے اس کا استعمال متروک ہو جانے سے اس مقصد کے مفید کوئی "بیلون" شہر بھر میں دستیاب نہیں ہوا تو فوراً خاص طور پر ریشمی کپڑے کے ستر "بیلون" سات سات ہزار مکعب فٹ وسیع تیار کر کے السی کا تیل اور سیندور پکا کر ان پر پالش کر دی گئی اور باقی کل باتیں معمولی بیلونوں کی سی تھیں۔ سب سے پہلا "بیلون" ۲۳ جولائی کو ۲۷۲ خطوط و کاغذات اور چند پالتو کبوتر ساتھ لے کر چلا اور اوفرمیں جا اترا اور وہاں سے کبوتروں کے ذریعہ ضروری حالات سے پائے تخت کو اطلاع دی گئی۔ اسی طرح نامہ بر کبوتر ہر بیلون کا ضروری جزو ہے جن کے ذریعہ وقتاً فوقتاً "بیلون" سوار ضروری اطلاعیں بھیجتے رہتے تھے۔ غرض اس کے بعد اس تاریخ سے آخر محاصرہ یعنی ۲۸ کانون ثانی ۱۸۷۱ء تک ۶۱ "بیلون" اڑائے گئے جن میں سے ۵۴ صرف صیغہ ڈاک نے روانہ کئے تھے جن کے ذریعہ تخمیناً پچیس لاکھ خطوط دو سو اسی من وزنی بھیجے گئے تھے۔

انہی "بیلونوں" میں سے ورشنگٹن نامی ایک بیلون جرمنی فوج کے پڑاؤ سے ڈھائی تین ہزار بلندی سے گزر رہا تھا تو غنیم نے اس پر گولیاں چلائیں اور مسافرین

بیلون" نے جھٹ "بیلون" کو اونچا کر کے اپنے آپ کو دشمن کی زد سے بچا لیا ان کل بیلونوں میں سے بعض تو فرانس کی حدود سے پار نکل گئے۔ ایک بیلون دشمن کی فوج میں جا اترا اور تین بالکل بے پتہ رہے۔ اس جنگ کے ختم پر عموماً کل دولِ یورپ خصوصاً جرمنی نے بیلون کی اہمیت تسلیم کر کے اس کی جانب معقول توجہ دی اور "بیلون" صیغہ جنگ کا ایسا لازمی جز ہو گیا کہ جس سلطنت میں "بیلون پارٹی" نہ ہو اس کا صیغہ جنگ ناقص خیال کیا گیا۔ اس توجہ کا یہ اثر ہوا کہ "بیلون اِس قدر روز افزوں ترقی کرتے اور مفید ثابت ہوتے گئے کہ بہت جلد انہیں "ہوائی غباروں" سے "ہوائی جہازوں" کا لقب ملا اور یہ اُمید یقین کے درجہ کو پہنچ گئی کہ جنگی جہازات کی طرح "یہ ہوائی جہاز" بھی ملک کی حمایت اور غنیم پر آگ برسانے میں قابل قدر مدد دیں گے چنانچہ اس وقت تک اِن میں کس حد تک ترقی ہو گئی ہے۔ ہم اس کا ذکر بعد میں کرینگے۔

"بیلون" سے سیر و تفریح اور اِن جنگی فوائد کے علاوہ علمی تحقیقات میں بھی بہت مدد ملی ہے۔ سنہ ۱۸۰۳ء سے قبل علمی تحقیقات کے لئے "بیلون" میں اُڑنے کا پتہ نہیں لگتا ہے پہلے اسی سال ایک رُوسی علمی سوسائٹی کی تحریک پر رابرٹسن بعض علمی مسائل کی تحقیق کے لئے اولاً بمقام ہمبرگ اور سنہ ۱۸۰۴ء میں دوبارہ سہ بارہ بمقام پیٹرسبرگ "غبارہ" میں بیٹھکر اُڑا۔ یہ بعض مرتبہ ۲۲ و ۲۳ فٹ بلندی تک پہنچ گیا تھا لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

اِسی سال فرانس کی ایک علمی سوسائٹی کی تحریک پر بعض علمی مسائل خصوصاً بلند مقامات کی جاذبیت وغیرہ امور کی تحقیق کے لئے گالیساک (Gaylussac) نے بمقام پیرس دو تین بار "بیلون" کے ذریعہ بلند پروازی کی چنانچہ پہلی مرتبہ یہ تیرہ ہزار فٹ اور دوبارہ تیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچا اور کئی تجربات حاصل کئے۔ "مقیاس الحرارت" (تھرمامیٹر) جو اس وقت پیرس میں ۸۲ درجہ تھا۔ تیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچنے تک

بتدریج اُترتے اُترتے ۱۵ درجہ تک اُتر گیا۔ جس سے اُس نے یہ نتیجہ نکالا کہ تقریباً ہر تین سو فٹ بلندی پر ایک ایک درجہ حرارت کم ہوتی جاتی ہے۔ سب سے پہلے اس نے یہ دیکھا کہ اُوپر پہنچنے کے بعد زمین بھی مقعر معلوم ہونے لگتی ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم دو مقعر قبوں (ایک آسمان اور دُوسری زمین) کے درمیان معلق ہیں۔ اُس کو آسمان کا نیلا نیلا رنگ گہرا سیاہ نظر آنے لگا۔ دَم گھٹنے اور حلق خشک ہونے لگا۔ نبض بہت تیز چلنے لگی۔ شدّتِ سردی سے اعضا شل ہونے شروع ہو گئے۔ زور سے چلّانے پر بھی بالکل موہوم اور خفیف آواز سنائی دیتی تھی۔ یہی سب سے پہلے اِتنی اونچائی کی ہوا کسی قدر جمع کرلایا تھا جس کے بھی ٹھیک وہی اجزائے اصلی ثابت ہوئے جو زمین سے متصل ہوا کے ہیں۔

۱۸۰۶ء میں کارلو بروسکی فلکی جو پہلا اٹالین پرواز کنندہ تھا بمقام نیپلز علاقہ اٹالی گالیساک سے بھی زیادہ بلندی پر پہنچ گیا تھا لیکن بیلون کے پھٹ جانے سے زمین پر گر پڑا اور تعجب خیز بات یہ کہ بال بال بچ گیا۔ اس کے بعد سے ۱۸۵۰ء تک کسی شخص کے علمی اغراض کے لئے ہوا میں اُڑنے کا پتہ نہیں چلتا۔

۱۸۵۰ء میں بکسیو نے بمقام پیرس اور ۱۸۵۲ء میں گرین نے بمقام لندن پھر بھی تحقیقاتِ علمی کی غرض سے پرواز کی اور پہلا اُنیس ہزار فٹ بلندی پر پہنچکر کسی حادثہ کی وجہ سے اُتر آنے پر مجبور ہو گیا اور دُوسرے نے حسب مراد بلندی پر پہنچکر ٹھیک وہی تجربات حاصل کئے جو گالیساک نے کئے تھے۔

۱۸۶۲ و ۱۸۶۳ء میں گلیشر جو اس سے پہلے تخمیناً چار سو مرتبہ ہوا میں اُڑا تھا تقریباً سات میل بلندی تک پہنچ گیا۔ ساڑھے پانچ میل بلند ہونے کے بعد سے اس کے

ہاتھ پیر شل ہونے لگے - حتیٰ کہ بیلون کے ڈھکنے کی رسّی کھینچنے کے ناقابل ہو گئے - گرمی آنے کی غرض سے ہاتھوں پر برانڈی ڈالی گئی - پھر بھی کچھ نہ ہوا آخر دانتوں سے رسّی کھینچی - اس نے پہلے سفر میں درجۂ حرارت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کی تفصیلی کیفیت تحقیق کی - دُوسرے سفر میں ہوائی گرم مُوجوں میں جا پہنچا اور طبقہ وار اُنکے درجات حرارت کی کمی و بیشی اس کی رفتار وغیرہ کل امور دریافت کئے -

علم ہیئت کے متعلق بھی بہت سی مزید تحقیقات اور بعض خاص موقت امُور مثلاً کسُوف و خسوف وغیرہ کی دریافت میں "بیلون" سے بہت کام لئے گئے - حاصل یہ کہ "بیلون" کے ذریعہ وقتاً فوقتاً جو بیشمار علمی تحقیقات ہوئیں اور بہت سے فوائد حاصل ہوئے اُن کی پُوری پُوری تفصیل کیجائے تو ایک دفتر ہو جائے -

ہر زمانہ میں "بیلون" کی کامیابی کے ساتھ ساتھ ماہرین فن کے حوصلے بھی بڑھتے گئے اور بڑے بڑے سفر کرنے کی جرآت ہونے لگی - چنانچہ ہم چند مشہور پرواز کنندہ اشخاص کے مشہور سفروں کا ذکر کرتے ہیں جن سے اُن کی اُولو العزمی اور ہوا میں اُڑنے کے مقصد میں بتدریج کامیابی حاصل کرنے کا پتہ چل سکتا ہے - فلاماریون جو "بیلون" کی رفتار کے سکون و تکان کا محقق مانا گیا ہے اور جس نے اپنے کسی ہوائی سفر میں سب سے پہلے یہ تحقیق کی تھی کہ اگرچہ "بیلون" ہوائی تموج سے ہر لحظہ سیکڑوں بلکہ ہزاروں فٹ اوپر چڑھتا اور نیچے اُترتا تھا - پھر بھی اس کی رفتار ایسی بے تکان تھی کہ پانی سے لبریز گلاس تک چھلکنے نہ پاتا تھا - اپنے ایک سفر میں ۲۰ میل کا دھاوا مارا تھا -

۲۶ - جولائی سنہ ۱۸۶۸ء کو ایک لیڈی مسز گریہام رات کے وقت تنِ تنہا اپنے "بیلون" میں جس کا نام اُسی کے نام پر رکھا گیا تھا - سوار ہو کر بہت عرصہ تک ہوا میں اُڑتی رہی - لیکن صحیح طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کس قدر بلندی پر پہنچی اور کتنی مسافت طے کی -

۱۸۵۹ء میں مسٹر جان وائز امریکن تین چار آدمیوں سمیت سینٹ لوئی سے ہنڈرسن کو چلا اور تقریباً فی منٹ ایک میل کے حساب سے ۱۹ گھنٹہ ۵۰ منٹ میں گیارہ سو پچاس میل طے کئے۔ تیز پروازی کے اعتبار سے یہ واقعہ بھی زیادہ قابل ذکر ہے کہ اسی سال لاموشٹن اور جنرل تو نے چار گھنٹوں میں تین سو میل کے قریب مسافت طے کی۔ پروفیسر گرین انگریز جو فن "بیلون" کا بڑا عالم گذرا ہے اس نے گویا اپنی زندگی ہی ہوا میں اڑنے کے لئے وقف کر دی تھی۔ یہ ۲۶ سال کے عرصہ میں تقریباً ایک ہزار چار سو مرتبہ ہوا میں اُڑا ہے۔ تین مرتبہ سمندر پار اُترا۔ سمندر میں گرا اور بال بال بچ گیا۔ اس کا مشہور سفر ۱۸۳۶ء کا ہے۔ جس میں یہ ہالینڈ اور اپنے دو ہمراہیوں کے ساتھ ایک بڑے "بیلون" میں بیٹھکر اور کئی ہفتہ کا زادِ راہ ساتھ لیکر لندن سے ویلبرگ کو روانہ ہوا جو پانسو میل کی مسافت تھی جس کو اس نے اٹھارہ گھنٹوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ طے کیا۔

اس قدر بڑے بڑے دعاوے مارنے یا طول طویل ہوائی سفروں کے باوجود پھر بھی اس وقت تک "بیلون" کے ذریعہ صرف سیدھا اوپر چڑھنا یا اُترنا تو اختیاری تھا لیکن اس کی اُفقی حرکت تموج ہوا کے بالکل تابع تھی اس لئے اگلے زمانہ کے بادبانی جہازات کی طرح ان ہوائی جہازوں سے بھی صرف بادِ موافق کی صورت میں کام نکل جاتا تھا۔ چنانچہ محاصرۂ پیرس کے وقت جو تجربات ہوئے تھے اُن سے گلیشر ڈاس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ "بیلون" سے مستقل ہوائی سواری کا کام ہرگز نہیں نکل سکتا۔ لیکن دوسرے ماہرین فن اس کے مخالف رہے اور ہر زمانہ میں لگاتار یہی کوشش جاری رہی کہ نقائص دُور کئے جائیں اور کسی تدبیر سے ایک مکمل اور قابلِ اطمینان ہوائی سواری بنائی جائے۔ یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ اس مقصد کے لئے جس قدر کوشش کیگئی اُس کا اکثر حصہ جنگی اغراض پر مبنی تھا۔ سلطنتوں کی حمایت و

اعانت بھی زیادہ تر اسی لحاظ سے ہوئی اور کامیابی کا سہرا بھی اسی صیغہ کے سر رہا۔ چنانچہ سب سے پہلے توجی بیلون ہی ایک حد تک کامیاب ثابت ہوئے بعض آلات واوزار ایزاد کرنے سے وہ اس قابل ہوگئے کہ معمولی ہوا میں اُن کے ذریعہ ہر طرف گھوم سکتے اور جہاں چاہتے اُتر سکتے تھے۔ لیکن پھر بھی یہ بڑا نقص باقی رہا کہ زور کی ہوا میں یا ہوا کے رُخ پر نہیں جاسکتے تھے۔ اِس لئے ماہرینِ فن کی توجہ بدستور اس کی جانب مبذول رہی اور وہ حرکت کے اختیاری اور تیز بنانے گیس وغیرہ کے کھڑاگ کو ترک کر دینے کی فکر میں برابر منہمک رہے اور مختلف تجاویز سوچی گئیں مسٹر ہارگریو اہل اسٹریلیا نے ایک ہوائی مشین پتنگ کے اصول پر بنائی اور ہوا سے برقی قوت کا کام لیا۔ گو اس نے چھوٹی چھوٹی متعدد مشینیں تیار کیں۔ جو ہوا میں اُڑتی رہتی تھیں لیکن اُن کے چھوٹے پن کے باعث سواری کا خیال نہ کرسکا۔ بعض نے کشتی نما غبارے بنائے۔ جن میں ایک یا کئی بادبان اور ہوا کاٹنے کے لئے چرخیاں اور پنکھے لگائے تھے۔ اوّل اوّل یہ ایک چھوٹی سی دستی مشین تھی جسکو سوار ہاتھوں سے چلاتا اور جس رُخ پر چاہتا رکھ سکتا تھا۔ اس کو حرکت دینے سے یہ چرخیاں اور پنکھے جو پون چکی کے پنکھوں سے مشابہ ہوتے تھے۔ ہوا کو کاٹتے جاتے اور یہ ہوائی کشتی اُسی رُخ پر ٹھیک۔ اسی طرح بڑھتی جاتی جس طرح آبی کشتیاں دستی بلیوں یا چرخیوں کے ذریعہ سطح آب پر چلنے لگتی ہیں۔ پہلی تجویز کی بہ نسبت آخرالذکر تجویز رفتہ رفتہ اس حد تک کامیاب ثابت ہوئی کہ مختصر پیمانہ اور محدود بلندی پر شوقین لوگ سطح سمندر پر تفریحاً ہوا میں اُڑنے لگے۔ چنانچہ کچھ عرصہ سے پہلے انگلستان کے مشہور اخبار گریفک میں مختلف شکل وہیت کی ان ہوائی کشتیوں کے فوٹو شائع ہوئے تھے جن میں ایک ایک دو دو آدمی بیٹھ کر سمندر پر پرندوں کے مانند جو سما میں منڈلا رہے تھے۔

جس طرح آبی کشتیوں اور بادبانی جہازوں کو ہاتھوں سے کھینے یا بادِ موافق کی امداد سے چلانے کے عوض سائنس کی مدد سے رفتہ رفتہ دخانی یا برقی طاقت سے کام لیکر دخانی جہازات اور موٹر بوٹ کی ایجاد کی بدولت ملّاحوں کے "ڈنڑ" "چپوؤں" اور بادِ موافق کے بارِ احسان سے سبکدوشی حاصل کرلی گئی۔ اسی طرح کچھ عرصہ بعد ان ہوائی کشتیوں کے چلانے میں بھی برقی قوت سے کام لیا جانا تجویز ہوا اور اس طرح بادِ مخالف کے اندیشہ سے رہائی نصیب ہوگئی۔ "ہوا میں اُڑنے" کے مقصد میں جو اس وقت خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوگئی ہے اُس کا سنگِ بنیاد یہی تجویز تھی جس میں اور قدیم "بیلونوں" میں علّتِ غائی کے اعتبار سے تو کوئی فرق نہیں لیکن قوائے آلیہ اور اصُولِ پرواز میں بہت فرق ہے۔ موجودہ زمانہ کی کامیاب مشینیں بھی دو قسم کی ہیں۔ بعض تو "بیلون" کی طرح اپنی مساوی الحجم ہوا سے ہلکی ہیں۔ اور بعض بھاری۔ اوّل کی پرواز موازنہ سیّالات کے ضوابط پر مبنی ہے اور دوسروں کی اُڑان پرندوں کے اصُولِ پرواز اور قواعدِ حرکت پر (دیکھو فقرہ ۷) چونکہ ہمارا مضمون بہت طویل ہوگیا ہے۔ لہٰذا ہم یہاں اس کے متعلق صرف مختصر حالات اور ترقیات کا ذکر کرتے ہیں۔

جب اس ایجاد سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ تیز ہوا میں تاب لانے یا ہوا کے رُخ پر اُڑانے کے لئے پرواز کرنے والی چیز کا اس لطیف سیّال سے بھاری ہونا ضروری ہے تو ہوا سے بھاری کشتیاں یا گاڑیاں بنائی گئیں اور پرندوں کے اصُولِ پرواز اختیار کئے گئے۔ کیونکہ مشاہدہ اور تجربہ سے یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ کل پرندے چھوٹے سے چھوٹے کیڑے سے لیکر بڑے سے بڑے پرندے تک سب اپنی مساوی الحجم ہوا سے بھاری ہیں۔ سب سے پہلے لالی نتھل نے اس قسم کی ہوائی گاڑی ایجاد کرکے تیز ہوا کے رُخ پر سفر کیا۔ اس نے چند روز بعد لوگوں

کے امر اپر پھر دوبارہ پرواز کی اور کسی خلل کی وجہ سے اپنے آپ کو اس ایجاد پر قربان کردیا۔ پروفیسر لینگلی نے ایک بڑا اسٹیم انجن لگا کر ہوا سے بہت بھاری گاڑی تیار کی جس کے ہر پر کا پھیلاؤ ۱۴ فٹ تھا۔ رفتہ رفتہ اور لوگوں نے بھی کئی ایک گاڑیاں بنائیں اور اُن کے ذریعہ شوقین لوگ چھوٹے چھوٹے سفر کرنے لگے۔ ہوائی مشینیں مختلف شکل کی بنائی جاتی ہیں۔ ظاہری شکل وہیئت پر نظر کرتے۔ بعض بہیئتِ مجموعی تیتری اور بعض پرند وغیرہ اور مچھلی سے مشابہ ہوتی ہیں۔ بعض میں گاڑی کی طرح پہیئے ہوتے ہیں اور بعض میں پرندوں کی طرح پر ہیں۔ بعض میں کشتی کی طرح سکان اور بادبان لگے ہوئے ہیں۔ لیکن سب کی رُوح یا جان برقی قوت ہے۔ جس کے ذریعہ اس کے مصنوعی پر یا دُوسرے کل پُرزے حرکت کرتے ہیں اور یہ مصنوعی پرندہ اپنے سوار کو لئے اُڑا پھرتا ہے اور سوار کے اس قدر قابو میں ہے کہ پروں یا اوزاروں کی حرکت کو کم و زیادہ کر کے جدھر چاہو اس کو موڑ سکتے اور نصف میل کی بلندی سے ہر طرف چار میل کے اندر جہاں چاہو اُتر سکتے ہو۔

گدھ اور بعض شکاری پرندوں اور گرہ باز کبوتر سے قطع نظر جنکہ انہیں صرف منڈلانے کے سوا راست قطع مسافت مقصود نہیں ہوتی۔ دُوسرے پرندے اکثر اوقات چالیس پچاس فٹ بلندی پر پرواز کرتے ہیں۔ لیکن پرندہ ذرا سا جانور ہے جس کو درختوں وغیرہ سے ٹکرانے کا اندیشہ نہیں۔ اس کے برخلاف اس مصنوعی پرندے یا ہوائی گاڑی کو اس قسم کا خطرہ ہر وقت لگا ہوا ہے۔ اس لئے اِس کی پرواز اکثر ہزار دو ہزار فٹ بُلندی سے ہوتی ہے اور بوقتِ ضرورت اِس سے بھی زیادہ اُونچی اُڑ سکتی ہے۔ اور اس کی رفتار اس قدر تیز ہے کہ اس کی تیز پری کے مقابلہ میں کسی تیز پر پرندہ کو بھی شاید مشکل سے کامیابی ہو۔ چنانچہ اُمید کی جاتی ہے کہ عمدہ ہوائی گاڑی دو سو میل فی گھنٹہ جا سکیگی۔ غرض کہ اِس سے سابق اُڑنے والی کل مشینوں میں اِس وقت کی ہوائی مشینیں

ہر طرح مکمل ہیں۔ اور ان سے آئے دن سہولت و اطمینان سے بڑے بڑے سفر طے ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ حال ہی میں ایک فرنچ شخص موسیو بلریو ۲۵۔ جولائی سنہ ۱۹۰۹ء کو اپنی ہوائی مشین (مونوپلین) کے ذریعہ انگلش چینل کو عبور کرکے انگلستان پہنچا اور اس نے فاتح ہوا کا لقب حاصل کیا ہے۔ اگرچہ جو راستہ بلریو نے طے کیا ہے اُس سے تقریباً سوا سو برس قبل پروفیسر بلانشارڈ نے بھی پہلے پہل طے کیا تھا۔ لیکن اُس میں اور اِس میں بہت بڑا فرق یہ تھا کہ اُس وقت بلانشارڈ کا مرکبِ ہوائی بالکل بے قابو اور اُس کا منزلِ مقصود پر پہنچ جانا اتفاقی تھا۔ اس کے برخلاف بلیریو کا ہوائی توسن گویا سدھا سدھایا اور ہر طرح سوار کے قابو میں تھا۔

انہی دنوں اخبار "ڈیلی میل" لنڈن کی جانب سے ایک انعامی اشتہار شائع ہوا تھا کہ جو شخص ہوائی کشتی یا گاڑی کے ذریعہ ۲۴ گھنٹہ میں لندن سے مانچسٹر پہنچے۔ اُسکو دس ہزار پونڈ انعام دیا جائیگا۔ یہ انعام حاصل کرنے کے لئے بہت سے لوگوں نے کوشش کی لیکن مسٹر رائیٹ نے اپنی ہوائی گاڑی میں بیٹھکر ایک ہزار فٹ بلندی سے فی گھنٹہ چالیس میل رفتار سے نہایت کامیابی کے ساتھ منزلِ مقصود پر پہنچکر انعام حاصل کرلیا۔

حاصل یہ کہ اس وقت کی ہوائی گاڑی یا دوسری مشینوں اور اگلے زمانہ کے بیلونوں میں ٹھیک وہی نسبت ثابت ہو رہی ہے جو قدیم زمانہ کے بادبانی جہازوں اور آجکل کے نو ایجاد اسٹیمروں میں ہو سکتی ہے۔ اسی وجہ سے اب "بیلون" کا استعمال متروک ہو رہا ہے اور ہوائی گاڑیاں یا کشتیاں روز بروز اس قدر رواج پاتی جا رہی ہیں کہ امریکہ اور یورپ میں اِن کے بنانے کے کارخانے بھی جاری ہو گئے اور ہو رہے ہیں۔ اگرچہ فی الحال عمدہ ہوائی گاڑی پر تقریباً تیس ہزار روپیہ لاگت آتی ہے۔ لیکن بہت جلد اس کی قیمت اس حد تک گھٹ سکے گی جو متوسط درجہ کے لوگ بھی اس میں

بیٹھکر لطفِ پرواز اُٹھا سکینگے۔

جس طرح بیلون میں کامیابی ہوتے ہی اُس سے جنگی اغراض کے لئے کام لینے کا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اِسی طرح ہوائی کشتی یا گاڑی کی ایجاد کے ساتھ ہی اُس کو جنگی اغراض کے لئے مکمل بنانے کا خیال پیدا ہو گیا۔ بلکہ یہ کہنا بالکل صحیح ہو کہ اس مقصد میں عموماً جنگی اغراض ہی کے لئے یہ سب کوششیں ہوئیں جو بار ور ثابت ہوئی گئیں گویا یہ ایجاد محض جنگجوئی ہی کی غرض سے ہوئی ہے جس کا ثبوت اس سے ہو سکتا ہو کہ گورنمنٹ امریکہ نے یہ قانون پاس کر دیا تھا کہ ہوائی کشتی۔ گاڑی۔ بیلون یا کسی قسم کی ہوائی مشین کے ذریعہ بارود کا استعمال نہ کیا جائے اور شاید اسی قانون کی تائید میں کل دول سے باہمی معاہدہ کرنے کی درخواست کی تھی۔ مگر جرمنی۔ فرانس برطانیہ کلاں۔ جاپان وغیرہ نے اس قسم کا معاہدہ کرنے سے مخالفت ظاہر کی۔ دراصل اگر یہ قانون عام طور پر پاس ہو جاتا تو جرمنی۔ فرانس۔ انگلستان میں بہت سے لوگ جو اس ایجاد کی تکمیل اور ترقی میں ہمہ تن مصروف رہے ہیں۔ اس سے بہت کم دلچسپی لیتے اور عجب نہیں جو یہ ایجاد اب سے بہت بعد میں مکمل ہوتی۔ غرضکہ شوقین لوگوں کے شوق۔ جنگی اغراض کے حامی افراد کی سرگرمی اور سلطنتوں کی حمایت سے "ہوا میں اڑنے" کی کوششیں بہت جلد بار آور ہوئیں اور اس وقت اس حد تک ترقی کر گئی ہیں کہ آج بہت بڑی بڑی گاڑیاں اور ہوائی جہازات تیار ہو چکے ہیں جس میں کئی کئی آدمی بیٹھکر ہوائی سفر کر سکتے ہیں۔ جن میں سے بعض مشہور مشہور اور کامیاب مشینوں کا ہم یہاں مختصر ذکر کرتے ہیں۔

مسٹر لیدیم نے جو ہوائی مشین تیار کی ہے۔ یہ اکتیس فٹ لمبی اور (۷۰۰) پونڈ وزنی ہے۔ اس کے پروں کا پھیلاؤ ۴۲ فٹ ہو۔ اس میں آٹھ سلنڈر والی مشین ہو۔ جس میں سو گھوڑوں کی طاقت ہو۔ اس میں سات فٹ قطر یعنی بائیس فٹ

دور کا ایک چکر لگا ہوا ہے جو برقی قوت سے ایک منٹ میں (۱۲۰۰) مرتبہ گھومتا ہے۔

مسٹر رائٹ (امریکن) کی ہوائی مشین (۵۲۸) فٹ وسیع اور (۹۶۸) پونڈ وزنی ہے جس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہیے اور دو سکان ایک دائیں بائیں بیٹھنے کے لئے اور دوسرا اوپر نیچے چڑھنے اُترنے کے لئے لگائے گئے ہیں۔

ولاڈی پاری نامی مشین الومینیم اور لکڑی کی بنائی گئی ہے جو (۱۱۷) فٹ طویل، فٹ اونچی ہے جس میں (۲۱۱۹۲) مکعب فٹ گیس کی گنجائش اور (۰) گھوڑوں کی طاقت ہے۔

انگریزی ڈریجبل جو ہوائی جنگی جہاز ہے وہ چمڑے کا بنا ہوا ہے جس میں نیچے اوپر چمڑے کی آٹھ تہیں ہیں اور اوپر کینوس منڈھی ہوئی ہے جس میں بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی پرواز کے لئے کسی مدت کا تعین نہیں ہے جس قدر عرصہ چاہو ہوا میں اُڑ سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے فوجی مقاصد کے لئے بہت مفید مانا گیا ہے۔

لاربلیق کے ہوائی جنگی جہاز میں (۱۲۷۰۰) مکعب فٹ گیس کی گنجائش تھی۔ چار آدمی بیٹھ سکتے تھے اس میں ۸½ فٹ قطر کے دو پہیے تھے اور ۸۵ گھوڑوں کی طاقت تھی یہ جہاز ۲۵۔ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو کسی حادثہ سے تباہ ہو گیا۔

کوڈی انگلش، ایک ٹن یعنی ۲۸ من وزنی ہے جس میں دو سکان ہیں ایک آگے اور ایک پیچھے۔ یہ جہاز ۸۔ ستمبر سنہ ۱۹۰۹ء کو آلڈرشارٹ سے اُڑا اور ۶۳ منٹ میں چالیس میل طے کیا۔

فارمن (فرینچ) کا جہاز بھی نہایت مشہور ہے جس نے اگسٹ سنہ ۱۹۰۹ء میں (۱۸۰) کیلومیٹر طے کیا تھا۔ اور ۲۷۔ اپریل سنہ ۱۹۱۰ء کو لنڈن سے مانچسٹر پہنچا۔

کونٹ زپلین کا ایجاد کردہ جہاز سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے جس میں پچیس چھبیس آدمی معہ ضروری سامان رسد کے بیٹھ سکتے ہیں۔ اس کو سلطنت

جرمنی نے سات لاکھ پچاس ہزار میں مُوجد سے خرید لیا ہے۔

زپلن نے اسی نمونہ کا ایک اَور جنگی جہاز (۴۴۵) فٹ لمبا اور صرف ۴۲½ فٹ چوڑا تیار کیا ہے جسکی رفتار بہت تیز ہے۔ چنانچہ مئی سنہ ۱۹۰۹ء میں اس نے بہت بڑا طُول طویل ہَوائی سفر کیا اور چالیس گھنٹے میں نوسو چالیس (۹۴۰) میل کا چکر لگایا۔

حال ہی میں مسٹر ریمنڈ فلپس مکینکل انجینیر لورپول نے ایک ہَوائی تارپیڈو ایجاد کیا ہے جسکی نسبت انہیں یہ دعویٰ ہے کہ اس سے لندن کے کسی مقام سے سو میل کے اندر بڑے بڑے قلعے اور عمارتیں مسمار کر دے سکتے ہیں۔ چنانچہ موجد نے ۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۰ء کو لندن کے میدان میں جہاں تیس پینتیس ہزار آدمیوں کا مجمع تھا۔ اس کا اس طرح تجربہ کر دکھایا کہ مجمع کے بیچ میں ایک اُونچے مقام پر وُہ کھڑا رہا۔ روبرو میز پر ایک چھوٹی سی مشین اور اس سے پچاس فٹ کے فاصلہ پر چوبیس فٹ لمبا پانچ فٹ چوڑا ایک ہَوائی جہاز رکھا ہُوا تھا۔ جس میں تیس آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ مسٹر فلپس نے اس مشین کا ایک بٹن دبایا جس کے دبانے سے جہاز زمین سے کچھ اُونچا ہو کر اُن کے سر پر آگیا۔ دُوسرا بٹن دبانے پر وُہ بلند ہونا شروع ہُوا۔ ایک اَور بٹن دباتے ہی ہَوائی جہاز میں خودبخود روشنی ہو گئی۔ چار سو فٹ کی بلندی پر پہنچنے کے بعد مسٹر موصُوف نے ایک اَور بٹن دبایا اور فوراً کاغذ کے مصنُوعی گولے حاضرین کے سروں پر اس قدر جلد جلد گرنے شروع ہوئے کہ ۲۰ منٹ کے قلیل عرصہ میں کُل حاضرین پر گولہ باری ہو گئی۔

حاصل یہ کہ کئی اگلے زمانہ کی کامیاب تجویزیں انقلابِ زمانہ سے ملیامیٹ ہو کر دُھری اَور بہت سی تجویزوں اور تحریکات کی طرح ہَوا میں اُڑنے کی جدید تحریک بھی سینکڑوں برس کی لگاتار کوششوں سے بتدریج ترقی کرتے کرتے بڑی حد تک مکمل اور بارور ہو چکی ہے اور شوقین لوگ نہایت سہولت و کامیابی کے ساتھ بے کھٹکے میلوں ہَوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ گو مُدت کے لحاظ سے تو اس مقصد میں کامیابی

یہ نہ اس ارزاں نہیں مگر ایک اور عجیب بات سے یہ نہایت کم قیمت حاصل ہوئی ہے کیونکہ کچھ زمانہ پہلے اندازہ لگایا گیا تھا کہ "بیلون" کے تجربات میں پچیس ۲۵ آدمی سے زیادہ ہلاک نہیں ہوئے ہیں۔ اس کے مقابل قطب شمالی کی تحقیق میں ساڑھے سات سو جانیں تلف ہو چکی ہیں۔

اب وہ دن دور نہیں کہ ہوا میں اُڑنا بھی سطح آب پر تیرنے کی طرح ایک معمولی بات سمجھا جائیگا اور "ہوائی جہاز" یا گاڑیاں بھی بری و بحری ذرائع آمد و رفت "ریل" اور "جہاز" کی طرح مستقل اور عام سواری کے کام آئینگی۔ چنانچہ یورپ و امریکہ میں اس وقت "ہوا میں اُڑنا" مستقل فن تسلیم کر لیا گیا ہے جس کی باضابطہ تعلیم ہوتی ہے۔ ہوائی جہازوں اور گاڑیوں کی تجارت شروع ہو گئی ہے۔ چنانچہ حال کے اخبارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دریائی جہازوں کی مانند روس و جاپان وغیرہ نے برلن پایہ تخت جرمن کو ہوائی جہازوں کی فرمائشیں کی ہیں۔ جرمن میں سب سے پہلے ۱۹۰۷ء میں اس فن کی تعلیم کے لئے باضابطہ مدرسہ قائم کیا گیا اور دوسرے علوم و فنون کی طرح اس کے لئے نصاب تعلیم۔ مدت اور طریقۂ تعلیم وغیرہ امور بالکل باقاعدہ طور پر جاری کئے گئے۔ فرانس میں گو خاص مدرسہ قائم نہیں ہوا تھا البتہ انجمنوں ۔ کلبوں ۔ فوجی چھاونیوں میں اس فن کی باضابطہ تعلیم شروع ہو گئی تھی۔ جہاں شائقین لوگ گیس کی فراہمی ہوائی مشینوں کے کل پرزوں کی شناخت اور ساخت ۔ ان کا جوڑنا اور استعمال کرنا وغیرہ سیکھتے ہیں امتحانات پاس کر کے ہر سال اسناد حاصل کرتے رہتے ہیں اور اس کا شوق کچھ ایسا روز افزوں ترقی پذیر اور عام ہوتا جا رہا ہے کہ آئے دن ہوائی گاڑیوں کی دوڑ ہوتی ہے۔ منچلے سیاح شرط لگا کر بڑی بڑی مسافتیں طے کرنے کی جرأت کرتے ہیں۔ متعلمین تجربہ اور مہارت حاصل کرنے کی غرض سے بڑے بڑے دھاوے مارتے ہیں۔

اب تک تو ہم یورپ و امریکہ کی ہوا کھاتے رہے اب خاص ہمارے ملک میں ہمارے عنوان سے متعلق جو کارروائی ہوئی ہے۔ اس کا بھی مختصر حال ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ ہندوستان میں فوجی "بیلونوں" کے علاوہ اکثر مقامات پر تماشا کے طور پر بہت سے بیلون اُڑائے گئے ہیں۔ اور اس وقت "غبارہ" اور "غبارہ میں بیٹھ کر اُڑنے" کے نام سے اکثر لوگوں کے کان آشنا ہو گئے ہیں۔ تخمیناً پچاس سال قبل "بیلون" کا پتہ یہاں نہیں چلتا۔ پہلے پہل سنہ ۱۸۶۷ء میں ایک انگریز نے بمقام بمبئی بیلون میں بیٹھ کر اور اہلِ ہند کو بغیر پر کے ہوا میں اُڑنے کا تماشہ دکھا کر محوِ حیرت بنا دیا تھا۔ اِتفاق سے یہ "بیلون" تقریباً چھ ہزار فٹ بلند ہو کر یکایک پھٹ گیا اور "بیلون سوار" سمندر میں گر پڑا۔ احتیاطاً پہلے سے سمندر میں کشتیاں۔ جہازات پھیلا دیئے گئے تھے جن کی وجہ سے وُہ غرق ہونے سے بچ گیا۔

سنہ ۱۸۸۹ء میں ایک بنگالی نوجوان رام چندر چیٹرجی نے اوّل کلکتہ اور بعد لاہور۔ الہ آباد وغیرہ مقامات پر "بیلون" کے ذریعہ بلند پرواز کی۔ غالباً یہی سب سے پہلا ہندوستانی ہے جس نے اپنے اہلِ ملک کے لئے نظیر قائم کر دی۔ اور انہیں اس قسم کی جُرأت دکھانے کا سبق دیا۔ اس کے بعد سے تو ہندوستان کے اور مشہور مقامات پر ہوا میں اُڑنے کا نظارہ بیسیوں مرتبہ دیکھا گیا ہوگا۔

خاص حیدرآباد دکن میں تو اس کا وجود سنہ ۱۲۹۸ھ یا سنہ ۱۲۹۹ھ سے پایا جاتا ہے کیونکہ سب سے پہلے اسی سال میں سالار جنگ اوّل کے عہد میں باغ عام سے ایک "بیلون" اُڑایا گیا تھا۔ یہ "بیلون" ڈیڑھ میل کے فاصلہ پر راز دار خاں کی پہاڑی[1] پر گرا اور شوقین تماشائیوں نے اطراف و جوانب سے دوڑ دوڑ کر اُس کو جا گھیرا اور غل کرنے

[1] بلدہ حیدرآباد سے قریب شمالی مغربی گوشہ میں ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے چونکہ یہ جس گاؤں کے حدود میں واقع ہے وہ گاؤں کسی زمانہ میں راز دار خان مہدی المخاطب بہ قزل نواز خاں کو سرکار نظام سے جاگیر میں دیا گیا تھا۔ اس لئے یہ پہاڑی اس وقت سے انہی کے نام سے مشہور ہے ۱۲

اپنی بندوقوں سے بیلون کو چاند ماری کا ٹارگٹ بنا دیا۔ خیر گزری کہ بیلون خالی تھا اور کوئی اس میں سوار نہ تھا۔

اس کے دوسرے تیسرے سال اسی مقام سے دو یورپین بیلون میں بیٹھکر اُڑے اور شہر سے مشرقی جانب چار میل کے فاصلہ پر سرور نگر کے قریب صحیح سالم اُترے۔ اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں ایک اطالین لیڈی مس وانشل بیلون میں پانچ ہزار فٹ بلند اُڑ کر چھتری (پیراشوٹ) کے ذریعہ نیچے اتر آئی۔ اسی کے دو چار روز بعد پھر دوبارہ اُڑی اور پہلے سے زیادہ بلندی پر پہنچکر شہر سے مغربی و شمالی جانب چھ میل پر اُتری۔ اس کے بعد بھی دو ایک مرتبہ حیدر آباد میں ہوا میں اُڑنے کا نظارہ دیکھا گیا ہے۔ مگر افسوس کہ اس وقت صرف حیدر آباد ہی نہیں۔ بلکہ کل ہندوستان میں ان کارگذاریوں کا قریباً کل حصہ یورپینوں ہی کے ہاتھ رہا بعض فوجی سپاہیوں کے علاوہ اہل ملک سے شاذ و نادر ہی کسی شخص نے اس قسم کی بلند پروازی کی جرأت کی ہے۔

۱۹۰۷ء میں ہز مجسٹی سراج الملۃ والدین امیر کابل نے سیاحت ہند کے وقت ایک مقام پر بنفس نفیس ایک فوجی بیلون میں بیٹھنے کی جرأت دکھائی۔ چونکہ بیلون میں اُڑنے کے لئے مہارت ضروری ہے اور غیر عادی شخص نہیں اُڑ سکتا لہٰذا تھوڑی بلندی پر پہنچنے کے بعد بیلون اُتار لیا گیا۔

کچھ عرصہ ہوا کہ ایک پنجابی شخص نے بمقام کلکتہ اپنے بنائے ہوئے بیلون میں ہوا میں اُڑنے کا کرتب دکھایا۔ عجب نہیں جو یہی سب سے پہلا بیلون ہو جو ہندوستانیوں کے ہاتھوں تیار ہوا ہو۔ کس قدر تعجب اور افسوس کی بات ہو کہ اہل یورپ نے تو اس مقصد میں اسقدر عروج حاصل کر لیا ہے کہ آسمان کے تارے بن رہے ہیں اور ہم نے اب کہیں اس کی ابجد خوانی شروع کی ہو۔ خدا کرے کہ ہمارے اہل ملک بھی اس مقصد میں کافی توجہ کے ساتھ کامیابی حاصل کر کے اپنے ملک کے قدیم اُڑن کھٹولوں کو صحیح ثابت کر دکھائیں۔

سید شہاب الدین مہدی (از حیدرآباد)

ہندو مسلمانوں کے تعلقات

(گذشتہ اشاعت سے آگے)

سلطنت کا انقلاب - اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ پہلے ہندوستان میں مسلمان حاکمانہ حیثیت رکھتے تھے - اور اگرچہ یہ ظاہر ہے کہ کسی وقت کسی ایک حکمران کے ہاتھ سے کسی خاص شخص یا اشخاص پر ظلم ہو جانا ممکن ہے اور ایسا کبھی خود اپنی قوم کی حکومت میں بھی ہو جاتا ہے مگر بحالت مجموعی مسلمان حاکموں کا برتاؤ ملک کی ہندو جماعت کے ساتھ مشفقانہ اور محبت آمیز تھا اور ان فسانوں میں اکثر مبالغہ ہے جو عام طور پر مسلمانوں کے ظلم کی نسبت زبان زد ہیں لیکن پھر بھی حاکم و محکوم کا تفاوت بہت بڑا تفاوت ہے - اب زمانہ نسبتاً بہت ترقی کر گیا ہے اور حاکم و محکوم کے فرائض زیادہ واضح اور مشتہر ہو گئے ہیں اور انگریز حکام رعایا سے بیجا تواضع کے آرزومند نہیں ہیں - مگر آج بھی انگریز قوم کا ایک ادنیٰ سپاہی دیسی حکام، معززین اور نیز تعلیم یافتہ طبقہ کے سامنے ایک خاص رعب داب رکھتا ہے اور خواہ دیسی رتبہ میں اس سے بہت اعلیٰ ہو - مگر صاحب لوگ بوجہ حکمران قوم میں ہونے کے ضرور زیادہ التفات حاصل کرتے ہیں - یہ فاتحیت و مفتوحیت کا قدرتی اثر ہے اور یہی ڈھلتی چھاؤں کبھی قدیم ہندیوں کے مقابلہ میں آریاؤں پر اور آریاؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں پر سایہ ڈال چکی ہے اور اسوقت اسی طرح مسلمان کا مسلمان ہونا ہندو جنٹلمین کی نظر میں اس کو اپنے سے کسی قدر زیادہ معزز بناتا تھا اور نیز ساتھ ہی یہ احساس بھی ضرور ہوتا ہوگا کہ جو اعزاز آج انکو حاصل ہے کبھی ہمیں حاصل تھا - اس کے بعد زمانے نے پلٹا کھایا اور

فاتحین فاتح بننے کی قوت کھو بیٹھے۔ زمانے کو نہ کسی سے خاص عناد ہے اور نہ کسی کی خاص رعایت۔ فاتحین عزت کے منصب سے معزول ہُوئے اور جنہیں استحقاق ثابت ہُوا خالی اسامیوں پر لائے گئے۔ اس وقت ہندوؤں کو ضرور خیال آنا چاہیئے تھا اور آیا ہوگا کہ جو لوگ ہمارا تخت چھین کر ہم ہی سے بڑھ بڑھ کر چلتے تھے۔ آج وُہ بھی پیچھے ہوکر ہمارے برابر آ گئے اور پہلے جو حکومت کی وجہ سے اُن کی ہر ادا ہم سے بہتر نظر آتی تھی۔ اب وقت ہے کہ ہم سب باتوں میں اُن سے بہتر اور برتر ہوکر دکھائیں۔ کیونکہ پہلے اُن کا پاس کرنا پڑتا تھا اور اب برابر کی دوڑ ہے۔ غرض پہلے اگرچہ میرے عقیدہ میں ہندو مسلمانوں کے اندر کوئی قومی عناد نہیں تھا اور نہ ہندوؤں کو مسلمانوں کی حکومت سے کوئی وجہ شکایت موجود تھی۔ مگر پہلے فاتح اور مفتوح کی نسبت موجود ہونے اور پھر اُس کے جاتے رہنے پر اس احساس کا پیدا ہونا قدرتی امر تھا چنانچہ ہُوا اور ہندوؤں نے اپنی قوم کو مسلمانوں سے بڑھانے اور بڑھا ہُوا ثابت کرنے کے لئے حسب ضرورت قابلیتوں کو حاصل کرنے اور اپنی فطری قابلیتوں کو دکھانے اور اپنے اطوار و عادات کو زمانے کے مناسب بنانے کی اور اپنی قوم کو اس کام کے لئے اُکسانے اور بڑھانے کی کوششیں شروع کیں اور اسوقت ضرور تھا کہ وُہ مسلمانوں کی نسبت اپنی قوم سے زیادہ ہمدردی کرنے اور جس مفاد تک دونوں پہنچ سکتے ہوں جھپٹ کر پہلے اپنے ہمقوم کو اُس تک پہنچاتے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایسا کیا کہ اور یُوں بے اختیار وُہ قومی خود غرضی پیدا ہوگئی جو آج عداوت کا تناور درخت بن رہی ہے۔ لیکن اگر صرف یہی احساس ہوتا اور دیگر واقعات جو آیندہ پیش آئے نہ پیش آتے تو چونکہ کوئی عناد نہ تھا اور اُدھر مسلمان تازہ صدمہ اُٹھا کر ایسے مضمحل ہو رہے تھے کہ انہیں برسوں تک زمانے کی رفتار پر چلنے

کا خیال نہیں آیا۔ چہ جائیکہ ہندوؤں سے بڑھنے کی کوشش کرتے۔ اس لئے ممکن تھا کہ کچھ عرصے کے بعد مسلمانوں کی فوقیت کی یاد اور اُس کی تلافی کی تحریک باقی نہ رہتی اور دو ملکی بھائیوں کے ایک حالت میں ہونے سے ایک کو دوسرے سے ہمدردی ہو جاتی مگر ہندوستان کے نئے دور نے دوسرا سبب پیدا کر دیا جو اب تک قائم ہے۔

عقیدہ قومیت۔ دوسرا سبب یہ ہوا کہ انگریز ہندوستان میں ایسے وقت آئے کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کو جس درجہ تک ہندوؤں نے اپنے زمانے میں اور مسلمانوں نے اپنے زمانے میں پہنچایا تھا اس وقت دونوں اپنے اس سرمایہ کو کھو بیٹھے تھے اور ہندوستان جہاں اور وحشت کا شکار ہو رہا تھا اُدھر انگریز آئے تو اس شان سے آئے کہ اُنکے فنونِ جنگ۔ اُنکی حکمتِ عملی۔ اُن کا آئینِ ملکداری۔ اُن کی صنعتیں اور اُنکے علوم۔ غرض ہر ادا سے ہندوستانی حیران رہ گئے۔ کیونکہ سب باتیں اُن کی سمجھ میں فوق العادت تھیں اور وہ خیال بھی نہیں کر سکتے تھے کہ یہ کمالات پیدا ہو سکتے ہیں۔ کبھی کہتے تھے کہ یہ کوئی بلا ہیں اور کبھی تعریف کرتے تھے کہ آدمیت ہر تو انھی میں ہے۔ اس حیرت و استعجاب نے دل میں تجسس پیدا کیا اور انگریزوں کے ایسے کمالات اور ایسی کامیابی و اقبالمندی کی وجہ تلاش کرنے لگے۔ مگر آہ۔ جہالت بُری چیز ہے۔ دماغ کام نہیں دیتا اور بالخصوص قومی جہالت انسان کو صدیوں تک برباد رکھتی ہے۔ اور دو چار دس روشنی میں آئیں بھی تو اُنکے دماغ ایسے سلیم نہیں ہو سکتے جس قدر کسی ترقی یافتہ قوم اور اُس کے علما کے ہونے چاہئیں چنانچہ انگریزوں کی نسبت بہت سے استدلال قائم ہوئے اور اکثر میں دھوکا کھایا۔ سمجھا گیا کہ اُنکے علوم و فنون حاصل کرنے چاہئیں اور درست سمجھا۔ مگر غلطی

یہ بھولی کہ صرف انگریزی زبان سیکھ کر اسی کو قابلیت کا معراج گردان لیا گیا اور زبان میں جس قدر علوم تھے اُن کی طرف توجہ نہ کرنے کے باوجود اپنے تئیں عالم باکمال سمجھنے لگے۔ سمجھا گیا کہ اُنکے اطوار قابلِ تعریف ہیں اور حاصل کرنے چاہئیں اور بجا سمجھا۔ مگر نادانی سے اطوار میں سے نشست و برخاست اور لباس اور مکان میں اُنکی نقل کرنے کو کافی سمجھا گیا اور انگریزوں کی شکل بنا کر سمجھ لیا کہ اُن کے کمالات قبضہ میں آگئے۔ سمجھا گیا کہ پابندیٔ اوقات انہی لوگوں کی ترقی کا گُر ہے اور واقع میں ہے۔ مگر قباحت یہ ہوئی کہ حاضری اور ڈنر کا وقت اور فٹ بال اور ٹینس کا وقت چھوٹنے نہ پاتے۔ پابندیٔ اوقات کا یہی مقصود گردان لیا گیا۔ غرض جہالت وُہ باعث تھا جس نے انگریزوں کی فوقیت ثابت ہونے کے بعد فوقیت تک پہنچنے کا صحیح رستہ دیکھنے نہ دیا اور پکی سڑک چھوڑ کر اِدھر اُدھر کی پگ ڈنڈیوں کی خاک اُڑانے لگے۔ اِسی جہالت میں جب دیکھا کہ پچھلے بادشاہوں کے زمانے میں دیسیوں کو صوبوں کا حاکم بنا دیتے تھے اور وُہ بھی اس شان سے کہ خزانہ بھی اسی کے پاس ہے اور فوج کا سپہ سالار بھی وُہی ہے اور عدالتی اختیارات بھی اسی کو حاصل ہیں۔ اور اب صوبوں کے پرانے حکمران یکے بعد دیگرے موقوف ہوتے جاتے ہیں اور نہ صرف وُہ بلکہ قسمتوں کے کمشنر اور ضلعوں کے کلکٹر بھی دیسی نہیں بنائے جاتے اور ہر اسامی پر ولایت سے عہدہ دار بلایا جاتا ہے اور اس کے علاوہ انتظامی عدالتی اور فوجی تمام کاروبار میں مشورہ صرف اپنے ہمقوموں سے لیا جاتا ہے تو اس وقت ملک والے یہ کہاں سمجھ سکتے تھے کہ انکے اصُولِ ملکداری ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں۔ اِس لئے حکومت اور مشورہ کے لائق نہیں ہو سکتے۔ خیال یہ کیا گیا کہ ان لوگوں کی قومی ہمدردی ہے جس سے اپنی قوم کے سوا غیروں کو فائدہ نہیں پہنچاتے۔ بلکہ اوروں کے حقوق بھی اپنوں ہی کو دیتے ہیں اور فوقیت حاصل کرنی ہو تو یہی وصف پیدا کرنا چاہئے۔

ہمدردی کے غلط معنی۔ اسوقت اس امر پر غور کرنے کی ضرورت نہیں کہ انگریزوں میں قومی ہمدردی ہے یا نہیں اور ہے تو کس حد تک۔ ہمارے ملک میں جو علت و معلول کا سلسلہ کام کر رہا ہے اُس میں اپنی عقلی رفتار کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے اُنکے افعال سے اُنکی اخلاقی حالت کو جانچا اور سمجھے کہ قومی ہمدردی ہی وُہ ہول ہے جس نے سات سمندر پار ہندوستان جیسے برّاعظم کو اُنکے پاؤں میں ڈالدیا۔ چنانچہ اس وقت ہندو مُسلمان دونوں قوموں کے ذرا سمجھ دار افراد میں قومی احساس پیدا ہوا اور چونکہ دماغ سلیم نہیں تھا قومی ہمدردی کے معنے یہ لیئے گئے کہ جہانتک ہو سکے اپنوں کو بڑھاؤ اور غیروں کو پامال کرو۔ چنانچہ کوئی عدالت کی کُرسی پر ہے تو سمجھتا ہے کہ اہل مقدمات میں گو ہمقوم کا حق نہ ہو جب بھی ڈگری دیجائے اور غیر اس کے حق سے محروم کر دیا جائے تو قوم پروری کا اعلیٰ کارنامہ ہوگا۔ اور کوئی انتظامی اختیارات رکھتا ہے تو غیر قوم کے مُلازموں کو برطرف کرنے اور ہمقوم کو ملازم رکھنے کی تدبیر کرنی کار ثواب جانتا ہے اور دل میں مسرت محسوس کرتا ہے۔ ممتحن ہے تو غیروں کے نمبر کاٹنے اور اپنوں کو غلط لکھنے پر پاس کرنیکو ہمدردی جانتا ہے۔ اور اہل الرائے ہی تو فساد اور بلوؤں کے وقت مظلوموں کو غیر ہونے کے جُرم پر سزا دلوانے اور ظالموں کو اپنا جان کر بری کروانے کی تدبیریں سوچتا ہے اور اسی کو نجات سمجھتا ہے۔ غرض ہمدردی کا یہ اصُول قرار پایا اور کچھ تو ایک طرف چل پڑنے سے رفتار خود بخود تیز ہو جاتی ہے اور رستہ زیادہ سے زیادہ روشن دکھائی دینے لگتا ہے اور کچھ دونوں فرقوں کے ایسے سلوک سے باہم گر شکایت پیدا ہونے اور ظاہر کیجانے لگی۔ جس سے عداوت کا رنگ آگیا۔ اور اب وُہ زمانہ آیا کہ اس غلط ہمدردی نے دُوسروں کے افعال پر گرفت کرنے اور اپنے افعال سے نقصان پہنچانے کے آگے ترقی کی اور شکایتوں سے

رنجش پیدا ہونے کے باعث افعال سے بڑھکر نیتوں پر حملہ کیا جانے لگا اور مسلمان گائے ذبح کرتا ہے تو اس کو مذہبی حکم سمجھنے کی بجائے فریاد ہونے لگی۔ کہ ہم کو ستانے کے لئے ایسا ہوتا ہے۔ اور ہندو چھوت کا خیال کرتا ہے تو اس کا قدیمی طریق سمجھنے کی بجائے کہنے لگے کہ ہم کو ذلیل جانکر نفرت کیجاتی ہے۔ اور اس طرح سے جو ناجائز طرفداریاں کیجاتی تھیں انکو بجا ثابت کرنے کے لئے اور دوسروں کو بدنیت اور فسادی اور ہمدردی کے ناقابل ٹھہرانے کے لئے ان شکایتوں کو معقول عذر قرار دیا گیا۔ مگر قاعدہ ہے کہ سزا دینی یا بدلہ لینا عداوت کو بھڑکاتا ہے اس لئے ان شکایتوں سے دل اور پچھلے اور اب موجودہ ہم وطنوں کو بدنیت اور شریر کہتے کہتے اُنکے بزرگوں کو ملزم ٹھہرانے اور ہمیشہ سے ظالم اور سفاک ثابت کرنے کی کوشش ہونے لگی۔ اور ایسی کوشش نے پرانے بادشاہوں اور انسے بڑھ کر مذہبی پیشواؤں کی نسبت وُہ وُہ اتہام اور بے ادبیاں صادر کرائیں جنکو سنکر رونگٹے کھڑے ہوں اور خون میں جوش آئے اور فتنہ و فساد کی وُہ آگ بھڑکی کہ اب ایک فریق دوسرے کی تقریر نہیں سُن سکتا۔ اور تحریر اور اخبار اور رسالہ غصہ سے کانپ اُٹھنے کے بغیر نہیں دیکھ سکتا۔ اور لُطف یہ کہ ابتک اِن سب بیہودیوں کو قومی ہمدردی کے روغن نے چھپایا ہُوا ہے اور قوم پر جان دینے والے اِن ظلموں کے ارتکاب سے وُہ فرض اتم ادا کرتے ہیں جس سے بڑھکر دُنیا میں کوئی نیکی نہیں اور جب تک یہ حالت قائم ہے اور جب تک ہمدردی کے مفہوم کا اس طرح پر خون ہوتا رہیگا۔ ہندو مسلمانوں کی عداوت روز افزوں ترقی کریگی اور زوال کا مُنہ نہ دیکھےگی۔

میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمدردی کو خواہ غلط سمجھا گیا مگر اس طرح کے استدلال کے لئے بھی کچھ نہ کچھ ہوش اور زمانے کی حالت کو دیکھنے کی قوت درکار تھی اور

چونکہ ہندو پہلے بیدار ہوئے ہیں اور مسلمان بہت دیر تک مئے شبینہ کے خمار میں مبتلا رہے اس لئے ہمدردی کا احساس اور اس کے لئے ایسی رفتار پہلے ہندو بھائیوں نے اختیار کی - مگر خیر یہ میرا اپنا خیال ہے اور ممکن ہے کہ غلط ہو لیکن اس میں شک نہیں کہ موجودہ عداوت کا سُراغ ملنا اسی تقلید کی خواہش میں ہے جو انگریزوں کے آنے پر کسی قوم میں زیادہ اور کسی میں کم پیدا ہوئی - اور جس طرح انگریزوں کے اکثر حالات کو ہم نے غلط سمجھا - اسی طرح ہمدردی کے سمجھنے میں یہ غلطی کی اور یہ غلطی بڑھ کر عداوت تک پہنچی - اس لئے اب اگر ہندو مسلمان دونوں عداوت کے نقصان کو سمجھ گئے ہوں اور اس کو دُور کرنا چاہتے ہوں تو ضرور ہے کہ جو افعال وُہ قومی ہمدردی کے خیال سے کرتے ہیں اُن پر نظرِ ثانی کریں اور دیکھیں کہ ہمدردی اور انصاف کہاں تک برابر رکھا جا سکتا ہے اور کہاں تک اور کیا نقائص ہیں جن سے ہمدردی طلسم بنجاتی ہے -

ہمدردی کی حقیقت - کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ اپنوں کے ہونے کا فائدہ ہی کیا جب بُرے وقت میں اور مصیبت پڑنے پر کام نہ آئیں - مگر آہ! انسان بہت دھوکہ باز مخلوق ہے اور دُوسروں کو دھوکا دینا ایک طرف کبھی اپنے آپ کو بھی دھوکا دے لیتا ہے - فقیر صدا کرتا ہے "مجھے پیسہ دینے والے تیری آئی بلا دُور" - اور اکثر نادان محض اسی خیال سے دینے میں جلدی کرتے ہیں کہ فقیر کا لب شیر کا بن ہے - کیا معلوم کوئی بلا آنے کو ہو جسے دیکھکر یہ پکار رہا ہے" اور اگر اتفاق سے رات کو چور آئے اور خبر ہو جانے پر بھاگ نکلے - یا آگ لگ جائے اور جلدی سے فرو کر دیں تو پھر شاہ جی پر لوگوں کو اعتقاد ہونا ہی تھا خود شاہ صاحب کو بھی یقین ہو جاتا ہے کہ "جو بات ہمارے مُنہ سے نکلے خدا پوری کر دیتا ہے" - اسی طرح قومی راگ گانے والے یہاں بھی قصور اور شرارت کرنے کے بعد ایسے نعرے کہتے

ہیں شہرت سے اور دوسروں کو اُلّو بنانے کے لئے - مگر جادو کا رگر ضرور ہو جاتا ہے
اور نہ صرف سُننے والوں کا دل پسیجتا ہے - بلکہ کہنے والے بھی ایسا کرنے والوں
کو ایشور کا اوتار اور ولی سمجھنے لگتے ہیں اور اس طرح پر یہ عقیدہ عام ہو گیا ہے کہ
کسی پر چھُری پھیر کر آئے یا مال مار کر لائے - اپنوں کا فرض ہے کہ اپنے کو بچائیں اور
اُسکو کنوئیں میں سے نکالنے کے لئے مضائقہ نہیں - اگر غیر کو دھکا دیکر پھینکدیں
اور اس کی پُشت پر سے رستہ بنائیں - گو ایک وقت پر کسی عقیدے کا عام ہو جانا
اُونہ بات ہے لیکن واقعیت کو بدل نہیں سکتا اور غور کرنے والے دیکھ سکتے ہیں
کہ ہمدردی کے معنی کسی کی تکلیف کے وقت میں اعانت کرنا ہے اور اعانت
اسی طرح ہو سکتی ہے کہ جو کام وہ نہیں کر سکتا اور جو وسائل اس کو حاصل نہیں انکے
لئے خود کوشش کریں اور جو شخص اس غرض سے مالی یا بدنی تکلیف اُٹھاتا ہے وُہ
ہمدرد ہے - اب اگر ایسی تکلیف کسی شخص نے کسی انسان کے لئے محض اس کو
انسان سمجھکر اُٹھائی ہے تو وُہ انسانی ہمدرد ہے اور اگر کسی کے لئے اپنا ہمقوم
سمجھکر اُٹھائی ہے تو قومی ہمدرد ہوگا اور بیشک جس طرح انسانی ہمدردی ایک
وصف ہے قومی ہمدردی بھی وصف کہلانے کی مستحق ہے - لیکن یہ نہ ہو کہ
کسی کے لئے تکلیف پہنچے ایک شخص کو - اور اس کا اعزاز دیا جائے دُوسرے
شخص کو جس نے تکلیف نہیں اُٹھائی - اور اسی طرح یہ سمجھنا بھی مشکل نہیں کہ کسی کو
ضرورت ہے کھانے کی اور ہم اپنے پاس سے دینے کی بجائے اُس کے کپڑے
بیچ کر کھانے کا سرانجام کردیں یا اُس کی کمر پر گوشت خورہ دنبل ہے اور ہم مرہم کی
کا قیمہ بھرنے کی بجائے اس کی اپنی ران کا گوشت کاٹ کر زخم کو بھردیں تو ہمدردی
نہ ہوگی اور اگر بالکل آنکھیں بند کرلیں تو اس قدر کہہ سکتے ہیں کہ کھانے کا سرانجام
کرنے اور گوشت خورہ کو بھرنے میں ہمدردی کی گنہگار کردینے اور ران کو چیر

ذات سے دوسری ضرورت اور دوسرے عضو کے بارہ میں ظلم کیا۔ اور اسی طرح یہ بھی ہمدردی نہیں کہ ایک بھوکے کو کھانا کھلانے کے لئے ایک اور کی جیب کتر لی یا مادہ فاسد کو نکالنے کے لئے کسی عضو کو چیرنا یا کاٹ ڈالنا ضرور ہے اور بیمار اذیت سے گھبراتا ہے تو محبت کے جوش میں اپریشن سے باز رہنا ہمدردی نہیں بلکہ ظلم ہوگا اور نیز جو دیوانہ کپڑے پہن کر آگ لگا لیگا اور کپڑے فنا کرنے کے ساتھ اپنے جسم کو بھی نقصان پہنچائے گا۔ اس کو لباس پہنانا ظلم ہے اور ہمدردی کا مستحق وہ ننگا ہے جو کپڑوں کی حقیقت کو سمجھتا ہے اور اپنے تئیں سردی گرمی سے بچانے کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ان مثالوں کو دیکھنے کے بعد بالکل یہی منظر پیش آتا ہے۔ اگر ملک یا کم از کم اپنی قوم کو ایک شخص فرض کیا جائے مثلاً

(۱) **مقدمات**۔ اگر عدالت میں ایک شخص نے ناحق یا اپنے حق سے زائد دعویٰ دائر کیا ہے اور وہ شخص حاکم عدالت کا ہمقوم ہے اور مدعا علیہ غیر ہے اور اس لئے حاکم اس کی رعایت کرتا ہے۔ فریق ثانی پر سوال اس طرز سے کئے جاتے ہیں کہ اظہار سے خود بخود مدعی کے بیان کو تقویت پہنچے۔ مدعی کی شہادت پر مناسب جرح کرنے سے روکدیا جاتا ہے اس کی دستاویزوں سے ڈھونڈھ کر وہ موقعے نمایاں کئے جاتے ہیں جو اُسے مفید ہوں اور یوں روئداد کو پختہ کیا جاتا ہے۔ تاکہ فیصلہ اس کے حق میں ہوسکے یا کبھی بغیر ایسی حکمتوں کے سینہ زوری سے روئداد کے خلاف محض ہمدردی کے خیال سے ڈگری دیجاتی ہے تو اس صورت میں فریق ثانی پر ظلم ہونے اور اس سے اس کا حق چھیننے کے علاوہ خود اپنے ہمقوم کو حق کے خلاف کوشش کرنے کی جرأت دلائی جاتی ہے اور بھیڑیئے کو انسان کا خون چٹانے کے بعد خود اس کے پالنے والے بھی محفوظ نہیں رہ سکتے اسی طرح خلافِ واقعہ فریاد اور ناجائز کوشش کی عادت ڈال کر خود اپنی قوم کے لئے ایک خوفناک

دشمن پیدا کیا جاتا ہے اور سوسائٹی کے ایک رکن سے ہمدردی کرتے ہوئے ایک ملکی بھائی پر
ظلم کرنے کے ساتھ خود اپنی قوم کو نقصان پہنچانے کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور ایک
جیب کترا کر دوسرے بھوکے کو کھانا دینے سے آئندہ اور جیبیں کتروانے کا سامان
کیا جاتا ہے اور چونکہ ایسا فعل ہمدردی نہیں اس لئے مقدمات میں جج کے فرائض
سے زیادہ رعایت بھی ہمدردی میں داخل نہیں اور ایسے لوگوں کو موجد ظلم کہنے کے
بجائے خیر خواہ قوم سمجھنا غلطی کے سوا کچھ نہیں۔

(۲) امتحان ۔ اگر ممتحن اپنے ہمقوم امیدواروں کے جوابوں پر نمبر دینا ہے جو غلط ہیں
یا ایسے جوابوں پر پورے نمبر دیتا ہے جنہیں غلطی ہے تو چونکہ یونیورسٹی نے اسکو ممتحن قرار
دیا ہے اس لئے کہ وہ امیدواروں کی واقعی قابلیت سے اطلاع دے اور یونیورسٹی
کو امیدواروں کے واقعی قابلیت معلوم کرنے کی ضرورت ہے اس لئے کہ جو قابل ثابت
ہوں انکی شہادت دے اور سرکار یا پبلک اس شہادت کے مطابق قابل آدمیوں سے
ملکی خدمات میں وہ کام لے جسکے وہ اہل ہیں اور یوں ملک اور اہل ملک کی خوشحالی کو
ترقی ہو ورنہ نالائقوں کے ہاتھ میں کام دیا جائیگا تو عمدگی سے سرانجام نہ ہوگا اور
گورنمنٹ اور ملک کی تمام قوموں کو اس سے نقصان پہنچیگا۔ اس لئے جو ممتحن ہمقوم کی
قابلیت کو اصل حالت سے بہتر ظاہر کرتا ہے وہ دھوکا دیتا ہے اور نہ صرف یونیورسٹی
کے کام کی خوبی کو زائل کرتا ہے بلکہ سرکار کو اور پبلک کو نقصان پہنچاتا ہے اور
پبلک میں خود اس کی قوم بھی شامل ہے۔ اس لئے وہ ایک دیگ میں قیمہ بھرنے کے
لئے تمام جانداروں کا گوشت چھیلنے کے علاوہ خود اپنی قوم کے تمام جسم میں گھاؤ
ڈالنے کی تدبیر کرتا ہے اور ایسا شخص نہ صرف ہمدردی کے وصف سے عاری ہے
بلکہ انسانیت اور عقل کا معمولی وصف بھی اُسکے اندر پایا نہیں جاتا۔ اور اگر
کوئی شخص اپنے ہمقوموں کو اس طرح کی امداد دینے کے ساتھ غیر قوم کے لائق

اُمیدواروں کے نمبر کم کرنے یا انہیں ناکام رکھنے کی کوشش کرتا ہے تا جو خدمات اُنکو مل سکتی ہوں وُہ اُس کے ہم قوموں کو ملیں تو کاروبار پر نالائقوں کو قابض کرنے کے علاوہ قابلوں کو کام سے اور کام کو قابلوں سے محروم رکھنے کا مرتکب ہوتا ہے اور ایک فعل سے نقصان پہنچا کر دوسرے فعل سے اہل لیاقت پر اور مُلک پر ظلم کرتا ہے اور خود کوئی تکلیف برداشت کرنے کے بغیر ہمدردی کا اعزاز حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اُس تکلیف اور مصیبت سے جو اس کے ہاتھوں بہت سے بندگانِ خدا کو پہنچی۔

(۳) نالائقوں کو ملازمت دینا۔ اگر کوئی با اختیار اپنے صیغہ میں قومیت کے خیال سے بھرتی کرتا ہے ایسے لوگوں کی جو اس کام کی قابلیت نہیں رکھتے تو اس نقصان کے ساتھ جو وُہ اپنے مُلک اور گورنمنٹ کو پہنچاتا ہے اور اُس ظلم کے ساتھ جو وُہ قابل آدمیوں پر نازل کرنے کا مرتکب ہوتا ہے حقیقت میں اُس شخص پر بھی ظلم کرتا ہے جسکی ہمدردی ظاہر کیجاتی ہے۔ کیونکہ نالائق اپنے فرائض کو نہ سمجھنے کے سبب ایسی غلطیوں کا نشانہ بن سکتا ہے جن سے خود اسکو نقصان پہنچے۔ اور نیز اگر اسکو کام کرنے کی جرأت نہ دلائی جائے تو بعض اوقات وُہ خود بھی لائق بننے کی کوشش کرتا ہے اور وُہ نہیں تو اس کی نظیر کو دیکھکر اور نالائق اپنے تئیں لائق بنانے کی کوشش کرینگے اور اکثر کامیاب ہو سکینگے لیکن نالائقوں سے ہمدردی کرنے کی رسم انکو نالائق رہنے اور مُلک کو ترقی اور کمال سے محروم رکھنے کی ترغیب دیتی ہے اور خود انہی کے ہاتھوں انکو بہت سے نقصان پہنچانے کا باعث ہوتی ہے۔ پس یہ ہمدردی حقیقت میں اُس شخص کی سی ہمدردی ہے جو دیوانہ کو کپڑے پہناتا ہے اور دیوانہ کپڑوں کو آگ لگا کر اپنے تئیں بھی تلف کر دیتا ہے اور اس لئے ایسا ہمدرد خود دیوانہ کہلانے کا مستحق ہے۔

(۴) **غیر مستحق کو ملازمت دینا** - اگر نوکری ایسے شخصوں کو دیجاتی ہے جو قوم کے لائق افراد تو ہیں مگر اُس صیغہ سے تعلق نہیں رکھتے یا اس کام کے اُمیدواروں میں جونیئر ہیں اور غیر قوم کے سینئر امیدوار بھی قابلیت رکھتے ہیں تو بیشک ایسے حاکم نے کام کو قابل ہاتھوں میں دیا اور اس لحاظ سے مُلک اور گورنمنٹ کا کوئی قصور نہیں کیا۔ لیکن جو شخص کسی کام کے لئے تگ و دو اور کوشش کرتا ہے قدرت کا قانون ہے کہ وُہ کامیاب ہو اور اسی قانون کا علم ہے جس سے ہر طرح کے علمی اخلاقی اور رُوحانی کمالات حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ اگر معلوم ہو کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہوگا تو کوئی شخص کوشش کی طرف قدم نہ اُٹھائیگا اور ظاہر ہے کہ سر رشتوں میں اُمیدوار رہنا اور مفت کام کرتے رہنے سے ایک وقت پر معاوضہ پانے کی اُمید رکھنی یہ بھی ایک کوشش ہے بلکہ یہی کوشش ہے جس سے عام طور پر کام ملا کرتا ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے لیکن جو حکّام کوشش کرنے والوں کو مایوس کر کے ایسے شخصوں کو کامیاب کرتے ہیں جنہوں نے کوشش نہیں کی وُہ اپنے طرزِ عمل سے سکھانا چاہتے ہیں۔ کہ کوشش پر نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اور اُس جذبہ کو نابود کرنا چاہتے ہیں جس سے دُنیا کی تمام ترقیاں وابستہ ہیں۔ اور اس طرح پر اگر وُہ علمی لیاقت بڑھانے کی ترغیب دیتے ہیں تو عملی قابلیت اور مقاصد تک پہنچنے کے صحیح رستہ کو بُھلانا چاہتے ہیں اور اس لئے عملی طور پر وُہ بھی گورنمنٹ ملک اور خود اپنی قوم کو کچھ کم نقصان پہنچانے کے مرتکب نہیں ہوتے اور یہی غیر بجا ہمدردی ہے جس کے بھروسے پر ہمارے مُلک کے ہزاروں نوجوان ادھوری تعلیم کے بعد مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے ہمقوموں کے لئے وبالِ جان ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر انکو یقین ہوتا کہ بغیر لیاقت کے کام ہرگز نہ ملیگا۔ تو یا تعلیم کو تکمیل تک پہنچاتے اور یا اس طرف توجّہ نہ کرتے

اور کسی اور کام میں لگتے اور اس لئے ہمارے ایسے ہمدرد بعض لوگوں کو بالا فانوں پر بیشک چڑھا دیتے ہیں مگر اُن سیڑھیوں کو توڑ دینے کی کوشش کرتے ہیں جن سے اُنکے اور بھائی چڑھ سکیں اور اس لئے ہمدردی کا اعزاز پانے کے مستحق نہیں ہیں۔

(۵) تناسب۔ اگر یہ بھی نہ ہو اور صیغہ کے اُمیدواروں میں سے قابل افراد کو جگہ دیجائے۔ مگر کوشش یہ ہو کہ تمام صیغہ پر محض اپنی قوم کا تصرف ہو اور اُدھر اس ملک یا علاقے میں دیگر قومیں بھی آباد ہوں تو ان اقوام کے بہت سے فوائد اور اغراض کو بغیر کسی بدنیتی کے بھی نقصان پہنچ جانا یقینی ہے کیونکہ قومی رسم و رواج اور قومی عقائد اور جذبات کو غیر قوم کا فرد اس خوبی سے سمجھ ہی نہیں سکتا۔ جس طرح سمجھنا ملکی کاروبار اور انتظام سلطنت کے واسطے ضروری ہے اور یہی وہ اصُول ہے جس سے شائستہ قومیں رعایا کا کسی نہ کسی حد تک کاروبار حکومت میں شریک ہونا ضروری جانتی ہیں اس لئے کسی صیغہ کو ایک قوم کے تصرف میں دیدینے سے انتظام حکومت اور ملکی امن و امان میں اسی قدر خلل پیدا ہوگا۔ جس قدر اُس صیغہ کا اثر ہے اور اس فعل سے وُہ تمام قومیں متاثر ہونگی جو ملک میں آباد ہوں۔ پس ایسی کوشش کرنے والے اُن نتائج کو نہیں دیکھتے جو یکے بعد دیگرے پیدا ہوتے ہوئے ملک اور خود اُنکی قوم کو بے امنی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کرینگے اور یہ لوگ قوم کے وہ نادان دوست ہیں جو جسم میں زہر پھیلا کر امید رکھتے ہیں کہ بیمار صحت یاب ہو جائیگا۔

(۶) مجرموں کی طرفداری۔ جو افسر اپنے ہمقوم ماتحتوں کے قصوروں کو چھپاتا ہے یا جو اہل الرائے فساد کرنے والوں میں سے اپنے طرفداروں کی بیجا حمایت کرتا ہے وُہ انکو اُس نقصان سے بیشک محفوظ رکھنا چاہتا ہے جو

عدالت پہنچنے کو ہو۔ لیکن قطع نظر اُس ظلم کے جو ان لوگوں کے ہاتھوں کسی نہ کسی پر ہوتا ہے وُہ شخص اپنے لوگوں کو ایسے جرم کرنے کی عادت ڈلواتا ہے۔ کیونکہ جرم کرنے پر ایک دفعہ بری ہو جانے سے دُوسری بار اسی قسم کا کام کرنے کی جرأت ہوتی ہے اور ایسے ایسے موقعے ملتے رہیں تو ہر دفعہ جرأت بڑھتی جاتی ہے اور دُنیا میں جس قدر شہدے اور مجرم پائے جاتے ہیں اُن کا آغاز اکثر اسی قسم کے اتفاقی واقعات سے اور کمال اسی طرح کے خوش نصیبیوں سے ہوا ہے اور اس لئے خواہ ایک دفعہ کے بعد دُوسری دفعہ مجرم کسی اَور کے ہاتھ سے سزا پانے پر اپنی عادت کو چھوڑ بیٹھے اور دیگر خواہش رکھنے والے بھی عبرت حاصل کریں۔ مگر جو لوگ پہلی دفعہ یا ہمیشہ اپنے مجرموں کی حمایت کرتے ہیں اُنہوں نے اپنی طرف سے وُہ تخم بو دیا ہے جسکا ثمر ان لوگوں کی سنگدلی اور سفاکی ہو۔ پس ایسے لوگ علاوہ ملک کے اور انصاف کے دشمن ہونے کے اپنی قوم کے ہمدرد بھی نہیں ہیں اور اُس عضو کا اپریشن نہیں کرتے جو آخرکار تمام جسم کو مسموم کر دیگا اور ہلاکت کا باعث ہو گا۔

ہمدردی کا موقع۔ غرض یہ اور اس قسم کے اَور کام جو انصاف کے خلاف اور خود اپنی قوم کیلئے بہت سے بد نتائج کا موجب ہیں سخت ترین ظلم کہلانے کے مستحق ہیں اور ہمدردی کا اعزاز نہیں پا سکتے۔ اور وقت پر بہی خواہوں یا خود غرضوں کی طرف سے اُن کی تعریف اس لئے کیجاتی ہے کہ اُن پیچ در پیچ اور مخفی نتائج تک نظر نہیں پہنچتی جو بظاہر خفیف واقعات سے پیدا ہوتے ہیں۔ آخر میں خوفناک تباہی تک پہنچاتے ہیں اور قوم کو ترقی کے سچے رستہ پر چلنے نہیں دیتے۔ البتہ جن کاموں سے محض فائدہ متصور ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں۔ انکو اپنی قوم سے مخصوص کرنا قومی ہمدردی ہو گا۔ چند مثالیں پیش کیجاتی ہیں جن رفاہ عام کے کاموں سے

محض فائدہ متصور ہے اور کسی طرح کے ظلم کا احتمال نہیں انکو اپنی قوم سے مخصوص

کرنا قومی ہمدردی ہوگا۔ مثلاً کوئی شخص روپیہ کماتا ہے اور رفاہ عام کے کاموں میں خرچ کرنے کی توفیق پاتا ہے۔ وُہ اس روپیہ کو صرف اپنی قوم کے فوائد پر صرف کرے یا جو شخص اپنی زندگی یا اُس کا کچھ حصہ وقف کرنا چاہتا ہے۔ وُہ خاص اپنی قوم کی خدمت میں مصروف ہو۔ پلیڈر اپنی قوم کے سائلوں سے کچھ نہ لے یا کم خرچہ پر پیروی کرے ڈاکٹر اپنے قوم والوں کو بلا فیس طبی امداد دے۔ عالم اپنا وقت اپنی قوم کے درس و تدریس میں صرف کرے اور اسی طرح وُہ کام جو محض کسی کے اپنے اختیار میں ہو قومی ترقی کے خیال سے کیا جائے تو بیشک قومی ہمدردی ہوگی۔ مگر ان مثالوں میں بھی غلط فہمی نہ ہونی چاہئے۔ گورنمنٹ ایڈووکیٹ کا فرض ہے کہ ہر ایسے مستغیث کیلئے پیروی کرے جس کے لئے تنخواہ پاتا ہے۔ ڈاکٹر کا فرض ہے کہ اُس ہسپتال میں آنے والے تمام مریضوں کا علاج کرے جس میں وُہ نوکر ہے۔ تنخواہ دار مدرس کو ایسے تمام طلبا کو ایک نظر سے دیکھنا چاہئے۔ جو اُس کے زیر تعلیم ہوں۔ اِس لئے یہ لوگ اگر اپنے منصبی فرائض میں اپنے ہمقوموں کی جانب غیروں سے زیادہ توجہ کرینگے تو وُہ بھی ظلم اور خیانت کے مرتکب ہیں۔ اعزاز و تحسین کے لائق نہیں۔ مگر جن افعال پر کسی قسم کا معاوضہ نہیں ملتا یا کسی قانون کی پابندی لازم نہیں اور کرنے والے کو انتخاب کے لئے پُوری آزادی حاصل ہو۔ وُہی افعال ہیں جنہیں قومی ہمدردی کا موقع مل سکتا ہے اور ایسے کاموں سے کسی کو شکایت اور رنج کرنیکا حق نہیں۔ اور عداوت پیدا نہیں ہو سکتی

ہمدردی کا اعلیٰ معیار۔ مگر یہ ضرور کہنا پڑیگا کہ قومی اور افرادی تہذیب کا ایک معین درجہ ہے جس کی حد تک اپنے اختیاری خدمات کو قوم کے ساتھ مخصوص کرنا قابلِ تعریف ہوتا ہے۔ ورنہ جب شائستگی اور اخلاق میں اس حد سے آگے ترقی ہوتی ہے تو اور پردے کھُلتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے دولت و ثروت اور دُنیا کے عیش و آرام کو کسی قوم اور کسی مذہب کے ساتھ مخصوص نہیں کیا اور اس کا دسترخوان اعلیٰ اور ادنیٰ

سب کے لئے وسیع ہے۔ علم و فن حاصل کرنے کی قابلیت بھی کسی خاص قوم اور فرقے سے مخصوص نہیں۔ صحت حاصل کرنے کے وسائل اور کاروبار میں کامیاب ہونے کی تدابیر بھی ہر قوم کو یکساں مفید ہو سکتی ہیں۔ غرض یہ سب ضروریات ہیں اور قدرت نے سب انسانوں کے لئے بلالحاظ قوم و ملت مہیا کی ہیں۔ اب اگر کوئی شخص جیب میں پیسہ ڈال کر گھر سے نکلتا ہے اس نیت سے کہ کسی بھوکے کو پیٹ بھرنے کے لئے دے تو چونکہ وہ پیسہ ہر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھر سکتا ہے اور اسی لئے بنا ہے تو اب ایک بھوکے کو دیکھ کر اس لئے نہ دینا کہ وہ دینے والے کا ہمقوم نہیں اور تلاش کرنا کہ بھوکا بھی ہو اور ساتھ ہی وہ اسی نسل سے ہو جس میں دینے والا ہے یا انہی عقائد کا پابند ہو جو دینے والا رکھتا ہے تو حقیقت میں یہ خیرات میں ایسی صفت کا ازدیاد کرنا ہے جو قدرت نے اس کے اندر نہیں رکھی اور یہ اعتقاد کر لینا ہے کہ یہ پیسہ ہماری جیب سے اگر غیر قوم کے بھوکے کا پیٹ بھرنے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ اور ذرا باریک نظر سے دیکھا جائے تو اس بھوکے پر ظلم ہے جو ہر ایک کے کام آنے والا پیسہ لیکر جانیوالے کو سب سے پہلے ملتا تھا۔ اور اسی طرح جو شخص کوئی اور خدمت کرنے کے لائق ہے اور خدمت کرنی چاہتا ہے تو چونکہ سب قابلیتوں میں قدرت نے ہر قوم کو فائدہ پہنچانے کی خاصیت رکھی ہے اور قدرت ہی نے فائدہ پہنچانے والوں کو وہ قابلیت دی ہے اس لئے فائدہ پہنچانے کی نیت کرنے کے بعد در حقیقت منشائے قدرت کے خلاف ہوگا۔ اگر اس شخص کو محروم رکھا جائے جو سب سے پہلے فائدہ لینے کا مستحق ثابت ہوتا ہے اور محروم اس خیال سے رکھا جائے کہ وہ اُن مراسم کا پابند نہیں جو فائدہ دینے والے کو پسند ہیں۔

عداوت کا دفعیہ۔ بیشک ملک میں ایسا اعلیٰ اخلاق اور حاجتمند کو دیکھ کر مدد کے لئے بیقرار ہو جانے کا جذبہ اور تمام انسانوں کو مساوی سمجھنے کا یقین پیدا

ہونا ایک طرف۔ ابھی اس کا امکان بھی دُور ہے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ابھی ہمدردی کے ابتدائی درجوں میں اور ظلم میں تمیز کرنے کا ملکہ بھی نظر بأکثر حالات مُلک میں پیدا نہیں ہُوا۔ اور تمام ایسے واقعات میں جہاں دو فریق یا دو اُمیدوار مختلف قوموں میں سے ہوں ہمدردی کی لہر اُلٹی بہے۔ اس شخص کے لئے جو اپنا ہمقوم ہوا نہیں توجہ کی جاتی اُس ضرورت یا استحقاق کی طرف جو غیر کو حاصل ہے۔ اور یہی غلط فہمی باہمی عداوت اور عناد کا باعث ہوئی ہے اور جب تک باقی رہیگی عداوت کو نابود نہ ہونے دیگی۔ اور اس سے آگے یہ شکایتیں کہ ہندو یا مُسلمانوں نے بعض ایسی تجارتیں کیوں اختیار کیں جو پہلے دُوسرے فریق کے قبضہ میں نہیں۔ یا کسی فریق نے علیحدہ پولیٹیکل انجمن کیوں بنائی۔ بلکہ یہ بھی کہ دُوسروں سے جُدا ہو کر کسی حاکم کو گارڈن پارٹی کیوں دی۔ ان باتوں پر واویلا کیا جاتا اور عداوت کا سبب سمجھا جاتا ہے اسی لئے کہ رنجش کی تخم ریزی بجا طرفداری کے جذبہ سے ہو چکی ہے اور اس کا پھل ان شکلوں میں ظاہر ہونا ضرور تھا۔ لیکن اگر اُن تمام نتائج کو غور سے دیکھا جائے جو طرفداری کے شوق میں دُوسروں پر ظلم کرنے سے پیدا ہوتے ہیں اور دُوربینی کی حس کو ترقی دیکر اُن نقصانات کو معلوم کیا جائے جو غلط ہمدردی سے خود اپنی قوم کو پہنچ سکتے ہیں تو پھر جس طرح دشمن کے ساتھ ایک گاڑی میں بیٹھکر گاڑی کو دریا میں ڈبونے کی کوشش نہیں ہو سکتی اور ایک چھت کے نیچے بیٹھکر اس کو جلانے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی کیونکہ دشمن کے ساتھ خود اپنی ہلاکت کا یقین ہوتا ہے اسی طرح مقدمات۔ ملازمت۔ امتحان وغیرہ اور پولیٹیکل جدوجہد کے موقعوں پر غیروں کے حقوق پامال کرنے کا خیال بھی نہ آئیگا۔ کیونکہ عقل پیش بین اُس وقت بھی اسی طرح خود اپنی قوم کے لئے مضرت اور نقصان محسوس کریگی۔ اور عقل کی ایسی اصلاح اور اخلاق کی اس قدر درستی کے بعد جب وہ افعال سرزد نہ ہونگے جو عداوت کو پیدا کرتے اور اسے ترقی دیتے ہیں اور انصاف

کا جذبہ غلط ہمدردی پر غالب آکر ایک کے ہاتھ سے دُوسرے کو ناجائز تکلیف نہ پہنچنے دیگا تو عداوت خود بخود محبت اور یگانگت میں بدل جائیگی اور اس وقت دل و دماغ کی روشنی اُن تاریکیوں کو بھی دُور کر دیگی جن سے عداوت کے دیگر اسباب پیدا ہوتے ہیں اور سمجھ میں آسکیگا کہ اگر بالفرض مُسلمان سلاطین کے ہاتھ سے غیر مذہب رعایا کو کبھی امن نصیب نہیں ہُوا تو بھی اس وقت وہ لوگ موجود نہیں جنکے جور و ستم کی فریاد کیجاتی ہے اور اب جو نسل موجود ہے وُہ دیگر اقوام کے ساتھ ایک سلطنت کے ماتحت ایک ہی طرح کے قوانین کی۔ پابند اور ایک ہی مُلک کی خوشحالی اور بدحالی میں حصہ لینے والی ہے۔ اس لئے اس جور و ستم کا انتقام جو گذشتہ مُسلمانوں کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اُن لوگوں سے لینا جنکو اس میں بالکل دخل نہیں کسی طرح جائز نہیں ہوسکتا۔

ایک اور ضرورت۔ غرض میرا خیال ہے کہ عداوت ہمدردی کو غلط استعمال کرنے سے پیدا ہوئی ہے اور اگر اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آجائے اور دل میں اعتقاد ہو کہ جن معاملات میں انصاف اور قانون کو دخل ہو ہمقوم اور غیر اور دوست اور دشمن برابر ہیں اور ہمدردی صرف اُن موقعوں میں ہوسکتی ہے جہاں کسی قسم کی رعایت انسان کی اپنی مرضی اور انتخاب پر موقوف ہو تو ملک میں عداوت کا نشان نہ رہیگا۔ اور تمام واقعات کی حقیقت کھُل جائیگی۔ جن سے باہم دگر شکایت کرنے کا موقع ملتا ہے مگر ان سب مرحلوں کو طے کرنے کے بعد مجھے ایک امر کی نسبت پھر بھی اندیشہ ہے اور مَیں خیال کرتا ہوں کہ مذہبی بحث و تکرار اگرچہ فی نفسہٖ بُری نہیں مگر اس میں بدتہذیبی سے کام لینا اور اصُولِ مذہب پر روشنی ڈالنے کی بجائے مذہبی پیشواؤں کو بُرا کہنا اور غلط اتہاموں سے دیگر مذاہب کو بدنما کرنا بعض صاحبوں کا پیشہ ہو گیا ہو اور مَیں سمجھتا ہُوں کہ اُن میں ہمدردی کا جوش اور غلطی سے ایسی کوششوں کو مفید سمجھنے کا خیال بھی نہیں بلکہ محض شکم پروری اور گرم بازاری کی خواہش ہو جو

ناوانوں کے مذہبی جوش اور غلط ہمدردی کے خیال سے فائدہ اٹھا کر پوری کیجاتی ہے اور اس لئے ایسے لوگ ہمدردی اور انصاف کو سمجھ لیں جب بھی توقع نہیں ہو سکتی کہ آگ پر تیل ڈالنے اور دونوں قوموں کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکانے سے باز آئیں۔ ان لوگوں کی تعداد کیسی ہی محدود ہو۔ ملک میں فتنہ و فساد قائم رکھنے کے لئے کافی سے زیادہ ہے اور وہ ناوانوں کے مذاق کو ایسا خراب کر چکے ہیں کہ مضمون نگاری سے معاش پیدا کرنے والوں کو مفید مضامین پر ایسی قدر افزائی کی توقع نہیں جس قدر بازاری گالیوں اور کمینہ طعن و تشنیع کی اشاعت سے متصور ہو اور اس لئے ان کی تعداد میں کمی آنے کا احتمال بھی نہیں۔ لیکن اگر عداوت ملک کے لئے مضر ہے اور اگر ترقی باہمی محبت اور اتحاد پر منحصر ہے تو جہاں ملکی ترقی کا ذریعہ سمجھکر غیر ملکی اشیاء کو ترک کرنے اور لوگوں سے چھڑوانے کی کوشش کیجاتی ہے حالانکہ عام پبلک ملکی اور غیر ملکی میں تمیز کرنے کی قابلیت اور نیز خواہش نہیں رکھتی۔ اور جہاں قومی ہمدردی کی دھن میں بعض بعض جگہ ہندو مسلمانوں کو اور مسلمان ہندوؤں کو بائیکاٹ کرتے سُنتے جاتے ہیں۔ حالانکہ ایک کا گذارہ دوسرے کے بغیر ممکن نہیں۔ وہاں ترقی کا اصلی راز دریافت کرنے والوں اور اتحاد و یگانگت کی قدر و قیمت سمجھنے والوں میں کیا ایسے جوانمرد پیدا نہیں ہو سکتے جو بے تہذیب مضمون نگاروں کو بائیکاٹ کریں۔ اور ایجوکیشنل سوشل اور پولٹیکل اغراض کے لئے جد و جہد کرنے اور لوگوں کو ترغیب دینے کے ساتھ اس امر کا بھی عزم کریں کہ دل آزار تحریروں اور بانیان مذاہب کی بے ادبی کرنیوالے رسالوں اور اخباروں کو نہ خریدینگے اور جہانتک ممکن ہوگا لوگوں کو ان کی امداد و اعانت سے باز رکھینگے۔ اور جس طرح ٹمپرنس سوسائٹی یا اصلاح تمدن کے حامی بعض عادات اور رسوم کو چھوڑنے کا عہد کر کے اپنے دائرہ اثر کو بڑھانے کی مسلسل کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اسی طرح کی ایک سوسائٹی فتنہ انگیز تحریر و تقریر کو چھوڑنے اور چھڑوانے

کی باقاعدہ کوشش کو اپنا فرض گردانے تو کیا ایسی کوشش پر کوئی نتیجہ مرتب نہ ہوگا؟ یا کیا اہل ملک کی باہمی عداوت ملک کو اس سے زیادہ نقصان نہیں پہنچاتی جس قدر شراب خواری اور دیگر رسوم سے متصور ہے۔ اور کیا مذہبی دل آزار تحریریں مخالفت کو بڑھانے اور ایک کو دوسرے کے خون کا پیاسا کرنے کی منحوس خدمت ادا نہیں کرتیں؟ اگرچند دل و دماغ ان نتائج کو محسوس نہیں کرتے تو اُنکے لئے بیشک کسی کوشش کا موقع نہیں اور دریا کی دو دھاروں کو شوق سے علیحدہ ہو کر اپنی روانی کا زور کھو دینا چاہیئے مگر ایسے لوگوں کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ واقعے کی سچی کیفیت کو سمجھنے والے بھی موجود ہیں اور انہی کا فرض ہے کہ ہمدردی اور انصاف کے مدارج سمجھیں اور سمجھائیں اور عداوت کی آگ پر پانی ڈالیں اور تیل ڈالنے والوں کے آگے دیوار آہنی بن کر کھڑے ہو جائیں +

محمود علی از کپورتھلہ

تیمارداری۔ مولوی محمد سعید صاحب صوفی نے تیمارداری نام ایک کتاب انگریزی زبان سے ترجمہ کی ہے جسے شیخ محمد عبداللہ صاحب وکیل علیگڈھ وایڈیٹر رسالہ خاتون نے شائع کیا ہے۔ اور جنرل کمیٹی ایجنسی علیگڈھ سے (بقیمت ۱۲) مل سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لائق مترجم نے ایک ایسی ضرورت کو پورا کیا ہے جو مدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اور اُردو خوان صاحبان اور خواتین اس کتاب کو بہت کارآمد پائینگے۔ ابتدا میں شیخ محمد عبداللہ صاحب نے دیباچہ کے طور پر چند صفحے لکھے ہیں۔ جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کتاب میں بعض ہدایات تیمارداری کی ایسی درج ہیں جو انگریزوں کے ملک یا اُنکے طریق بود و باش کے لئے مناسب ہیں اور ہندوستان میں اُن پر عمل نہیں ہو سکتا لیکن عام اصول ہر جگہ یکساں ہیں اور اُن پر عمل کرنا بیماروں اور تیمارداروں دونوں کے لئے مفید ہوگا +

جاپان میں تعلیم نسواں

مسز کیلب صاحبہ نے لاہور میں ایک مختصر سی زنانہ لٹریری سوسائٹی قائم کی ہوئی ہو
جہاں کبھی کبھی پردہ دار خواتین کو جمع کر کے بعض دلچسپ مضامین پر لکچر دیئے جاتے ہیں
یہ مضمون ایک لکچر کا ترجمہ ہے جو خود مسز کیلب صاحبہ نے چند روز ہوئے دیا تھا:-

جاپانی عورتیں پرانے زمانے سے تعلیم حاصل کر رہی ہیں - مگر جو تعلیم مردوں کو دیجاتی تھی اس سے عورتوں کی تعلیم کو کوئی نسبت نہیں ہوتی تھی - سترھویں صدی میں جب جاپان میں علوم و فنون کا ایک دور جدید شروع ہو رہا تھا تو اہل الرائے مردوں نے محسوس کیا کہ عورتوں کو فقط نرمی فرمانبرداری - دیانت - رحمدلی وغیرہ نیکیوں کی تلقین ہی کافی نہیں - بلکہ اُن کی دماغی قوت کو بھی ترقی دینی چاہیئے -

ایک شخص کیبارا نامی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ عورتوں کے بہت سے نقص صرف اُن کی جہالت یا اُن میں تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے ہیں - اس کی رائے تھی کہ سات برس کی عمر تک لڑکے اور لڑکیوں کو یکجا اور یکساں تعلیم دیجاوے - اس کے بعد لڑکیوں کی تعلیم جدا ہونی چاہیئے - اور انہیں چینی زبان کی قدیم علمی کتابیں لکھائی پڑھائی اور حفظ کرائی جاویں - اور عورتوں کے متعلق پرانے عالموں کی تصانیف انکے درس میں رکھی جاویں - جب دس برس کی ہو جاویں تو انہیں گھروں سے باہر نہیں جانا چاہیئے - اور وہیں سینا - بُننا - حساب کتاب اور انتظام خانہ داری سیکھنا چاہیئے - جب اور بڑی ہو جائیں تو اُنکے بزرگوں کا فرض تھا کہ انہیں عامیانہ اور ناشائستہ کتابوں اور گیتوں سے پرہیز کرنے کی تاکید کر دیں - اور اس بات کی احتیاط کریں کہ عورتوں کی چار دل ضروری

خصلتیں یعنی پاکدامنی - وضع داری حیا اور خدمت گذاری غرض وُہ سب صفات جو عورت کی شان کے شایاں ہیں ان میں موجود ہوں - تاکہ جب ان کی شادی کا وقت آئے تو وُہ سچی نسوانی خوبیوں سے معرا نہ پائی جاویں۔

کیبارا کے بعد اس کے بعض مداحوں نے اس کی ان ہدایات کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کیا اور اعلےٰ تعلیم نسوان اس کا نام رکھا - چونکہ یہ کتاب اس وقت کی تمدنی حالت کے موافق تھی اس لئے اس کو اس قدر شہرت اور وقعت حاصل ہوئی کہ کوئی شریف گھر ایسا نہ تھا جس میں اس کتاب کا ایک نسخہ موجود نہ ہو - لوگ اسے لڑکیوں کی تعلیم کا دستور العمل سمجھتے تھے - اس کے رُو سے عورتوں پر بزرگوں کی تعظیم اور اطاعت لازم تھی اور مرد اور عورت کے فرائض بالکل متمیز تھے - یہ کتاب اس قدیم چینی مسئلہ کی حامی تھی - جس کے مطابق طلاق کی سات وجوہات تھیں اور نکاحِ بیوگاں ممنوع تھا حقیقت یہ ہے کہ مرد و عورت کے باہمی تعلقات کے بارے میں یہ کتاب چین کے مذہبی پیشوا کنفوشیس کے اقوال کی تفسیر تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عمل ہمیشہ کنفوشیس کے اقوال پر نہیں رہا - کیونکہ بہت سی پُرانی روایات اور تاریخیں ایسی ملتی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں سب اختیار مردوں ہی کے ہاتھ میں نہ تھا بلکہ ایسی ایسی ہمت والی عورتیں گذری ہیں جو جنگی اور سیاسی معاملات میں شریک ہوتی تھیں اور تمدنی امُور میں مردوں سے پُورا مقابلہ کر سکتی تھیں - چنانچہ آٹھویں صدی میں شاہزادیاں تختِ پر مسلسل بیٹھتی رہیں - مگر دسویں صدی سے ان کی حالت میں زوال شروع ہُوا اور عورتوں کی دماغی اور اخلاقی قوت کم ہونے لگی - نزاکت خوبی سمجھی جانے لگی اور یہ فیشن ہو چلا کہ عورتیں تکلف سے اپنے آپ کو نازک اور حسین ظاہر کریں اور

حیا و شرم کے یہ معنے قرار پائے کہ خود اپنے خاندان کے مردوں کے سامنے
آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھے۔ اِس کے بعد بارھویں صدی میں جب فوجی گروہ کا زور
ہوا تو عورتوں کو خانہ نشین رہنے اور اپنے آپ کو مٹانے کی تلقین ہونے لگی
اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ بُدھ مذہب کا زور بڑھتا جاتا تھا اور وُہ یہ سکھاتا تھا
کہ عورتیں گناہ کی پتلیاں اور بے وفا اور بے رحم طبع ہیں اور انہیں لازم
ہے کہ اپنے آپ کو مٹا کر اپنی زندگی عبادت میں صرف کریں اور اگر اس پر بھی
اطمینان قلب نہ حاصل ہو تو تارک الدُنیا ہو جائیں۔ مردوں عورتوں کو اس
زمانہ میں ایک دُوسرے سے بالکل جُدا رکھا جاتا تھا اور ان کو سیر وغیرہ کے
لئے بھی باہر جانے کی اجازت نہ تھی۔ جب کنفیوشیس کا مذہب پھر تازہ ہونے
لگا تو عورتوں کو کسی قدر زیادہ آزادی ملی۔ مگر اس مذہب کے جو مسائل مردوں
کی فوقیت کے بارے میں تھے وُہ اور زور پکڑ گئے اور یہ بھی خرابی پیدا ہوئی
کہ اس مذہب کے عالم اکثر ایسے مرد تھے جو خود اچھے اخلاق نہیں رکھتے تھے۔
دسویں صدی کے اخیر اور گیارھویں صدی کے شروع میں خاندان فیوجی دارا
کی ملک میں بڑی عزت تھی۔ اس خاندان کی بیٹیوں میں سے پاشاہوں اور شاہزادوں
کے لئے بیگمات چُنی جاتی تھیں۔ اور انہیں اس اعلیٰ مرتبہ کے قابل بنانے کے
لئے نہایت لائق اور تعلیم یافتہ اُستانیاں موجود رہتی تھیں جو انہیں تعلیم
دیتی تھیں۔ اور جب وُہ محلات میں جاتی تھیں تو وُہ اُنکے ساتھ جاتی تھیں۔ ان
بیگمات میں سے بعض ایسی تربیت یافتہ ہوتی تھیں کہ وُہ صاحب تالیف تصنیف
گذری ہیں۔ انہیں میں وُہ مشہور عورت ہے جس کا نام مونوگتاری ہے اور جس کی
نظم و نثر بلحاظ خوبی و طرز ادا کے مدتوں طالب علم لڑکے اور لڑکیوں کو قابل تقلید نمونے کا کام
دیتی رہی۔ وقتاً فوقتاً عورتوں کے فائدہ کے لئے بہت سی کتابیں لکھی جاتی

ہیں جس میں بیشتر زور اس امر پر دیا جاتا تھا کہ عورت کو چاہئے کہ اپنے شوہر کے ساتھ وفاداری کرے اور جان پر کھیل جائے مگر ناموس پر دھبہ نہ آنے دے۔ مگر عورتوں کو سوسائٹی میں اپنا اصلی مرتبہ اس وقت حاصل ہوا جب پندرہ سو انچاس میں فرانسس زیویر نامی ایک جسویٹ پادری وہاں پہنچا۔ اس نے نہ صرف عیسوی مذہب جاپان تک پہنچایا۔ بلکہ اس نے ایک نئی تہذیب کی بنیاد ڈالی اور گو ایک پولیٹکل صدمے نے تھوڑے ہی عرصہ میں جسویٹ پادریوں کو جاپان سے نکال باہر کیا لیکن جو شعلہ وہ بھڑکا گئے تھے وہ بڑا ہوتا گیا اور انیسویں صدی تک بیرونی اور اندرونی واقعات نے ایسی صورت اختیار کی کہ نوجوانان قوم نے بڈھوں کی مخالفت کے باوجود یہ فیصلہ کر لیا کہ مغربی تہذیب کو اپنے ملک میں رواج دیں۔ عام اصلاح کی جو تجویز ہوئی اس سے عورتوں کو خارج رکھنا ناممکن سمجھا گیا اور تسلیم کیا گیا کہ کوئی لڑکی اچھی بیوی اور اچھی ماں نہیں بن سکتی۔ جب تک کہ وہ تعلیم نہ حاصل کرے۔ اعلیٰ خاندانوں سے لڑکیوں کے مدرسے قائم کرنے کے واسطے بہت سا روپیہ دیا۔ اگرچہ وہ مدرسے انہیں خاندانوں کی تعلیم کے لئے بنے تھے اور ان کا فائدہ محدود تھا تاہم وہ تعلیم نسواں کے پیشرو تھے اور ان سے طریق تعلیم میں ایک جدت پیدا ہوئی سنہ ۱۸۷۱ء میں شاہ جاپان نے اپنے امرا کے نام ایک فرمان جاری کیا۔ جس میں انہیں ممالک غیر کی سیاحت کی ترغیب تھی اور اسی میں تعلیم نسواں کے متعلق حسب ذیل ارشاد تھا۔

"ابھی اس ملک میں ہمارے پاس عورتوں کی تعلیم کے واسطے کوئی باضابطہ انتظام نہیں ہے اور وہ عموماً معاملات کے سمجھنے اور ان پر رائے قائم کرنے کی قابلیت میں ناقص ہیں۔ بچوں کی تربیت ماؤں کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح مائیں ان کی تربیت کرینگی اسی طرح وہ بڑھینگے۔ یہ ضروری معاملہ ہے۔ اس لئے یہ مناسب

ہوگا کہ اب سے جو لوگ باہر جائیں وُہ اپنی بیبیوں کو اور لڑکیوں کو یا بہنوں کو ساتھ لیجائیں۔ تاکہ وُہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ اَور ملکوں میں عورتیں کس طرح تعلیم پاتی ہیں اور کس طرح بچّوں کی پرورش کرتی ہیں"۔

اس تاکید کے بعد تعلیم نسوان کا شوق بڑھتا گیا اور ہر طبقہ کے لوگ علم کی تلاش میں دَوڑ پڑے ۱۸۷۲ء میں حکومت کی طرف سے ابتدائی تعلیم ملک میں جاری کی گئی اور یہ حکم ہُوا کہ ہر درجے کے لوگوں کے لڑکے لڑکیاں چھ برس کی عمر میں مدرسوں میں داخل ہو جائیں۔ ۱۹۰۵ء کی رپورٹوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرکاری اور نجی کے زنانہ مدرسوں کی کل تعداد ایک سو تھی اور طالب علموں کی تعداد ۴،۷۵۱ -۳۱۵،۴۰۰ لڑکوں کے مدرسین کی تعداد ۲۷۱ اور تعدادِ طلبا ۱۰۴۵۱۱ تھی۔ چونکہ آبادی میں زن و مرد قریب قریب برابر ہیں اور مدرسے جانے والی لڑکیوں اور لڑکوں کی تعداد میں ایک اَور تین کی نسبت ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم نسواں میں ابھی بہت ترقی کی گنجائش ہے۔ حال میں وہاں یہ خیال بھی پیدا ہُوا ہے کہ عورتوں کو ایسی تعلیم دیجائے جس سے وُہ اگر ضرورت پڑے تو اپنی روزی پیدا کر سکیں۔ اور ٹوکیو میں ایک چھوٹا سا طبّی مدرسہ جاری ہُوا ہے۔ جس میں عورتیں ڈاکٹری تعلیم پا رہی ہیں اور نرسیں اور دائیاں بن رہی ہیں اور اس وقت ۱۳۰ عورتیں ملک میں ڈاکٹری کا کام کر رہی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۱ء میں ٹوکیو میں زنانہ یونیورسٹی کھولی گئی جس میں تدبیر خانہ داری لٹریچر معلمی اور سائنس کی تعلیم ہوتی ہے اور عنقریب ورزشی تعلیم۔ موسیقی اور فنونِ لطیفہ وغیرہ کی تعلیم بھی اس یونیورسٹی میں جاری ہونے کو ہے۔ اس کے ساتھ کنڈرگارٹن اور ابتدائی سکول اور زنانہ ہائی سکول ہیں۔

ایک محکمہ ایسا بھی ہے جس میں دست کاری سکھائی جاتی ہے اور تجارتی

تعلیم دیجاتی ہے۔ ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاپان میں عورتوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت نہیں کی جا رہی لیکن مغربی خیالات کے موافق ابھی بہت ترقی درکار ہے۔ مجھے شک نہیں کہ جوں جوں جاپان کے مردوں میں علم زیادہ ہوتا جائے گا وہ تسلیم کرینگے کہ اگرچہ عورت کو زیادہ تر اپنے گھر کے فرائض اور بچوں کی تربیت ہی میں مصروف رہنا چاہیئے۔ لیکن ان کے سوا بھی اس کے فرائض کا دائرہ وسیع ہے۔ مثلاً اپنے شوہر کی رفاقت۔ بیماری میں اس کی خبر گیری، اس کی تکالیف میں اس کی حوصلہ افزائی روزمرہ کے معاملات کو حسن تدبیر سے طے کرنا اور شوہر کے دل میں اپنے خاندان کی ترقی اور قوم کی ترقی کے لئے اعلیٰ اور نیک ارادے پیدا کرنا یہ سب کچھ جبھی حاصل ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو ہر طرح کی عمدہ تعلیم دیجائے اور اُن کی اخلاقی اور دماغی تعلیم و تربیت مکمل ہو۔ سچ تو یہ ہے کہ مرد اور عورت ایک دُوسرے کا تتمہ ہیں اور اُن میں سے ہر ایک دُوسرے کے بغیر نامکمل ہے +

جامِ سُرُور - منشی درگا سہائے صاحب سرورؔ جہان آبادی کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جو انڈین پریس الہ آباد میں چھپ کر شائع ہوا ہے۔ بیشتر نظمیں وہ ہیں جو وقتاً فوقتاً اوراقِ مخزن و زمانہ میں شائع ہو چکی ہیں۔ اور وہ نظمیں بھی جو حال میں رسالہ ادیب الہ آباد میں نکلی ہیں۔ اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ منشی صاحب کا کلام کسی تعریف کا محتاج نہیں۔ مدت سے درجہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ اُمید ہے کہ انکے کلام کے معترف اس مجموعہ کے شائع ہونیکی خبر خوشی سے سنیں گے اور اسے خرید کر اپنے کتب خانوں میں جگہ دینگے۔ کاغذ لکھائی چھپائی سب عمدہ ہیں۔ کتاب کے شروع میں منشی نوبت رائے نظرؔ نے ایک مختصر سا دیباچہ لکھا ہے اور سرورؔ مرحوم کے کچھ حالات درج کئے ہیں۔ کتاب کی ضخامت دو سو صفحہ کے قریب ہے اور قیمت دو روپیہ ہے +

کوہِ سائنس

موسم بہار شباب پر تھا جس کے دلفریب مناظر قدم قدم پر دل چھینے لیتے تھے۔ نیلگوں آسمان کا صاف چمکدار رنگ آنکھوں میں کھُبا جاتا تھا۔ رُوئے زمین کثرتِ گلہائے بوقلموں اور میوہائے گوناگوں سے رو کشِ باغِ ارم بن رہی تھی۔ دِل بے اختیار اُس صناعِ بے بدل کی چابکدستیوں پر لوٹ تھا۔ جس طرف نظر اُٹھ جاتی تھی حکمت ہی حکمت نظر آتی تھی۔ ع

جدھر دیکھتا ہوں اُدھر تو ہی تو ہے

کچھ عرصہ میں یُوں دلفریب قدرتی مناظر کی خوبیوں سے حظ اُٹھاتا رہا۔ آخر پھرتے پھرتے تھک کر ایک چٹان کے ٹکڑے پر بیٹھ گیا۔ جس کو قدرت کے رنگسازِ کائی نے سبز رنگا تھا۔

خشک پتّوں کے جھڑنے کی سریلی جھنکار۔ آبشاروں کے زمین پر گرنے کی دلفریب آواز۔ مُرغانِ خوش الحان کے دلکش نغمے عجب فرحت بخش تھے۔

الغرض مَیں اپنے اِرد گرد کی دلفریبیوں پر غور کرتے کرتے خوشگوار نیند کے مزے لینے لگا۔ کیا دیکھتا ہُوں کہ مَیں ایک وسیع میدان میں کھڑا ہُوں۔ جس کے وسط میں ایک کوہ فلک فرسا سدِ سکندری کی طرح ایستادہ تھا۔ جس کی بلندی دیکھ کر طائرِ وہم وخیال کے ہوش اُڑتے تھے۔ یہ میدان سبزہ آغاز نوجوانوں سے بھرا پڑا تھا۔ جن میں سے اکثر بڑے جوشِ

خروش سے قدم بڑھائے چلے جاتے تھے۔ اگرچہ راستہ اکثر جگہ بالکل سیدھا اور ناقابلِ گذر تھا۔

وُہ لوگ جنہوں نے ابھی چڑھنا شروع کیا تھا۔ اپنے کو قلۂ کوہ کے قریب ہی سمجھتے تھے۔ مگر جُوں جُوں وُہ آگے بڑھتے تھے۔ نئے نئے پہاڑ ایک دُوسرے پر اُٹھتے ہوئے نظر آتے تھے۔ سب سے بلند پہاڑ کی چوٹی جو اُنہوں نے اوّل اوّل دیکھی تھی۔ اس وقت ایک دُوسرے پہاڑ کا دامن ثابت ہوتی تھی۔ آخر کار رفتہ رفتہ تمام پہاڑ بادلوں میں غائب ہونے لگے۔

مَیں اِن تمام چیزوں کو نہایت حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ کہ دفعتہً میرا فرشتہ ہدایت ظاہر ہُوا اور کہنے لگا۔ "یہ پہاڑ جو تیرے سامنے ہے۔ کوہِ سائنس ہے۔ اِس کی چوٹی پر صداقت کا مندر ہے۔ جس کی چوٹی بادلوں کے اوپر ہے۔ اور اس کے رُخ کو نور کا نقاب چھپائے ہُوئے ہے۔ خاموشی اور غور سے اس کے پرستاروں کی ترقی دیکھو"

مَیں نے دیکھا کہ اس پہاڑ تک رسائی صرف ایک دروازہ سے ہے۔ جسکو دروازۂ زبان کہتے ہیں۔ اس کی محافظ ایک عورت تھی جس کے چہرہ سے غرور و فکر نمایاں تھا۔ اس کے لب ہر دم حرکت میں تھے۔ گویا وُہ اپنے دل میں کوئی چیز دُہرا رہی تھی۔ اس کا نام حافظہ تھا۔ جونہی کہ مَیں پہلے دروازہ میں داخل ہوا میرے کان ناخوشگوار کریہہ آوازوں کے شور سے کر ہو گئے۔ معاذ اللہ اس قدر مخلوط اور بے معنی تھیں۔ کہ اُنکے سامنے غوغائے بابل بھی گرد تھا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے مڑ کر پہاڑ کو دیکھا۔ جہاں ہمیشہ صاف اور فرحت بخش ہوا چلتی تھی۔ رستہ پر آرل اور دیگر سدا بہار درخت سایہ کئے ہوئے تھے۔ اور تجلّی انوار جو اس مقدس دیوی کے رُخ سے درخشاں تھے۔ اس کے پرستاروں کے چہروں کو عجیب پُر جلال بناتی تھی۔ بے اختیار میری زبان سے نکلا۔ "آہ! کیسے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو اس پہاڑ کو طے کرتے ہیں"۔ ابھی یہ جملہ پوری طرح ادا بھی نہ ہوا تھا۔ ایک مقدس صورت سراپا نور و محبت پہلو میں ایستادہ نظر آئی۔

مقدس صورت۔ "ان سے بھی زیادہ خوش قسمت وہ ہیں جنکو نیکی قناعت کے محلّوں میں داخل کرتی ہے"۔

میں۔ "کیا نیکی اس درۂ کوہ میں رہتی ہے"۔

مقدس صورت۔ "ہاں میں درہ میں بھی ہوں۔ پہاڑ کو بھی روشن کرتی ہوں۔ میں ہی مزدور کو محنت کے وقت خوش کرتی ہوں۔ میں ہی حکیم کو غور و فکر کی حالت میں تسلّی دیتی ہوں۔ میں شہروں کی عام جماعتوں میں شامل ہوں۔ میں مرتاض کو اس کے تنگ و تاریک غار میں مبارکباد دیتی ہوں۔ میرا مسکن ہر ایک دل میں ہے جو میرا دلدادہ ہے۔ میں ہمیشہ اس کے ساتھ ساتھ رہتی ہوں۔ جو میری تمنا کرتا ہے۔ بیشک سائنس تم کو عالم و فاضل بنا سکتی ہے مگر صرف میں ہی ہوں جو تمہیں حقیقی خوشی کی راہ پر لگا سکتی ہوں"۔

جبکہ مقدس دیوی اس طرح ہمکلام تھی میں نے استفسار سے اپنے ہاتھ اسکی طرف بڑھائے کہ میری آنکھ کھل گئی۔ شبنم چاروں طرف پڑ رہی تھی۔ تمام دلفریب مناظرات کے تاریک میں غائب ہوتے جاتے تھے۔ میں جلد جلد گھر کی طرف روانہ ہوا اور تمام رات نہایت ہی خاموشی اور غور و فکر میں گذری۔

ترجمہ ــــ محمد سجاد علی ایم اے (کرنال)

کلامِ اکبر

کیا ہے دورِ فلک میں کوئی تمکین کے ساتھ
جب زمانہ چلے ایک ہی آئین کے ساتھ

دل دیا، مال دیا، پیار کیا اِنکو مگر
اِن بُتوں کو وہی کاوش ہے مرے دین کے ساتھ

مخلصانہ جو نہ ہو مدح تو کیا لُطف آئے
چشمِ غمّاز کی گردش بھی ہے تحسین کے ساتھ

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی
دُعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی

فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو
ہمیں سے داد بھی چاہی جوشِ امتیازی کی

بہت خلوص سے حاضر رہا میں خدمت میں
مگر حضور نے مجھ سے زمانہ سازی کی

خیال کیا ہو کسی کو بنائے مسجد کا
کہ مسجدوں کو ضرورت ہے اب نمازی کی

ہمیشہ پیشِ نظر ہیں وضو شکن منظر
اِس انجمن میں نبھے کس طرح نمازی کی

گلے میں پھیرتے ہیں تیغ معذرت کے ساتھ
خدا کے فضل سے عادت ہے دلنوازی کی

اگرچہ بینڈ کی گت بھی ہے دلفریب اکبر
مگر وہ بات کہاں نغمۂ حجازی کی

کیوں خدا کے باب میں بحثوں کی اتنی دُھوم ہے
ہست میں شُبہ نہیں ہے حیثیت نامعلوم ہے

اس تغیر پر بھی ہے ذہنوں میں قائم کوئی چیز
اور وُہ کیا ہے فقط یا حیُّ یا قیوم ہے

میں نے جو کہا چاند سے رخسار کو لا ہیں
کہنے لگا بوسے کا تو کر لیجئے لا (قانون) پاس

کشتِ دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے
دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے

نہیں کچھ اس کی پرسش اُلفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

سید اکبر حسین

عورت کی ساخت

سنسکرت کے جادو نگار نے اپنے علم الاصنام کے رُو سے لکھا ہے کہ جب توشتری دیوتا عورت ذات کے بنانے کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے معلوم کیا کہ تمام مسالہ تو مرد کی تعمیر میں صرف ہو چکا۔ اب کوئی ٹھوس عنصر باقی نہیں رہا جو عورت کی ساخت میں کام آئے۔ چنانچہ اُس نے بحرِ تفکّر میں غوطہ لگایا اور دیر بعد زانو سے سر اُٹھا کر اس نظم کے نصفِ اوّل میں جو اشیاء مذکور ہیں بہم کر کے انہیں گوندھ ملا کر عورت کی مورت تیار کر دی۔ جب یہ خیال اُردو کے مینا کار کے ہاتھ آیا تو اُس نے نہ صرف اسے نظم ہی کا لباس پہنایا بلکہ اپنی شاعری کی قلمکاری سے پرانے خاکہ میں ایسے رنگ بھرے کہ صنفِ لطیف کی ایک بولتی چالتی تصویر تصوّر کی نگاہوں میں پھر گئی

چاند کی لیکر گولائی۔ سانپ کا پیچ اور خم
گھاس کی پتّی کی ہلکی تھرتھراہٹ بیش و کم

بیدِ مجنوں کی نزاکت بیل کے بل کی کجی
بانکپن طاؤس کا۔ نرمی گلِ کہسار کی

پیارے پیارے۔ بھولے بھولے دیدۂ آہوئے چیں
جن میں ہو رقصِ شعاعِ نورِ خورشیدِ مبیں

ابر سے آنسو۔ صبا سے بیوفائی لی اُڑا
سہم خرگوش اور چیتے سے لیا جور و جفا

سرد مہری یخ نے دی۔ سختی ملی الماس سے
تا بتانِ آہنی دل کا۔ دلِ سنگیں بنے

طوطیِ گلزار نے رنگینیِ منقار دی
قمریِ بیزار نے شیرینیِ گفتار دی

روزِ اوّل سے ودیعت نور کا جوبن ہوا
پَرِ بلبل کا اضافہ اس پہ ہلکاپن ہوا

گوندھ گندھا کر یہ مسالہ جب اکٹھا ہو گیا
دستِ قدرت نے بنایا ایک ڈھانچا نور کا

آگ کا تن بن گیا اور نور کی صورت بنی
شکل عورت کی بنی کیا موہنی مورت بنی

بال سنبل سے لئے نرگس سی چشمِ نیمخواب — روئے روشن نے کیا کسبِ ضیائے آفتاب
رُخ ہوا وَالفَجر اور وَاللَّیل زلف اسکی بنی — سورۂ وَالشَّمس سے فرخندہ پیشانی بنی
چشمۂ حیواں کی کھولی مانگ نے سیدھی سڑک — خندہ پیشانی نے صبحِ عید کی پائی چمک
چاندسے مکھڑے پہ قطراتِ عرق کی ہے نمی — چاند کے ٹکڑے پہ افشاں یا ستاروں نے چنی
ابروئے قوسی کے رکھے ہیں برابر دو ہلال — یا لکھا ہے مطلعِ موزونِ دیوانِ کمال
آنکھ دشتِ کاشغر کا آہوئے رمدیدہ ہے — ہر نگاہِ مست جس کی فتنۂ خوابیدہ ہے
ایک جانب ابروئے پیوستہ نے کھولی کماں — دوسری جانب ہے ترکِ چشم نے تھامی سناں
اک نگاہ کے وار میں ہر شیر آہو ہو گیا — تیرِ مژگاں جو اڑا دل میں ترازو ہو گیا
آتشیں رخسار میں روشن ہوئی نارِ خلیل — خندہ رونی ہنسکے بول اُٹھی ہو اللہ الجمیل
معجزہ شق القمر کا وہ لبِ اظہار ہے — اس کی خاموشی میں پنہاں معنیٔ گفتار ہے
ہر ادا میں بات ہے ہر بات میں انداز ہے — سحر ہے فتنہ ہے یا جادو ہے یا اعجاز ہے
جنت الفردوس سے آیا ہے وہ سیبِ ذقن — پانی پانی آبِ دنداں سے ہوا دُرِّ عدن
لعل سے لب اور گوہر سے دُرِ دنداں بنے — پنجۂ دستِ حنائی پنجۂ مرجاں بنے
دست و بازو کی جو دیکھی تازہ روئی کی بہار — آتشِ سوزِ دروں سے جل اُٹھی جانِ چنار
نور کے سانچے میں اس کا قدِّ موزوں ڈھل گیا — ایک افسوں تھا کہ جو خلقِ خدا پر چل گیا

بن گیا قامت قیامت چال محشر ہو گئی
عالمِ ایجاد میں ہر حال محشر ہو گئی

صادق
(از سرینگر کشمیر)

موسم بہار

سنبھل بیٹھو بے موت کے مرنے والو   حسینوں پہ ایماں فدا کرنے والو
محبت کا اُلفت کا دم بھرنے والو   قدم عشق کی راہ میں دھرنے والو

ہوا باغ عالم کی بدلی ہوئی ہے
چمن میں گھٹا کیسے چھائی ہوئی ہے

اُمنڈ آیا ابرِ بہار آسماں پر   ترانے ہیں مرغِ چمن کی زباں پر
مٹے سب عنادل کے شور فغاں پر   گیا جوبن آنے لگا بوستاں پر

ابھی خشک تھے سب پہاڑ اور جنگل
ہوا فیضِ باراں سے جنگل میں منگل

گھٹا آتی ہے بدلی موسم نے صورت   ہوئی اور سے اور گلشن کی حالت
نظر میں لگی جھنپنے پھولوں کی رنگت   وہ کلیوں کا کھلنا وہ ان کی نزاکت

نیا روپ گلشن میں بدلا سبھی نے
نکالے غضب پاؤں سرو سہی نے

سیہ کار بادل بہت پی گیا ہے   کسی میکدے پر کہیں جھک پڑا ہے
عجب رنگ سے جھومتا یہ اُٹھا ہے   بہکتا ہوا ہر طرف جا رہا ہے

ہے لغزش اسے مے پرستوں سے بڑھکر
عجب کیا جو کھل کھیلے مستوں سے بڑھکر

ہر اک لکۂ ابر کی اُف رے شوخی   بدلنے کو آیا ہے رندوں سے ٹوپی
ملا جھک کے سب سے دمِ بادہ نوشی   اندھیرے میں اس کو غضب کی یہ سوجھی

ہر اک میکدے میں اجارا ہے اس کا
کہ رندوں سے اب بھائی چارہ ہے اس کا

برستا ہی رم جھم شب و روز پانی ہے صورت گلوں کی غضب کی سہانی
کوئی سرخ ہے اور کوئی آسمانی کوئی چمپئی ہے تو ہے کوئی دھانی

چمن کا ہے کچھ اور انداز گویا
یہ سبزہ ہے طاؤسِ طنّاز گویا

ہری دوب کوسوں نظر آ رہی ہے جہاں تک نگہ جائے لہرا رہی ہے
نزاکت سے کیا کیا وہ بل کھا رہی ہے خرامِ حسیناں کو شرما رہی ہے

رگِ ابر کے واسطے نوکِ نشتر
رہے دب کے کیوں سر اُٹھائے نہ کیونکر

مزہ موسمِ ابر کا آ رہا ہے کوئی لطفِ معشوق سے پا رہا ہے
کوئی جام بھر بھر کے چھلکا رہا ہے کوئی سیرِ گلزار کو جا رہا ہے

اُٹھائیں نہ قسمت سے گو لطف کچھ ہم
مبارک ہو عرشی کو یارب یہ موسم

ابوالاعجاز عرشی

نیا زمانہ

ہمارے عنایت فرما پنڈت برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی دہلوی نے موجودہ زمانہ کی انقلابی حالت کا نقشہ مندرجہ ذیل اشعار میں کھینچا ہے۔ زمین تو پرانی ہے مگر کیفیتیں نئی ہیں:-

پیدا ہوئے ہیں دشمنِ ایماں نئے نئے ہندو نئے نئے ہیں مسلماں نئے نئے

ویدوں پہ تازہ تازہ چڑھاتے ہیں حاشیے | گھڑتے ہیں لوگ معنئے قرآں نئے نئے
انساں تو کیا خدا کے بھی سجدے سے عار ہے | پیدا ہوئے ہیں اندنوں شیطاں نئے نئے
کوثر کے بھی خیال میں اب کچھ مزا نہیں | چشمے نکالے خلد میں رضواں نئے نئے
سالوس۔ وہمی اور جنونی ہیں انکے نام | بندھتے ہیں اہلِ دل پہ یہ بہتان نئے نئے
ہو اتفاق شیخ و برہمن میں کس طرح | پیدا ہیں اختلاف کے ساماں نئے نئے
جتنے پڑھے نفاق و حسد اُس قدر بڑھے | تعلیم کے یہ ہم پہ ہیں احساں نئے نئے
اُن کی طرف کسی کی توجہ ذرا نہیں | ہیں جو کھلے ترقی کے میداں نئے نئے
گھر اپنا ایک دل میں بھی تم سے نہ بن سکا | کیا ہو گیا بنائے جو ایواں نئے نئے
داخل نہیں جو ذیل میں اُنکی وجود ہے | ہیں مفتیانِ عصر کے فرماں نئے نئے
سودائی ہے کوئی تو کوئی ست جگی نژاد | اِس گھر میں گھس کے بیٹھے ہیں مہماں نئے نئے
تسخیرِ ملکِ دل کا کسی کو نہیں خیال | سرور نئے نئے ہیں تو سلطاں نئے نئے
تھل بیڑا نوح کی بھی نہ کشتی کا لگ سکے | کلجگ میں اُٹھ رہے ہیں وہ طوفاں نئے نئے
زور آزمائیوں کے ہیں مجرے سٹیج پر | رستم نئے نئے ہیں نریماں نئے نئے
حاکم سے بے رخی ہے تو آپس میں لاگ ڈانٹ | ہیں قوم کی ترقی کے ساماں نئے نئے
جو خال ہے وہ بڑھ کے مسا ہو رہا ہے اب | لاتی ہے رنگ زلفِ پریشاں نئے نئے
پیرس میں جا کے ٹھانی ہے خدمت ہو قوم کی | اُٹھتے ہیں بیٹھے بیٹھے یہ خفقاں نئے نئے
ہے نقطۂ سیاسی ترقی کا اب قطب | لوگوں کو خوب ہوتے ہیں ہذیاں نئے نئے
بد دل برادروں سے کیا شہ سے بدگماں | ہیں یہ طریقِ خدمتِ اخواں نئے نئے
اُلفت وطن کی دل میں سر میں ہے جوشِ عشق | دعوے نہیں یہ آپ کو شایاں نئے نئے
سودا ہے سر کو آنکھوں میں چھائی ہے تیرگی | ہم دیکھتے ہیں خواب پریشاں نئے نئے
خالِ سیہ سے زینتِ حسنِ صبیح ہے | بُت سیکھیں دلفریبی کے عنواں نئے نئے

کوشش یہ ہو رہی ہے سوا مرد اُنہیں بنائیں پیدا ہوئے ہیں حامیِ نسواں نئے نئے
گانے میں لڑکے۔ لڑکیاں ورزش میں برق ہیں تعلیم کے ہیں کارنمایاں نئے نئے
اندر اسن آگے ہال کے کمرے کے بیچ ہے تفریح کے بھی چاہئیں عنواں نئے نئے
لیکر بغل میں ایک پری نازنیں بزم میں تہذیب پر ہوئے ہیں جو قرباں نئے نئے
چکر کہاں یہ جا کے ٹھہرتا ہے دیکھئے لاتی ہے رنگ گردشِ دوراں نئے نئے
اُن کے نکالنے کی بھی تدبیر کیجئے دل میں جو پال رکھے ہیں ارماں نئے نئے
اہلِ زباں کا سرد ہے بازار ان دنوں شاعر نئے نئے ہیں سخنداں نئے نئے
ٹھہرا ہے حصرِ ملت و قوم اب زبان پر تہذیب کے یہ پہلے ہیں ارکاں نئے نئے
یارانِ رفتہ کی کہیں اب کس سے داستاں دُنیا نئی ہے اور ہیں انساں نئے نئے

کیفی بہت نہ بزمِ سخن میں تو بڑھ کے بول
نقاد بن کے بیٹھے ہیں سحباں نئے نئے

کیفی

شکوۂ محبوب

میری حسرتوں کا تم نے نہ کیا خیال جاناں مری آرزو کو تم نے کیا پائمال جاناں
مرے درد کی خبر لو، نہ تو پوچھو حال جاناں یہی بے وفائیاں ہیں سببِ ملال جاناں
یہ ستم اگر نہ ہوتے تو میں مضطرب نہ ہوتا
وُہ خدا دکھائے گھڑیاں کہ ہوں شاد کام ہم تم نہ ہو اپنے جی کا رونا، نہ شباب کا یہ ماتم
گر رہا نہ دوست کوئی، نہ کوئی رفیقِ ہمدم میں ہوں اور دردِ فرقت مرا دل ہے اور غم
مگر اُف نہ لب پہ آئی وُہ وفا شعار ہوں میں

وہ فراق میں تمہارے مری آہ و زاری — وہ نہ آنسوؤں کا رُکنا شب و روز اشکباری
مری بسترِ الم پر وہ تڑپ وہ بیقراری — مری زندگی ہی کیا تھی فقط اک نفس شماری
مرا حال کاش یا غم میں کبھی منقلب نہ ہوتا

مری داستانِ فرقت نہ سُنے کوئی الٰہی — مری پُر الم حکایت نہ سُنے کوئی الٰہی
مرے درد دل کی حالت نہ سُنے کوئی الٰہی — مرا ذکرِ عشق و اُلفت نہ سُنے کوئی الٰہی
چمنِ خزاں رسیدہ گُل داغدار ہوں میں

مرے عشق اور محبت کی نہ تم نے قدر جانی — نہ کبھی پیام بھیجا، نہ سلام ہی زبانی
ہوا حیف! مجھ کو حاصل نہ مآلِ زندگانی — نہ ثمر جہاں میں لایا مرا نخلِ کامرانی
کہ شرابِ وصل ہوتی کوئی محتسب نہ ہوتا

مرے کام کے نہیں ہیں یہ سرور و عیش و عشرت — مرے کام کے نہیں ہیں یہ متاعِ مال و دولت
نہ میں راحتوں کا خواہاں نہ میں چاہتا ہوں عزت — نہ میں طالبِ تسلی، نہ میں خوگرِ نصیحت
ستمِ فلک سے نالاں دلِ بیقرار ہوں میں

مرے دل کو کیوں لگی ہے یہ ہوائے وصلِ جاناں — کہ بنا دیا ہے جس نے مجھے شکلِ یاس و حرماں
کبھی بیکسی میں چُپ ہوں، کبھی ناشکیب گریاں — یہ بلا گلے نہ لگتی کہ نہیں ہے جس کا درماں
جو میں جرمِ دل دہی کا کبھی مرتکب نہ ہوتا

نہیں تابِ ضبطِ نالہ مرے لب پہ اب فغاں ہے — نہیں زیست کی توقع مجھے زندگی گراں ہے
نہ شباب کی اُمنگیں، نہ یہ دل مرا جواں ہے — میں ہوں مبتلائے کلفت مرا دم فقط رواں ہے
مرا غم نہ پوچھ محوی کہ بحالِ زار ہوں میں

محمد حسین محوی لکھنوی

رُباعیات

دُنیا سے سفرِ عدم کا کرنا ہے تجھے — اور منزلِ ہستی سے گزرنا ہے تجھے
ہے مشتِ غبار جسمِ خاکی تیرا — اس خاک سے مُنہ لحد کا بھرنا ہے تجھے

دنیا ہوگی نہ اوج و پستی ہوگی — آنکھوں کے سامنے یہ نہ بستی ہوگی
سوتے ہونگے لحد میں اک دن تہِ خاک — تعبیر تری یہ، خوابِ ہستی ہوگی

اس دارِ محن میں آہ! خورسند ہے تو — اے خاک نشیں! زمیں کا پیوند ہے تو
دلِ دولتِ فقر سے غنی کر منعم! — کیوں حرصِ زر و مال میں پابند ہے تو

مُنہ مانگے دُرِ یگانہ دے گا تجھ کو — سو طرح سے آب و دانہ دے گا تجھ کو
غم رزق کا کھا رہا ہے کیوں اے غافل — دیتا ہے جو سب کو، کیا نہ دے گا تجھ کو؟

دکھلا کے یہ سبز باغ، بجھ جائیں گے — سینے کے، لحد میں داغ بجھ جائیں گے
ہو جائے گا نظروں میں زمانہ تاریک — اِن آنکھوں کے جب چراغ بجھ جائینگے

پیوندِ زمیں قالبِ بیجاں کر دو! — اِس مٹی کو زیرِ خاک پنہاں کر دو
حاجت ہے کفن کی کیا فقیروں کے لئے — عُریاں آئے تھے، دفن عُریاں کر دو

دل میں نہیں کوئی خوں کا قطرا باقی — اشکوں نے نہ آہ! کچھ بھی رکھا باقی
دل ہو گیا زیست کی حلاوت سے سیر — اب موت کی چاشنی ہے چکھنا باقی

لازم ہے صفائے قلب طاعت کے لئے — ہے شرط خلوص آدمیت کے لئے
آلودہ اسے دروغ و غیبت سے نہ کر — غافل! ہے زبان شکر نعمت کے لئے

آزادئ دل دام ہوس میں کیسی؟ — راحت غم فکر پیش و پس میں کیسی!
پابندئ نفس اور اُمید نجات — پرواز کی آرزو قفس میں کیسی!

بجتا ہی رہا یہ ساز ہستی ہیہات — مر کر بھی کھلا نہ راز ہستی ہیہات
پایاں نہیں قصۂ مختصر کچھ تیرا — اے طول شب دراز ہستی! ہیہات

دنیائے دنی بھی ہے بلا کا پھندا — ہر تار نفس حرص و ہوا کا پھندا
اُبھری ہوئی ہیں جو جسم لاغر پہ رگیں — ہے طائر جاں کو یہ قضا کا پھندا

وحشت دل مبتلا پہ طاری ہوگی — غم سے نہ وہاں بھی رستگاری ہوگی
بالیں پہ نہ غمگسار ہوگا کوئی — سنتے ہیں لحد کی رات بھاری ہوگی

روداد غم سفر سنانے سے رہے — مانند صبا خاک اُڑانے سے رہے
کر لیں جی بھر کے پیار یاران وطن — ہم جا کے عدم کو آہ! آنے سے رہے

وُہ لُطفِ بہارِ زندگانی نہ رہا وُہ دَورِ نشاط و کامرانی نہ رہا
اب وقتِ سفر ہے صبحِ پیری آئی سایہ تیرا اَے شامِ جوانی! نہ رہا

اِک طرفہ فسوں ہے زندگانی ہیہات پیری ہے نہ طفلی، نہ جوانی ہیہات
بازیچۂ اطفال ہے دنیا کا طلسم اِک کھیل ہے دورِ فانی ہیہات

ارمانِ شباب کا لہو ہے دل میں داغِ غمِ آرزو کی بُو ہے دل میں
دُنیا کی تو سَیر کر چکے اَے تمنّا کو اب کُنجِ لحد کی آرزو ہے دل میں

تمنّا کرد میرٹھی،

ہماری زبان

(ایک گیت)

شہد و شکر سے شیریں اُردو زباں ہماری ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری
اس کے نقاط میں ہے اسکے حروف میں ہے آرام دِل ہمارا، تسکینِ جاں ہماری
ہندوستان کی ہر بیشک یہ آسپرانٹو پڑدے میں ہے اسی کے بیتِ نہاں ہماری
کشمیر سے دکن تک، برما سے تا بہ کابل یکجاں ہمیں کرے گی اردو زباں ہماری
اس کے بغیر جینا ممکن نہیں ہے اپنا معلوم کیا کسی کو دشواریاں ہماری
اس کو بچائیں گے ہم جبتک کہ دم میں دم ہم میزباں ہیں اس کے، یہ میہماں ہماری
عالم میں یک زبانی سے بن رہی ہیں قومیں ہے محوِ صد زبانی بستی یہاں ہماری
ان صد زبانیوں نے گونگا کیا وطن کو ہم ہوں زبان والے، قسمت کہاں ہماری

شمعِ اخیرِ شب ہیں ہم محفلِ جہاں میں — باقی رہے گی کب تک پھر داستاں ہماری

ناواقفِ تپش کو معلوم کیا بھلا ہو

گرمیِ دل و جگر کی طورِ تپاں ہماری

غلام محمد طور۔ بی اے

نخلِ ماتم

کھِلا سکے نہ ہوا جس کو۔ مَیں وہ غنچہ ہوں — کسی سے ہو نہ سکے حل۔ مَیں وہ مُعمّا ہوں

لُٹا ہوا سا چمن۔ آبِ رفتہ دریا ہوں — مَیں کیا کہوں تجھے ہمدم کہ کون ہوں کیا ہوں؟

گذشتہ خاک نشینوں کی یادگار ہوں مَیں

مٹا ہوا سا نشانِ سرِ مزار ہوں مَیں

ہرا بھرا چمنِ نو شگفتہ رشکِ جناں — ہزار حیف کہ دم بھر میں ہو گیا ویراں

سُناؤں کس کو مَیں اب حالِ سوزِ دردِ نہاں — نہ خویش ہو نہ برادر نہ سر پہ باپ نہ ماں

نہ مونسے نہ رفیقے نہ ہمدمے دارم

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

نظر سے گر گیا آنسو کی طرح ہر منظر — نہ باغ سے کوئی مطلب نہ خواہشِ گلِ تر

ہے کچھ تجھی سے تسلّیِ خاطرِ مضطر — نہ مجھ سے آنکھ چُرا اے تصوّرِ مادر

رواقِ منظرِ چشمِ من آشیانۂ تست

کرم نما و فرود آ کہ خانہ خانۂ تست

یہ مرغِ پر زدہ بے بال و پر رہے کب تک — تنِ ضعیف تہِ بارِ سر رہے کب تک

عزیز ماں سے پسر بے خبر رہے کب تک — یہ جسم پردۂ چشمِ نظر رہے کب تک

حجاب چہرۂ جاں میشود غبار تنم
خوشا دمیکہ ازیں چہرہ پردہ بر فگنم

امید خاطر محزوں کبھی بر آئیگی — کبھی تو گردش افلاک رنگ لائیگی
تڑپ تڑپ کے کسی دن تو جان جائیگی — یقین ہے کہ کبھی موت مُنہ دکھائیگی

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند چنیں نیز ہم نخواہد ماند

تجھے نہیں ہے نشیمن ہوں میں بھی خانہ بدوش — ترے جگر میں حرارت ہے میرے خون میں جوش
وفور گریہ سے ہو جاؤں گا میں بیہوش — جھکا کے سر کو درختوں پہ تو رہے خاموش

بنال بلبل اگر بامنت سر یاریست
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

جگر میں چٹکیاں لیتا ہے درد بے درماں — ہے خونفشانی پہ آمادہ چشم اشک فشاں
دل حزیں میں نہیں تاب ضبط آہ و فغاں — نہ منع کر مجھے رونے سے ناصح ناداں!

برو بکار خود اے واعظ اینچہ فریادست
مرا فتادہ دل از کف ترا چہ افتادست

کبھی تو کشت تمنا بہار پر آتی — کبھی تو آرزوئے جان زار بر آتی
کوئی امید کی صورت نہیں نظر آتی — کوئی نہیں عدم آباد کی خبر آتی

صبا اگر گذرے افتدت بکشور دوست
بیار نفحہ از گیسوئے معنبر دوست

کیا ہے گردش گردوں نے جب سے خانہ خراب — ترقیوں پہ ہے بیتابی دل بیتاب
نہ دن کو ہے کوئی آرام اور نہ رات کو خواب — خدا کسی کو نہ دے درد فرقت احباب

جدا کسی سے کسی کا غرض حبیب نہو

یہ داغ وہ ہے کہ دشمن کو بھی نصیب نہ ہو

رباعی

زخم دلِ صد چاک دکھایا سب کو　　افسانۂ دردِ غم سنایا سب کو
افسوس نہ ایک یار صادق نکلا　　دیکھا سب کو اور آزمایا سب کو

سید احمد حسین۔ امجد

تازہ غزلیں

(از جناب سید امداد حسن صاحب ظفر نیوری)

حکایتِ ستم و جورِ یار۔ یعنی چہ　　شکایتِ الم روزگار۔ یعنی چہ
وفائے وعدہ ز یارانِ ایں زمانہ مجو　　کشودِ کار بجز کردگار یعنی چہ
ز دستہائے حنا بستہ کار نکشاید　　کشود کار ز دستِ نگار یعنی چہ
ز بختِ خویش امیدِ وصالِ یار محال　　ہوائے صبح ز شبہائے تار۔ یعنی چہ

ظفر ز دردِ غم روزگار نالیدن
چو نیست در کفِ تو اختیار۔ یعنی چہ

وله

ہوسِ وصل یار، یعنی چہ　　ہمہ دم بیقرار۔ یعنی چہ
بر سرِ غنچہ خزاں دیدہ　　آمدِ نوبہار۔ یعنی چہ
واعظ از عاشقاں قرار مجوئے　　عاشقاں را قرار۔ یعنی چہ
دلِ تو از دست دادہ آخر　　گلہ روزگار، یعنی چہ
بفغاں آمدن ز سختیِ عشق　　ظفر دلفگار، یعنی چہ

(از جناب کمال لکھنوی جانشین حضرت جلال مرحوم)

غمزے نے ناز نے انداز نے دل چھین لیا — اُن سے پھر چشم فسوں ساز نے دل چھین لیا
کسی غمزے نے نہ انداز نے دل چھین لیا — اس سُریلی تیری آواز نے دل چھین لیا
مجھ سے کہتے ہیں وہ بلکہ یہ ستم تو دیکھو — فلکِ تفرقہ پرداز نے دل چھین لیا
یوں بھی بیہوش بنادے نہ جوانی کی ادا — کہتے پھرتے ہیں ترے ناز نے دل چھین لیا
نہ مروت رہی آنکھوں میں نہ وہ پاسِ وفا — فتنہ پرداز دغا باز نے دل چھین لیا
اُٹھ گیا بیٹھ کے پہلو سے بدل کر چتون — ساز کرکے مرے دمساز نے دل چھین لیا
یہ بھی قسمت اک ادا نے ہمیں مدہوش کیا — یہ بھی خوبی نگہِ ناز نے دل چھین لیا
دیکھ اس رنگ کو پردے سے نکل کر باہر — پردے والے تری آواز نے دل چھین لیا
یہ تو ہے خوبیٔ تقدیر شکایت کیسی — شکر ہے اک بتِ طناز نے دل چھین لیا

آج بیٹھے ہیں کمال اپنے جگر کو تھامے
اس ادا سے نگہِ ناز نے دل چھین لیا

(از حضرت صفدر مرزا پوری)

لے ہی لینگے مرا دل کہتے ہیں نادان ہو میں — دے ہی دونگا انہیں سیدھا سا مسلماں ہوں نہیں
واں کھلیں شانے پہ اور یاں اُترآئیں دل میں — تیری زلفوں کی درازی سے پریشاں ہو نہیں
میری وحشت نے بنایا ہے تماشا مجھ کو — رونقِ بزم ہوں گو بے سروساماں ہوں نہیں
ذوقِ ایذا طلبی باعثِ راحت ہے مجھے — درد خود اُٹھ کے یہ کہتا ہے کہ درماں ہوں نہیں
اک نظر دیکھ لے او خانہ برانداز حجاب — دیر سے منتظرِ جنبشِ مژگاں ہوں میں
تیر رکتے ہیں بدن میں یہ خبر کیا لیکن — مردمِ چشم کی صورت تہِ مژگاں ہوں میں
مرگِ دشمن پہ بھی ہیں مجھ پہ بلائیں نازل — بال بکھرائے کوئی اور پریشاں ہوں میں

ترے صدقے میں مجھے صبحِ وطن یاد آئی
تیرا ممنون بہت شامِ غریباں ہوں میں

اُس نے جب کھول کے بالوں کو بنائی گھونگر
حلقے حلقے نے کہا دل سے کہ زنداں ہوں میں

غیر کو مدِّ نظر کیوں ہے اُٹھانا میرا
نہ تو چلمن نہ نقابِ رُخِ جاناں ہوں میں

یہ تو کہئے کہ ٹپک جاتے ہیں آنسو ورنہ
انہیں قطروں کو کروں جمع تو طوفاں ہوں میں

جوش اتنا ہے کہ نکلے نہ جنوں کی حسرت
ہمہ تن مثلِ مہِ نو جو گریباں ہوں میں

جان ہی لیکے ٹلی ایسی ادا سے آئی
اے اجل تیرے اس انداز پہ قرباں ہوں میں

خوش ہوں اُس در پہ کہ صورت مری غم سے بدلی
غیر آتے ہیں تو کہتا ہوں کہ درباں ہوں میں

روز ہوتے ہیں درِ یار پہ سجدے سو قدر
شرم آتی نہیں کہتے ہو مسلماں ہوں میں

(از بخشی حضور علی صاحب المتخلص بہ عاشق)

وعدۂ دیدارِ فردا چال تھی صیاد کی
بند ہستی میں جکڑنے کی غرض بنیاد کی

رُوح سے پوچھی جو وجہِ ہستی قیدِ وجود
بولی۔ مجھ کو کھینچ لائی آرزو صیاد کی

توڑ ڈالوں کا قفس کی تیلیاں فولاد کی
قید بجھ سکتی نہیں مجھ سے تو اب صیاد کی

اے پرِ پروازِ آزادی اُڑا لیچل مجھے
عُمر گذری منتیں کرتے ہوئے صیاد کی

رازِ فطرت لاکھ ڈھونڈھے حضرتِ انساں مگر
کب پہنچ سکتا ہے تہ تک وہ عدم آباد کی

سخت جانی سے مری دونوں کی سیری ہو گئی
میرے شوقِ قتل کی اور سختی جلاد کی

نخلِ اُلفت بار ور ہوتے نہیں دیکھا کبھی
جانِ شیریں چھن گئی یہ مُزد تھی فرہاد کی

وقتِ کشتی تھا میں سرخوش زیرِ زانوئے حبیب
اور خون چھلکے پیا کی تیغ اس جلاد کی

کاش ہوتا جلوۂ دیدارِ حق سے بہرہ ور
ہائے یہ قسمت کہاں تھی عاشقِ ناشاد کی

چھپ کر تیار ہے

صبح زندگی

شائقین کو مژدہ ہو کہ کتاب جس کا انہیں ایک عرصہ سے انتظار تھا اور جس کی فرمائشیں قریب قریب ہر جگہ سے بہت ہی کثرت سے موصول ہو چکی ہیں۔ اب شائع ہو گئی ہے۔ یہ کتاب نہایت خوشخط دو قسم کے کاغذ پر چھپی ہے قسم اول کے کاغذ کی چھپائی بہت زیادہ ہے اسلئے قسم اول کی کتابیں جلد منگوا لینا چاہئیں۔ کتاب ہر سہ حصص [illegible] ہے جس میں ایک لڑکی کے چار برس کی عمر سے لیکر شادی کے وقت تک کے وہ تمام واقعات [illegible] سے متعلق ہیں قصہ کے پیرایہ میں بیان کئے گئے ہیں اور اس طرح کنواری لڑکیوں کو جن جن باتوں کے معلوم ہونے کی ضرورت ہے نہایت خوبی سے بتائی گئی ہیں۔ مذہب کی وقعت۔ خدا کی محبت۔ گفتار۔ کردار۔ اطوار۔ عادات کے متعلق طرز بیان ایسا موثر ہے کہ فوراً دلنشین ہو جاتا ہے خانہ داری کی تفصیل میں انتظام صفائی دسترخوان کے علاوہ سینے پرونے چھاپنے کاڑھنے کے بہت [illegible] بتائی گئی ہیں۔ سینے اور کاڑھنے کی ترکیب کے ساتھ نمونے بھی دئیے گئے ہیں۔ عورت کی زندگی کا [illegible] کتاب کی روح رواں ہے اور وداع کا سماں۔ بیوی کا بیٹیوں کو رخصت کرنا اور [illegible] سے تعلق رکھتی ہیں۔ زبان کے متعلق بیان کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ کتاب [illegible] اہل زبان یعنی [illegible] کے مشہور مصنف مولوی محمد عبد الراشد الخیری کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ [illegible] یہ دعویٰ ہے کہ اس سے بہتر اتالیقی کتاب [illegible] نہیں چھپی ہے۔ قیمت قسم اول ۱؎ قسم دوم ۸؎ علاوہ محصول ڈاک۔

[illegible] سے منگوانی چاہئیں

مخزن الجنسی لاہور کی مجوزہ کتابیں

مقامات حریری - مصنفہ شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر ایٹ لا پہلے لاجواب ایڈیشن کے صرف چند نسخے باقی رہ گئے ہیں شائقین جلد منگوالیں ورنہ طبع ثانی کا انتظار کرنا پڑیگا۔ قیمت مع محصولڈاک -

رسوم دہلی - مصنفہ مولوی سید احمد صاحب مؤلف فرہنگ آصفیہ۔ قیمت مع محصولڈاک - ۱۲

منازل السائرہ - مولوی عبدالراشد صاحب الخیری دہلوی کی مقبول کتاب کا دوسرا ایڈیشن -

خواب ہستی - مرزا محمد سعید صاحب ایم اے کے پسندیدہ ناول کا دوسرا ایڈیشن -

ابو مسلم خراسانی - رسالہ الہلال مصری کے فاضل ایڈیٹر جرجی زیدان کی تصنیف ہے۔ مولوی محمد حلیم صاحب دہلوی نے مخزن الجنسی کی خاص فرمائش پر عربی سے سلیس اردو میں ترجمہ کیا ہے قیمت

مکتوبات آزاد - اردو زبان کے محسن شمس العلما مولانا آزاد کے خطوط کا مختصر مجموعہ بتصویر ۶

کلام نیرنگ - سید غلام بھیک نیرنگ بی اے وکیل کے کلام منظوم کا خوشنما ایڈیشن قیمت ۹

انتخاب مخزن - مخزن کی ۹ جلدوں کا انتخاب - قیمت علاوہ محصولڈاک -

درد جانستان - مصنفہ حکیم سید ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی - دہلی کی زبان میں ایک قصہ

دربار نمبر - بادشاہ جوشی کی تقریب پر مخزن کا ایک خاص نمبر نہایت اہتمام سے نکالا گیا تھا -

مثنویات میر حسن - مثنوی بےنظیر و بدر منیر کے ساتھ مثنوی گلزار ارم ایک مستند قلمی نسخے سے نقل کر کے شامل کی ہے

سیر تبت - انگریزی کتاب فی ارس اف تبت کا بامحاورہ ترجمہ اور تبت کے متعلق معلومات کا ذخیرہ ۱۰

مرقع خوشخطی - فن خوشنویسی کی ابتدائی کتاب جسکو منشی فضل الٰہی صاحب مرغوب رقم لاہور نے نہایت محنت سے بتدریج بچوں - کاتبوں اور شائقین کے واسطے تیار کیا جسکو دیکھکر خط کے تمام نکات بآسانی سمجھ میں آسکتے ہیں - علاوہ حسن ظاہری کے جو منشی صاحب موصوف نے ہر جگہ ملحوظ رکھا ہے - وہ یہ بھی ہے کر ابتدا سے ... [illegible]

درخواستیں بنام مینیجر مخزن [illegible]

ہاف ٹون عکسی تصاویر

(شائقین جلد منگوائیں)

علمی اور ادبی دنیا کے جن مشاہیر کی تصویریں وقتاً فوقتاً رسالہ مخزن میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اُن میں سے بعض ایسی ہیں جنہیں اکثر صاحبان بطور یادگار اپنے پاس رکھنا یا فریم میں لگانا چاہتے ہیں۔ اس لئے اُن کی کچھ کچھ زائد کاپیاں چھپوائی گئی تھیں۔ جو اب برائے فروخت پیش کی جاتی ہیں قیمتیں حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ حضرت داغ دہلوی مرحوم۔ قیمت ۳ر	۴۔ گروپ (میر مہدی مجروح مرحوم و منشی امیر اللہ تسلیم و احسان دہلوی) ۳ر
۲۔ شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی۔ ۳ر	۵۔ منشی ونایک پرشاد صاحب طالب بنارسی۔ ۳ر
۳۔ پروفیسر [illegible] (مع دستخط انگریزی و تحریر فارسی) ۳ر	۶۔ حضرت جلال لکھنوی (مرحوم)۔ ۳ر

تصاویر مصر و روم

شہزادہ عباس حلمی پاشا (خدیو مصر) ۴ر	جامع سلطان احمد (استنبول) ۴ر
والی بروصہ کے تین مہمان (جلال النسی بے۔ شیخ منیر حسین قدوائی و شیخ عبدالقادر)۔ ۴ر	(ان تینوں تصویروں کی فقط چند کاپیاں بچی ہیں)

ایضاً

چشمہ سلطان احمد و قیصر ولیم (استنبول) ۱ر	خزینہ ہمایوں کا دروازہ۔ ۱ر
قصر یلدز (جس میں جلوس سلطانی کی بھی تصویر ہے) ۱ر	کارخانہ ابریشم (بروصہ) ۱ر
غلطہ کا بڑا پل (استنبول)۔ ۱ر	درویشان طریقت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ ۳ر

متفرق

فرانس کی [illegible] کا چرخہ۔ (دیکھنے کے قابل) ۱ر	قصر مصنوعات [illegible] (نمائش لندن) ۱ر

درخواستیں بنام منیجر مخزن [illegible] لاہور آنی چاہئیں

عالیجناب نواب وقار الملک بہادر کے نام نامی کو
زندہ اور ہر وقت یاد رکھنے کو ہم نے

وقار الملک

ترکی ٹوپی - ابھی حال میں ولایت کے مشہور کارخانہ گرسٹی سے بنوا کر منگوائی ہے [illegible]
ٹوپی کی وضع اس قدر فیشن ایبل اور خوشنما ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے قیمت [illegible]

محسن الملک پیٹنٹ

یہ اس نئی طرز کی خوشنما ٹوپی کا نام ہے جو اپنی خوبصورتی کے سبب تمام ملک میں مشہور
ہو چکی ہے اور آج ہر فیشن ایبل شخص کے سر کا طرہ زیب ہے تمام بہتر چوٹی کا ہے
قیمت [illegible] محصول [illegible]

فرمائش کے ساتھ سر کا ناپ آنا ضروری ہے - ہر رنگ کی ٹوپیاں ہمارے ہاں موجود ہیں جس رنگ
کی ضرورت ہو مفصل تحریر فرمائیے -

نیز ہر قسم کی عمدہ ململ سلائی قمیصوں کے علاوہ ہر قسم کا مال ہمارے ہاں [illegible]
دکھایا جا سکتا ہے -

عبد الرشید برادر جنرل مرچنٹ علیگڑھ

کایا پلٹ

علم کیمیات جسے اکسیر البدن اور اطبائی اصطلاح میں

اکسیر اعظم کہتے ہیں

ابتدائے آفرینش سے مخلوق کا متفق علیہ مسئلہ ہے کہ تمام جڑی بوٹیوں میں صحیح اصلی عمل [illegible] معلوم ہوتا ہے۔ اگر کوئی حکیم ان جڑی بوٹیوں کا صحیح علاج [illegible] سے صحیح کو حاصل کرے پھر وہ جس مرض میں دیا جائے۔ مرض کیسی ہی [illegible]

لاعلاج ہو وہ اس کو طاقت دیکر مرض کو نکال دیتا ہے۔

یہی اکسیر دوا ہمیشہ ایک کو معلوم نہیں ہوتیں۔ بلکہ بعض خاص لوگوں کو جن پر اللہ میاں اپنا فضل فرماتا ہے تمام جڑی بوٹیوں کا راز افشا کرتا ہے جس میں صحیح حاصل دیا ہوتا ہے۔ چنانچہ ارسطو حکیم امام جعفر علیہ السلام ابن [illegible] سکندر جیسے بادشاہ اس قسم کی چیزوں کے متلاشی رہے حکیم [illegible] حکیم ہیں۔ [illegible] ماہر کو ایجاد کیا ہے اور [illegible] میں صحیح کو تبدیل کرتے ہیں کوئی [illegible]

اس لئے وہ سرایت کر کے جسم سے مرض کو بالکل نکال دیتا ہے۔

اکسیر البدن دوائی کا خاصہ ہے کہ مرض کو جسم سے داخل ہوتے ہی خارج کر دیتا ہے اور مزاج کو فوری حالت پہ پہنچاتا ہے [illegible] مرض ہے۔ ثابت ہو کہ یہ اکسیر اعظم ہر قسم کی مختلف لاعلاج بیماریوں میں [illegible] علم [illegible] تجربات کی وجہ اصل [illegible] ایجاد [illegible] حسب ذیل امراض میں بے حد مفید ثابت ہوئی ہے۔

[illegible]

ڈاکٹر [illegible] لاہور

چھپ کر تیار ہے

خیالستان

یعنی

سید سجاد حیدر صاحب بی۔ اے کے مصنفہ قصص و مضامین کا مجموعہ

یہ کتاب پونے چار سو صفحوں سے زیادہ حجم کی چھوٹی خوبصورت تقطیع پر نہایت عمدہ چھپی ہے۔ کاغذ چکنا ولایتی۔ سرورق کا کاغذ سفید ولایتی جس پر سرخ و سبز رنگ کے بیل بوٹے ہیں۔ ایک مختصر سی تمہید جناب میر نیرنگ صاحب بی۔ اے نے لکھ کر اس دلچسپ مجموعہ کے کتاب کی صورت میں پیش ہونے کی ضرورت ظاہر کی ہے۔

سید سجاد حیدر صاحب کے چھوٹے مضامین جس قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے ہیں [illegible] بیان نہیں۔ صرف مثال کے طور پر اتنا بتا دینا کافی ہے کہ بعض اوقات لوگ [illegible] ہیں۔ کہ مخزن کا ایک پرانا پرچہ جس میں صاحب موصوف کا فلاں مضمون تھا [illegible] ایک روپیہ کا وی پی کر دیجئے۔ اب انکے وہ سب مضامین جو مخزن میں نکلے ہیں اور دیگر مضامین جو اور رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ یکجا نہایت اہتمام اور خوبصورتی سے چھپے ہوئے ہدیہ ناظرین ہیں۔ قیمت علاوہ محصولڈاک دو روپے۔ شائقین جلد منگوائیں۔

مینیجر رسالہ مخزن [illegible]

قرآن مجید کا ایک نیا معجزہ

خدا کی کتاب فصاحت و بلاغت کا معجزہ تو ہے ہی یہ ہر ایک مسلمان
کا مسلمہ ہے لیکن اس کا یہ نیا معجزہ [illegible] ہے جو
قرآن شریف [illegible] جس کا [illegible] اشتہار ہے اس کے [illegible] صفحات
ہیں اور ہر صفحہ میں گیارہ سطریں ہیں [illegible] درمیانی سطر سے
اوپر اور نیچے پانچ پانچ سطریں ہیں اور [illegible]
کہ اس قرآن شریف کے تمام صفحات میں ہر ایک صفحہ کی درمیانی سطر سے
[illegible] سطروں کو [illegible] والی پانچ پانچ سطروں سے [illegible]
ہر صفحہ [illegible] حرف سے اوپر والی سطریں شروع ہوتی ہیں [illegible]
حرف سے نیچے والی سطریں شروع ہوتی ہیں اور درمیانی [illegible] سطر [illegible]
کے [illegible] درمیانی [illegible] ہے [illegible] آپ [illegible]
قرآن [illegible] معجزہ [illegible]

طب یونانی کی بقا کے لئے

عالیجناب حاذق الملک حکیم محمد اجمل خانصاحب رئیس اعظم کا

جو خدمات انجام دی ہیں انکا معقول حصہ شہرت کے منظر پر آچکا ہے۔ اطراف ہند میں اس کا اہم پہلو
جسکی نظریں انہی کی طرف اُٹھتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ طب یونانی کے مستقبل کی نسبت اگر کچھ امیدیں ہیں
تو وہ انہی کی ذات سے ہیں اور انہی کے خاندان سے وابستہ ہیں۔ جناب حاذق الملک احساس فخر کے
ساتھ دل میں اس فن شریف کی ترقی کے ارمان رکھتے اور خاموشی سے اپنے قیمتی اوقات کو ملک کی
اس اہم بالشان خدمت میں صرف کرتے رہتے ہیں۔ ہندوستانی دواخانہ انکے احساس فخر کا
اور انکی مستقل اور خاموش کوششوں کا ثمرہ ہے گو اسکی ظاہری حیثیت ایک تجارتی حیثیت ہے لیکن
حقیقت شناس نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک تجارتی کام نہیں۔ طب یونانی کی بقا کا سامان ہے [illegible]
اسکو علیحدہ رکھا گیا ہے۔ اس لئے جس غرض سے قائم ہوا ہے اسکے پورا ہونے میں کوئی مخالف اعتبار
باقی نہیں رہا۔ اصلی اور پورے اجزا سے بنی ہوئی یونانی ادویات اور انکے طرز شناخت میں تہذیب
ترقی دواخانہ کا مقصد ہے جسے یہ پورا کرتا ہے۔ بہت سی اس قسم کی ادویات جو مختلف امراض و
عام طور پر نایاب ہیں۔ بلکہ حکما کے وہ اصلی نسخے جو صرف رؤسا و امرا کو میسر آ
تھے بالکل اصل اس دواخانہ میں تیار ہوتے ہیں اور واجبی قیمت پر فروخت ہوتے ہیں

اس دواخانہ کی آمدنی مدرسہ طبیہ زنانہ شفاخانہ کو دیجاتی ہے

نیز جناب حاذق الملک بہادر نے اپنی اور اپنے زندہ جاوید بزرگوں کی خاص خاص دوائیں بھی اس دواخانہ کو عطا
فرمائی ہیں صحت و تندرستی ایک جوہر بے بہا ہے اور ہر ایک انسانی جسم اس دولت کا محتاج [illegible]
کو ان اعلیٰ اور منتخب یونانی اور عربی ادویات سے جو اس دواخانہ میں خاص اہتمام [illegible]
اسکے ساتھ اس کار خیر کی مدد کا موقعہ ملسکتا ہے۔ خوبی انتظام اور حسن معاملہ کے باعث تھوڑے عرصہ میں
دواخانہ نے غیر معمولی ترقی کی ہے

خط کا ٹھیک پتہ - منیجر ہندوستانی دواخانہ دہلی